خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

# خواتین ڈائجسٹ

اگست 2017



# خواتین ڈائجسٹ


خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز




[illegible]

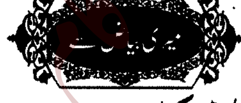
| | |
|---|---|
| [illegible] | ،، 700 |
| [illegible] | ،، 6000 |
| [illegible] | ،، 7000 |






























اگست 2017

جلد 45 شمارہ 4

قیمت 60 روپے

خط وکتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام : بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی



Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیر

## کہی ان کہی

خواتین ڈائجسٹ اگست کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

انسانوں کی طرح قوموں کی بھی عمر ہوتی ہیں۔ وہ وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہیں۔ بام عروج پر پہنچتی ہیں اور قوانین فطرت کی خلاف ورزی کے باعث اپنے انجام کو پہنچتی ہیں۔ وقت ان کا نام و نشان تک مٹا دیتا ہے۔ تاریخ کے صفحات میں قوموں کے عروج و زوال کی بے شمار داستانیں محفوظ ہیں۔ بیشتر قومیں اس لیے تباہ و برباد ہوئیں کہ وہ زمین پر عدل و انصاف کا نظام قائم نہ کرسکیں۔ ان کے ہاں کمزور اور طاقت ور کے لیے جزا اور سزا کے علیحدہ علیحدہ پیمانے تھے۔ عدل اسی وقت ہوسکتا ہے جب قانون سب کے لیے یکساں ہو، بلا امتیاز سب کا احتساب ہو، خواہ وہ امیر ہو یا غریب، کمزور ہو یا طاقت ور کسی کو بھی استثنیٰ حاصل نہیں ہونا چاہیے۔

کسی قوم کی شناخت اس کے عقائد، اس کی طرزِ فکر اس کا قومی مزاج اور اس کی ثقافت ہونے کے ساتھ وہ خطہ زمین بھی ہوتا ہے جو اس کا وطن ہوتا ہے، جہاں وہ اپنے مذہبی عقائد، اپنی سوچ، فکر کے مطابق ایک نظام قائم کرسکے اور ایک آزادانہ زندگی گزار سکے۔

اس سوچ کو سامنے رکھتے ہوئے شاعر مشرق علامہ اقبال نے ہندوستان کے ہر مسلمان کے دل میں ایک علیحدہ وطن کی جوت جگائی۔ قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت میں برصغیر کے مسلمانوں نے جدوجہد کی۔ ایک کڑی مسافت کے بعد چودہ اگست 1947ء کو یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ مسلمان ہندوؤں کے تسلط سے آزاد ہوئے اور دنیا کے نقشے پر ایک نیا ملک ابھرا اسلامی جمہوریہ پاکستان۔ اپنا علیحدہ وطن اور آزادی اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے لیکن افسوس ہم آزاد ہوکر بھی آزاد نہ ہوپائے اور آج تک ان ہی دائروں میں سفر کررہے ہیں۔

وقت بہت آگے نکل چکا ہے۔ بہت کچھ ہم گنوا چکے ہیں۔ اب مزید کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ ہمیں مل جل کر کوشش اور محنت کرنا ہوگی، تب ہی ایک مستحکم اور خوش حال پاکستان کا خواب تعبیر پاسکے گا۔

قارئین کو جشن آزادی مبارک۔

اللہ تعالیٰ ہمارے پاک وطن کو سرسبز، شاداب اور آباد رکھے۔ آمین۔

### عید نمبر

خواتین ڈائجسٹ کا ستمبر کا شمارہ عید نمبر ہوگا جس میں عید الاضحیٰ سے متعلق تحریریں اور سلسلے شامل ہوں گے۔ عید نمبر میں ایک خصوصی سروے بھی شامل ہوگا۔

### اس شمارے میں،

- نفیسہ ناز کا مکمل ناول ۔ فسانۂ زندگی،
- سائرہ رضا کا مکمل ناول ۔ عین المآب اور ۔
- سارہ عرفان کا مکمل ناول ۔ تیرا انتظار امرت،
- منشاء محسن علی اور سدرہ حیات کے ناولٹ،
- نمرہ احمد اور آمنہ ریاض کے ناول،
- آسیہ مذاقی، شازیہ جمال طارق، شازیہ الطاف ہاشمی اور سحر محمد علی کے افسانے،
- ٹی وی فنکارہ بینش راجا سے باتیں،
- ڈراما نگار اور ڈائریکٹر نوید جعفری سے ملاقات،
- کرن کرن روشنی ۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

# کرن کرن روشنی

ادارہ

## جنت میں مسلمان

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم تقریباً" چالیس آدمی ایک خیمے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، آپ نے (وہاں) فرمایا "کیا تم پسند کرتے ہو کہ تم اہل جنت کا چوتھا حصہ ہو؟" ہم نے کہا "ہاں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کیا تم پسند کرتے ہو کہ تم اہل جنت کا تہائی حصہ ہو؟"

ہم نے کہا "ہاں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! میں یقیناً" امید رکھتا ہوں کہ تمہاری تعداد اہل جنت میں آدھی ہوگی اور یہ اس لیے کہ جنت میں مسلمان ہی داخل ہوں گے۔ اور تم مشرکین کے مقابلے میں ایسے ہی ہو جیسے کالے بیل کی کھال میں سفید بال یا سرخ بیل کی کھال میں سیاہ بال ہوں۔"

(بخاری و مسلم)

### فوائد و مسائل :

1۔ اس میں ایک تو اس حقیقت کا بیان ہے کہ اہل ایمان و توحید کے مقابلے میں اہل شرک کثرت سے ہوں گے جیسا کہ قرآن کریم میں بھی اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔

2۔ دوسری امتوں کے مقابلے میں امت محمدیہ کے مسلمان جنت میں زیادہ ہوں گے حتیٰ کہ ان کی تعداد' اہل جنت میں نصف ہوگی۔ اس میں امت محمدیہ کے لیے خوش خبری بھی ہے اور ان کی توقیر و عزت بھی۔

3۔ اس میں اہل ایمان کا حسن انجام اور اہل کفر و شرک کا انجام بد بیان کیا گیا ہے۔

## اہل ایمان

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"قیامت کے روز مومن اپنے رب کے قریب کر

دیا جائے گا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنی حفاظت اور رحمت میں لے لے گا' پھر وہ اس سے اس کے گناہوں کا اقرار کروائے گا' اس سے کہے گا۔
"کیا تو فلاں گناہ جانتا ہے؟ کیا تجھے فلاں گناہ کا علم ہے؟"
مومن کہے گا۔ "ہاں اے رب! جانتا ہوں۔"
اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ "میں نے دنیا میں بھی تیرے ان گناہوں پر پردہ ڈالے رکھا اور آج میں تیرے یہ گناہ معاف کرتا ہوں۔" پھر اسے اس کی نیکیوں کا دفتر دے دیا جائے گا۔" (بخاری و مسلم)
**فائدہ:** اس میں ایسے اہل ایمان کا تذکرہ ہے کہ ان کے ساتھ اللہ خصوصی فضل و کرم کا معاملہ فرمائے گا اور ان کے گناہ معاف فرما کر پہلے مرحلے ہی میں انہیں جنت میں بھیج دے گا۔

## گناہ کی معافی

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا۔
"اے اللہ کے رسول! مجھ سے ایسا جرم سرزد ہو گیا ہے۔ جس پر میں سزا کا مستحق ہو گیا ہوں' آپ وہ سزا مجھ پر نافذ فرمائیں۔"
(اتنے میں) نماز کا وقت ہو گیا اور اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی۔ جب وہ نماز سے فارغ ہو گیا تو اس نے (پھر) کہا۔
"اے اللہ کے رسول! مجھ سے قابل سزا جرم کا ارتکاب ہو گیا ہے' آپ میرے بارے میں اللہ کی کتاب (کا حکم) نافذ فرمائیں۔"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کیا تو نے ہمارے ساتھ نماز پڑھی ہے؟"
اس نے کہا "ہاں۔"
"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:" تیرا گناہ معاف کر دیا گیا ہے۔" (بخاری و مسلم)
اصبت حدا کے معنی ہیں: مجھ سے ایسا گناہ ہو گیا ہے، جو موجب تعزیر ہے۔ اس سے مراد حقیقی حد شرعی نہیں ہے' جیسے زنا اور شراب نوشی وغیرہ کی حد ہے۔ اس لیے کہ یہ حدیں نماز سے معاف نہیں ہوتیں' نہ حاکم وقت ہی کو یہ اختیار ہے کہ وہ ان کا نفاذ ترک کر دے۔

## شکر

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"بے شک اللہ تعالیٰ بندے کی اس ادا پر خوش ہوتا ہے کہ وہ کھانا کھائے اور اس پر اللہ کی حمد کرے یا پانی پیے تو اس پر اللہ کی حمد کرے۔" (مسلم)
**فوائد و مسائل:**
1۔ کھانے یا پانی وغیرہ پینے کے بعد الحمد للہ کہنا چاہیے۔ بہتر ہے کہ کوئی مسنون دعا پڑھ لی جائے' اس باب میں اس حدیث کو لانے کا مقصد خوف اور رجاء (امید) دونوں باتوں کا **استحضار** (ذہن میں موعود کرنا) ہے۔ کھاتے پیتے وقت اللہ کو یاد رکھو گے تو اللہ کی رضا مندی کی امید ہے۔ علاوہ ازیں یہ خوف بھی دامن گیر رہے کہ وہ اللہ ہی سب کچھ دینے والا ہے' وہ اگر چاہے تو تم سے یہ نعمتیں سلب کر لے یا نعمتوں کی فراوانی کے باوجود تمہیں کھانے پینے کی قوت سے محروم کر دے' جیسے بعض بیماریوں میں ایسا ہوتا ہے۔ اعاذنا اللہ منھا۔

## توبہ

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"بے شک اللہ تعالیٰ رات کو اپنا ہاتھ دراز فرماتا ہے تاکہ دن کو برائی کا ارتکاب کرنے والا توبہ کر لے۔ اور دن کو اپنا ہاتھ دراز فرماتا ہے تاکہ رات کو برائی کا ارتکاب کرنے والا توبہ کر لے' یہاں تک کہ سورج مغرب سے طلوع ہو۔" (مسلم)
**فوائد و مسائل:**
1۔ ہاتھ پھیلانا کنایہ ہے قبول توبہ سے' جیسے کسی چیز

کو لینا ہو تو ہاتھ پھیلائے جاتے ہیں اور نہ لینا ہو تو قبض کر لیے جاتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہاتھ کس طرح پھیلاتا ہے' سو اس کی کیفیت ہم نہیں جان سکتے۔ تاہم اس میں اللہ کی صفت کا بیان ہے جس پر بغیر کسی تاویل یا تشبیہ کے ایمان رکھنا ضروری ہے' جس طرح اس کی دوسری صفات پر ایمان ضروری ہے' یہی سلف کا مذہب ہے۔

2۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہاتھ پھیلانے' یعنی قبول توبہ کا سلسلہ جاری رہے گا' یہاں تک کہ قیامت کے قریب جب سورج مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہو گا تو یہ سلسلہ موقوف ہو جائے گا اور اس کے بعد کسی کا ایمان لانا اور توبہ کرنا قبول نہیں ہو گا' اس لیے انسان کو توبہ کرنے میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے اور توبہ بھی وہ جو صحیح توبہ ہو۔

حضرت ابو نجیح عمرو بن عبسہ سلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ۔

"میں (اسلام سے قبل) زمانہ جاہلیت میں گمان کرتا تھا کہ لوگ گمراہی پر ہیں اور وہ کسی دین پر نہیں ہیں اور بتوں کی عبادت کرتے ہیں' پھر میں نے ایک آدمی کی بابت سنا کہ وہ مکے میں (بتوں کے خلاف) کچھ باتیں کرتا ہے۔ چنانچہ میں اپنی سواری پر بیٹھا اور اس شخص کے پاس مکے آیا تو دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چھپ کر اپنا تبلیغی کام کر رہے ہیں اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی قوم دلیر ہے۔ چنانچہ میں نے چوری چھپے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ملنے کی تدبیر کی' حتیٰ کہ میں مکے میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کہا۔

"آپ کون ہیں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں نبی ہوں۔"

میں نے کہا: "نبی کون ہوتا ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "(جسے اللہ اپنے احکام دے کر بھیجے اور) مجھے اللہ نے بھیجا ہے۔"

میں نے کہا: "آپ کو اللہ نے کس چیز کے ساتھ بھیجا ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مجھے اس نے بھیجا ہے کہ میں صلہ رحمی کا حکم دوں' بتوں کو توڑ دوں اور یہ کہ ایک اللہ کی عبادت کی جائے' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔"

میں نے کہا "اس کام پر آپ کے ساتھ کون (کون) ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ایک آزاد شخص اور ایک غلام۔"

اور اس وقت آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر اور حضرت بلال رضی اللہ عنہم تھے۔

میں نے کہا "میں (بھی) آپ کا پیروکار ہوں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم آج اس کی ہرگز طاقت نہیں رکھتے۔ کیا تم میرا اور لوگوں کا حال نہیں دیکھ رہے؟ لہٰذا تم (ابھی) اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ جاؤ' جب تم میری بابت سنو کہ میں غالب آگیا ہوں تو پھر میرے پاس آنا۔"

چنانچہ میں اپنے گھر والوں کے پاس آگیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ چھوڑ کر) مدینہ تشریف لے آئے اور میں اپنے گھر والوں میں تھا۔ چنانچہ میں نے خبروں کی جستجو شروع کر دی اور جس وقت آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مدینہ آگئے تو میں (آپ کی بابت) لوگوں سے پوچھتا۔ یہاں تک کہ کچھ لوگ باشندگان مدینہ میں سے آئے تو میں نے کہا: "اس آدمی کا کیا حال ہے جو (مکے سے ہجرت کر کے) مدینہ آیا ہے؟"

انہوں نے کہا: "لوگ اس کی طرف تیزی سے آ رہے ہیں' اس کی قوم نے تو اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن وہ ایسا نہیں کر سکے۔"

چنانچہ میں مدینہ آیا اور آپ کے خدمت میں حاضر ہوا' میں نے کہا: "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ مجھے پہچانتے ہیں؟"

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: "ہاں' تم وہی ہو جو مجھے مکے میں ملے تھے۔"

میں نے کہا: "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ مجھے وہ باتیں بتلائیں جو اللہ نے آپ کو سکھلائی ہیں اور میں ان سے ناواقف ہوں۔ مجھے نماز کے متعلق بتلایئے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم صبح کی نماز پڑھو' پھر سورج کے ایک نیزے کی مقدار بلند ہونے تک نماز سے رکے رہو' اس لیے کہ جب تک سورج طلوع ہوتا ہے تو وہ شیطان کے دو سینگوں کے درمیان نکلتا ہے اور اس وقت کافر اسے سجدہ کرتے ہیں۔ پھر تم نماز پڑھو' اس لیے کہ نماز میں فرشتے گواہ ہوتے اور لکھنے کے لیے حاضر ہوتے ہیں' یہاں تک کہ سایہ (کم ہوتے ہوتے) نیزے کے برابر ہو جائے۔ (یہ نصف النہار' یعنی زوال کا وقت ہے۔) پھر (اس وقت) نماز سے رک جاؤ' اس لیے کہ اس وقت جہنم بھڑکائی جاتی ہے' پھر جب سایہ بڑھنے لگے (یہ ظہر کے وقت کا آغاز ہے) تو نماز پڑھو' اس لیے کہ نماز میں فرشتے گواہ اور (لکھنے کے لیے) حاضر ہوتے ہیں' یہاں تک کہ تم عصر کی نماز پڑھو' پھر (نماز عصر کے بعد) تم نماز سے رک جاؤ' یہاں تک کہ سورج غروب ہو جائے' اس لیے کہ سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان غروب ہوتا ہے اور اس وقت اسے کافر سجدہ کرتے ہیں۔"

میں نے کہا: "اے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! وضو کے بارے میں بھی مجھے بتلایئے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم میں سے جو شخص بھی وضو کا پانی اپنے قریب کرے اور (ہاتھ دھونے کے بعد) کلی کرے' ناک میں پانی ڈالے اور ناک جھاڑ کر صاف کرے تو اس کے چہرے' منہ اور ناک کے گناہ گر جاتے (جھڑ جاتے) ہیں' پھر جب وہ اپنا منہ دھوتا ہے' جیسے اسے اللہ نے حکم دیا ہے' تو اس کے چہرے کی غلطیاں اس کی ڈاڑھی کے کناروں سے پانی کے ساتھ گر جاتی ہیں' پھر اپنے دونوں ہاتھ کہنیوں تک دھوتا ہے تو اس کے ہاتھوں کی خطائیں اس کی انگلیوں سے پانی کے ساتھ نکل جاتی ہیں' پھر وہ اپنے سر کا مسح کرتا ہے تو اس کے سر کی غلطیاں اس کے بالوں کے کنارے سے پانی کے ساتھ نکل جاتی ہیں' پھر وہ اپنے دونوں پیر ٹخنوں تک دھوتا ہے تو اس کے پیروں کے گناہ اس کی انگلیوں سے پانی کے ساتھ نکل جاتے ہیں۔ چنانچہ (اس کے بعد) اگر وہ کھڑا ہوا اور نماز پڑھی' پس اللہ کی حمد و ثنا اور بزرگی اس طرح بیان کی جس طرح وہ اس کا حق رکھتا ہے اور اپنے دل کو اللہ کے لیے فارغ کر دیا (یعنی خشوع خضوع کا اہتمام کیا) تو وہ گناہوں سے اس طرح پاک صاف ہو کر نکلتا ہے' جیسے وہ اس وقت تھا جب اس کی ماں نے اسے جنا تھا۔"

یہ حدیث عمرو بن عبسہ نے حضرت ابو امامہ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی' سے بیان کی تو ان سے ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"اے عمرو بن عَبَسہ! دیکھو تم کیا بیان کر رہے ہو۔ ایک ہی جگہ پر' اس آدمی کو یہ مقام دے دیا جائے گا؟ (یعنی صرف ایک وضو کرنے پر ہی تم سارے گناہوں سے پاکیزگی کا مقام عطا ہونے کی بات کر رہے ہو؟)

حضرت عمرو نے فرمایا: "اے ابو امامہ! میری عمر بڑی ہو گئی' میری ہڈیاں کمزور ہو گئیں اور میری موت قریب آگئی ہے اور مجھے کوئی ضرورت بھی نہیں ہے کہ میں اللہ تعالیٰ پر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولوں۔ اگر میں نے یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مرتبہ' دو مرتبہ' تین مرتبہ' حتیٰ کہ سات مرتبہ تک نہ سنی ہوتی تو میں کبھی یہ حدیث بیان نہ کرتا لیکن میں نے تو یہ حدیث اس سے بھی زیادہ مرتبہ سنی ہے۔ (مسلم)

## فوائد و مسائل :

1۔ اس میں ایک تو دعوت و تبلیغ کی حکمت اور اس کے اسلوب کا بیان ہے کہ جب داعی کمزور اور اس کے مخالفین طاقتور ہوں تو اپنی افرادی قوت کی حفاظت ضروری ہے تاکہ حاصل شدہ قوت ضائع نہ ہو' اس لیے آپ نے حضرت عمرو بن عبسہ کو تاکید فرمائی کہ ابھی تم اپنے اسلام کو مخفی رکھو اور اپنے گھر ہی میں جا کر

رہو۔

2۔ حالات کتنے ہی نامساعد ہوں اور مخالفت کتنی ہی زیادہ ہو' تاہم داعی الی اللہ کو اللہ کی طرف سے مدد اور فتح و غلبہ کی امید رکھنی چاہیے۔ چنانچہ اسی امید پر آپ نے حضرت عمرو کو فرمایا: "جب تمہیں میرے غلبے کی خبر پہنچے تو میرے پاس آنا۔"

یہ آپ کی نبوت کی دلیل بھی ہے کہ جس طرح آپ نے فرمایا' اسی طرح ہوا۔

3۔ نماز کے وقت فرشتے بھی حاضر ہوتے ہیں۔ جس کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی نماز اطمینان اور خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرے تاکہ اس کی نماز کی رپورٹنگ (اطلاع) صحیح ہو۔

4۔ نماز کے مکروہ اوقات کا بیان اور وہ ہیں: نماز فجر کے بعد طلوع آفتاب تک' زوال کے وقت' عصر کے بعد غروب آفتاب تک اور عین طلوع و غروب کے وقت۔

وضو اور نماز' یہ صغیرہ گناہوں کا کفارہ ہیں اور اسی مناسبت سے یہ روایت اس باب میں ذکر کی گئی ہے۔

اہل عرب بالعموم بادیہ نشین تھے' اس لیے نصف النہار (زوال) کا وقت معلوم کرنے اور سورج کے طلوع کا اندازہ کرنے کے لیے' نیزے کا تذکرہ فرمایا کیونکہ اس کے لیے ان کے ہاں اسی کا استعمال تھا۔ اب فلکیات کے علم نے تمام سیاروں کی رفتار کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرکے تمام اوقات طلوع و غروب اور زوال وغیرہ کا تعین کر دیا ہے' تاہم شہروں سے دور' پہاڑوں اور جنگلات وغیرہ میں رہنے والوں کے لیے اب بھی یہ پیمانے مفید ہیں اور وہ ان سے کام لیتے ہیں۔

5۔ زمانہ جاہلیت میں بھی نیک اور صحیح الفطرت لوگ بتوں کی عبادت کو گمراہی ہی سمجھتے تھے۔

## اچھی امید

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: "اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے: اے انسان! جب تک تو مجھے پکارتا رہے گا اور مجھ سے (اچھی) امید رکھے گا' میں تجھے بخشتا رہوں گا' چاہے تیرے عمل کیسے ہی ہوں اور میں پروا نہیں کروں گا۔ اے ابن آدم! اگر تیرے گناہ آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جائیں' پھر تو مجھ سے بخشش طلب کرے تو میں تجھے بخش دوں گا اور میں کوئی پروا نہیں کروں گا۔ اے آدم کے بیٹے! اگر تو میرے پاس زمین بھر گناہوں کے ساتھ آئے اور تو مجھے اس حال میں ملے کہ تو میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا ہوگا تو میں تیرے پاس زمین بھر بخشش لے کر آؤں گا۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔)

**فوائد و مسائل:**

1۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان گناہ آلود زندگی کو اپنا شیوہ بنالے کیونکہ ایسا شخص تو پھر توبہ و انابت الی اللہ کی توفیق سے ہی بالعموم محروم رہتا ہے۔ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ انسان سے نادانی اور غفلت میں کتنے بھی گناہ ہو جائیں' حتیٰ کہ اس کے گناہ آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جائیں' لیکن اسے اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہونا چاہیے بلکہ خلوص دل سے توبہ کرکے اگر وہ اللہ سے مغفرت کا طلب گار ہوگا تو اللہ تعالیٰ کی آغوش رحمت اپنے لیے وا پائے گا۔

2۔ شرک ناقابل معافی جرم ہے۔ شرک کے علاوہ کیسے بھی اور کتنے بھی گناہ ہوں' ان کی مغفرت کی امید ہے۔ اللہ چاہے گا تو پہلے مرحلے میں معاف فرما دے گا' ورنہ کچھ سزا کے بعد معافی ہو جائے گی۔ بہرحال گناہ گار مومن کے لیے جہنم کی سزا دائمی نہیں' جیسے مشرک کے لیے ہے۔

3۔ شیطان کا طریقہ واردات یہ ہے کہ پہلے بندے کو گناہ پر آمادہ کرتا اور جب وہ اس کا مرتکب ہو جاتا ہے تو پھر اسے توبہ سے غافل رکھتا ہے اور اگر کبھی بندہ انابت الی اللہ کا سوچے تو گناہوں کی ایک لمبی فہرست انسان کے سامنے کھول کر اسے مغفرت سے ناامید کر دیتا ہے۔ اس حدیث میں اسی بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔



# جگنو میاں کی کہانی

انشا جی

میں بتاؤں جگنو میاں سے میری ملاقات پہلے کس طرح سے ہوئی تھی۔ یہ بہت پہلے کی بات ہے۔ جگنو میاں اسکول میں پڑھتے تھے اور بوائے اسکاؤٹوں کے ایک جتھے کے ساتھ مضافات میں کیمپ لگائے ہوئے تھے۔ ایک لڑکا درخت پر لکڑی کے ایک تختے کو کیلوں سے اس طرح جڑنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس پر چیزیں لٹک سکیں۔ جگنو میاں نے اسے ایک طرف ہٹا کر کہا۔

"میاں! تم سے نہیں ہوگا۔ ادھر لاؤ' میں ٹھونکتا ہوں کیل۔" تختے کو دیکھ کر وہ کہنے لگے۔

"ذرا ایک منٹ ٹھہرو' اس تختے کا یہ سرا جو ٹیڑھا ہے' پہلے اسے برابر کرنے کی ضرورت ہے' بس آری سے کاٹ دیا جائے گا۔"

آری بھی کہیں سے مل گئی اور جگنو میاں نے کاٹنا بھی شروع کر دیا' لیکن ایک دو ہاتھ چلا کر رک گئے اور کہا۔

"کس کباڑ خانے سے اٹھا لائے یہ آری' ذرا اس کے دندانے تیز کرنے چاہئیں' یوں کام نہ چلے گا۔"

دندانے تیز کرنے کے لیے ریتی چاہیے تھی۔ کسی کی خوشامد کر کے کوئی شخص مانگ لایا' لیکن قباحت یہ تھی کہ اس کی ہتھی نکلی پڑ رہی تھی۔ اس پر جگنو میاں نئی ہتھی لگانے کے لیے کوئی مناسب لکڑی تلاش کرنے لگے' خیر لکڑیوں کی وہاں کیا کمی تھی' لیکن جب تک کلہاڑے کی تیز دھار نہ ہو' لکڑی ٹھیک کٹنا ممکن نہیں۔ کلہاڑے کی دھار تیز کرنا کوئی ایسا علم تو نہیں جو صرف کابلی پٹھانوں کو آتا ہے۔ لیکن سان کا پتھر اس وقت کہاں تک بنتا ہے جب تک اس کے سہارے کے لیے لکڑی کی ٹانگیں مضبوط نہ ہوں۔ اس کام کو ڈھنگ سے کرنے کے لیے جگنو میاں نے سب سے پہلے بڑھئی والا بنچ بنانے کا فیصلہ کیا جس میں جمائے بغیر آپ لکڑی پر رندہ کر ہی نہیں سکتے۔ دقت یہ تھی کہ اچھے اوزاروں کے بغیر بنچ کا بننا ناممکن۔ آخر بے چارے جگنو میاں کو اوزار لینے کے لیے شہر جانا پڑا اور وہ پھر نہیں لوٹے۔

کئی ہفتے بعد شہر سے کوئی آدمی آیا تو اس نے اطلاع دی کہ جگنو میاں ہر طرح خیریت سے ہیں۔ بازار میں مل گئے تھے' اوزار بنانے کی ولایتی مشینوں کے تھوک بھاؤ پوچھتے پھر رہے تھے۔

اس کے بعد تو ایک زمانے میں جگنو سے میری اچھی خاصی دوستی بھی رہی۔ کچھ دنوں ہم کالج میں پڑھتے رہے۔ لیکن افتاد قسمت کہ جگنو میاں پڑھائی میں زیادہ نہ چل سکے۔ وہ جس کام کو شروع کرتے' بڑے ذوق و شوق سے شروع کرتے' لیکن راستے میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ آن پڑتی تھی۔ مثلاً" ایک بار انہوں نے جدید اردو ادب کا مضمون لیا۔ تھوڑے دنوں بعد انہوں نے محسوس کیا کہ اس کے لیے قدیم اردو ادب کا پڑھنا ضروری ہے۔ قدیم اردو ادب کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیے ابھی دو ہی ہفتے ہوئے تھے کہ دریافت ہوا کہ جب تک عربی پہ عبور نہ ہو۔ فارسی کا علم مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔ عربی میں ہاتھ ڈالا' پتا چلا کہ منبع عبرانی زبان ہے۔ جگنو میاں نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر عبرانی کے معلم کی تلاش شروع کر دی۔ دوڑ دھوپ کے بعد ایک شخص ملا تو اس نے بتایا کہ عبرانی کا فیقی اور آرامی وغیرہ زبانوں سے جو پیکانی حروف میں مٹی کی لوحوں پر لکھی جاتی تھیں گہرا تعلق ہے۔ جگنو میاں کو یہ جان کر بے حد مایوسی ہوئی کہ ان حروف کا آخری ماہر دو سال قبل کسمپرسی کے عالم میں فوت ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بے چارے کو پھر سے مضمون کا انتخاب کرنا پڑا۔

اب کے انہوں نے جغرافیہ لیا اور کورس میں صرف ہندوستان کا جغرافیہ تھا۔ لیکن ہندوستان کوئی فضا میں معلق چیز تو ہے نہیں' آخر ایشیا کا حصہ ہے۔ لہٰذا جگنو صاحب نے' جو ہر مسئلے کا باقاعدہ مطالعہ

کرنے کے قائل ہیں۔ ایشیا کے متعلق پڑھنا شروع کیا۔ دورانِ مطالعہ انہیں خیال آیا کہ یہ مطالعہ تقابلی ہونا چاہیے۔ جب تک افریقہ، یورپ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ کا بھی زیادہ نہیں، تھوڑا تھوڑا حال نہ پڑھا جائے، ایشیا کا صحیح مقام کیسے معیّن کر سکتے ہیں۔ بات ٹھیک تھی، لیکن پورے کرۂ ارض کا جغرافیہ جاننے کے بعد انہیں شوق ہوا کہ دوسرے سیاروں سے اتنی بے اعتنائی نہیں برتنی چاہیے۔ بالخصوص مریخ کے متعلق تفصیلی تحقیقات کر کے عام غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا چاہیے۔ یہ کام تمام ہوا اور وہ زحل کی طرف توجہ کرنے والے تھے کہ کسی نے کہا۔

"میاں کس چکر میں ہو۔ یہ تمہارا سارا نظام شمسی کائنات کا ایک حقیر حصہ ہے۔ ایسے نہ جانے کتنے نظام شمسی اس میں بھرے پڑے ہیں۔"

جگنو صاحب کائنات کی کنہ تلاش کرنے چلے تو اپنی بھی خبر بھول گئے۔

جگنو میاں نے کوئی ڈگری نہ لی۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہ پڑا۔ انہیں تو محض علم کی طلب تھی ورنہ خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ روٹی کمانے کے لیے بزنس کی طرف رجوع کیا اور وہ بیس ہزار روپے جو خاندانی جائیداد سے ان کے حصے میں آئے تھے۔ انہوں نے ایک گیس پلانٹ میں لگا دیے۔ اس میں کچھ گھاٹا ہوا جس کی وجہ یہ تھی کہ گیس بنانے میں جو کوئلہ استعمال ہوتا ہے وہ مہنگا پڑتا ہے۔ پندرہ ہزار روپے لے کر انہوں نے گیس پلانٹ سے قطع تعلق کر لیا اور کوئلے کی کان میں روپیہ لگا دیا۔ یہ کاروبار بھی ایسا کامیاب نہ رہا۔ کیونکہ کان کنی کی مشینیں بہت گراں ہوتی ہیں۔ جگنو میاں نے کان کے حصے اونے پونے بیچ دیے اور دس ہزار روپے جو حاصل ہوئے۔ کان کنی کی مشینیں بنانے کے ایک کارخانے میں لگا دیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں انہیں بہت فائدہ ہوتا بشرطیکہ گیس، جس کے بل پر کارخانہ چلتا ہے، اتنی مہنگی نہ ہوتی۔ انہوں نے وہ کاروبار بھی پانچ ہزار کا گھاٹا اٹھا کے چھوڑ دیا اور اس کے بعد ایک سے دوسری، دوسری سے تیسری صنعت میں پاؤں جمانے کی کوشش کی، لیکن کسی نے غلط نہیں کہا کہ۔

"وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔"

جگنو میاں کی گھریلو زندگی بہت خاموش اور پر سکون تھی۔ انہوں نے شادی کبھی نہیں کی البتہ محبت متعدد بار کی۔ افسوس یہ کہ کبھی اس محبت کا خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ ان کی پہلی محبت کا قصہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ کیونکہ ان دنوں ہمارے تعلقات خاصے گہرے تھے۔ انہیں ایک لڑکی سے فوری اور بے پناہ قسم کی محبت ہو گئی۔ جیسی پرانی داستانوں کے ہیرو ہیروئنوں میں ہوا کرتی تھی۔ یعنی آنکھیں چار ہوتے ہی عشق وغیرہ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی نیت نیک تھی۔ پہلی ملاقات کے بعد ہی انہوں نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں اپنے گھر کی زینت بناؤں گا، تو اس لڑکی کو، چاہے ادھر کی دنیا ادھر کیوں نہ ہو جائے۔

"کب ....؟" میں نے پوچھا۔ "کیا فوری طور پر شادی کر رہے ہو؟"

"نہیں جی!" انہوں نے کہا "میں پہلے اپنے آپ کو اس کے قابل بنانا چاہتا ہوں۔"

اپنے آپ کو اس کے قابل بنانے کے لیے انہوں نے اپنی روحانی اور اخلاقی سطح کو بلند کرنا شروع کیا۔ انہیں افسوس ہوا کہ وہ اب تک مذہب سے، جو اخلاق کی بنیاد ہے۔ اتنے بیگانہ کیوں رہے۔ انہوں نے محلے کے مدرسہ فیض العلوم میں داخل ہو کر علوم قرآنی کی باقاعدہ تحصیل شروع کر دی۔ تھوڑے دنوں بعد انہوں نے محسوس کیا کہ یہ قرآنی تعلیم سے پہلے عربوں کی تاریخ جاننا ضروری ہے اور عرب قبائل کے سماجی پس منظر سے کماحقہٗ واقفیت بھی۔ جگنو میاں نے نہایت خضوع و خشوع سے ان چیزوں کا مطالعہ شروع کیا اور دو سال تک اس میں جتے رہے۔ دو سال کے بعد جب انہوں نے اپنے آپ کو اس لڑکی کے قابل محسوس کیا تو انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ موصوفہ ایک ان گھڑ گاؤدی سے شادی رچا چکی ہیں۔ جس کا مونگ پھلی کا بزنس ہے

✡

## ٹی وی فنکارہ

# باتیں بینش راجہ کی

شاہین رشید

1۔ ”اصلی نام؟“
”بینش راجہ۔“

2۔ ”پیار کا نام؟“
”بنی“۔(Bunny)

3۔ ”تاریخ پیدائش؟“
”17 ستمبر 1990ء۔“

4۔ ”قد/ستارہ؟“
”5 فٹ 7 انچ“ (قوس)

5۔ ”بہن بھائی آپ کا نمبر؟“
”ہم پانچ بہنیں ہیں۔ ایک بھائی ہے اور میرا نمبر چوتھا ہے۔“

6۔ ”تعلیمی قابلیت؟“
”ایم ایس سی ان آئی آر۔ جس فیلڈ میں ہوں اسی میں دلچسپی تھی اور یہی بننا چاہتی تھی۔“

7۔ ”شادی؟“
”جی ابھی نہیں ہوئی۔“

8۔ ”فیلڈ میں کیسے آئیں/گھر والوں کا رد عمل؟“
”شوق تھا.... بس پھر راستے بنتے چلے گئے۔“ ”میری امی نہیں چاہتی تھیں کہ میں اس فیلڈ میں آؤں مگر ابو کی فل سپورٹ تھی مجھے۔“

9۔ ”پہلا ڈرامہ؟“
”پہلی فلم فتویٰ جو 2010ء میں ہوئی تھی۔“

10۔ ”وجہ شہرت؟“
”سنگ مرمر“ ”نظر بد“ اور اب ”یقین کا سفر“۔

11۔ ”پہلی کمائی کا کیا کیا؟“
”پہلی کمائی اپنی اور اپنے گھر والوں کی شاپنگ پہ خرچ کر دی۔“

12۔ ”شوبز کی بڑی برائی؟“
”شوبز میری کمائی کا ذریعہ اور میری پہچان ہے۔ کوئی برائی نہیں ہے۔ بس وقت کم ملتا ہے فیملی کے لیے.... اگرچہ بہت محنت ہے مگر مزہ آرہا ہے۔“

13۔ ”آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟“
”نو بجے میری صبح ہو جاتی ہے۔ بہت کم سوتی ہوں۔ مشکل سے چھ گھنٹے کی نیند لیتی ہوں۔ یعنی چوبیس گھنٹوں میں صرف چھ گھنٹے۔“

14۔ ”آنکھ کھلتے ہی پہلا کام؟“
”اپنا موبائل چیک کرتی ہوں اور کچھ دیر بیڈ پہ لیٹی رہتی ہوں۔ سو سو کے تھک جو جاتی ہوں.... قہقہہ۔“

15۔ ”دنیا میں کیا تبدیلی لانا چاہتی ہیں؟“
”دنیا سے ظلم ختم کرنا چاہتی ہوں۔ امن قائم کرنا چاہتی ہوں۔“

16۔ ”اچھی اور بری خبر سب سے پہلے کس کو سناتی ہیں؟“
”پہلے امی ابو کو پھر ماموں کو اور آخر میں بہنوں کو سناتی ہوں۔“

17۔ ”اپنے اندر کیا تبدیلی لانا چاہتی ہیں؟“
”اپنے اندر تھوڑا Patience لانا چاہتی ہوں۔ بہت impatient (بے صبر) ہوں۔“

18۔ ”فخر کا کوئی لمحہ؟“
”جب بھی ماں باپ کو (کریڈٹ) دینے کا موقعہ ملتا ہے بہت فخر محسوس کرتی ہوں۔“

19۔ ”بچپن کی کوئی بری عادت؟“
”بچپن سے ہی بہت جلد باز ہوں۔ اعتدال پسند بننا چاہتی ہوں۔“

20۔ ”طبیعت میں ضد ہے؟“
”بہت زیادہ ضدی ہوں۔ کسی چیز کی ٹھان لوں تو پھر کوئی



نہیں روک سکتا مجھے۔"

21۔ "زندگی کا ایک ہی دن باقی ہو تو خدا سے کیا مانگیں گی؟"

"جنت مانگوں گی سب کے لیے۔"

22۔ "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"

"بس تو پھر اس کی شامت آجاتی ہے۔"

23۔ "سات دنوں میں پسندیدہ دن؟"

"جمعہ۔"

24۔ "بارہ مہینوں میں پسندیدہ مہینہ؟"

"دسمبر۔"

25۔ "لڑکیوں میں کیا بات اچھی اور کیا بری لگتی ہے؟"

"لڑکیوں میں گوسپ کرنے کی عادت بہت بری لگتی ہے اور اچھی بات یہ لگتی ہے کہ لڑکیاں دل کی بہت نرم ہوتی ہیں۔"

26۔ "زندگی کب بدلی؟"

"زندگی تو ابھی تک نہیں بدلی۔"

27۔ "وقت سے پہلے کیا ملا؟"

"کچھ اندازہ نہیں کہ کیا ملا۔"

28۔ "غصہ کب آتا ہے اور رد عمل کیا ہوتا ہے؟"

"غصہ بہت کم آتا ہے، مگر شدید آتا ہے۔ کوشش کرتی ہوں کہ اس جگہ سے اٹھ جاؤں اور کہیں چلی جاؤں فوراً سے کیونکہ اپنا غصہ میں ہی جانتی ہوں۔"

29۔ "آپ خوف زدہ رہتی ہیں؟"

"ہاں... کچھ چیزوں کا بہت زیادہ خوف ہے میرے اندر۔"

30۔ "آپ اکثر سوچتی ہیں؟"

"اکثر نہیں... عموماً بہت زیادہ سوچتی ہوں۔"

31۔ "بھوک میں آپ کی کیفیت؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں اور کس کو کھاؤں ہاہاہا۔"

32۔ "اگر کسی ایئر لائن کا اوپن ٹکٹ ملے تو کہاں جائیں گی؟"

"سوئیزرلینڈ Switzerland۔"

33۔ "اگر کسی ارب پتی کا بینک چیک دستخط کے ساتھ ہاتھ لگے تو؟"

"اگر نیچے گرا ہوا ملے گا تو پھاڑ کر پھینک دوں گی اگر خود انہوں نے دیا اس کے اماؤنٹ کا 40 فیصد لوں گی۔"

34۔ "کس سیاست دان کو فالو کرنا چاہیں گی؟"

"عمران خان کو۔"

36۔ "جھوٹ کب بولتی ہیں؟"

"جب کسی کو بچانا ہو ورنہ جھوٹ اور میرا تعلق اچھا نہیں ہے۔"

37۔ "گھر آکر کیا دل چاہتا ہے؟"

"گھر آکر دل چاہتا ہے بس سو جاؤں۔"

38۔ "کسی کی تعریف میں بس وہی جملے کہتی ہیں؟"

"کسی کی تعریف کرتے ہوئے نہیں گھبراتی۔"

39۔ "شوبز میں جگہ بنانے کے لیے کیا ضروری ہے؟"

"فوکس" کسی بھی فیلڈ میں جگہ بنانے کے لیے فوکس رہنا بہت ضروری ہے۔"

41۔ "خواہش ہے کہ کسی ایسی فلم میں کام کروں جو؟"

"جو ہسٹری سے متعلق ہو۔"

42۔ "اپنی کمائی کا کتنے فیصد بچت کرتی ہیں؟"

"بچت نہیں کرتی بس کوشش کرتی ہوں۔"

43۔ "ایک محبت جو بھول نہیں سکتی؟"

"اپنے ماں باپ کی محبت۔"

44۔ "کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہیں؟"

"ٹریولنگ کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہوں۔"

45۔ "کس کو دیکھے بغیر نیند نہیں آتی؟"

"امی کو۔"

46۔ "گھر کے کس کمرے میں سکون ملتا ہے؟"

"جہاں بہت زیادہ اندھیرا ہو۔"

47۔ "کسی کی سچی محبت دیکھنی ہو تو؟"

"کسی کی سچی محبت دیکھنی ہو تو اس کا رویہ اس کے گھر والوں کے ساتھ اور غریب لوگوں کے ساتھ دیکھیں' وہ سب کو کیسے عزت دیتا ہے اور آپ کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔ محبت دیکھنے کے لیے بہت سی چیزیں کاؤنٹ ہوتی ہیں' صرف آئی لو یو پر خوش نہیں ہونا چاہیے۔"

48۔ "کبھی کرائسس میں وقت گزارا؟"

"ہاں.... بہت بار.... مگر اللہ کا کرم ہے کہ برا وقت گزر گیا۔"

49۔ "کب "بی پی" ہائی ہو جاتا ہے؟"

"جب کوئی میرے بارے میں کسی سے کوئی غلط بات کرے۔ جھوٹ بولے' مجھے کسی چیز سے منع کرے یا میرے کردار پر انگلی اٹھائے۔"

50۔ "آپ کے بیگ کی تلاشی لیں تو کیا کیا نکلے گا؟"

"اے ٹی ایم کارڈ۔ کچھ وزیٹنگ کارڈز اور کیش تو میں رکھتی ہی نہیں۔"

51۔ "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"

"ان لوگوں کی نصیحت بری لگتی ہے جو خود تو لائف میں کچھ کرتے نہیں ہیں' مگر دوسروں کو نصیحت کر رہے ہوتے ہیں۔"

52۔ "کھانے کی ٹیبل پہ کیا نہ ہو تو کھانے کا مزہ نہیں آتا؟"

"اگر مشروم نہ ہوں تو مزہ نہیں آتا۔"

53۔ "کھانے کا مزہ کہاں آتا ہے۔ چٹائی پہ۔ ڈائننگ ٹیبل پہ یا اپنے بیڈ پہ؟"

"مجھے سب کے ساتھ چٹائی پہ بیٹھ کر کھانے کا مزہ آتا ہے۔"

54۔ "انٹرنیٹ' فیس بک اور انسٹاگرام سے آپ کی دلچسپی؟"

"ان سے بہت گہری دوستی ہے میری oflicat Beenishraja کے نام سے ہوں۔ انسٹا میں۔ فالومی Follow me ہاہاہا۔"

55۔ "وقت کی پابندی کرتی ہیں؟"

"بہت زیادہ۔"

56۔ "ایک کھانا جو کئی دن تک کھا سکتی ہیں؟"

"میں سب کچھ کھاتی ہوں اور کھا سکتی ہوں۔"

57۔ "کوئی ایسی ڈیٹ جو بھول نہیں سکتیں؟"

"نہیں کوئی خاص نہیں۔"

58۔ "دوسرے ملک جا کر کیا بات نوٹ کرتی ہیں؟"

"لوگوں کی نظریں جو یہاں کے لوگوں سے بلکہ لڑکوں سے کافی صاف ہوتی ہیں۔ سکون سے گھوم سکتے ہیں' کوئی

آپ کو گھر تک چھوڑنے نہیں آتا۔"

59۔ "اپنے لیے اپنی کمائی سے قیمتی چیز کیا خریدی؟"

"اپنی ذات پہ بہت کم خرچ کرتی ہوں۔ ویسے ابھی تک تو اپنی کمائی سے موبائل جو بہت قیمتی ہے۔"

60۔ "کوکنگ سے آپ کا لگاؤ؟"

"لگاؤ ہے۔ اچھی کوکنگ کر لیتی ہوں۔ بس موڈ اچھا ہونا چاہیے۔"

61۔ "ایک کردار جو آپ کرنا چاہتی ہیں؟"

"پرنسس کا......"

62۔ "ایک کردار جو مقبول ہوا؟"

"درخانے" "سنگ مرمر" میں کیا تھا۔

63۔ "کوئی کردار جو کرکے پچھتائیں؟"

"نہیں ابھی تک تو نہیں پچھتائی۔"

64۔ "آپ کی فیوچر پلاننگ؟"

"کوئی خاص نہیں۔ پلاننگ زیادہ کرتی بھی نہیں۔"

65۔ "عورت ذہین ہونی چاہیے یا حسین؟"

"ذہین ہو تو حسین خود بخود ہو جاتی ہے۔ ذہانت قبر تک کام آتی ہے۔ جبکہ حسن بس کچھ سال کی مار ہوتا ہے۔"

66۔ "ایک خواب جو بار بار دیکھتی ہیں؟"

"بہت سارے خواب ہیں جو بار بار دیکھتی ہوں۔"

67۔ "پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟"

"لاہور کی۔"

68۔ "آئینہ دیکھ کر سوچتی ہوں؟"

"آئینہ دیکھ کر خود سے باتیں کرتی ہوں یا پھر اگر تیار ہو رہی ہوتی ہوں تو ساتھ ساتھ گنگناتی بھی رہتی ہوں۔"

69۔ "شادی میں پسندیدہ رسم؟/ تحفہ دینا چاہیے یا کیش؟"

"شادی میں مہندی کی رسم بہت پسند ہے۔/ اور میرے خیال میں کیش دینا چاہیے۔ تاکہ سامنے والا اپنی مرضی سے جو خریدنا چاہے خرید لے۔"

70۔ "کھانا اور ناشتہ کس کے ہاتھ کا پکا پسند ہے؟"

"امی کے ہاتھ کا اور اپنی بہن مبشرہ کے ہاتھ کا۔"

71۔ "بدلہ لیتی ہیں؟"

"نہیں۔"

72۔ "کب فریش ہوتی ہیں؟"

"صبح اٹھ کر۔"

73۔ "اپنے تجربے سے سیکھتی ہیں یا دوسروں کے تجربے سے؟"

"اپنے تجربے سے ہی سیکھتی ہوں۔"

74۔ "دنیا میں اللہ کا بہترین گفٹ؟"

"ماں باپ اور میرا مسلمان ہونا۔"

75۔ "لوگ ملتے ہیں تو کیا فرمائش کرتے ہیں؟"

"سیلفی بنوانے کی۔"

76۔ "آپ کی کوئی عجیب و غریب خواہش؟"

"کوئی ایک نہیں ہے۔ بہت سی عجیب و غریب خواہشات ہیں۔"

77۔ "فلم، ماڈلنگ کی؟"

"نہیں ابھی تک تو نہیں۔"

78۔ "بچپن کا کوئی کھلونا جو ابھی تک سنبھال کر رکھا ہوا ہے؟"

"کھلونے سب توڑ دیتی تھی میں۔"

79۔ آپ کو فوبیا ہے؟

"جی ہے۔ مجھے کیڑوں سے ڈر لگتا ہے۔ پانی سے ڈر لگتا ہے، اونچائی سے اور اسی طرح کافی چیزوں کا فوبیا ہے۔"

80۔ "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"

"ہاں جی، محبت اندھی، بہری، گونگی اور لنگڑی ہوتی ہے ....ہاہا....ہاہا۔"

81۔ "اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں؟"

"ہاں.... اپنی غلطی فوراً مان لیتی ہوں۔"

82۔ "دل کی سنتی ہیں یا دماغ کی؟"

"دل کی سنتی ہوں۔"

83۔ "غصے میں پہلا لفظ کیا نکلتا ہے؟"

"مختلف الفاظ ہیں۔ گھر والوں کے لیے کچھ اور دوستوں کے لیے کچھ اور۔"

84۔ "بستر پہ لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں بدلتی ہیں؟"

"بستر پہ لیٹ کے موبائل استعمال کرتی ہوں اور موبائل یوز کرتے کرتے نیند آجاتی ہے تو سو جاتی ہوں۔"

85۔ "سونے سے پہلے ایک کام جو ضرور کرتی ہیں؟"

"اللہ سے باتیں، دعائیں اور معافی مانگ کر سوتی ہوں۔"

86۔ "پیسہ محنت سے ملتا ہے یا قسمت سے؟"

"محنت اور قسمت دونوں سے۔"

87۔ "پسندیدہ تہوار؟"

"عید کا تہوار۔"

88۔ "زندگی کب بری لگتی ہے؟"

"جب بور ہو رہی ہوتی ہوں۔"

89۔ "مارننگ شو کیسے لگتے ہیں؟"

"مہمان کی حیثیت سے اچھے لگتے ہیں۔۔۔ ویسے میں دیکھتی نہیں ہوں۔"

90۔ "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟"

"گلاسز، پرس اور اے ٹی ایم کارڈ۔"

91۔ "پاکستان کے لیے کیا سوچتی ہیں؟"

"پاکستان کے لیے بہت زیادہ سوچتی ہوں۔ نارمل لوگوں سے زیادہ اور لوگوں کی بے حسی دیکھ کر غصہ آتا ہے۔ پاکستان ہمارے لیے ایک بہت بڑا تحفہ ہے۔"

92۔ "شوبز میں نہ ہوتیں تو؟"

"پتا نہیں کہاں ہوتی۔"

93۔ "ایک وہم جو پریشان کرتا ہے؟"

"اپنے سے قریب لوگوں کو کھونے کا وہم بہت ڈراتا رہتا ہے۔"

94۔ "کیا چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟"

"کھانا۔"

95۔ "اللہ کی حسین تخلیق؟"

"اللہ کی بنائی ہوئی ہر چیز بہت حسین ہے۔"

96۔ "کبھی آنسوؤں سے رونا آیا؟"

"بہت دفعہ روئی ہوں۔"

۔ "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"

"پریشان نہیں ہوں گی، کوئی اور حل نکال لوں گی۔ اللہ نے پیدا کیا، ٹیلنٹ دیا، کام کرنے کی طاقت دی تو پھر زوال کیسا۔"

☆

### اروی رباب۔۔۔ سیالکوٹ

رمضان جہاں عید کے پرمست لمحات عطا کرگیا وہیں مابدولت کو زوجہ بلال کے منصب عظیم پر بھی فائز کرگیا۔ جولائی میں رب تعالیٰ نے بھانجے اور بھتیجے کی نعمت عظمیٰ سے سرفراز کردیا پہلی مرتبہ خالہ اور پھپھو جانی بننے کی خوشی' دل احساس شکر سے لبریز تھا۔

دو ماہ کے شمارے ایک ساتھ پڑھے' اب چلتے ہیں "دشت جنون" کی اور۔ میں اس ناول کو پہلے خاص توجہ کا حقدار نہیں گردانتی تھی' دو اقساط ایک ساتھ پڑھیں تو اندازہ ہوا کہ معاملہ یہاں بھی برعکس ہے۔ بہترین ناول اور اچھا پلاٹ "حالم" کی تین اقساط اور ہر قسط بہتر سے بہترین کی جانب گامزن۔

"حسن الماآب" سائرہ رضا کا انداز سادہ اور دل موہ لینے والا۔ دعا اور اس کی قبولیت پر اس طرح لکھا کہ دعاؤں میں یقین کی کیفیت آگئی۔

عنیزہ سید کا "صبغت اللہ کو بلاؤ" ٹاپک حساس نوعیت کا تھا مگر انصاف کا پہلو نمایاں تھا' میں اس معاملے میں' میں عنیزہ سے سو فیصد متفق ہوں صبغت اللہ کو واقعی لوٹنے کی ضرورت ہے۔

"کیسی جیت کیسی مات" سمیرا کا تو نام ہی کافی ہے' زخموں سے چور داستان محبت مات آخر کار جیت میں بدل ہی گئی۔ ویسے سمیرا جی کارل صاحب کو پیغام دیں۔ معصوم قارئین آپ کی راہ میں دیدہ دل فراش کیے بیٹھی ہیں۔

افراح سکندر کا افسانہ "تمہاری" جو لڑکیاں دل کے خلاف قدم اٹھا کر اپنی عزت کی چادر کو داغ دار ہونے سے بچاتی ہیں۔ آخر میں جگنو اور روشنی ان ہی کا مقدر ہوتی ہے۔ فوزیہ اشرف کے افسانے میں شوکت صاحب کا فیصلہ بہترین اور بروقت تھا۔ الف سے عید ہلکی پھلکی تحریر' احساس کا سبق دیتے ہونٹوں پر شگوفے کھلا گئی۔ باقی سب افسانے بھی کمال تھے۔

سرورق پر لگی ماڈل کے چہرے کی مسکراہٹ بہت پیاری لگی عید نمبر تھا مگر ماڈل عید کے مطابق تیار نہ تھی نہ مہندی نہ چوڑیاں۔

ج: پیاری اروی! سب سے پہلے زوجہ بلال بننے پر مبارک باد۔ ہماری دعا ہے زندگی کا یہ خوب صورت موڑ آپ کے لیے ڈھیر ساری خوشیاں لے کر آئے۔ آمین۔ خالہ جانی اور پھپھو جانی بننا بھی بہت خوش گوار تجربہ ہے۔ آپ کو مبارک ہو۔

مہندی سے ماڈل کو الرجی ہے اور مصروفیت کی وجہ سے چوڑیاں پہننے کا موقع نہ مل سکا لیکن ان دونوں چیزوں کی کمی ماڈل کی معصوم مسکراہٹ نے پوری کردی۔ جو آپ کو بھی پسند آئی ہے۔







خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com


آپ بے دھڑک اپنے افسانے بھیج دیں۔ شرط اول و آخر صرف ایک ہے۔ "معیار"

### نگہت غفار۔۔۔ کراچی

میں رائٹر نہیں اور ٹیچر ہوں۔ بہت سے پرچوں میں میری تحریریں شائع ہوچکی ہیں۔ آپ کے پرچوں میں اپنی تحریر شائع کرانا چاہتی ہوں۔

ج: پیاری نگہت! ایک طویل عرصہ بعد آپ نے یاد کیا' بہت خوشی ہوئی۔ آپ سے ملاقات ہمیں یاد ہے' آپ ہمارے آفس تشریف لائی تھیں۔ ہمارے پرچے حاضر

ہیں، ضرور لکھیں۔ اچھی تحریروں کے لیے ہمارے دروازے ہمیشہ کھلے ہیں۔

**رابعہ آفرین امانت..... لاہور**

پرانی رائٹرز آج کل نظروں سے اوجھل ہوگئی ہیں جی، لوٹ آئیں ناں۔ "کرن کرن روشنی" کے صفحات تو میں باقاعدہ اپنی فائل میں محفوظ کرتی ہوں۔ منصور علی خان سے ملاقات دلچسپ رہی۔ پھر سیدھا "شاعری" کے صفحے پر گئے۔ انتخاب بہت اچھا تھا۔ کچھ اس لیے بھی کہ شاعری میری کمزوری ہے۔ "رنگا رنگ پھول" کا سلسلہ تو ہمیشہ سے میرا پسندیدہ رہا۔ "خاتون خانہ کی ڈائری" اس بار صرف ایک صفحے پر مشتمل تھی، مجھے یہ سلسلہ بھی بہت پسند ہے۔ پلیز! اسے دو صفحات سے کم نہ کریں۔ "گوہر ممتاز سے باتیں" پڑھ کر اچھا تو لگا لیکن کافی خود پسند انسان لگتے ہیں۔ ارررررے! آپ نے یہ کیا کیا؟ "میری بیاض سے" کو بھی ایک صفحے تک محدود کردیا۔ خدارا ایسا ستم تو نہ کریں۔ "خبریں وبریں" سلسلہ بھی پڑھتی ہوں اور کبھی نہیں بس اس لیے یہ نارمل ہی ہے۔ "ہمارے نام" کافی اچھا ہوتا جارہا ہے نا؟ اب تو بہت ہی دلچسپ خطوط پڑھنے کو ملنے لگ گئے ہیں۔ "نفسیاتی الجھنیں" لازمی پڑھتی ہوں۔ عدنان بھائی! میرا بھی ایک مسئلہ حل کردیں نا، بہت نرم دل ہوں میں، ہر کسی کی بات پر اعتماد کرلیتا ہے میرا دل "بہت مذاق بنتا ہے میری ان عادتوں کی وجہ سے۔ کچھ بتائیں نا، میں کیسے سخت دل بنوں؟ "بیوٹی بکس" کے متعلق ایک بات پوچھنا تھی کہ جن مسئلوں کا حل لکھا جاتا ہے، وہ صرف ان کے لیے ہی ہوتے ہیں جنہوں نے خط لکھے ہوں یا سب کے لیے؟ "الف سے عید" فرزانہ کھرل کی ہلکی پھلکی اور معاشرے کے ایک حساس پہلو پر توجہ دینے کی دعوت دیتی ہوئی تحریر تھی۔ "منہاری" افراح سکندری خان! شاید یہ کوئی نئی رائٹر ہیں۔ سچ کہا آپ نے کہ عورت کا اصل وقار اس کی عزت یعنی پاک کردار ہوتا ہے۔ "صبغت اللہ لوٹ آؤ" عید کی صحیح ترجمان تحریر تھی۔ "فیصلہ" فوزیہ اشرف آپی کی تحریر بھی اچھی تھی۔ "کیسی جیت کیسی مات" سمیرا آپی کا کمال کا ناولٹ تھا۔ پڑھتے وقت کئی بار ہنسی کا فوارہ منہ سے نکلا اور امی جی کی گھوریاں بھی۔ پھر امی جی کو وضاحت سے آپ کا ناول پڑھ کر سنایا تو وہ بھی بہت ہنسیں بہت زیادہ۔ "فلک نامہ" مہناز نعیم بہت خوب لکھا تھا۔

"ہاں کہو کہ عید ہو" فریدہ سیفی کا افسانہ بہت رومانٹک تھا۔ "بن مانگی دعا کا ثمر" بی سحر ملک کا ناولٹ امیزنگ تھا۔ "دشت جنون" بہت اچھا جارہا ہے لیکن آپ کو نہیں لگتا کہ یہ کچھ طویل ہوتا جارہا ہے؟ "حسن الماب اور..." "واہ سائرہ جی! بہت اچھی کاوش ہے۔ آپی جی اک بات تو بتائیں۔ کہ میری اک پوری کتاب شاعری کی لکھی ہوئی ہے۔ کیا میں وہ سینڈ کروں؟ میں نے وہ کتاب تین سرکاری ٹیچرز کو اور دو افسروں کو بھی پڑھوائی ہے، سب نے کہا کہ مجھے سینڈ کردینی چاہیے۔

ج۔ پیاری رابعہ! خط تاخیر سے موصول ہونے کی بنا پر شامل نہ ہوسکا اور کہانیاں ابھی پڑھی نہیں۔ شاعری کی پوری کتاب تو نہیں ایک دو غزلیں بھجوادیں، پڑھ کر ہی بتاسکتے ہیں کہ تین سرکاری ٹیچرز اور دو افسروں نے آپ کا دل رکھا ہے۔ یا واقعی آپ میں شاعری کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔

تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ آپ کو ہمارے تمام سلسلے اور ساری ہی کہانیاں بہت پسند آئیں۔ یہ جان کر ہم بہت خوش ہوئے ہیں۔

بیوٹی بکس کے مشورے تمام قارئین استعمال کرسکتی ہیں۔ اگر ان کا مسئلہ بھی وہی ہے جو خط لکھنے والی بہن کا ہے۔

**انیلا سلطان..... لاہور**

میں 99ء سے آپ کے ان شماروں کو پڑھ رہی ہوں۔ لیکن خط پہلی دفعہ لکھ رہی ہوں میرے پاس وہ الفاظ ہی نہیں جن میں ان کی تعریف بیان کی جاسکے۔

اتنے سال ہوگئے ہیں پڑھتے ہوئے اور آج تک مجھے کوئی ایسی کہانی نہیں ملی جس پر میں تنقید کرسکوں۔ لیکن جب کہانیوں کے اختتام پر ہیرو "مر" جاتا ہے تب دکھ ضرور ہوتا ہے یا پھر جب دو دل بچھڑ جاتے ہیں۔ ہماری نئی اور پرانی سب رائٹرز بہت بہت اور بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ یہ جو کچھ رائٹرز ٹی۔ وی کو پیاری ہوگئی ہیں ان سے درخواست ہے کہ پلیز واپس آجائیں۔

خواتین اور شعاع کی تحریروں کے ساتھ بہت بار آنکھیں نم ہوئی ہیں وہیں پہ بے ساختہ ان تحریروں نے ہنسایا بھی ہے۔ کچھ رائٹرز جو اس فانی دنیا سے چلی گئی ہیں۔

اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائیں اور ان کے درجات بلند کریں۔ آمین۔

ج ۔ پیاری انیلا! آپ کا پیغام تمام رائٹرز تک پہنچا رہے ہیں۔ خواتین کے بارے میں آپ کے جذبات جان کر دلی مسرت ہوئی۔ اتنے عرصے بعد آپ نے خاموشی توڑی تھی تو کچھ جولائی کے پرچے کے متعلق بھی لکھ دیتیں۔

## بنت جاوید ... کراچی

یونیورسٹی کے دور میں خط بہت پوسٹ کیے لیکن صرف اسائنمنٹ کی حد تک جرنلزم میں ایسے ہی اسائنمنٹ ملتے ہیں۔ (کیا کریں) درحقیقت نمرہ احمد کے ناولز ہی مجبور کرتے ہیں ہم جیسے خاموش قارئین کو کہ ہم بھی اپنے خطوط روانہ کریں۔ مصحف، جنت کے پتے، نمل اور اب حالم... کمال ہے ان کی تحریروں میں۔ ہمیشہ کچھ نیا سیکھنے کو ملتا ہے۔ ورنہ عشق و عاشقی کی داستانیں تو ہر جگہ عام ہیں۔ پڑھ پڑھ کر دل بھر گیا ہے مگر مصنفین اس موضوع سے پیچھا چھڑانے کو تیار نہیں۔ اس ماہ سمیرا حمید کا ناول بازی لے گیا۔ ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔ بہت خوب سمیرا! دشت جنوں بھی اچھا جا رہا ہے۔ آئے کت ہی اصل آیوشمتی ہے۔ میرا گمان شروع سے یہ ہی ہے۔ افسانوں میں "فلک نامہ" بہترین رہا۔

ج ۔ بنت جاوید! یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ یونیورسٹی میں جو خط پوسٹ کیے تھے خواہ اسائنمنٹ کے ہی سہی کس کے نام تھے؟ اور ہاں، ہمیں خط لکھتے ہوئے آپ نے اپنا نام کیوں نہیں لکھا۔ یقین جانیں کہ ہم کوئی بلیک میلر نہیں۔ آئندہ تمام خواتین بے دھڑک اپنا نام لکھیں۔ آدم اور حوا کا ساتھ تو ازل سے چلا آ رہا ہے۔ بابا آدم کا دل تو اماں حوا کے بغیر جنت میں بھی نہ لگ سکا۔ پھر کہانیوں میں یہ ذکر کیوں نہ آئے۔

## نادیہ اشرف ... رائے ونڈ

کرن کرن روشنی حسب معمول دل روشن۔ روح شاداب۔ منصور علی خان + گوہر ممتاز سے ملاقات خاص لگی، خاص طور پر منصور علی کا سیاسی رنگ میں، سیاسی لیڈرز پر تبصرہ اچھا لگا۔

تمام افسانے معیاری نہ تھے۔ فلک نامہ کچھ بہتر، فرزانہ کھرل کا افسانہ متاثر نہ کر سکا۔ "صبغت اللہ لوٹ آؤ"
عنیزہ سید + سائرہ رضا، نمرہ احمد کا نام ہی گارنٹی والی بات ہے، سائرہ رضا کی تحریر میں بہت روانی ہے بھئی، سوچ کو الفاظ میں ڈھالنے اور حقیقت کا رنگ بھرنے میں۔

"حالم" میں نمرہ احمد سے سوال "سچے خواب" تو صدیقین کو آتے ہیں، فاتح راپزل تو ٹھیک بندہ ہے لیکن تالیہ مراد (ڈاکورانی) کو کیسے؟ امید ہے یہ پزل حل ہونے والا ہے۔ سپرفینٹسی لکھنا رائٹر کا امتحان ہوتا ہے۔ نمرہ جو بھی لکھیں گی آپ کو وہ بین الاقوامی ادب میں ملے گا۔ جو ہم سب خواتین ڈائجسٹ سے وصول کر رہے ہیں۔ (شکریہ) میری ایک گزارش ہے کہ فرسٹ لیٹر کو "لیٹر آف منتھ" قرار دے دیں تاکہ زیادہ سے زیادہ ذہین قاری سامنے آئیں۔

ج ۔ پیاری نادیہ! خواب کسی کو بھی آسکتے ہیں لیکن صدیقین کے خواب زیادہ سچے ہو سکتے ہیں۔ تالیہ مراد ڈاکورانی نہیں ہے۔ اس کا کردار آگے چل کر واضح ہو گا۔

ج خطوط کے سلسلے میں آپ کی تجویز تو اچھی ہے لیکن ہم اس امتحان میں پڑنا نہیں چاہتے۔ ہماری تمام قارئین بہت اچھے خط لکھتی ہیں اور ہمیں تمام ہی قارئین بہت عزیز ہیں اور ہمیں سب کے خط ہی اچھے لگتے ہیں، خواہ وہ ٹوٹی پھوٹی اردو میں لکھے گئے ہوں کیونکہ تمام خطوط میں سچے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔

## ثمینہ اکرم ... کراچی

"میری پیاری والدہ جمیلہ بیگم رضائے الٰہی سے اپنے خالق حقیقی سے جا ملی ہیں۔ ادارہ خواتین ڈائجسٹ اور تمام قارئین سے دعا مغفرت کی درخواست ہے۔"

ج ۔ پیاری ثمینہ! آپ کی والدہ کی وفات کے بارے میں جان کر بہت افسوس ہوا۔ ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو صبر دے اور آپ کی والدہ کو جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے۔ آمین۔

## سیدہ فہمی رضا ... منڈی بہاؤالدین

گزشتہ 27 سالوں سے میرے آنگن میں موسم گل یعنی خواتین ڈائجسٹ ہر ماہ کی 10 تاریخ کو اترتا ہے۔ پھر چاہے گرمی ہو یا سردی، میرے اردگرد اس دھنک کے سارے رنگ بکھر جاتے ہیں۔ مجھے سنوارنے، نکھارنے اور کچھ بنانے میں اس ادارے کا بڑا ہاتھ ہے۔ کہنی سنی پڑھنے کے

بعد کرن کرن روشنی سے مستفید ہوئے۔ ابن انشا کی تو ہر تحریر شان دار ہے چاہے شاعری میں ہو یا نثر میں۔ منصور علی خان کی باتیں اچھی لگیں۔ نمرہ احمد بہت اچھا لکھتی ہیں عنیزہ سید نام ہی کافی ہے جب بھی لکھا اچھا لکھا۔

عنیزہ سید اینڈ ہما کوکب بخاری' سائرہ رضا عام سی بات کو بہت لمبا اور خاص کر کے لکھتی ہیں۔

سمیرا حمید لکھتی تو اچھا ہیں لیکن فلسفہ بہت ہے ان کی تحریروں میں اور کڑواہٹ۔ بی سحر ملک کو تو میں پہلے بنت سحر ہی سمجھی تھی کہانی پڑھنے پر سمجھ آیا کہ یہ وہ نہیں ہیں۔ بنت سحر کا اپنا انداز ہے۔ افسانے سارے اچھے تھے خاص طور پر فرزانہ کھرل اور ممناز نعیم کا۔

ہمارے پاس مزاح لکھنے والوں کی کمی ہے۔ ممناز نعیم مزاح لکھنے والوں میں اچھا اضافہ ہے۔ ممناز اب اپنا انداز برقرار رکھنا۔ موسم کے پکوان بیوٹی بکس کے مشورے سب چیزیں شان دار۔

ج ۔ پیاری فہمی! آپ نے جو لکھا ہے' وہ کہانی نہیں ''یاد'' ہے آپ اس یاد کو کہانی کی شکل میں ڈھال کر لکھتیں تو ہم شامل کر سکتے تھے۔ ویسے آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ خواتین ڈائجسٹ آپ کو پسند آیا' بہت شکریہ۔

### حیا شمائی ..... کنوی پاک سندھ

جولائی کا شمارا بہت اچھا لگا باقی شماروں کی طرح۔ حالم بہت زبردست جا رہا ہے اسٹارٹ ہی نمرہ آپی نے اتنا اچھا لیا ہے آگے تو پھر یقیناً ''اچھا ہی ہو گا'' تو گھر بیٹھے مختلف ملکوں کی سیر کروا دیتی ہیں اور اب گھر بیٹھے ملائشیا اور وہاں کے لوگوں سے ملنے کا موقع مل رہا ہے۔ ہمارے نام میں ضرور پڑھتی ہوں قارئین کے تبصرے پڑھ کر بہت اچھا لگتا ہے۔ اور ہاں عمیرہ آپی کی کمی بہت شدت سے محسوس ہوتی ہے انہیں کہیں ناں کہ ناول لکھیں۔ ہمارے نام میں کنزا ریحان کا تبصرہ بہت اچھا لگا۔ باقی حسن المآب بہت' بہت جا رہا ہے حسنل کا اللہ پر یقین پسند آیا واقعی صحیح کہا گیا ہے کہ دعاؤں میں بہت طاقت ہوتی ہے۔ اسی یقین کامل کی وجہ سے تو حسنل اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی۔ یادداشت جنون۔ آمنہ ریاض واقعی نائس لکھ رہی ہیں۔ عنیزہ سید نے بہت اچھا موضوع اٹھایا ہے آج کل کے ماحول کو مد نظر رکھتے ہوئے جولائی کے شمارے میں سلسلہ وار ناولز کے علاوہ سب سے اچھی تحریر ہی لکھی۔ باقی رہی بات سمیرا حمید کی تو اس دفعہ پہلی بار یہ ہوا کہ ان کی تحریر متاثر نہ کر سکی ورنہ تو یہ سب سے ہٹ کر موضوع کا انتخاب کرتی ہیں اس دفعہ تو لگتا ہے سمیرا جی کو روزہ زیادہ لگ رہا تھا۔ لکھتے ہوئے بی سحر ملک کا ناول بھی اچھا تھا۔

جون کے شمارے میں افراز رسول سے مل کر بہت اچھا لگا۔ ''عشق مجذوب'' کا اینڈ اچھا رہا۔ ہر ایک کردار کو انصاف مل گیا منزلوں کا یقین نائس اسٹوری تھی اور صائمہ اقبال نے بھی بہت اچھا لکھا' باقی رہی بات سلسلہ وار ناولز کی تو وہ تو سارے ویسے ہی سپرہٹ جا رہے ہیں۔ لیلیٰ واسطی سے ملاقات بھی اچھی رہی۔ مجھے سب لیلیٰ واسطی سے تشبیہ دیتے ہیں۔

ج ۔ پیاری حیا! بہت خوشی ہوئی کہ آپ کو خواتین ڈائجسٹ کی تمام تحریریں اچھی لگیں۔ سمیرا حمید نے یہ ناول اپنے انداز سے قدرے ہٹ کر لکھا تھا۔ ہماری بہت سی قارئین کی فرمائش ہوتی ہے کہ ہلکی پھلکی تحریریں بھی شامل ہونا چاہئیں۔ ہمیں افسوس ہے' آپ کو پسند نہیں آیا۔

آپ نے ناول لکھا ہے' وہ بے حد المیہ ہے۔ دنیا میں مقامات آہ و فغاں بے شمار ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارا پرچا پڑھ کر ہماری معصوم سی قارئین آنسو بہائیں۔

### حنا سلیم اعوان ..... گاؤں اخون باانڈی تحصیل و ضلع ہری پور ہزارہ

دکان کے بار بار چکر کاٹنے کے بعد آخر کار۔ جولائی کو شعاع و خواتین اکٹھے نصیب ہوئے۔ شعاع اس مرتبہ کیوں لیٹ تھا.....؟ بقول چھوٹے بھائی حسن کے کہ کراچی میں بارشوں کا موسم عروج پر ہے۔ تمہارا رسالہ بھی بارشوں کی نذر ہو گیا ہے۔ ٹائٹل بہت عرصے بعد' خوب صورت' ترو تازہ اور معصوم سا تھا۔ لیکن ایک کمی سی پھر بھی رہ گئی۔ جی ہاں' ماڈل کے ہاتھ مہندی سے خالی تھے۔

ڈائجسٹ لیٹ ملنے لگے ہیں اس لیے خط نہیں لکھ پاتی اور پھر تبصرہ بھی تب ہی مزے دار ہوتا ہے جب پورا شمارہ پڑھ رکھا ہو۔

''ہمارے نام'' سب سے پہلے پڑھتی ہوں..... سب قارئین ماشاء اللہ بھرپور انداز میں شرکت کرتی ہیں۔ مزا آجاتا ہے۔

ماہا ملک کا "میرے خواب ریزہ ریزہ" منگوانا چاہتی ہوں۔ پلیز طریقہ کار سے ضرور آگاہ فرمادیجیے۔ اور کچھ رائٹرز ہیں اور وہ عرصہ دراز سے کہیں غائب ہیں۔ آپ سے التجا ہے۔ مہربانی کرکے ان تک پیغام پہنچادیں۔ ماہا ملک' فائزہ افتخار' عمیرہ احمد' ثمرہ بخاری' راحت جبیں اور دیگر رائٹرز۔ مانا کہ ٹی وی بڑی گلیمرس والی اور بڑی چارم والی جگہ ہے لیکن ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔

ج ۔ پیاری حنا! چاہے آندھی آئے یا طوفان ہم پرچے کی تیاری میں لگے ہوتے ہیں۔ اور پھر بارشوں کا موسم تو کراچی میں بڑی دعاؤں کے بعد' سالوں بعد آتا ہے۔ ایسے میں کام کی رفتار خود بخود بڑھ جاتی ہے کہ ہمیں اپنے کام سے عشق ہے مگر پرچا قارئین تک بروقت کیوں نہیں پہنچ پارہا۔ کی بہت سی وجوہات ہیں۔ لیکن بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمیں قسطیں تاخیر سے موصول ہوتی ہیں۔ آپ نے خط اور سروے رجسٹری سے بھجوایا اسی لیے ہمیں تاخیر سے موصول ہوا۔ رجسٹری پہنچنے میں دس دن لگ جاتے ہیں۔ آپ ہمیں بذریعہ ارجنٹ میل سروس بھجوائیں۔

### مسرت الطاف احمد..... کراچی

خواتین ڈائجسٹ کا ٹائٹل دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ ماڈل گرل بجی سنوری روپ میں دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ "حالم" کی یہ ایپی سوڈ انٹرسٹنگ تھی۔ ایڈم کا تالیہ مراد سے معافی مانگنا کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ ایڈم کا کردار کافی معصوم اور ساہ ہے اگر تھوڑا مضبوط ہوتا تو زیادہ مزا آتا۔ "دشت جنوں" کی قسط بہت ہی نائس لگی خاص طور پر منفرا کے حوالے سے' اگر آئے کت نام کی بلا معاویہ کی جان چھوڑدے تو وہ منفرا کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی گزار سکتا ہے اور یہ آئے کت زندہ ہے؟ "حسن المآب" یہ قسط کچھ زیادہ ہی پسند آئی۔ حلیمہ پر بہت افسوس ہوا' ماہ رو کے ساتھ اس کا رویہ کافی حد تک ہتک آمیز تھا۔ اسلام تنگ نظری کا نام تو نہیں۔ "بن مانگی دعا" ہلکی پھلکی محبتوں سے بھرپور اسٹوری پسند آئی۔

"صبغت اللہ لوٹ آؤ" بہت ہی متاثر کن تحریر تھی اور حقیقت کے قریب تر محسوس ہوئی۔ عید اور ایسی کئی تقریبات اب پہلے جیسے روایتی انداز میں نہیں منائی جاتیں ۔ "کیسی جیت کیسی مات" سمیرا حمید نے اس بلو ہنستی مسکراتی تحریر لکھ کر دل خوش کردیا۔ احد کی پٹائی اور دھلائی سے میں عاجز آگئی۔ افسانوں میں نمبر ون "منہاری" اور "کہو کہ عید ہو" بیسٹ لگے۔ پڑھ کر بہت مزا آیا۔ "فیصلہ" ایک آنکھ نہیں بھایا۔

ج ۔ پیاری مسرت! ایڈم کا کردار معصوم اور سادہ تو ہے لیکن کمزور نہیں' وہ بہت مضبوط شخصیت کا مالک ہے۔ اس قسط کو پڑھیے' آپ کی رائے بدل جائے گی۔

### اقراء ممتاز..... سرگودھا

اس دفعہ کا شمارہ تھوڑا لیٹ ملا۔ ٹائٹل گرل پر براجمان ندا علوی کو پسند کی سند بخشتے اندر پہنچے۔ مکمل ناول "حالم" بہت خوب جارہا ہے۔ ناولٹ "کیسی جیت کیسی مات" سمیرا حمید کی کیا زبردست اسٹوری تھی۔ ہنس ہنس کر پیٹ میں درد ہونا شروع ہوگیا۔ سمیرا حمید' آپ جب بھی لکھتی ہیں بہت منفرد لکھتی ہیں۔ افسانہ "کہو کہ عید ہو" فریدہ سیفی "کی اچھی کاوش تھی ناولٹ "بن مانگی دعاؤں کا ثمر" بی سحر ملک کا ناولٹ بھی شاندار تھا۔

میری طرف سے ہماری دو پیاری سے رائٹر کو سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ مصباح علی آپ کی سالگرہ 17 اگست کو اور فرح بخاری آپ کی سالگرہ 19 اگست کو ہے۔ خدا آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے (آمین) اور آپ اسی طرح ہمیں پیاری پیاری اسٹوری لکھ کر بھیجتی رہیں۔ میں آپ کی سالگرہ پر اور تو کچھ دے نہیں سکتی۔ لیکن ایک دعا لکھ رہی ہوں۔ امید ہے آپ دونوں کو پسند آجائے گی۔ مجھے لفظوں کو موتی کے مالا جیسا پرونا تو نہیں آتا لیکن کوشش کررہی ہوں۔

دل کے لبوں پر ایک دعا رہے گی<br>
ہر گھڑی مجھے آپ کی پروا رہے گی<br>
خدا ہر سکھ کرے عطا آپ کو<br>
ہر دعا میں میری یہ ہی التجا رہے گی

ج ۔ پیاری اقرا! اتنے مختصر تبصرے سے اندازہ ہورہا ہے کہ پرچا واقعی تاخیر سے ملا تھا۔ آپ کو آپ کی نیک تمنائیں اور مبارک باد ان سطور کے ذریعے مصباح علی اور فرح بخاری تک پہنچارہے ہیں۔

### فریحہ عزیز شیخ..... کنڈیارو

جو خواتین کہتی ہیں کہ ڈائجسٹ پر ماڈل کی تصویر نہیں ہونی چاہیے۔ تو میرا ان کو مشورہ ہے کہ یا تو ڈائجسٹ پڑھنا

چھوڑ دیں یا پھر ایسی فضول بات کرنا چھوڑ دیں' کیونکہ ماڈلز کی ہی تصاویر سے ہی خواتین ڈائجسٹ لگتا ہے ورنہ بچوں کے رسالے ہوتے ہیں جن پر منظر کشی ہوتی ہے۔

کہانیوں پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گی کیونکہ میرے دو خط تبصرے سے بھرپور آپ نے شائع نہیں کیے۔ امید ہے کہ یہ والا بھی شائع نہیں ہوگا۔ خیر' اگر یہ خط شائع نہ ہوا تو بھول جایئے گا کہ فریحہ عزیز شیخ نام کی بھی کوئی قاری تھی۔ میں لکھنا ہی چھوڑ دوں گی۔ بس ایک تو بھائیوں کی اتنی منتیں کرو پھر ان کے مذاق کا بھی نشانہ بنو۔ باقی خط میری بہن مالا عزیز نے لکھا ہے۔" خواتین ڈائجسٹ کی کیا تعریف کروں میرے پاس تو الفاظ نہیں ہیں۔ اتنا اچھا ہے کہ پڑھنے سے ہی ساری ٹینشن دور ہو جاتی ہے اور میں تو پورا ڈائجسٹ پڑھتی ہوں چاہے دو ماہ کیوں نہ لگیں۔ رہی فریحہ کی بات تو وہ جذباتی انسان ہے اسے جو جس کو بھی کہنا ہو وہ کہہ دیتی ہے 'سوچتی نہیں۔ وہ تو مجھے سنا دیتی ہے۔ اگر ڈائجسٹ کا ایک صفحہ مڑ جائے تو بول دیتی ہے اور ایسا بولتی ہے کہ بس اور جی ان سب باتوں میں اپنا نام بھول گئی۔ میرا نام مالا عزیز ہے۔

ج پیاری فریحہ! مالا نے آپ کے بارے میں صحیح لکھا ہے کہ بہت جذباتی ہیں۔ اب دیکھیں نا' آپ کے خط بروقت ملتے تو شامل ہوتے ناں۔ محکمہ ڈاک کی سستی کے ہم تو ذمہ دار نہیں۔ ان کا غصہ ہم پر نہ نکالیں۔ خط لکھنا چھوڑ دیں گی تو کیا پرچا پڑھنا بھی چھوڑ دیں گی۔ یہ آپ ہی کا تو پرچا ہے۔

کہانی ابھی پڑھی نہیں۔ کہانی کے بارے میں پتا کرنے کے لیے اس نمبر پر فون کریں۔

021-32721666 -

پیاری مالا! پرچا آپ کو پسند آیا' یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ آئندہ آپ علیحدہ کاغذ پر خط لکھ کر فریحہ کے لفافے میں رکھ دیجیے گا پھر وہ خط آپ کے نام سے شائع ہوگا۔

### مریم قرۃ العین' ڈیرہ غازی خان

نمرہ احمد کا ناول خواتین میں دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ حالم کی شخصیت ہر وقت میرے ذہن میں رہتی ہے۔ بہت اچھا ناول ہے' بھئی کیا کہنے۔ نمرہ جی کی کہانیاں نئی سوچ پیدا کرتی ہیں۔ میں خواتین کے علاوہ کوئی دوسرا ڈائجسٹ نہیں پڑھتی۔ ایک دن بھائی کہنے لگے تمہاری آنکھیں کمزور ہیں' پھر بھی فضول میں یہ ڈائجسٹ پڑھتی ہو' تو ان دنوں آب حیات اور نمل ہٹ تھا۔ میں نے ان اقساط کو پڑھ کر سنایا تو انہیں بھی اچھا لگا۔ پھر اکثر مجھ سے پوچھتے کہ ان کہانیوں میں کیا ہوا' پھر کبھی اس کے پڑھنے کو فضول نہیں کہا۔

ج ۔ پیاری مدیحہ! پورے خط میں صرف ایک ہی ناول پر تبصرہ؟ وہ جو ہماری اتنی ساری مصنفین نے محنت سے کہانیاں' ناول لکھے اور ہم نے پورے ماہ کی محنت کے بعد پرچا ترتیب دیا تھا۔ اس کے لیے ایک لفظ بھی نہیں۔ آئندہ ماہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

### مومنہ ارشد' آمنہ ارشد۔۔۔ کوٹلی ساہیاں گکھڑ

ہم خواتین اور شعاع کے خاموش قاری ہیں۔ بہت اعلا ہیں تمام مصنف خاص طور پر سائرہ رضا' سمیرا حمید اور نمرہ احمد۔ نمرہ احمد کے "حالم" کی ابھی کچھ خاص سمجھ نہیں آرہی۔ آمنہ ریاض "دشت جنون" بہت اعلا لکھ رہی ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ یہ ایک حقیقی کہانی ہے اور "حسن المآب" کے کیا ہی کہنے۔ سائرہ رضا جب بھی لکھتی ہیں بہت منفرد لکھتی ہیں۔

ج ۔ پیاری مومنہ اور آمنہ! تحریر سے اندازہ ہو رہا ہے کہ واقعی خاموشی پسند ہیں۔ خاموش رہنا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے اور یہ کام خواتین انجام دیں تو سراہنا تو بنتا ہے۔

### اختر جہاں۔۔۔ ڈھوک بابا اڈلہ روڈ

مجھے خوش نصیب کی فکر تھی' اس کے بارے میں لاہور فون کر کے اپنی سسٹر سے پوچھ لیا اور اللہ کا شکر ادا کیا' خوش نصیب بچ گئی' لیکن آمنہ ریاض آئے کٹ کے ساتھ پتا نہیں کیا کریں گی اور تو کسی کا پتا نہیں' لیکن میں خواتین ڈائجسٹ کی ہر سطر سے کچھ نہ کچھ سیکھتی ہوں اور اللہ کا شکر ہے کہ میری زندگی پر سکون گزر رہی ہے اور میں تو ہر ایک کو مشورہ دوں گی کہ خواتین کا مطالعہ اپنی زندگی میں شامل کرلیں اور اب لاہوریوں کے لیے سلام' میں تو پنڈی آگئی ہوں' لیکن دل وہاں لاہور میں ہی ہے اور ایک بات بتا دیں کہ ایک ہی لفافے میں' میں اور میری بیٹی خط لکھ کر ڈال سکتے ہیں۔

ج ۔ پیاری اختر! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ ایک لفافے میں اپنا اور اپنی بیٹی کا خط اور تمام سلسلوں کے لیے انتخاب بھیج سکتی ہیں مگر علیحدہ کاغذ پر لکھیں۔

## ناظمہ زیدی۔۔۔ چوک اعظم

بہت خوب صورت' بارش کے موسم کا لطف ... ملوط میں اپنا نام دیکھ کر جی خوش ہوگیا اور جل بھی ہوگیا۔ جی اس کی وجہ سدرہ بتول ملتان کا خط ... رہ ہی حیرت ہے۔ آپ میرا تبصرہ پڑھ کر بے ... ہوتے بچیں۔ حالانکہ کوئی اینتھیسزیا تو ... میں۔ خیر آپ دوبارہ رسالہ اٹھائیں اور میرا ... میں۔ آپ کو میرے کس لفظ سے ایسا لگا کہ مجھے ... ناول پسند نہیں آیا۔ کہیں کوئی ناپسندیدگی یا قابل ... بات بھی تو آپ اس کی نشان دہی کردیتیں۔ مگر بغیر ... آپ نے میرا نام لکھ دیا۔ یہ تو صریح بہتان ... میرا حمید کے ناول کی تو میں اس میں بھی اپنا ... لڑ چکی ہوں کہ مجھے عورتوں پہ تشدد والے ... نہیں لگتے۔ مگر مجھے آگے بڑھتی ہوئی عورت ... کے لیے لڑتی ہوئی' اپنا آپ منواتی اچھی لگتی ... میرا حمید بلاشبہ ایک بڑی اور سلجھی ہوئی رائٹر ہیں۔ ... نازیبا الفاظ کے بے تحاشا استعمال پر اعتراض ... مجھے باقی لوگوں کا پتا نہیں۔ مگر میرا چھوٹا بھائی ... نمرہ اِیر کا اسٹوڈنٹ ہے۔) رسالہ ایسے ہی ذوق و ... پڑھتا ہے جیسے میں اور پھر بعد میں ہم سر جوڑ کر ... تبصرے بھی کرتے ہیں۔ سو آپ سمجھ سکتی ... حال نمرہ جی کے بارے میں آپ کا میرا نام لینا مجھے ... لگ گیا۔ ایک بار تو دل کیا کہ گاڑی پکڑ کر ملتان ہی ... اور آپ کو اپنا تبصرہ دوبارہ پڑھواؤں گی' مگر پانچ ... مسلسل برستی بارش' میں رات سو نہیں پائی کہ

... بھی ان کی تردید نہیں کی۔ "حالم" شروع کیا ہے ... دار لگ رہا ہے۔ اس ماہ کی قسط میں نمرہ نے لکھا کہ ... مک میں ہار گرا دیتی ہے۔ یہاں پاکستان کے ... (ایڈبلز) allow نہیں ہیں۔ کیا KL میں ... ہوتی ہیں' اگر جواب نمرہ خود دیں۔ دبنگ خان کا ... اچھا لگا۔ مختصر افسانے سارے پڑھے ہیں' بہت ... ابھی زیر مطالعہ ہے۔

ج: ناظمہ! اتنا غصہ کہ ساری رات سو نہ سکیں۔ ... بارش نے روک لیا ورنہ تو آپ ملتان پہنچ ... اچھا ہی ہوتا کہ آموں کا موسم ہے اور ملتان کا ... مزے دار ہوتا ہے۔

بہرحال آپ غصہ جانے دیں۔ ہوسکتا ہے سدرہ بتول کو غلط فہمی ہوگئی ہو اور جہاں تک ہماری تردید کا تعلق ہے تو ہمیں اعتراف ہے کہ ہماری یادداشت اتنی اچھی نہیں کہ ہم یاد رکھ سکیں کہ کس قاری بہن نے کیا لکھا تھا۔

عورتوں کی تذلیل اور تشدد والی تحریریں ہمیں بھی پسند نہیں اور غیر مہذب الفاظ کا استعمال تو کسی کو بھی اچھا نہیں لگ سکتا' لیکن وہ زبان اس کہانی کے ماحول کی عکاسی تھی۔ اس لیے جانے دی گئی۔ آئندہ خیال رکھیں گے۔ نمرہ احمد تک آپ کا سوال پہنچا رہے ہیں۔

## صائمہ مشتاق۔۔۔ بھاگٹانوالہ' سرگودھا

ٹائٹل گرل پنک ڈریس میں مسکراتی پسند آئی۔ "کرن کرن روشنی" میں بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ اچھا لگا انشاجی کا درجہ وار اشتہارت اچھا لگا تھا۔ منصور علی خان سے ملاقات اچھی رہی۔ پھر موسٹ فیورٹ ناول "حالم" کی جانب دوڑ لگائی۔ نمرہ جی "حالم" کی تیسری قسط بھی جان دار رہی۔ عنیزہ سید کا مکمل ناول صبغت اللہ لوٹ آؤ' عنیزہ جی بہت زبردست اسٹوری تھی۔ واقعی ماں' باپ' بچوں کی راہ تکتے اس دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں۔ اس کاوش کے لیے بہت بہت مبارک ہو۔ گوہر مختار کو جان کر اچھا لگا۔ آپی جی کیا خواتین کی میں سالانہ خریدار بن سکتی ہوں' ضرور بتائیں' آپی میں نے پانچ سالوں میں ایک اسٹوری لکھی ہے' اس کا پہلا صفحہ آپ کو بھیج رہی ہوں' آپ ضرور بتائیں کہ میں نے درست لکھی ہے کہ نہیں۔

ج۔ صائمہ! آپ نے رائٹنگ اور لکھنے کے طریقے کے بارے میں پوچھا ہے تو آپ نے ٹھیک ہی لکھی ہے لیکن کہانی کیسی ہے؟ شائع ہوگی یا نہیں؟ یہ ہم پوری کہانی پڑھ کر ہی بتا سکتے ہیں' آپ کہانی ہمیں بھجوادیں۔

خواتین کی سالانہ خریدار ضرور بن سکتی ہیں۔ آپ درجہ ذیل ایڈریس پر 720 روپے منی آرڈر کردیں۔

خواتین ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی

## شبانہ شمس بلوچ۔۔۔ گھوٹکی' سندھ

رمضان اور روفی کی شادی کی شاپنگ میں اتنی مصروف تھی تب ہی آپ کو خط نہیں لکھ سکی۔ روفی کی رخصتی عید کے دوسرے روز ہوگئی۔ وہ اپنے گھر میں بہت خوش ہے' لیکن میں بہت اداس ہوں اور آپ سے تو میں ناراض.

ہوں' میں نے اور رونی نے سمیرا حمید اور خواتین ڈائجسٹ کے لیے اتنے محنت سے کارڈ بنا کے بھیجے تھے' آپ کو پورا مہینا انتظار کیا کہ پتا نہیں آپ کو کیسے لگے' لیکن جب خط دیکھا تو اس میں کارڈ کے بارے میں آپ نے کچھ بھی نہیں لکھا' مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ آپ کو ملے بھی ہیں کہ نہیں۔

اس مرتبہ ماڈل کا میک اپ مجھے بہت پسند آیا' ہماری پیاری پیاری رائٹرز نے اس ماہ بھی ہمیشہ کی طرح ہمارے لیے بہت اچھی اچھی کہانیاں لکھیں' لیکن اس مرتبہ جو کہانی سب سے زیادہ جو بہت بہت.... پسند آئی وہ ہے حسن المآب نمبرون اسٹوری' اگلی قسط کا بہت شدت سے انتظار ہے۔ تھینک یو سائرہ رضا' اتنی اچھی اسٹوری لکھنے کا۔ اس کے بعد جو اسٹوری پڑھی وہ ہے سمیرا حمید کیسی جیت' کیسی مات تو یہ آپی ایسی خون خوار ہیروئن' خیر ڈفرنٹ اسٹوری تھی لیکن اچھی تھی۔ اس مرتبہ سحر ملک نے بھی بہت اچھا لکھا۔ مجھے کزنوں والی اسٹوریاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ "بن مانگی دعا کا ثمر" کزنز کی وجہ سے اچھا لگا۔ "صبغت اللہ لوٹ آؤ" عنیزہ سید اسٹوری اچھی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم 12 بہن' بھائی اور ہمارے کزنز سب ایک ساتھ بہت ہی محبت سے رہتے ہیں۔

افسانوں میں مجھے افراح سکندر کا افسانہ بہت پسند آیا۔ لڑکیوں کے لیے ایسی کہانیاں مشعل راہ ہیں۔ دوسرے نمبر پہ فرزانہ کھرل کا اچھا لگا۔ (الف سے عید) لیکن ایک بات ہے آپی جب بھی فرزانہ کھرل کی کہانی دیکھتی ہوں تو مجھے پڑھتے ہوئے ڈر لگتا ہے' کیونکہ وہ ہمیشہ ہیرو' ہیروئن کو جدا کردیتی ہیں۔ پلیز پلیز فرزانہ کھرل' ہمارا دل اتنا نازک ہے' ایسی کہانیاں مت لکھا کریں۔ آپی ایک ریکویسٹ اور مشورہ دینا تھا اس مرتبہ نفسیاتی ازدواجی الجھنیں میں اسٹارٹنگ میں جو باتیں لکھی تھیں ان کا مجھ پہ بہت اثر ہوا اور میں نے بھی ان کی باتوں پہ عمل کرنے کی کوشش کی۔ آپ عدنان بھائی سے کہیں ہر مہینے ہمارے لیے ڈفرنٹ موضوعات پہ تھوڑی تھوڑی باتیں سوالات سے پہلے لکھا کریں۔ اس مرتبہ جو میں نے ان سے جو باتیں سیکھی وہ شکر کرنا' اچھی امید رکھنا اور مصروفیت جیسی اچھی اچھی باتیں۔ میں انتظار کروں گی کہ اب اگلے مہینے وہ کیا مشورہ دیتے ہیں اور آپی عائشہ رباب کا خط پڑھ کے بہت بہت خوشی ہوئی۔ خوشی سے میرے آنکھوں میں آنسو آگئے کہ کیا ابھی بھی ایسے لوگ ہیں جو بنا دیکھے ہمیں دعائیں دیں۔ تھینک یو عائشہ رباب' تھینک یو سوچ۔ ایک شکایت ہے کہ ڈائجسٹ بہت دیر سے آتا ہے اور اب تو مجھے پڑھ کے رونی کو بھی بھیجنا ہے۔ رونی کی شادی گاؤں میں ہوئی ہے۔ اس لیے وہاں یہ ڈائجسٹ نہیں ملتا۔ وہ روز فون کرتی ہے کہ کب بھیجوگی۔ اب میں پڑھوں تو بھیجوں نا اس کو۔

ج - پیاری شبانہ! آپ اتنے سارے لوگ آج کے دور میں بھی مل جل کر ساتھ رہتے ہیں اور کوئی لڑائی جھگڑا نہیں' یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ محبتوں اور خلوص کے رنگوں سے سجے اتنے دلربا اور دل کش کارڈز ہمیں مل گئے تھے۔ شکریہ۔ آپ کے علاوہ دیگر بہنیں بھی جو سالگرہ یا دیگر مواقع پر ہمیں کارڈز اور دعائیں بھیجتی ہیں۔ سب کا شکریہ۔ فرزانہ کھرل کی تحریر کے بارے میں آپ کا تبصرہ پڑھ کر ہمیں ایک لطیفہ یاد آگیا۔

"ایک صاحب کی بڑے عرصے بعد اپنے دوست سے ملاقات ہوتی ہے۔ وہ پوچھتے ہیں "اور سناؤ.... تمہارے اس عشق کا کیا بنا جو یونی ورسٹی میں بڑے زوروں پر تھا۔" دوست کہتے ہیں اس کا تو بڑا المناک انجام ہوا.... کیوں کیا ہوا؟ اس کی شادی کہیں اور ہوگئی۔" نہیں.... اس کی شادی مجھ سے ہی ہوگئی" دوست نے ٹھنڈی سانس بھر کے جواب دیا۔

رونی کو شادی کی مبارک باد اور ڈھیر ساری دعائیں۔ جس طرح وہ اپنے گھر میں بہن' بھائیوں اور کزنز کے ساتھ پیار سے رہتی تھی۔ دعا ہے اس کو سسرال میں بھی ایسا ہی ماحول ملے۔



آمنہ ریاض

# دشتِ جنوں

"قلعہ فلک بوس کا آسیب آیو شمتی..... ایک بھٹکتی روح جس کے اسرار سے کوئی واقف نہیں ہے۔

معاویہ فلک بوس آتا ہے تو اسے وسامہ کی ڈائری ملتی ہے۔

فلک بوس میں وسامہ اپنی بیوی آئے کت کے ساتھ رہتا ہے۔ وسامہ بہت اچھا اور ذہین مصنف ہے۔ وہ باوقار اور وجیہہ شخصیت کا مالک ہے لیکن ایک ٹانگ سے معذور ہے۔ وہ غیر معمولی حساس ہے۔ اسے قلعہ فلک بوس میں کوئی روح محسوس ہوتی ہے۔ آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن کوئی نظر نہیں آتا۔ معاویہ وسامہ کا پھوپھی زاد بھائی ہے' آئے کت اور وسامہ 'معاویہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ قلعہ فلک میں آیو شمتی کی روح ہے لیکن معاویہ مضبوط اعصاب کا مالک ہے' اسے اس بات پر یقین نہیں آتا۔

کہانی کا دوسرا ٹریک جہاں بھائی جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت رہتے ہیں۔

صابر احمد سب سے بڑے بھائی ہیں۔ صابر احمد کی بیوی صباحت تائی جان ہیں اور تین بچے' رامین' کیف اور فہمینہ ہیں۔ رامین کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملائیشیا میں ہے۔

شفیق احمد کی بیوی فضیلہ چچی ہیں۔ مالی لحاظ سے وہ سب سے کم ہیں۔ شفیق احمد نے ان سے پسند کی شادی کی تھی۔ دو بیٹیاں صیام اور منہا ہیں اور دو بیٹے شاہ جہاں اور شاہ میر ہیں۔ بڑے بیٹے شاہ جہاں مٹھو بھائی کا دماغ چھوٹا رہ گیا ہے۔

باسط احمد' تیسرے بھائی کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کی بیوی روشن امی اور دو بیٹیاں خوش نصیب اور ماہ نور ہیں۔ خوش







نصیب کو سب منحوس سمجھتے ہیں' جس کی وجہ سے وہ تنک مزاج ہو گئی ہے۔ خوش نصیب کی نانی بھی ان کے ساتھ رہتی ہیں۔ خوش نصیب کو دونوں چچاؤں سے شکایت ہے کہ انہوں نے ان کا حق نہیں دیا ہے۔ گھر کا سب سے خراب حصہ ان کے پاس ہے۔ صباحت تائی جان اور روشن امی خالہ زاد بہنیں ہیں۔ صباحت تائی جان کے چھوٹے بھائی عرفات ماموں جو بہت نرم گفتار اور دل موہ لینے والی شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے شادی نہیں کی۔ وہ کیف کے ماموں ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا آئیڈیل بھی ہیں۔

کہانی کا تیسرا ٹریک منفرا اور تیمی ہیں۔ منفرا امریکہ میں پڑھنے آئی ہے۔ ہاسٹل میں رہتی ہے۔ زیر زمین ٹرین میں ان کی ملاقات معاویہ سے ہوتی ہے۔ منفرا کی نظریں معاویہ سے ملتی ہیں تو اسے وہ بہت عجیب سا لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی سفاکی اور بے حسی ہے۔ منفرا چونک سی جاتی ہے۔

ایک حادثے میں آئے کت اپنے بچے سے محروم ہو جاتی ہے اور اس کا ذمہ دار معاویہ کو سمجھتی ہے۔ معاویہ اس سے شادی کا فیصلہ کرتا ہے' مگر وہ انکار کر کے اپنے وطن لوٹ جاتی ہے۔ معاویہ اپنے گھر آجاتا ہے۔ کچھ سالوں بعد صاعقہ ممانی کے بھتیجے کی شادی میں دونوں کی ملاقات ہوتی ہے۔ جہاں معاویہ آئے کت سے اپنی شادی کا اعلان کرتا ہے۔ صاعقہ ممانی' ماموں' معاویہ کے والد سب اس رشتے سے ناخوش ہیں' مگر معاویہ اپنے دلائل سے انہیں قائل کر لیتا ہے۔ کچھ ردوکد کے بعد آئے کت بھی راضی ہو جاتی ہے۔

شاہ میر کچھ شعبدے دکھا کر پورے گھر کو متاثر کرتا ہے' مگر خوش نصیب اس کی باتوں میں نہیں آتی البتہ اس کے دل و دماغ پر ضرور ان باتوں کا اثر ہوتا ہے۔

منفرا کے والد مسٹر جمال پاکستان جانے کے لیے بضد ہیں' مگر ان کا بیٹا آدم تیار نہیں۔

معاویہ کی آئے کت سے شادی کو وادی کے تمام لوگ نیکی سمجھ کر سراہتے ہیں۔ اردشیر ازی ناراضی بھول کر اپنی دوسری بیوی اور تینوں بچوں سمیت فلک بوس پہنچ جاتے ہیں اور شادی کے انتظامات انتہائی اعلیٰ پیمانے پر کرواتے ہیں۔ مہندی کی رات آئے کت کو فلک بوس کی عمارت پر ایک ہیولہ نظر آتا ہے۔

مٹھو بھائی خوش نصیب کو خود کشی کرتا دیکھ کر بچا لیتے ہیں۔ پورے خاندان میں اس بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے۔ خوش نصیب اپنے اس فعل سے خود بھی حیران ہوتی ہے' اسے خود نہیں معلوم کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ صباحت بیگم کو فضیلہ چچی کی اس معاملے میں نکتہ چینی بری لگتی ہے۔ وہ فہمینہ کو روشن امی کی بھری جوانی میں بیوگی اور مشکلات کا بتاتی ہیں جنہوں نے روشن امی کے شوخ مزاج کو بدل کے رکھ دیا تھا۔

آدم کا خیال ہے کہ اس کے والد منفرا کی شادی اس کے بچپن کے دوست شامیر سے کریں گے۔ مگر وہ اس خیال کو رد کردیتی ہے۔ وہ اسے صرف دوست سمجھتی ہے۔

خوش نصیب کی خود کشی کی خبر کیف کو بھی مل جاتی ہے۔ وہ اسے فون پر تنگ کرتا ہے تو وہ غصے میں شامیر کے جبران سے ملنے کی ضد کرتی ہے اور اگلے روز شامیر ایک زیر تعمیر بنگلے میں اس کی ملاقات جبران سے کراتا ہے۔ جبران روایتی جن نہیں بلکہ غیر معمولی حسن کا حامل پراسرار سا شخص ہے۔ شامیر خوش نصیب کو کمرے میں بند کر کے چلا جاتا ہے۔

آئے کت کسی بھی آسیب کو ماننے سے انکار کردیتی ہے' اس کے خیال میں کوئی انہیں ڈرا رہا ہے۔ مگر معاویہ اسے آسیب ہی سمجھتا ہے۔ کسی بھی ناخوشگوار واقعے سے بچنے کے لیے وہ نکاح کا انتظام کرتا ہے۔ مگر عین نکاح کے وقت آئے کت پراسرار انداز میں غائب ہو جاتی ہے۔

خوش نصیب تھوڑی کوشش کر کے باہر آجاتی ہے۔ ایک دوسرے کمرے میں اسے شامیر بیری والے ملنگ بابا کے ساتھ شیطانی عملیات میں مصروف نظر آتا ہے' وہیں جبران ہوتا ہے جو اسے دیکھ لیتا ہے۔ جبران' خوش نصیب کو وہاں سے نکال دیتا ہے' فراڈیے ڈامیر کی اصلیت سے آگاہ کرتا ہے۔ جبران در حقیقت معاویہ ہے جو کسی روح کی تلاش میں شامیر سے ٹکرایا ہے۔

## اٹھارہویں قسط

بھید بھری رات چپ چاپ بہتی چلی جا رہی تھی۔
دھند کا ایک مرغولہ تھا جس نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ وہ سیدھی چلتی ہوئی آئی اور بنا دیکھے داہنی سمت کو مڑ گئی۔ پھر ایک جگہ ٹھہری اور آنکھیں جھپک جھپک کر اپنی بصارت کو اس دھند سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔
خدا جانے وہ کہاں تھی۔ زمین پر یا خلا میں بھٹک رہی تھی۔ اس خیال نے اس کے اعصاب شل کر دیے۔
نہ کچھ دکھائی دے رہا تھا نہ سجھائی دے رہا تھا۔ اندھی نہیں تھی لیکن اندھوں سے زیادہ بے بس کھڑی تھی۔
معاً" اسے اپنے کان کے پاس سرسراہٹ سی محسوس ہوئی ایسے جیسے کوئی زور زور سے سانس لے رہا ہو۔ اس احساس نے اس کے دل میں دہشت بھر دی۔ اگلے ہی پل وہ پوری جان لگا کر بھاگنے لگی۔ بنا دیکھے، بنا مڑے وہ ناک کی سیدھ میں دوڑتی چلی جا رہی تھی۔
یکایک اس کے پیر رک گئے۔ اور وہ دم بخود ہو کر دیکھنے لگی۔ دھند کا غبار ایسے چھٹا جیسے کسی نے دونوں ہاتھوں سے اس کے لیے جگہ بنا دی ہو۔ سامنے ایک کھلا میدان تھا۔ میدان میں ریت ہی ریت بھری ہوئی تھی۔ اس ریت کے میدان سے پرے برگد کا درخت نظر آ رہا تھا جو قدیم اور ہیبت ناک لگتا تھا۔ چوڑے پتے اور زمین کو چھوتی ہوئی جٹائیں تھیں۔ تنا موٹا سا تھا اور اسی تنے سے وہ بندھی تھی۔
مدہوش سی اور نحیف بدن کے ساتھ.... ہاں وہ.... وہی تھی.... ماہ نور۔ اس کی پیاری بہن۔ ماہ نور۔
خوش نصیب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔
"ماہ نور!" وہ حلق کے بل چلائی اور تیزی سے ماہ نور کی طرف دوڑی۔
دور تنے سے بندھی ماہ نور نے ذرا کی ذرا آنکھیں کھول کر اپنی نحیف گردن اٹھا کر اس طرف دیکھا اور ذرا سی دیر میں ہی اس کی گردن واپس ایک طرف کو ڈھے گئی۔ خوش نصیب کی جان نکل کر جیسے حلق میں آ گئی۔ اس کا بس نہ چلتا تھا اڑ کر ماہ نور کے پاس پہنچ جائے لیکن جتنا آگے بڑھتی تھی اتنا پیچھے دھکیلی جا رہی تھی۔ پیر تھے کہ ریت میں دھنسے جاتے تھے۔
اسی اثنا میں کہیں سے شامیر نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں تیز دھار چاقو تھا۔ آتے ہی اس نے ماہ نور کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر جھٹکا دیا۔ یہاں تک کہ ماہ نور کا چہرہ اوپر اٹھ گیا ساتھ ہی اس نے خنجر والا ہاتھ بھی ہوا میں بلند کیا۔
خوش نصیب پوری قوت سے دوڑی اور تبھی اسے احساس ہوا۔ وہ ریت جو اسے آگے نہ بڑھنے دیتی تھی۔ دلدل بنی اسے نگل رہی تھی۔ وہ تڑپنے لگی اور اور خود کو اس دلدل سے نکالنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا لیکن ہر کوشش بے سود۔ ادھر شامیر نے خنجر لہرایا آسمان کی چھٹتی دھند سے بجلی کی ایک لہر خنجر کے پھل سے ٹکرائی اور خنجر ماہ نور کی گردن کے آر پار ہو گیا۔
خوش نصیب کے لبوں سے چیخ بلند ہوئی اور وہ ایک خوفناک خواب کا حصار توڑ کر جاگ اٹھی۔
وہ اپنے کمرے میں تھی۔ فضل منزل کی سب سے اونچی منزل کے سب سے بڑے اور گرم کمرے کی گیلری میں بچھے اپنے بستر پر۔ اس کا حلق بالکل خشک ہو چکا تھا۔ اور جسم پسینے سے تر تھا۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ چند منٹ گزرے تو سب کچھ سمجھ میں آنے لگا تب دیکھا۔
ماہ نور وہیں کھڑی کھیس تہ کر رہی تھی۔ خوش نصیب کی حالت دیکھ کر پریشان سی ہو گئی اور ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگی لیکن جوں ہی خوش نصیب اپنے حواس بحال کرتی اس کی طرف متوجہ ہوئی ماہ نور نے لاتعلقی سے منہ موڑ لیا۔
خوش نصیب کا بے ہنگم طریقے سے دھڑکتا ہوا دل بالکل ہی بے جان ہو گیا۔ ماہ نور، شامیر کی مخالفت کرنے پر

اس سے اس حد تک خفا ہو چکی تھی کہ اس وقت اگر خوش نصیب خوف کے مارے نیند کے دوران مر بھی جاتی تو یقیناً "ماہ نور اسے ہلا کر جگانے کی زحمت ہرگز گوارا نہ کرتی۔
بے حد نرم طبیعت کی مالک، دوسروں کی تکلیفوں کو اپنا سمجھنے والی اور چھوٹی بہن پر جان چھڑکنے والی ماہ نور کے دل میں اس حد تک لاتعلقی اور نفرت ڈال دی تھی اس سے بڑھ کر شامیر کے شر کی گواہی اور ہو بھی کیا سکتی تھی۔
ماہ نور نے سلیقے سے کھیس تہ لگا کر دروازے کی اوٹ میں رکھی کرسی پر رکھے دیگر بستروں کے اوپر رکھ دیا۔ اس کرسی پر ایسے ہی کئی بستر، لحاف، روزمرہ استعمال کی چادریں وغیرہ رکھی جاتی تھیں۔ کھیس رکھ کر اس نے چارپائی سے اپنا دوپٹا اٹھا کر کندھوں پر پھیلایا اور جوں ہی کمرے سے باہر جانے لگی خوش نصیب نے بے ساختہ اسے پکارا۔
"ماہ نور!"
ماہ نور نے ایک اجنبی سی نظر اس پر ڈالی۔ منہ سے البتہ ایک لفظ نہیں بولی۔ اس اجنبی نظر میں اتنا سرد پن تھا کہ خوش نصیب جھجک سی گئی۔
"مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔
"اگر تم شامیر کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہو تو پہلے ہی بتا دوں۔ اس کے خلاف میں ایک لفظ نہیں سنوں گی۔"
"ماہ نور! میری بات تسلی سے بیٹھ کر سنو تو سہی۔" اپنی جگہ سے اٹھ کر خوش نصیب اس کے پاس جاتے ہوئے تقریباً "گھگھیا" ہی گئی تھی۔
"میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔ بہن ہوں تمہاری..... جو بھی بات کروں گی اس میں تمہاری بھلائی ہی ہوگی۔" اس نے ماہ نور کا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا۔
ماہ نور جو بے زاری اور سختی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ خوش نصیب کے ہاتھ سے چھڑا لیا اور اسی انداز میں بولی۔
"تم اگر میری اتنی ہی خیر خواہ ہوتیں تو شامیر کے معاملے میں میرا ساتھ دیتیں۔"
"تم شامیر کے علاوہ کسی کا بھی نام لے لیتیں..... میں تمہارا ساتھ دیتی۔" اس نے سچے لہجے میں کہا تھا لیکن سامنے ماہ نور تھی جو اس وقت ایک ان دیکھے حصار میں قید تھی۔ بظاہر اس حصار کا نام محبت تھا در حقیقت نہیں۔
ماہ نور کی آنکھوں میں نمی دکھائی دینے لگی۔ اسے خوش نصیب سے ایسے جذباتی دھچکے کی امید نہیں تھی۔
"میں نے تو زندگی میں کبھی بڑی بڑی خواہشیں نہیں پالی تھیں خوش نصیب! محبت کرنا تو دور کی بات ہے..... میں نے تو کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ میں کسی کو پسند کرنے لگوں گی۔ میں نے تو ہمیشہ صرف تمہاری اور روشن امی کے لیے سوچا تھا..... لیکن اب مجھے محبت ہو گئی ہے تو میں کیسے دست بردار ہو سکتی ہوں..... وہ بھی صرف اس لیے کیونکہ تمہارے شامیر سے اختلافات ہیں۔"
"میرے اس سے کوئی اختلافات نہیں ہیں۔" خوش نصیب نے تیزی سے کہا۔
اتنی ہی بیزاری سے ماہ نور نے سر جھٹکا تھا۔
"آگے سے ہٹو..... مجھے کچن میں بہت کام ہیں۔ تمہاری طرح سارا دن ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھنا ہوتا مجھے۔"
اس وقت ماہ نور کا لہجہ فضیلہ چچی جیسا دل دکھاتا ہی ہو گیا تھا۔
"میں سچ کہہ رہی ہوں ماہ نور!..... میرے شامیر سے کیا اختلافات ہو سکتے ہیں..... میری کون سی جائیدادیں پڑی ہیں جنہیں شامیر سے بچانے کے لیے میں تمہیں اس سے شادی کرنے سے منع کروں گی..... میری دولت تو روشن

امی ہیں۔ نانی ہیں اور..... اور تو تم ہو ماہ نور!"
اس نے جذباتیت اور محبت سے ماہ نور کا چہرہ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں بھر لیا تھا۔
"بس بھی کرو..... اور کتنا ڈراما کرو گی۔" ماہ نور نے نخوت سے اس کے ہاتھ جھٹک دیے تھے۔
"شامیر کی حقیقت میں جانتی ہوں..... تم نہیں۔" خوش نصیب بے چاری رونکھی ہی ہو گئی تھی۔
"اچھا؟..... اور کیا ہے شامیر کی حقیقت؟ ذرا مجھے بھی تو پتا چلے ناں؟"
"اس کا اصل چہرہ وہ نہیں ہے جو دکھائی دیتا ہے..... وہ تو۔"
ایک دم سے بولتے بولتے وہ کھٹک کر رک سی گئی۔ دماغ میں شامیر کی سرگوشی کھٹ سے آن گری تھی۔
"عرفات ماموں کو تو میں نے راستے سے ہٹا دیا..... اگلا کون ہوگا' اس کا فیصلہ تم خود کرو گی؟ ان کی جان بخش دی ہے باقی کسی کے لیے وعدہ نہیں کر سکتا..... بس ایک بات ذہن میں بٹھالو میں تمہیں ایسے ہی اکیلا کرتا جاؤں گا۔ تمہارے سارے اپنے ایک ایک کر کے تم سے اتنا دور کر دوں گا کہ تم بے بس ہو کر رہ جاؤ گی..... خوش نصیب!"
خوش نصیب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اب کچھ بعید نہیں تھا کہ ماہ نور کو شامیر کی اصلیت بتانے پر اس کا بھی وہی حال ہوتا جو عرفات ماموں کا ہو رہا تھا۔ اسے بولتے ہوئے احتیاط کرنا ہو گی۔ اس وقت ماہ نور کے سامنے کھڑی خوش نصیب نے سوچا۔
"اب بولو بھی..... چپ کیوں ہو گئی ہو؟ بتانے کے لیے کچھ ہے نہیں ناں؟" ماہ نور بے زاری سے پوچھتے ہوئے استہزا سے ہنسی۔
"شامیر ٹھیک کہتا ہے خوش نصیب! تم ان لوگوں میں سے ہو..... جو ساری زندگی نہ اپنا بھلا ہونے دیتے ہیں نہ کسی دوسرے کا..... ہٹو آگے سے۔"
اس نے زبردستی خوش نصیب کو سامنے سے ہٹایا اور گیلری سے باہر نکل گئی۔
خوش نصیب اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔



منفرا کے لیے معاویہ کو مونٹوک دکھانا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ وہ یہاں کے چپے چپے سے واقف تھی۔ زندگی میں پہلی بار اسے اپنی بطور گائیڈ فراہم کی گئی خدمات کا معاشی فائدے کے بجائے دلی فائدہ حاصل ہونے جا رہا تھا۔ اور لاشعوری طور پر وہ اس بات سے خوش بھی تھی۔
وعدے کے عین مطابق صبح ساڑھے آٹھ بجے معاویہ اس کے دروازے پر موجود تھا۔
منفرا اسے سب سے پہلے لائٹ ہاؤس دکھانے لے گئی جو Turtle Hill پر واقع تھا اور مونٹوک کے موسٹ وزیٹڈ پلیس کی لسٹ میں اول درجے کی حیثیت رکھتا تھا۔ داخلہ فیس ادا کر کے وہ دونوں اندر آ گئے اور اگلے چار گھنٹے وہاں گھومتے پھرتے رہے۔ لائٹ ہاؤس کے ساتھ ہی لوکل میوزیم بھی تھا۔ اور معاویہ کو میوزیم کی ہر چیز کی تاریخی حیثیت سے آگاہ کرنے کے لیے منفرا جیسا لائق گائیڈ بھی تھا۔
سفید رنگ کے ٹراؤزر کے ساتھ بے بی پنک ٹاپ اور اس پر ذرا گہرے پنک کلر کی ڈھیلی سی شرٹ پہنے بالوں کی اونچی سی پونی ٹیل بنائے وہ بولنا شروع کرتی تو بولتی ہی چلی جاتی تھی۔
"لائٹ ہاؤس اس دور میں تعمیر کیا گیا۔ اس سن میں فلاں فوج نے اس پر قبضہ کیا۔ فلاں فوجیوں نے اسے آزاد کروایا۔ اس سن میں دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ یہ پتھر اس دور میں آیا۔ دروازے کی یہ چوکھٹ اس لکڑی کی بنی ہے جو دور

دراز جزیرے پر پایا جاتا ہے۔ اتنے علاقے کو بجلی فراہم کی جاتی ہے۔ ٹاور کی اونچائی کتنی ہے اور جس چوٹی پہ یہ ٹاور کھڑا ہے۔ وہ سطح سمندر سے کتنی بلندی پر واقع ہے۔"

گویا اس کے پاس ہر وہ معلومات موجود تھی جس سے کم سے کم معاویہ کو تو رتی بھر بھی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

اس نے کئی بار منفرا کو ٹوکنے کا ارادہ کیا لیکن پھر خاموش ہی رہا۔ نجانے کیوں؟ یہاں تک کہ منفرا کی نظر اس کے اکتائے ہوئے چہرے پر پڑ گئی اور وہ ایک دم سے خاموش ہو گئی۔ چند سیکنڈ بعد اس نے پوچھا۔

"کیا ہوا؟ تمہیں دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی۔"

"ہرگز نہیں۔" اس نے مروّت بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔

"میں اتنی دیر سے بول رہی ہوں..... تم مجھے ٹوک سکتے تھے۔" منفرا نے قدرے حیرانی سے کہا تھا کیوں کہ معاویہ جیسے بندے سے یہ توقع تو فضول ہی تھی کہ وہ اب تک مروّت میں خاموشی سے اسے سن رہا ہو گا۔

"ٹوکنے کے لیے بھی کوئی نہ کوئی تو اسٹاپ چاہیے ہوتا ہے۔۔۔ میں حیران ہوں تم لڑکیاں نان اسٹاپ کیسے بول لیتی ہو۔" اس نے سنجیدگی سے کہا اس وقت اس کی آنکھیں شرارت سے جگمگا اٹھی تھیں۔ کسی مرد کی آنکھیں اتنی خوب صورت کیسے لگ سکتی ہیں۔ منفرا نے دل میں سوچا۔

"اگر تم جیسے لڑکے ہمہ وقت اررگنٹ (مغرور) بن کر رہ سکتے ہیں تو ہم لڑکیاں نان اسٹاپ کیوں نہیں بول سکتیں۔" اب منفرا نے بھی مروّت کو ایک طرف رکھ کر کہا تھا۔

معاویہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"تمہیں لگتا ہے میں اررگنٹ ہوں۔"

منفرا نے ایسے ظاہر کیا جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔

"اگر یہاں کی ہسٹری سے دلچسپی نہیں ہے تو کہیں اور چلیں؟ مونٹوک میں ایسی بہت سی جگہیں ہیں جنہیں وزٹ کرنا تمہارے لیے خوش آئند ثابت ہو سکتا ہے۔۔۔ مجھے امید ہے تمہارے مزاج کی تلخی پر بھی خاطر خواہ اثر پڑے گا۔"

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بڑے سرد لہجے میں بول رہی تھی۔ معاویہ نے چونک کر اسے دیکھا اور اس کا دل شرارت سے بھر گیا۔ لائٹ ہاؤس دلچسپ جگہ نہ سہی لیکن منفرا دلچسپ لڑکی ہی تھی۔ اور ایک دلچسپ لڑکی کے ساتھ ایک غیر دلچسپ جگہ گھوم پھر لینے میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔

اس لمحے معاویہ نے اپنی مسکراہٹ ہونٹوں تلے چھپاتے ہوئے منفرا کو کچھ مارکس دیے اور کسی اور جگہ جانے کے لیے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ضرور۔۔۔ لیکن اب کسی ایسی جگہ لے کر جانا جہاں کی رٹی رٹائی تاریخ مجھے سنانے کے بجائے تم مجھے اس کی کہانی سنا سکو۔" منفرا نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"کہانی؟"

"ہاں کہانی۔۔۔ جیسے ہم سب کی کوئی نہ کوئی کہانی ہوتی ہے جس میں کچھ رنگ ہوتے ہیں کچھ اذیتیں ہوتی ہیں۔۔۔ اسی طرح ہر جگہ کی بھی کوئی نہ کوئی کہانی ضرور ہوتی ہے۔"

"اس ٹاور کی صرف وہی کہانی ہے جو میں ہر ٹورسٹ کو سناتی ہوں۔"

"پھر اس کہانی کو سنانے کے لیے تمہاری کیا ضرورت ہے۔۔۔ جو اعداد و شمار تم بتا رہی ہو، یہ تو گوگل بھی بتا سکتا ہے۔" وہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ منفرا کا چہرہ خفت سے لال پڑ گیا۔

اسے ایک دم احساس ہوا شکل سے مغرور اور بے حس دکھائی دینے والا یہ وجیہہ انسان اصل میں اس سے بھی زیادہ مغرور تھا جتنا وہ اب تک اسے سمجھ رہی تھی۔



"شامیر کی یہ شروع سے عادت رہی ہے۔ ملکوں ملکوں گھومتا پھرتا ہے.... نئی نئی ثقافتوں کا شیدائی ہے.... کسی ایک جگہ ٹک کر رہنا تو جیسے اس نے سیکھا ہی نہیں ہے۔ لیکن اب میں دیکھ رہی ہوں.... آپ کے گھر کچھ زیادہ ہی دل لگ گیا ہے اس کا۔"

شامیر کی والدہ جنہیں سب فاطمہ کہہ کر پکار رہے تھے اس وقت بڑے کمرے میں موجود تھیں۔ اور بڑے طرح دارانداز میں اپنے بیٹے کی عادات پر روشنی ڈال رہی تھیں۔

کہنے کو شامیر کی والدہ تھیں لیکن کسی بھی طرح اس کی بڑی بہن سے زیادہ معلوم نہ ہوتی تھیں۔ اس عمر میں بھی ان کی جلد بے داغ اور جھریوں سے بے نیاز تھی۔ لمبے قد پر ساڑھی بہت جچ رہی تھی۔ پورے آستین کے بلاؤز کے ساتھ بھی داہنی کلائی میں انہوں نے ایک نازک سا بریسلیٹ پہنا ہوا تھا۔ انگلیاں مخروطی اور ناخن صاف ستھرے۔ مصنوعی رنگ سے پاک۔

خوش نصیب نے خود دیکھا فضیلہ چچی جن کی خوب صورتی خاندان بھر میں مانی جاتی تھی بار بار فاطمہ بیگم کے ہاتھوں کو دیکھتیں۔ اگلی حسرت بھری نظر اپنے ہاتھوں پر ڈالتیں جو اس عمر میں خوب صورتی کے کسی بھی معیار پر پرکھے جانے کے قابل بھی نہ رہے تھے اور چپکے سے انہیں آنچل میں چھپا کر کوئی اگلا موضوع چھیڑ دیتی تھیں۔

دوسری طرف شامیر مگن اور لاپروا سا بیٹھا کیف سے باتیں کر رہا تھا۔ آج اس نے ایک بار بھی خوش نصیب کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی نہ ہی اپنی کمینگی۔ اور شیطانیت سے بھری مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی تھی۔

ماں کی موجودگی میں شاید تھوڑا محتاط ہو گیا تھا یا شاید خوش نصیب سے اس کا دھیان ہی ہٹ چکا تھا۔ جو بھی تھا' یہ دن خوش نصیب کے لیے قدرے سکون کا باعث ثابت ہو رہا تھا۔ آج نہ سارا دن اس کا دل گھبرایا نہ بیٹھے بیٹھے وہ حال سے کٹ کر کسی اور جہاں کو نکلی تھی۔ بس وہ ایک خواب تھا جو پچھلی رات اپنا اثر اس کے ذہن پر چھوڑ کر جا چکا تھا۔

ماہ نور کی طرف سے مایوس ہو کر اس نے شامیر سے بات کرنے کی ٹھانی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا شامیر جیسے کمینے انسان کی ساری باتیں تو خیر نہیں مانے گی لیکن ماہ نور کو بچانے کے لیے اس کی منت سماجت کرنے کا ارادہ بہرحال بنا لیا تھا۔ لیکن کوئی مناسب موقع اسے مل کر ہی نہ دے رہا تھا۔

اسے یہاں بیٹھ کر شامیر کی تعریفیں سننے کا بھی کوئی شوق نہیں تھا نہ وہ ان خاتون سے متاثر ہو رہی تھی۔ جیسا کہ گھر کی دیگر خواتین کا حال ہو رہا تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اپنی حسن پرست طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہو کر خوش نصیب نے ان کی خوب صورتی کو دل سے کئی بار سراہا تھا۔ وہ شامیر کی والدہ تھیں۔ اور ان سے مل کر خوش نصیب کو احساس ہوا تھا شامیر نے اپنی وجاہت میں ماں کی خوب صورتی کا ہی عکس لیا ہے۔ ان کے شوہر کا کئی سال پہلے انتقال ہو چکا تھا اور امریکہ میں رہ کر انہوں نے ایک خود مختار عورت کی طرح اپنے بیٹے کی پرورش کی تھی۔ وہ بجا طور پر اپنی جدوجہد پر نازاں اور اپنے اکلوتے بیٹے سے خوش دکھائی دیتی تھیں۔ جو کچھ وہ بتا رہی تھیں اسے سن کر انسان انہیں حق بجانب بھی سمجھ سکتا تھا۔

اب خدا جانے انہیں اپنے اس ہونہار سپوت (طنز) کے کرتوتوں کا علم تھا بھی یا نہیں۔ بظاہر تو سچ بات ہے' لاعلم

ہی لگ رہی تھیں۔
خود چونکہ بہت محنت والی زندگی گزاری تھی اس لیے روشن امی کی محنت اور جدوجہد کو بھی خوب سراہ رہی تھیں۔
شامیر کسی کام سے اٹھ کر کمرے سے باہر جانے لگا تو خوش نصیب ایک دم حرکت میں آ گئی۔ وہ اب تک یوں بھی صرف روشن امی کی تاکید سن کر رکی ہوئی تھی۔ صبح سویرے ہی اسے مہمان کے ساتھ اخلاق اور تمیز سے پیش آنے کا درس پڑھایا جا چکا تھا۔ لہٰذا یہاں بیٹھے رہنا بھی ضروری تھا لیکن جوں ہی شامیر کمرے سے نکلا۔ خوش نصیب بھی اس کے پیچھے باہر کو لپکی۔
اپنی ذہنی الجھنوں کا شکار' بے زار اور عجلت باز خوش نصیب کو احساس تک نہ ہو سکا۔ شامیر کے پیچھے یوں لپکنا سب نے ہی نوٹس کیا تھا۔ بہرحال وہ شامیر کے پیچھے ہی باہر نکل آئی اور کچن سے منسلک راہداری میں اسے جا لیا۔
"رکو... مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" رعب ڈالنے والا انداز نہیں تھا الٹا ایسا لگتا تھا ابھی رو دے گی۔
شامیر نے مڑ کر ایک لاتعلق سی نگاہ اس پر ڈالی۔ "بعد میں آنا... ابھی میں فارغ نہیں ہوں۔"
"میں زیادہ وقت نہیں لوں گی۔" وہ ایک دم سے اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔
"تم ماہ نور کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔"
اس نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔ "ابھی میں نے کچھ کیا ہی کہاں ہے... ابھی تو صرف ارادہ کیا ہے۔"
"تمہاری جنگ مجھ سے ہے... میرے گھر والوں کو اس میں شامل مت کرو۔" منت سے بولتی اس کی آنکھوں میں آنسو ہی آ گئے تھے۔
"ارے ہم دوستی کرنا چاہ رہے ہیں اور تم جنگ چھیڑنے کی باتیں لے کر بیٹھ گئی ہو۔" اس نے ایسے نرمی سے اور مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا کہ خوش نصیب اس کی اصلیت سے واقف نہ ہوتی تو ضرور اس کی سچائی پر ایمان لے آتی۔
"کس قدر ناسمجھ لڑکی ہو تم... اور پلیز رو مت... یہ جھوٹے آنسو بہا کر تم تو کیا دنیا کی کوئی عورت مجھے قائل نہیں کر سکتی... تمہارے آنسو تو ویسے ہی مجھے خوشی پہنچاتے ہیں... کیونکہ تمہارا ایک ایک آنسو تمہاری بے بسی کی علامت ہے... اور میں تمہیں بے بس ہی دیکھنا چاہتا ہوں... جیسے مچھلی تڑپتی ہے... پانی سے باہر آ کر... مرنے سے پہلے۔"
دوستانہ انداز میں بولا مسکراتے مسکراتے اس کی آنکھیں وحشی پن سے بھر گئیں۔ ایسے جیسے شکاری اپنے شکار کو دیکھ رہا ہوتا ہے چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ۔
"سب ٹھیک ہے ناں؟"
معاً ان دونوں کو پیچھے سے فاطمہ بیگم کی آواز سنائی دی۔ خوش نصیب تو اچھل ہی پڑی لیکن شامیر بڑے سکون سے پلٹا تھا اور ماں کو دیکھ کر خوب صورتی سے مسکرایا تھا۔
"سب ٹھیک ہے... ہم بس موسم کا حال ڈسکس کر رہے تھے۔"
لیکن فاطمہ بیگم کو خوش نصیب کے آنسوؤں نے الجھن میں ڈال دیا تھا۔
"موسم میں ایسا کیا ہے کہ اس بچی کی آنکھوں میں آنسو ہی آ گئے؟" انہوں نے الجھ کر پوچھا تھا۔ خوش نصیب ایک بار پھر سٹپٹائی اور تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔
شامیر نے اسے جاتے دیکھا پھر ماں سے بولا۔
"اس کے... یہاں پر... تھوڑا سا مسئلہ ہے۔" اس نے پہلے انگوٹھے سے خوش نصیب کی طرف اشارہ کیا پھر

اسی ہاتھ کو اپنے دماغ تک لے جا کر کہا تھا۔
"اس لیے اسے اگنور کریں۔۔۔ یہ بتائیں۔ آپ جس کام کے لیے آئی ہیں وہ کب شروع کریں گی؟"
"جلد ہی۔۔۔" انہوں نے پیار سے مسکرا کر بیٹے کا گال تھپتھپایا تو اس نے ماں کے کندھوں کے گرد بازو پھیلا دیا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا ایک معنی خیز رابطہ ان دونوں کے درمیان بھی محسوس ہوتا تھا۔



کچھ آگے جا کر معاویہ نے مڑ کر دیکھا منفرا ابھی تک وہیں کھڑی تھی جہاں چھوڑ کر وہ اسے آگے بڑھا تھا۔
"سو کیا پلان ہے؟ تم مجھے کہیں اور لے جا رہی ہو؟"
اس نے سادگی سے پوچھا اور منفرا کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے۔ وہ بندہ پل میں تولہ پل میں ماشہ کی اعلیٰ مثال تھا۔ ابھی اپنے کہے جملے کی تلخی کا شاید اسے احساس تک نہیں ہوا تھا کہ کس بری طرح سے منفرا کو شرمندہ کر گیا ہے۔
"میں تمہیں کہیں ضرور لے کر جاتی لیکن میرے پاس بھی اتنی ہی معلومات ہیں جتنی بقول تمہارے تمہیں گوگل دے سکتا ہے۔ میں نے ہسٹری کو ہمیشہ اعداد و شمار کے ساتھ ہی پڑھا ہے۔ کبھی اس میں کہانیاں تلاش نہیں کیں۔" وہ سنجیدگی سے بولی تھی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کی طرف بڑھی تھی۔ اس کے انداز میں ٹھہرنے کا کوئی اشارہ نہیں تھا بلکہ وہ متنفر ہو چکی تھی۔ اور اب یقیناً اس کا معاویہ کو مونٹوک کی مزید سیر کروانے کا بھی کوئی ارادہ نہیں تھا۔
معاویہ نے ذرا تعجب سے اسے دیکھا پھر مسکرا دیا۔
"تمہیں شاید میری بات بری لگی۔"
اللہ رے۔۔۔ کیا معصومیت تھی۔ یعنی ابھی بھی پوچھا جا رہا ہے کہ بات بری لگی یا میرے کہے ہوئے جملوں کو آپ نے کسی اعزاز کی طرح محسوس کیا ہے۔ کچھ لوگ پیدائشی سر پھرے ہوتے ہیں انہیں پہلے دن سے اتنی اہمیت مل چکی ہوتی ہے کہ وہ کسی کی طرف دیکھے بغیر بھی جانتے ہیں انہیں دیکھا جا رہا ہے ان پر نظر رکھی جا رہی ہے۔ یہ احساس تفاخر ان کے خون میں گردش کرنے لگتا ہے۔ معاویہ اردشیر ازی بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ایک تھا۔ اور منفرا کو بڑی شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ وہ اسے غیر ضروری اہمیت دینے کی مرتکب ہو چکی ہے۔
محض چند منٹوں میں وہ دل ہی دل میں معاویہ سے جی بھر کے متنفر ہو چکی تھی اور یہ تنفر اس کے چہرے سے بھی جھلکنے لگا تھا۔ معاویہ نے اسے دیکھا اور خود کو ہنسنے سے روک نہیں سکا۔ اس کی ہنسی منفرا کی نازک مزاجی پر اور بھی بجلی بن کر گری تھی۔
"تمہیں کسی نے بتایا ہے منفرا! تم ناراض ہوتی ہو تو بالکل ایک چھوٹی سی بچی کی طرح لگنے لگتی ہو۔"
"کیا میں اسے کامپلیمنٹ سمجھوں؟"
"جو بھی تمہارا دل کرے۔" وہ مسکراتا ہوا زینے پر بیٹھ گیا۔ سامنے لائٹ ہاؤس کا گھاس سے ڈھکا ہوا میدان تھا۔ جس کے دوسری جانب چوٹی کا اختتام ہوتا تھا اور اسی کنارے پر سورج جگمگا رہا تھا۔ یہ ایک روشن گرمائش سے بھرپور دن تھا۔
"یہاں آؤ۔۔۔ میں تمہیں اس ٹاور کی کہانی سناتا ہوں۔" معاویہ نے سامنے دیکھتے ہوئے کہنیاں گھٹنوں پر رکھیں اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا کر دوستانہ انداز میں کہا۔
منفرا بری طرح چونک گئی۔ اسے بھلا لائٹ ہاؤس کی کہانی کہاں سے پتا چلی ہو گی۔ اس نے سوچا لیکن میکانکی سے انداز میں جا کر اس سے کچھ دور بیٹھ گئی اور نہ چاہتے ہوئے بھی ہمہ تن گوش ہو کر اس کے بولنے کی منتظر ہوئی۔

"1967ء اس ٹاور سے چھلانگ لگا کر ایک اطالوی جوڑے نے خودکشی کی تھی۔۔۔ تمہیں پتا ہے؟" اس نے خفیف سی گردن موڑ کر منفرا کو دیکھا اور سوال کیا۔ منفرا کو حیرانی ہوئی لیکن اتنی بھی نہیں۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کافی پرانی بات ہے۔۔۔ میرا خیال ہے اس وقت میں پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔"

اس کی حس مزاح بھی خوب تھی' اس نے ثابت کیا۔ معاویہ محظوظ ہو کر ہنسا اور پھر ایک تسلسل میں بولتا چلا گیا۔

"اہم بات یہ نہیں کہ کسی نے اس ٹاور کو خودکشی کے لیے پسند کیا تھا' اہم بات یہ ہے کہ اس جوڑے کی خودکشی کے بعد ان کی یاد میں یہاں موم بتیاں جلائی گئی تھیں۔ اور روایت قائم ہو گئی تھی کہ جو بھی جوڑا یہاں آئے گا اور ٹاور کی سب سے اوپری منزل پر کھڑا ہو کر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اپنے رشتے کے تا عمر قائم رہنے کی دعا مانگے گا۔ اللہ اس دعا کو قبول کرے گا۔ بہت سے کپلز نے اس روایت کو دہرایا اور محبت کے نام پر یہاں دعائیں مانگیں۔ اس ٹاور کے کنگرے نے اب تک اتنی دعائیں سنی ہیں جتنی فٹ شاید اس کی بلندی بھی نہیں ہو گی۔"

وہ ایک لے میں بولتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اتنی چمک تھی جو غالباً "اس خودکشی کرنے والے مرحوم جوڑے کی یاد میں جلائی جانے والی موم بتیوں کی لو سے پیدا ہوئی ہو گی۔

"مجھے یاد آیا۔ میرے نانا جب تک زندہ تھے' وہ یہ قصہ سنایا کرتے تھے۔ رکو۔۔۔ مجھے اس اطالوی جوڑے کا نام یاد کرنے دو۔" منفرا نے اس کے خاموش ہوتے ہی کہا اور کنپٹی پر انگلی رکھ کر ذہن پر زور ڈالنے لگی۔

"رہنے دو۔۔۔ تمہیں ان کا نام یاد نہیں آئے گا۔" معاویہ ہنس دیا۔ "جب تمہیں ان کی کہانی ہی یاد نہیں رہی تو نام کہاں یاد رہے ہوں گے۔" وہ طنز نہیں کر رہا تھا لیکن منفرا کو ایسا ہی لگا کہ طنز کیا گیا ہے۔

"ایسی بات ہے تو نام بھی تم ہی بتا دو۔"

"نام تو مجھے بھی یاد نہیں۔۔۔ صرف ان کی داستان یاد تھی۔" وہ کندھے اچکا کر بولا۔

"ویسے کیا تم محبت کے آفاقی پن پر یقین رکھتی ہو؟"

"سو فیصد۔" منفرا نے ترنت کہا۔ "اب یہی دیکھ لو۔۔۔ محبت نے ہی ان دونوں کو اتنا بہادر بنا دیا تھا کہ وہ اس ٹاور سے کود کر زندگی جیسی پیاری چیز سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہو گئے۔۔۔"

"لیکن کیا فائدہ ہوا انہیں اس خودکشی سے؟ محبت کے نام پر جان ہی گنوانی ہو تو انسان اتنا نام تو کمائے کہ رومیو جولیٹ کی طرح تا عمر یاد رکھا جائے۔" اس نے طنزیہ ہنکارا بھر کر کہا تھا۔

"تم کچھ عجیب سی بات کر رہے ہو۔۔۔ ناموری کے لیے کون خودکشی کرتا ہے۔" اس نے ذرا چڑ کر کہا تھا۔ "خدا جانے وہ دونوں بے چارے کتنے مایوس ہوئے ہوں گے' موت انہیں کھینچ کر اس ٹاور تک لے آئی۔"

"میں تو اسے سراسر بے وقوفی ہی کہوں گا۔ محبت وحبت وقتی چیزیں ہوتی ہیں۔۔۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو یقیناً "اب تک دادا دادی تو بن ہی چکے ہوتے۔ ایک دوسرے سے شادی نہ بھی ہو پاتی تو کسی اور سے ہو جاتی۔ محبت کے لیے اپنی اور کسی کی زندگی ختم کر دینا کہاں کی عقل مندی ہے۔" وہ بڑی لاپروائی سے بول رہا تھا۔

"یہ تم کہہ رہے ہو؟ وہ انسان جو خود محبت کی خاطر زندگی کی رعنائیوں کو نظر انداز کر کے بیٹھا ہوا ہے۔" معا" منفرا کی زبان سے پھسلا۔

معاویہ نے بدک کر اسے دیکھا۔ وہ کیا کہہ رہی تھی۔

"کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتی ہو تم۔" وہ ایک دم سے سرد لہجہ اختیار کر گیا تھا منفرا کو وہ وہی معاویہ لگنے لگا جسے وہ کئی مہینوں سے پارک میں دیکھتی رہی تھی۔

"میں تمہاری بیوی کے بارے میں بات کر رہی ہوں۔" منفرا نے حلق تر کرتے ہوئے کہا۔ "یونیورسٹی میں مشہور ہے کہ۔ وہ تمہیں چھوڑ کر بھاگ گئی تھی اور تم نے اب تک اس کی محبت میں اسے بھلایا نہیں ہے۔"
"بکواس ہے یہ۔" وہ ایک دم غرایا اور جھٹکے سے اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔
منفرا پر شرمندگی کا آسمان آگرا۔ بولنے میں وہ اتنی لاپرواہ نہیں تھی پتا نہیں اس کی زبان کیسے پھسل گئی تھی۔
"آئی ایم سوری... میرا کہنے کا وہ مطلب نہیں تھا۔" اس نے فوراً کہا لیکن اب وقت ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ معاویہ اردشیرازی غصے سے بھرا ہوا کھڑا تھا۔ اس نے مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں۔ یکایک منفرا کو غضب ناک نظروں سے گھورتا ہوا وہ پلٹا اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔
"معاویہ! پلیز میری بات سنو۔" اپنی جگہ کھڑی ہو کر چلائی۔ لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کے پیچھے جاتی۔ ایک میکانکی طاقت نے اس کے پیروں کو جکڑ رکھا تھا۔ معاویہ چلا گیا وہ وہیں کھڑی رہ گئی۔
"Damn"... اس نے ہوا میں مکا لہرایا اور اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ زندگی میں پہلی بار اسے اپنے بولنے پر پچھتاوا ہوا تھا۔



خوش نصیب گھبرا کر عرفات ماموں کے پورشن میں آگئی۔
وہ بے چارے بستر پر آنکھیں موندے لاچار پڑے تھے۔ قریب ہی شیرو بلنگ کی کنارے سے ماتھا ٹکائے بیٹھا چپکے چپکے آنسو بہا رہا تھا۔ خوش نصیب کو پچھتاووں نے گھیر لیا۔ روئی ہوئی آنکھوں میں ایک بار پھر نمی چمکنے لگی تو کچھ خیال آنے پر اس نے جلدی سے آنکھیں پونچھیں اور گلا کھنکھار کر شیرو کو متوجہ کیا۔
"ایسے کیوں بیٹھے ہو شیرو؟"
اس کا گلا کھنکھارنے پر شیرو نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اور شکوہ کناں انداز میں بولا۔
"دیکھیں ناں خوش نصیب باجی! سر بولتے ہی نہیں ہیں... میں منتیں کر کر کے تھک گیا ہوں۔" وہ بری طرح سسکنے لگا تھا۔ خوش نصیب کا سر شرمندگی سے جھکنے لگا۔
اس کے گلا کھنکھارنے پر جہاں شیرو نے سر اٹھایا تھا وہیں عرفات ماموں نے ذرا کی ذرا آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تھا۔ خوش نصیب سے نظر ملی تو وہ اور بھی تڑپ اٹھی ان کی ذہین اور حوصلہ مند آنکھیں بیماری کے بوجھ سے بند ہوتی تھیں۔
"پہلے سر ڈانٹ لیتے تھے۔ میں شکوہ کرتا تھا کہ جب دیکھو ڈانٹ رہے ہیں تو کہتے تھے زبان چلاتے ہو... آپ ان سے کہیں ناں... اب ڈانٹیں گے تو میں ایک لفظ نہیں بولوں گا... بلکہ، بلکہ ان سے کہیں یہ مجھے ماریں... لیکن ایسے بے بس ہو کر مجھے نہ دیکھا کریں۔"
وہ اتنی بری طرح سے رو رہا تھا کہ خوش نصیب اپنے آنسوؤں پر زیادہ دیر قابو نہیں رکھ سکی۔ رونے لگی تو پھر روتی ہی چلی گئی۔
اسی آن کیف اندر داخل ہوا۔ ان دونوں کو زار و زار روتے دیکھا تو پریشان سا ہو کر عرفات ماموں کی طرف لپکا۔ وہ بے چارے بیماری کے زور کے باوجود پریشان آنکھوں سے ان دونوں کو روتا دیکھ رہے تھے۔
کیف کو دیکھ کر آنکھوں میں مدد کی درخواست سمٹ آئی۔ دوسری جانب کیف نے انہیں زندہ سلامت دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔ اگلے ہی پل غصے سے تن فن کرتا ان دونوں کی طرف پلٹا۔
"نکلو تم دونوں کمرے سے... تم دونوں اس قابل ہی نہیں ہو کہ کسی مریض کے پاس تمہیں بیٹھا رہنے دیا جائے

۔۔۔ کوئی مرے نہ مرے۔ تم دونوں کے بین ضرور اسے مار دیں گے۔"
"کیسی باتیں کر رہے ہو؟ اللہ نہ کرے عرفات ماموں کو کچھ ہو۔" وہ دہل کر بولی تھی۔
"جیسے تم ان کے سرہانے کھڑی ہو کر بھاں بھاں کر کے رو رہی ہو نا۔۔۔ وہ بے چارے اتنے بیماری سے مایوس نہیں ہوئے ہوں گے جتنا تمہیں روتا دیکھ کر ہو گئے ہیں۔" کیف نے بری طرح ڈپٹ ڈالا تھا۔
خوش نصیب شرمندہ سی ہو گئی اسے واقعی اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے گال پونچھتے ہوئے معذرت خواہانہ نظروں سے ماموں کو دیکھا۔ اور سر جھکا کر بولی۔
"سوری۔"
کیف نے جواب میں غضب ناک نظروں سے اسے دیکھا اور شیرو کو ڈپٹ کر بولا۔
"تم جا کر اپنی روتی صورت درست کرو۔ اور چائے بنا کر لاؤ۔۔۔ تمہاری طبیعت تو میں بعد میں ٹھیک کروں گا۔ پہلے ان محترمہ سے نمٹ لوں۔"
شیرو شرمندہ شرمندہ سا باہر نکل گیا تو عرفات ماموں اشارے سے کیف کو کچھ کہنے لگے۔ جسے سمجھنے کے لیے کیف مستعدی سے ان کے قریب جھک گیا۔ خوش نصیب بھی پوری طرح ان کی طرف متوجہ تھی لیکن سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ کیا کہنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چند منٹ کے بعد کیف ان کی بات سمجھ پایا تو پہلے ناراض سی نظر خوش نصیب پر ڈالی پھر کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے رکھی۔
"صرف عرفات ماموں کی وجہ سے معاف کر رہا ہوں تمہیں۔ اگلی بار ایسے روتی ہوئی نظر آئیں تو یاد رکھنا۔۔۔ ایک جھانپڑ کھاؤ گی مجھ سے۔"
اس کا کہنے کا انداز جارحانہ تھا خوش نصیب نے شرمندہ ہو کر سر جھکایا اور کرسی کی طرف ہاتھ بڑھایا تب ہی اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کیف نے کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھا اور ڈٹ کر بیٹھ گیا۔
خوش نصیب نے بری طرح شرمندہ ہو کر ہاتھ کھینچ لیا۔
"اب کیا میرے سر پر ہی کھڑی رہو گی؟۔۔۔ بیٹھ بھی چکو۔"
خوش نصیب جلدی سے عرفات ماموں کے پیروں کی طرف بیٹھ گئی۔
چند منٹ خاموشی سے گزرے۔ کیف نے عرفات ماموں کے قریب جھک کر کچھ کھسر پھسر کی پھر نروٹھے انداز میں ایک نگاہ غلط اس پر ڈال کر بولا۔
"ماموں پوچھ رہے ہیں تم اتنی اداس کیوں لگ رہی ہو؟"
"کک۔۔۔ کون میں؟"
"اور نہیں تو کیا میں؟"
"نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ اداس تو نہیں ہوں۔" کیف کے ڈر سے اس نے جلدی سے کہا تو وہ گھور کر بولا۔
"سچ بولو۔" خوش نصیب کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آ گئے۔ آج کل دل جانے کیوں اتنا بوجھل سا رہنے لگا تھا۔
"ڈانٹ کیوں رہے ہو؟"
کیف نے گہری سانس لی اٹھ کر اس کے قریب آیا اور آواز دبا کر بیزاری سے بولا۔
"تمہیں ٹسوے ہی بہانے ہیں تو پلیز یہاں سے چلی جاؤ۔۔۔ میں نہیں چاہتا عرفات ماموں تمہیں ایسے روتا دیکھ کر پریشان ہوں۔ تم نے اپنے علاوہ کسی دوسرے کا احساس کرنا تو سیکھا نہیں ہے۔۔۔ کم سے کم ایک بیمار انسان کا تو خیال کر لو۔"

کیف کا سرگوشی نما لہجہ اتنا بدگمان تھا کہ خوش نصیب کا دل ہی ٹوٹ گیا اس نے آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی کیف کی ناراضی ماند پڑ گئی۔ بدگمانی نہیں۔
اس کی آنکھوں میں آنسو وہ کبھی بھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن جو کچھ اس نے کیا اسے نظرانداز بھی نہیں کیا جا سکتا تھا' محبت بیوقوفی کا مارجن ضرور دیتی ہے۔ لیکن خود سے کھیلنے کا ہرگز نہیں۔



وہ بیزار سی کمرے میں آکر لیٹ گئی۔ حد درجہ مایوسی اسے گھیرے ہوئے تھی ایسے ہی نیند آگئی اور دوبارہ آنکھ کھلی تو مغرب کی اذانیں شروع ہو چکی تھیں اور روشن امی اسے ڈپٹ کر جگا رہی تھیں۔
"سو دفعہ سمجھایا ہے ایسے وقت میں مت سویا کرو.... لیکن تمہیں بھی بری عادت پڑ چکی ہے... چلو اب اٹھ کر منہ ہاتھ دھو اور کچن میں آکر ماہ نور کا ہاتھ بٹاؤ.... وہ بیچاری صبح سے اکیلی لگی ہوئی ہے۔"
خوش نصیب عادت کے برعکس اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ اور وہاں سے نکلی تو سیدھی کچن میں ہی آئی۔ گو کہ جانتی بھی تھی ماہ نور اپنی ناراضی کی بنا پر اس کی مدد لینا ہرگز گوارا نہیں کرے گی۔ پھر بھی آگئی کہ روشن امی کا حکم تھا۔
یہاں گھر کی ساری خواتین مع مہمان خاتون کی محفل جمی ہوئی تھی۔
خوش نصیب بیزار بیزار سی آکر ماہ نور سے پوچھے ہی سلاد بنانے لگی۔ فاطمہ بیگم نے اسے دیکھا تو مسکرائیں۔
"سچ تو یہ ہے روشن! کہ مجھے تمہاری دونوں بیٹیاں ہی بہت اچھی لگی ہیں۔ اتنی اچھی تربیت کی ہے تم نے کہ دیکھ کر دل خوش ہو جاتا ہے.... لیکن بچوں کی پسند ناپسند کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔" متبسم لہجہ خوشگوار انداز۔
خوش نصیب کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے بڑا چونک کر ماہ نور کو دیکھا وہ شرمیلی مسکراہٹ لبوں پر سجائے فانٹ ٹرائفل کے پیالے سجا رہی تھی۔
خوش نصیب ہاتھ میں چھری لیے پلٹی۔ اور طرح دار خاتون کو دیکھا۔
"اب تم اور مت سوچو اور مجھے ہاں میں جواب دو.... یقین کرو میں صرف ماہ نور کو اپنی بہو بنانے پاکستان آئی ہوں۔"
خوش نصیب کے سر پر کچن کی پوری چھت ہی جیسے آن گری تھی۔ فاطمہ بیگم کا مطالبہ اتنا حیران کن نہیں تھا جتنا اسے ہکا بکا روشن امی کی حوصلہ افزا مسکراہٹ نے کر دیا تھا۔
"یہ.... یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ آپ کا دماغ تو ٹھیک ہے؟"
اس سے قبل کہ روشن امی اپنی حوصلہ افزا مسکراہٹ جیسا ہی جواب دیتیں' خوش نصیب غرائی اور چھری والے ہاتھ کے ساتھ ان کی طرف جھپٹی تھی۔ دراصل وہ اتنی زیادہ پریشان ہو چکی تھی کہ اسے اپنے ردعمل پر قابو نہیں رہا تھا۔
اس کی غراہٹ کے ساتھ کچن میں جیسے سب کو ہی سانپ سونگھ گیا تھا اور سب کی ہی گردنیں خوش نصیب کی طرف مڑ گئی تھیں لیکن اگلے ہی پل جب وہ جھپٹی تو سب ہی ہکا بکا رہ گئے۔
روشن امی نے لپک کر اسے پکڑا۔
"خوش نصیب پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔"
فاطمہ بیگم الگ شاکڈ سی کھڑی اسے دیکھ رہی تھیں۔ ماہ نور پریشان۔
"پاگل میں نہیں یہ خاتون ہو چکی ہیں.... جو اپنے دھوکے باز بیٹے کے لیے ماہ نور کو مانگ رہی ہیں۔" وہ پاگلوں کی

طرح بول رہی تھی۔ اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ باہر سے تمام مرد حضرات بھی دوڑے چلے آئے تھے اور ظاہر ہے ان میں شامیر اور کیف بھی شامل تھے۔

"جب اس کا بس صیام پر نہیں چلا تو اس نے ماہ نور کو اپنا شکار بنانے کا سوچ لیا۔" وہ اب شامیر کی طرف دیکھتے ہوئے نفرت اور غصے سے بول رہی تھی۔

"لیکن میں تمہیں تمہارے عزائم میں کامیاب نہیں ہونے دوں گی' تمہارا اصل چہرہ میں سب کو دکھاؤں گی۔۔۔ اور صرف تمہارا نہیں' تمہاری ماں کا بھی۔"

"خوش نصیب! تمیز سے بات کرو۔" اس کا تضحیک آمیز لہجہ جہاں سب کو شرمندہ اور حیران سا کر گیا تھا وہیں شامیر کا جیسے دماغ ہی بھک سے اڑ گیا تھا۔ اس کا بس نہیں چلا اپنی ماں کے بارے میں اس طرح بات کرنے پر اس کا گلا ہی گھونٹ دے۔

"تمیز سے بات کروں، تم مجھے تمیز سکھاؤ گے؟ جو خود کسی تمیز تہذیب سے واقف نہیں ہے۔۔۔ ایک نمبر کا فراڈ اور دھوکے باز ہے۔" وہ اس وقت کسی بھی قسم کے ڈر اور خوف سے لاپروا ہو کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بول رہی تھی۔

"بیٹا! آپ کو شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" فاطمہ بیگم نے نرمی سے کہنے کی کوشش کی۔

"مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔۔۔ پوچھیں اپنے اس لائق فائق بیٹے سے۔ وہ یہاں کیا کچھ کرتا رہا ہے۔"

"اپنی بکواس بند کرو۔" شامیر کی آنکھیں لال ہو گئیں اور اس نے دانت بھینچ کر کہا۔

"نہیں۔۔۔ اب میں خاموش نہیں ہوں گی۔۔۔ میں نے تم سے کہا تھا میری بہن کا پیچھا چھوڑ دو۔۔۔ لیکن تم اپنی ماں کو بیچ میں لے آئے۔۔۔"

"یہ' یہ۔۔۔ اسے کیا ہو گیا ہے؟ اسے کوئی چپ کیوں نہیں کروا رہا۔" فضیلہ چچی اپنے مہمانوں کی عزت افزائی پر چند منٹ بعد ہی سہی لیکن تڑپ اٹھی تھیں۔

"خوش نصیب! میرے ساتھ آؤ۔"

"فہمینہ کو ذرا ہوش آیا اس نے آگے بڑھ کر خوش نصیب کا بازو پکڑنا چاہا لیکن وہ تو جیسے بالکل آؤٹ ہو چکی تھی' اس کا ہاتھ جھٹک کر بولی۔

"نہیں۔۔۔ اب نہ میں خاموش ہوں گی نہ یہاں سے جاؤں گی۔۔۔ کم سے کم تب تک نہیں جب تک اس گھٹیا انسان کا اصل چہرہ سب کو نہیں دکھا دیتی۔"

"اوہ ریئلی۔۔۔؟" وہ طنز سے بولا اور سینے پر بازو باندھتے ہوئے طنز سے اسے دیکھا۔ "اور کون سا ہے میرا اصل چہرہ؟"

"اسے اندر لے کر جاؤ۔" بڑے چچا کا ضبط بالکل جواب دے چکا تھا۔ انہوں نے اپنے کھولتے ہوئے اعصاب کو دانت بھینچ کر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مشترکہ طور پر سب خواتین سے کہا تھا۔

روشن آرا کا خون خشک ہو چکا تھا۔ "خوش نصیب! چپ ہو جاؤ۔۔۔ اور آؤ میرے ساتھ۔"

"میں کہیں نہیں جاؤں گی روشن امی!۔۔۔ کم سے کم اس وقت تک نہیں جب تک اس کی اصلیت سب کو نہیں بتا دیتی۔۔۔ صیام کے بعد ماہ نور اور اس کے بعد نہ جانے اور کس لڑکی کا نام لینے والا ہے۔"

کیف جو دور کھڑا تھا اس نے دل میں دعا کی۔ خوش نصیب اپنا منہ اب بند ہی رکھے۔ لیکن۔۔۔

"یہ۔۔۔ شامیر۔۔۔ جو بظاہر ایک پڑھا لکھا انسان دکھائی دیتا ہے۔۔۔ اس کی اصلیت اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ' یہ شیطان کی پوجا کرتا ہے۔ جنوں بھوتوں اور روحوں کو قابو کرنے کے لیے معصوم انسانوں کی بھینٹ چڑھاتا ہے اور

کالا جادو کرتا ہے۔" وہ ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی بالکل ایسے جیسے اگر سانس لینے کے لیے بھی رکی تو اسے بولنے سے روک دیا جائے گا۔

دوسری جانب اس کا پہلا جملہ سن کر ہی سارے ہکابکا رہ گئے تھے۔ صرف پیچھے کھڑا کیف تھا جس نے بے ساختہ اپنا ماتھا پیٹ لیا تھا۔

"اپنے شیطان کو خوش کرنے کے لیے اس نے میری بھینٹ چڑھانے کی کوشش کی۔ مجھے اپنے زیر تعمیر بنگلے میں بلایا اور جب میں کسی طرح وہاں سے بھاگ نکلی تو مجھے پریشرائز کرنے کے لیے... اس نے صیام سے شادی کرنے کی ٹھان لی... میں نے کیف کا نام لے کر صیام کو بچایا۔" سب کے سروں پر وہ ایک ایک کر کے بم پھوڑ رہی تھی۔

اس بات پر کیف چونکا۔ یہ بنگلے والی بات تو خوش نصیب نے اسے پہلے نہیں بتائی تھی۔

"پھر اس نے ماہ نور کا نام لے دیا... تم سمجھ رہی تھی ناں ماہ نور! یہ بھی تم سے محبت کرتا ہے... یہ تم سے کوئی محبت وحبت نہیں کرتا... یہ صرف مجھے پریشرائز کرنے کے لیے یہ سب کر رہا تھا... اس کا اصل چہرہ پہچانو... یہ ڈھونگ اور فریب کے سوا کچھ نہیں ہے... یہ ایک گندا انسان ہے... اللہ کی طے کردہ حدود سے تجاوز کرنا چاہتا ہے... انسان کے دماغ پر قابو پانے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔"

وہ خاموش ہوئی تو سب کو جیسے سانپ سونگھ چکا تھا۔ چند منٹ اسی سکتے والی کیفیت میں گزرے پھر اس خاموشی کو فاطمہ بیگم کی آواز نے توڑا تھا۔

"یہ... یہ کیا کہہ رہی ہے شامیر؟" ان کی آواز میں صدمہ اور پریشانی دونوں محسوس ہو رہے تھے۔

"آپ اس سے کیا پوچھ رہی ہیں... یہ کبھی آپ کو سچ نہیں بتائے گا... سچ صرف وہ ہے جو میں کہہ رہی ہوں۔"

"اب تم ایک لفظ نہیں بولو گی۔" وہ انگلی اٹھا کر غرایا تھا۔

"تم نے جتنی من گھڑت کہانیاں سنانی تھیں، سنالیں... حقیقت کیا ہے یہ میں سب کو بتاؤں۔" وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

"سچ تو صرف اتنا ہے کہ خوش نصیب خود مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اسی لیے وہ مجھے ٹریپ کرنے کی کوشش کرتی رہی ہے۔" اس نے جیسے بلی تھیلے سے باہر نکالی تھی۔

"اس بات کی گواہ صیام ہے... جس نے بہت پہلے ہی مجھے ان تعویذوں کے بارے میں بتا دیا تھا جو یہ پیر کے مزار سے مجھے اپنے زیر اثر کرنے کے لیے لاتی رہی ہے۔"

خوش نصیب کا رنگ فق ہوا۔

"شامیر! تم ہماری بیٹی پر الزام نہیں لگا سکتے۔" صابر تایا جان ایک دم ہی جلال میں آ گئے تھے۔

"آپ کی بیٹی اس وقت سے جو منہ میں آئے بول رہی ہے... آپ کے سامنے اس نے مجھے اور میری ماں کو ذلیل کیا ہے... مجھ پر جھوٹے بے بنیاد الزامات لگائے ہیں۔ اور اب جب اس کے کارنامے سننے کی باری آئی تو آپ مجھے چپ کروا رہے ہیں۔" وہ غصے سے بولا تھا۔

"یہ... یہ سچ نہیں ہے... میں کوئی تعویذ نہیں لائی۔" خوش نصیب ہکلا گئی تھی اور اس کا لہجہ ہی سب کو سچ کی گواہی دے گیا تھا۔

"کیوں صیام! کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟ کیا تم نے مجھے ان تعویذوں کے بارے میں نہیں بتایا تھا؟" شامیر ایک دم سے صیام کی طرف گھوما تو وہ جو ہونق بنی ساری باتیں سن رہی تھی اس بات پر اور بھی ہونق بن کر ان دونوں کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"صیام! کیا یہ سچ کہہ رہا ہے۔" شفیق چچا جان نے غرا کر بیٹی سے پوچھا۔
والد کے غصے کے آگے اس کا تو جیسے خون ہی خشک ہو گیا۔ جلدی سے اثبات میں سر ہلا کر بولی۔ "یہ سچ کہہ رہا ہے... میں نے خود خوش نصیب کے ہاتھ میں تعویذ دیکھے تھے اور پھر انہیں گیلری کی بالکونی سے نکالا تھا... بیری پیر کے پیر بابا نے وہ تعویذ کھولتے ہی بتا دیا تھا کہ یہ خوش نصیب نام کی لڑکی نے شامیر نام کے لڑکے کے لیے لکھوائے ہیں۔" وہ ہکلا کر بھی بولتی چلی گئی تھی۔
خوش نصیب کی بازی الٹی پڑنے لگی۔ اس نے ہمت اکٹھی کی کہ اپنے دفاع میں بول سکے لیکن اس سے پہلے شامیر نے تمام اہل خانہ کو طنز بھری اور جتاتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔
"خوش نصیب نے مجھے اٹریکٹ کرنے کے لیے کیسے کیسے اوچھے طریقے اپنائے ہیں... مجھے بتاتے ہوئے بھی شرم آرہی ہے۔ اگر میں نے روشن آنٹی اور ماہ نور کو نہ دیکھا ہوتا تو بڑے آرام سے خوش نصیب کی تربیت اور خاندان کو الزام دے دیتا۔ صرف یہی نہیں میرے پیچھے یہ میرے زیر تعمیر بنگلے میں بھی پہنچ گئی تھی اور اس بات کی گواہی وہاں موجود واچ مین بھی دے سکتا ہے کہ کس مشکل سے ہم نے اسے وہاں سے نکالا تھا... اگر مجھے ماہ نور اور روشن آنٹی کی عزت کی پرواہ نہ ہوتی تو اس روز یقیناً" غصے میں آپ سب لوگوں کو اس کی حرکتوں سے آگاہ کر چکا ہوتا... لیکن میں نے ہمیشہ اس کی عزت کی پرواہ کی۔ جس کی سزا مجھے یہ مل رہی ہے کہ آج آپ لوگوں کے گھر مجھے اور میری ماں کو ذلیل و رسوا کیا جا رہا ہے... پتا نہیں کون سے جن بھوتوں کی کہانی یہ سنا رہی ہے؟ خدا کا شکر ہے میری تربیت ایک مسلمان گھرانے میں ہوئی ہے اور میں ایسی کسی شیطانی طاقت سے واقف نہیں ہوں جسے قابو میں کرنے کے لیے انسانی جان کی بھینٹ چڑھائی جائے۔
چلیے ماما! اب ہم یہاں ایک منٹ بھی نہیں رکیں گے۔" اس نے اپنی ہکا بکا کھڑی ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اور جاتے جاتے ایک نظر خوش نصیب کو دیکھا۔
"اسے کسی اچھے سائیکاٹرسٹ کی ضرورت ہے... ورنہ یہ آپ سب کو برباد کر دے گی۔" اس نے نفرت سے کہا۔ ایک حسرت بھری اور محبت سے لبریز الوداعی نظر ماہ نور پر ڈالی اور ماں کو بازو کے حصار میں لیے باہر نکلتا چلا گیا۔
اس کے باہر جاتے ہی وہ سب ایسے جاگے جیسے کچھ دیر قبل کسی نے کوئی اسم پھونک کر ان سب کو اپنی اپنی جگہوں پر ساکت کر دیا ہو۔ پھر فضیلہ چچی سٹپٹا کر اپنے عزیز مہمانوں کے پیچھے بھاگیں۔
"بس اب یہی دن دیکھنا رہ گیا تھا اس کلموہی کی وجہ سے... کہ مہمان بھی بے عزت ہو کر نکالے جائیں گے... ارے شامیر بیٹا! رکو تو..."
سب ایک دوسرے کی شکلیں دیکھتے وہاں سے چپ چاپ کھسکنے لگے۔ تایا جان کی آنکھوں سے تو غیظ جھلک رہا تھا۔ سب باری باری نکلتے چلے گئے یہاں تک کہ ماہ نور، خوش نصیب کھڑی رہ گئیں اور روشن امی اپنا سر پکڑ کر کرسی پر ڈھے ہی گئیں۔
"روشن امی!" خوش نصیب تیزی سے ان کی طرف لپکی لیکن انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔
"صحیح کہہ رہی ہے فضیلہ! بس یہی دن دیکھنا رہ گیا تھا... تم میری کس غلطی کی سزا ہو خوش نصیب...!" وہ پریشان، نڈھال بے بس بیوہ تھیں۔
"میں، میں قسم کھانے کے لیے تیار ہوں روشن امی! میں نے شامیر کے بارے میں ایک بھی لفظ جھوٹ نہیں کہا۔" اس نے ان کے پیر پکڑ کر کہا تھا۔
"میرے سامنے سے چلی جاؤ... میں اس وقت تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔" انہوں نے غصے اور ناراضی سے منہ موڑ لیا تھا۔

"کئی سالوں بعد ایک خوشی ملنے جارہی تھی.... تم نے اسے بھی برباد کردیا۔"
"آپ میری بات کا یقین کریں.... وہ ماہ نور کے لیے مناسب نہیں تھا۔" وہ بے قراری سے بولی۔
"مناسب نہیں تھا۔" ماہ نور شاکڈ سی سامنے آئی۔
"کیوں مناسب نہیں تھا۔ اس لیے کیونکہ تم اس سے شادی کرنا چاہتی تھیں؟" اس نے غصے سے پوچھا۔
خوش نصیب نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔ کوئی اس کا یقین کیوں نہیں کرلیتا؟
اسی اثنا میں منہا وہاں آئی۔ وہ خود عجب مخمصے کا شکار تھی ان تینوں کو دیکھ کر گومگو۔ سی کھڑی رہی پھر بولی۔
"روشن چچی! تایا جان نے آپ کو بڑے کمرے میں بلوایا ہے.... اور 'اور تمہیں بھی۔" اس نے خوش نصیب کی طرف دیکھ کر کہا اور جلدی سے کہہ کر باہر نکل گئی۔
روشنی آرا کی وہی حالت ہو رہی تھی جو عدالت میں سماعت سے پہلے ملزم کی ہوتی ہو گی۔



مونٹوک کے ساحل پر شام اتر آئی تھی اور فضا میں ایک اداسی سی رچی بسی محسوس ہونے لگی تھی۔
منفرا کے چھوٹے سے کمرے کی ایک کھڑکی ساحل کی طرف رخ کیے کھلتی تھی۔ اسی کھڑکی میں ننھی سی چڑیا آ کر بیٹھی اور اپنی سریلی آواز میں چہچہانے لگی۔ پیکنگ کرتے ہوئے منفرا نے ذرا سی دیر کو نظریں اٹھا کر اس ننھی چڑیا کو دیکھا۔ اس کی آواز منفرا کے دل کو مزید اداس کر رہی تھی۔
وہ ہاتھ میں پکڑی شرٹ کو تہ کرتی کھڑکی کی طرف بڑھی۔ ننھی چڑیا خطرہ بھانپ کر پھر سے اڑ گئی۔ منفرا نے کھڑکی بند کر دی۔ ساحل کی شام اور ہوا بند کھڑکی کے شیشے سے سر ٹکراتی رہ گئی تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اداسی کمرے کے کونے کونے میں پھیل چکی تھی۔ منفرا نے سر جھٹکا اور پوری تندہی سے باقی کا سامان پیک کرنے لگی۔
اگلی صبح اسے واپس نیویارک چلے جانا تھا اور سچ بات ہے کہ اس بار اس کا دل بالکل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔
معاویہ سے دوبارہ اس کی بات نہیں ہو سکی تھی گو کہ اپنی بات کی معذرت کرنے کے لیے اس نے کئی بار اسے کال کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ہر بار اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ تھک ہار کر اس نے کوشش ہی ترک کر دی۔ شاید معاویہ مونٹوک سے جا چکا تھا کیونکہ اس چھوٹے سے ٹاؤن میں وہ دوبارہ منفرا کو دکھائی بھی نہیں دیا تھا۔
منفرا پہلے شرمندہ تھی پھر اس کی شرمندگی غصے میں بدل گئی یہاں تک کہ اسے ڈپریشن نے گھیر لیا۔
آخر اتنا مغرور کیوں تھا وہ شخص۔ ایسا کہہ بھی کیا دیا تھا منفرا نے اسے کہ وہ ایک بار بھی اس کی بات سننے پر راضی نہیں ہو رہا۔ دس دفعہ تو مسز جمال اور ایڈم اس سے معاویہ کے بارے میں سوال کر چکے تھے۔
"وہ میرا بوائے فرینڈ نہیں ہے کہ میں اس کے منٹ منٹ کی خبر رکھوں۔ مجھے کیا پتا وہ ملنے کیوں نہیں آیا.... اور مجھے یہ بھی کیا پتا وہ مونٹوک میں ہے یا جا چکا ہے.... آپ لوگ پلیز مجھ سے بار بار سوال کرنا بند کریں۔" مسز جمال کے پوچھنے پر اس نے بہت چڑ کر کہہ دیا تھا اور کھانے کی میز سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی تھی۔
مڑ کر یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ اس ردِعمل پر تینوں افراد متعجب ہو کر اسے دیکھنے لگے تھے۔ وہ خود اپنی ذہنی حالت سے تنگ آرہی تھی ان لوگوں کے سوالوں کا جواب دے بھی کیسے سکتی تھی۔
"منفرا۔ منفرا۔ نیچے آکر کافی پی لو۔ میں نے تمہارے لیے بنائی ہے۔"
اسے نیچے پورشن سے مسز جمال کی آواز سنائی دی۔ منفرا دروازے تک گئی۔ کمرے کے آگے چھوٹی سی گول برآمدہ نما لابی تھی جو گولائی کی شکل میں نیچے چھوٹے سے سٹنگ روم میں کھلتی تھی۔ مسز جمال زینے کے پاس کھڑی اسے آواز دے رہی تھیں۔

"میرا موڈ نہیں ہے.... آپ پی لیں کافی۔"
"کم آن ہنی! تم ہم سے ملنے آئی تھیں، اب ایسے اداس ہو کر تو مت واپس جاؤ۔" انہوں نے زینے کے آغاز پر کھڑے ہو کر کہا۔
منفرا دل ہی دل میں شرمندہ ہوگئی۔ "میں اداس نہیں ہوں.... بس کافی پینے کا دل نہیں چاہ رہا۔"
"اچھا نیچے تو آؤ.... دیکھو کوئی تم سے ملنے آیا ہے۔" انہوں نے پیار سے کہا تو منفرا چونک سی گئی اسی اثناء میں اسے نیچے لاؤنج میں کسی اور کی بھی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ اس نے چونک کر ادھر نظر ڈالی اور حیران ہی رہ گئی۔
سامنے والے صوفے کے پاس معاویہ کھڑا سر اٹھائے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔
دوستانہ انداز میں اور.... معذرت خواہانہ نظروں سے۔



شامیر بے حد غصے میں تھا لیکن اپنی ماں کے ساتھ کمرے میں آتے ہی جیسے اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔
"اپنا سامان پیک نہ کریں، ہمیں ابھی کچھ اور دن یہاں رکنا ہوگا۔" اس نے اتنے تحمل سے کہا تھا کہ فاطمہ بیگم مزید ہکا بکا رہ گئی تھیں۔
"کیسی باتیں کر رہے ہو اتنی بے عزتی ہوئی ہے ہماری۔ ہم کیسے یہاں رک سکتے ہیں؟" انہوں نے تعجب سے پوچھا تھا۔
"میں نے آپ کو بتایا تھا ناں۔ وہ لڑکی تھوڑی سی کھسکی ہوئی ہے۔ ایک مینٹلی ریٹارڈڈ (ذہنی مریض) کی باتوں کا کیا برا منانا۔" فاطمہ بیگم اس کا جواب سن کر ہونق رہ گئی تھیں۔ انہوں نے آگے بڑھ کر ایک جھٹکے سے اسے اپنی طرف موڑا۔
"مجھے سچ سچ بتاؤ شامیر! یہاں کیا ہو رہا ہے؟ وہ لڑکی جو کچھ کہہ رہی ہے ناں...." ان کا لہجہ اندیشوں سے لبریز تھا، ایسے جیسے وہ کسی نہ کسی راز سے واقف ہوں۔
شامیر لحظہ بھر کے لیے سٹپٹا گیا۔ پھر جلدی سے خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ "ایک ذرا سا مذاق کر دیا تھا اس سے، وہ سچ سمجھ بیٹھی۔"
"اس کا مطلب.... تم تم ایک بار پھر ان ہی حرکتوں میں پڑ گئے ہو۔" وہ بوکھلا ہی گئی تھیں۔
"چودہ سال کی عمر میں غلط صحبت نے تمہیں اس اوٹ پٹانگ شوق میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں نے کتنی مشکلوں سے تمہیں ان مصائب سے نکالا تھا۔" وہ سر پکڑے بولتی جا رہی تھیں۔
شامیر بے زاری سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔
"مجھے کیا پتا تھا.... تم ایک بار پھر۔"
"فار گاڈ سیک ماما! یہ میلو ڈراما بند کریں۔" وہ چڑ کر بولا تھا۔
"ہاں ٹھیک ہے یہ میرے ٹین ایج کے شوق ہیں۔ لیکن اس میں برائی کیا ہے آخر۔ میں وہ دنیا ایکسپلور کرنا چاہتا ہوں جہاں میرے اور آپ کے جیسے انسان نہیں رہتے.... آپ کیوں بار بار میرے راستے کی دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔"
"کیونکہ تمہارے یہ شوق پہلے بھی ایک انسان کی جان لیتے لیتے رہ گئے تھے.... تم سمجھتے کیوں نہیں ہو۔ یہ واہیات قسم کے سفلی عملیات انسانوں کو کچھ نہیں دے سکتے۔"
"آہستہ بولیں.... آپ میرا سارا پلان خراب کریں گی۔" وہ جھلا کر بولا تھا۔

"میں نے یہاں آپ کو ماہ نور سے اپنا رشتہ طے کرنے کے لیے بلایا تھا... اس لیے نہیں کہ آپ میرے لیے مزید مشکلات کھڑی کر کے چلی جائیں۔"
"ایسے نہیں جاؤں گی... اب تمہیں میرے ساتھ جانا ہوگا۔" وہ دوٹوک بولی تھیں۔
"یہ ناممکن ہے۔" وہ بھی اسی انداز میں بولا۔
"جب تک میں اپنا مقصد حاصل نہیں کر لیتا تب تک تو ہرگز نہیں جاؤں گا۔"
"اور وہ مقصد کیا ہے؟ خوش نصیب کو نقصان پہنچانا؟" انہوں نے طنز سے پوچھا۔ شامیر انہیں بے بسی سے دیکھنے لگا۔
"میں دنیا کے بڑے سے بڑے مائنڈ ریڈر کو مات دے سکتا ہوں... لیکن آپ کو کیسے پتا چل جاتا ہے کہ میں میرے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔" اس کی بے بسی میں جھلاہٹ نظر آ رہی تھی۔
"ماں ہوں تمہاری۔ تمہارے ایک ایک انداز سے واقف ہوں۔ بس پتا نہیں کیوں کبھی کبھی کچھ زیادہ ہی خوش گمان ہو جاتی ہوں تمہارے بارے میں۔ اب چلو میرے ساتھ اور سب کو اصل بات بتاؤ۔" وہ تحکم سے بولی تھیں۔
شامیر نے جھلا کر انہیں دیکھا۔
"میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"
"اگر تم نہیں بتاؤ گے تو میں بتا دوں گی۔" انہوں نے ناراضی سے دھمکی دی۔ "تمہیں اللہ کو منہ دکھانے کی فکر نہیں ہے کیونکہ تم تو اپنے ضمیر کو اپنے شوق کے ہاتھوں مار ہی چکے ہو۔ لیکن مجھے اللہ کو حساب دینا ہے اور میں کسی بے قصور کو لعنت ملامت سہتے بھی نہیں دیکھ سکتی۔"
"پتا نہیں وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب میں نے آپ کو یہاں بلانے کا سوچا۔" وہ چڑ کر بولا تھا۔
"اس گھڑی کو بعد میں کوس لینا... ابھی چلو میرے ساتھ۔"
"ہرگز نہیں... اگر آپ نے کسی کو کچھ بھی بتایا تو... تو میں اپنی شہ رگ کاٹ لوں گا۔"
فاطمہ بیگم کا غصے سے برا حال ہو گیا۔
"اگر ایسی بات ہے تو ٹھیک ہے تم بھی میری قسم کھاؤ کہ اس لڑکی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گے نہ اس پر کوئی عمل کرنے کی کوشش کرو گے۔"
"ماما! فار گاڈ سیک..."
"کھاؤ قسم..." انہوں نے شامیر کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھ لیا اور وہ فراڈ انسان ماں کی قسم کے سامنے وقتی طور پر ہار مان گیا تھا لیکن اس کا غصے سے برا حال تھا۔
"ٹھیک ہے صرف آپ کی خاطر... میں اسے چھوڑ رہا ہوں۔" اس نے جیسے بصد مجبوری ان کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تھا اور دل میں سوچا تھا۔
عمل نہیں کروں گا کوئی۔ لیکن جو اس نے میری انسلٹ کی ہے اس کا بدلہ تو ضرور لوں گا۔ ذلیل و خوار تو خوش نصیب کو ہونا ہی پڑے گا۔



بڑا کمرہ واقعی کمرہ عدالت بنا ہوا تھا۔
تایا جان کرسی پر بیٹھے دانت بھینچے ماتھے پر بل ڈالے جیسے اپنا غصہ کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شفیق چچا جان نہایت غیر شفیق موڈ میں غصے سے مٹھیاں بھینچے کمرے میں ادھر ادھر چکر لگا رہے تھے۔ صباحت تائی جان

فکر مندی سے لیکن چپ چاپ ایک کرسی پر بیٹھی سب کے چہرے دیکھ رہی تھیں۔ جبکہ فضیلہ بیگم غصے سے بھری ہوئی ایک طرف کھڑی تھیں۔

"میں نے پہلے ہی ہزار بار کہا تھا اس لڑکی کو قابو کرلو... لیکن کسی نے میری سنی ہی نہیں۔ اب دیکھ لیں میری کہی ہوئی بات ہی درست ثابت ہو رہی ہے۔ کٹوادی نا سارے خاندان کی ناک۔ اس کرموں جلی خوش نصیب نے۔"

"خدا کے لیے تم تو چپ کر جاؤ فضیلہ! ایک تو پہلے ہی دماغ غصے سے کھول رہا ہے اوپر سے تم جب سے کمرے میں آئی ہو بولے چلے جا رہی ہو۔" شفیق صاحب کچھ زیادہ ہی غصے میں تھے کہ اپنی نازوں والی بیگم کو بھی ڈپٹ کر رکھ دیا۔

جواباً" فضیلہ بیگم نے انہیں غضب ناک نظروں سے گھورا اور تنک کر بولیں۔ "کیوں چپ کروں میں؟ فاطمہ اور شامیر میرے مہمان ہیں۔ ان کی بے عزتی میری بے عزتی ہے... لیکن آپ کو کیا فرق پڑتا ہے... یہ کارنامہ آپ کی پیاری بھتیجی نے جو انجام دیا ہے... اگر جو میری صیام یا منہا میں سے کسی نے ایسی جرأت کی ہوتی تو اب تک پڑی اپنے کندھے سینک رہی ہوتیں۔"

"خیر اب ایسی بھی قیامت نہیں ٹوٹی کہ مار پیٹ کی نوبت ہی آجائے۔" صباحت تائی جان نے بے ساختہ لیکن دھیمی آواز میں کہا تھا۔

"مار پیٹ تو بہت دور کی بات ہے بھابھی جان! مجھے اپنی بیٹیوں میں سے کسی کی ایسی حرکت کا پتا چل جاتا تو... قسم کھا کر کہتی ہوں... اپنے ہاتھوں سے ان کا گلا گھونٹ دیتی لیکن روشن کی طرح بے غیرت بن کر آنسو نہ بہاتی۔" جوش جذبات میں وہ کچھ زیادہ ہی بڑا دعویٰ کر رہی تھیں اور کچھ اس ٹون میں کہ صباحت بیگم تو کہہ کر پچھتائیں۔

صابر احمد نے... جو اب تک چپ بیٹھے تھے گلا کھنکھار کر سب کو اپنی طرف متوجہ کیا اور سنجیدگی سے بولے۔
"جو بھی ہوا... مجھے اس کا افسوس ہے گھر آئے مہمان کی بے عزتی تو ہرگز برداشت نہیں کی جا سکتی۔"
ابھی وہ یہیں تک پہنچے تھے کہ فضیلہ بیگم تنک کر بولیں۔ "بلائیں پھر ان ماں بیٹیوں کو... اور سنا دیجیے سزا... خاندان کی سربراہی کی ذمہ داری آپ کے کندھوں پر ہے بھائی صاحب! میں چاہتی ہوں آپ خوش نصیب کو ایسی سزا دیں کہ اگلی بار وہ ایسی حرکت کرتے سو بار سوچے... اور ہاں... فاطمہ اور شامیر سے معافی بھی منگوانا ہوگی۔" یہ آخری جملہ بھی لگے ہاتھوں کہہ ڈالا تھا کہ کہیں کچھ رہ ہی نہ جائے۔
"او خدا کی بندی! تم بھائی صاحب کو ان کی بات تو پوری کر لینے دو۔" شفیق صاحب ایک بار پھر چڑ کر بولے تھے۔
فضیلہ بیگم نے بدمزہ سی ہو کر سر جھٹکا۔ وہیں صابر صاحب نے بھی سر جھٹک کر بات کو وہیں فل اسٹاپ لگا دیا تھا۔

"روشن اور خوش نصیب کو آلینے دو... میں سننا چاہتا ہوں خوش نصیب نے یہ سب کیوں کیا۔"
"لو اور سنو..." فضیلہ بیگم مضحکہ اڑا کر بولیں۔
"بس اب اسی بات کی کمی رہ گئی تھی کہ ان محترمہ سے بھی پوچھ گچھ ہوگی... میں نے کئی بار کہا ہے اسے ذہنی مریضوں کے ڈاکٹر کو دکھا لو... لیکن میری کوئی سنتا کہاں ہے۔"
اسی لمحے شرمندہ شرمندہ سی روشن آرا اور خوش نصیب اندر داخل ہوئیں تو فضیلہ بیگم بولیں۔
"لیجیے... تشریف لے آئی ہیں شہزادی صاحبہ! کسی بات کا صحیح جواب مل جائے تو مجھے بھی بتا دیجیے گا۔"

ان کا لہجہ طنز اور غصے میں ڈوبا ہوا تھا۔ روشن آرا پر از سر نو شرم ساری اتری۔

"اس کی طرف سے میں معافی مانگتی ہوں فضیلہ...!" انہوں نے جلدی سے کہا تھا۔
"ارے بس اب رہنے ہی دو روشن! کئی بار اپنی اس بیٹی کی وجہ سے تم معافیاں مانگ چکی ہو... لیکن میں بتا رہی ہوں اس بار میں ہرگز معاف نہیں کروں گی... اب تو یہ خوش نصیب اپنی ناک سے لکیریں بھی کھینچ لے تو میں معاف کرنے والی نہیں ہوں... ہاں۔"
بڑے بھائی کی موجودگی میں بیوی کی فر فر چلتی ہوئی زبان شفیق صاحب کو مسلسل شرمندگی اور غصے میں مبتلا کر رہی تھی۔ ان کے آنکھوں آنکھوں میں کیے گئے اشارے بھی بے کار ہی جا رہے تھے کیونکہ فضیلہ بیگم بولتے ہوئے کسی کی بھی طرف دیکھنے کی روادار نہ تھیں۔ دروازہ جو روشن آرا اور خوش نصیب کے اندر آتے ہوئے ادھ کھلا سا رہ گیا تھا اس کی اوٹ میں فہمینہ اور منہا آکر کھڑی ہو گئیں۔ ان کے پیچھے کیف اور طوطا بھائی تھے۔ سب ہی جیسے کان لگا کر سننے کی کوشش کر رہے تھے کہ اندر معاملہ کیا چل رہا ہے۔
"روشن امی! آپ کو کسی سے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے اور فضیلہ چچی! ناک سے لکیریں نکالنا تو بہت دور کی بات ہے میں تو معافی کا لفظ اپنی زبان پر بھی نہیں آنے دوں گی۔" وہ دوٹوک انداز میں بولی تھی۔
روشن آرا کا دل چاہا ایک زوردار تھپڑ ہی اسے کھینچ ماریں لیکن ہاتھ اٹھا بھی تو اپنا ہی سر پیٹ لینے کے لیے۔
دوسری جانب تمام اہل خانہ خوش نصیب کی ڈھٹائی پر ہکا بکا ہی رہ گئے تھے۔ تایا جان تو بالکل ہی غصے میں آ گئے۔ سب جانتے تھے انہیں غصہ کم آتا تھا لیکن جب آتا تھا تو بڑا خطرناک ثابت ہوتا تھا۔
"میں تمہیں کتنا سمجھا کر لائی ہوں خوش نصیب! تھوڑا تو ماں کا بھرم رکھ لو۔" روشن آرا منت سے بولی تھیں۔
"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں روشن امی! اس گھر کے ہر فرد کو میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں نے آپ لوگوں کی بیٹیوں کی جانیں بچائی ہیں... اس فراڈیئے کی اصلیت سامنے لا کر رکھی ہے... اور آپ سب لوگ مجھے ہی کوس رہے ہیں۔"
اپنی بات پر زور دے کر بولی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ حق پر ہونے کے باوجود خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑ رہا تھا۔
"ثبوت ہے تمہارے پاس؟" تایا جان نے ایک دم سے بڑی سنجیدگی (ایسی سنجیدگی جس سے غصہ جھلک رہا ہوتا ہے) سے پوچھا تھا ان کی آواز میں کچھ ایسا تھا کہ خوش نصیب کا سانس ہی خشک ہو گیا۔
"جی؟" اس نے مری ہوئی آواز میں پوچھا۔
"میں نے پوچھا ثبوت ہے تمہارے پاس؟" وہ غرائے۔ ان کی آنکھیں غیظ سے لال ہو رہی تھیں۔
خوش نصیب کے ہاتھ پیر کانپنے لگے۔ "ج... جی نہیں... لل... لیکن میں سچ کہہ رہی ہوں تایا جان!"
"یہ بات تو شامیر بھی کہہ رہا ہے۔ اپنی بات کی سچائی کا ثبوت بھی ہے اس کے پاس... بلکہ صیام نے تو اس کی بات کی تصدیق کر بھی دی ہے اس حساب سے تو تم ہی غلط ٹھہرتی ہو۔"
خوش نصیب کو ایسا لگا جیسے اس کے سر پر کسی نے الزام کا ایک وزنی پتھر رکھ دیا ہو۔ اسے یہ مان تھا اس سے لاکھ پرخاش سہی۔ مشکل کی اس گھڑی میں اس کا سارا خاندان اس کے ساتھ ہی کھڑا ہو گا لیکن یہاں اس سے ہی جواب طلبی شروع ہو گئی تھی۔
"دو دن ہیں تمہارے پاس۔ یا تو شامیر کے خلاف ثبوت لے کر آؤ... یا پھر اپنی غلطی کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اب تک میں تمہاری غلطیوں کو نظرانداز کرتا رہا ہوں... لیکن اب مزید نہیں کر سکتا... سن لیا ناں تم نے؟"
ن کا فیصلہ کن لہجہ کمرے کی دیواروں سے ٹکراتا باہر نکل گیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

# میراث

آسیہ رزاقی

لطیفے تو سب کی زندگی میں رونما ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ اسے لطیفہ نہ سمجھا جائے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ کوئی نہ کوئی لطیفہ سرزد ہو ہی جاتا ہے۔ اصل میں لطیفے اس طرح تشکیل پاتے ہیں۔ کہ واردات کسی پر گزرتی ہے۔ اور اسے گل پھندنے لگا کر لطیفہ کوئی اور بنا دیتا ہے۔ یا بنا لیتا ہے۔ پہلے زمانے میں قصہ گو حضرات ہوا کرتے تھے۔ وہ کسی چھوٹے سے واقعے کو بڑھا چڑھا کر محفل میں سنا کر داد وصول کرتے تھے۔ پھر وہ قصہ کہانی ترقی کرتی جاتی۔ اگر آپ نے ان سے کوئی قصہ سنا ہے۔ چوتھی پانچویں بار پھر ان ہی سے وہی واقعہ قصہ طولانی سن کر حیران ہوں گے۔ وہ قصہ بڑھتے بڑھتے ہزار داستان کا روپ اختیار کر چکا ہو گا۔

کچھ عرصہ گزرا۔ ہمارے بھائی سعدی (اللہ مغفرت کرے) امی کے ساتھ برائے سمجھوتا ٹرین [illegible] روانہ ہوئے۔ گاڑی امرتسر سے گزر گئی۔ سعدی کھڑکی سے لگے بیٹھے تھے۔ باہر مناظر بہت خوب صورت دیکھے۔ بالکل لاہور جیسے مگر ایک فرق ضرور نظر آیا۔ جابجا سور گھوم رہے تھے۔

انہوں نے امی سے کہا۔ "امی! یہاں کے سارے کتے چوہوں کی شکل کے کیوں ہیں۔"

وہ دن آج کا دن ہم لوگ اس ناپاک جانور کا نام لینے کے بجائے۔ وقت ضرورت 'انہیں' چوہوں کی شکل کے کتے کہہ دیتے ہیں۔ گو کہ یہ بھی ان جانوروں کی توہین ہو گی۔ پھر رات آ گئی۔ مارے شوق کے صبح سویرے اٹھ گئے۔ اور باہر جھانکنے لگے۔ ملگجا اجالا تھا۔ ٹرین دیہی علاقے سے گزر رہی تھی۔ کھیتوں میں



تھوڑے فاصلے سے مخلوق بیٹھی نظر آئی۔ سب کی پیٹھ ٹرین کی جانب تھی۔ مارے جوش کے سوئی ہوئی امی کو جگایا اور کھڑکی سے جھانکنے پر مجبور کرنے لگے۔

"امی دیکھیں۔ ایک دو نہیں۔ یہاں تو بے شمار بندر ہیں۔"

سن چکے تھے کہ انڈیا میں بندر بہت ہوتے ہیں۔

مخلوق خدا کو بندر سمجھ بیٹھے۔ وہ بے چارے لوگ۔ جو بوجوہ کھیتوں میں منہ اندھیرے رفع حاجت کے لیے آتے تھے۔

ہمارے ایک چھوٹے بھائی ہیں نجمی۔ وہ امی کے ساتھ کسی کے گھر ملنے گئے۔ باتوں کے سلسلے ختم ہوئے۔ تو وہ خاتون خانہ مہمانوں کی خاطر مدارات کا انتظام کرنے کے لیے کچن میں گئیں۔ ازراہ تجسس نجمی صاحب ان کے پیچھے ہولیے۔ عادتاً "معلومات کا حصول"۔۔۔ پھر کچھ دیر بعد آکر امی کے کان میں سرگوشی کرنے لگے "امی وہاں تو کوئی پیالی نہیں سب دودھ دانیاں ہیں۔ ہم چائے کیسے پئیں گے۔" سرگوشی خاصی بلند تھی۔

خاتون خانہ کی بیٹی جو مہمانوں کو کمپنی دے رہی تھیں۔ جھینپ گئیں۔ بولیں۔ "ارے، ارے پیالیاں بھی ہیں۔ چینی کی۔ اصل میں پلاسٹک کی پیالیاں سستی مل رہی تھیں۔ ہمیں اندازہ نہ تھا۔ ساری کمبخت پیالیاں چولھے کے پاس رکھنے کی وجہ سے ایک سائڈ سے پگھل گئیں۔ تو چونچ سی نکل آئی۔ امی ہم بہنوں پر اس بات پر بہت خفا ہوئیں۔"

شروع شروع میں جب پلاسٹک کے برتن بازار میں آئے نت نئے رنگوں اور ڈیزائن کے سبب بہت پسند آئے نا تجربے کاری۔ بے احتیاطی کے سبب اکثر پلیٹیں بھی پگھل کر مضحکہ خیز شکل اختیار کر لیتی تھیں۔ گھریلو خواتین کو یہ بات سمجھانا چاہیے۔ ہر آگ گرم ہوتی ہے۔ گیس کی ہو۔ لکڑی یا کوئلے کی۔ یا جہنم کی۔ ہر چیز پگھلا دیتی ہے۔

دنیاوی آگوں میں گیس کی آگ سب سے زیادہ گرم ہوتی ہے۔ تجربہ جو کھانا لکڑی یا کوئلے کی آگ پر ایک گھنٹے میں تیار ہوتا ہے۔ گیس کی آگ پندرہ منٹ لے گی۔ سب تیار۔ کوئلے کی انگیٹھی پر کھانا پکایا جاتا تھا۔ اب انگیٹھی کے پاس پیالیاں رکھی رہتی تھیں۔ کبھی نہیں پگھلیں۔ گیس کے چولھے نے سب پیالیوں کی دودھ دانیاں بنادیں۔ یہ تجربہ ان صاحبہ کا تھا جہاں یہ کارنامہ وقوع پذیر ہوا تھا۔ پیالی کی دودھ دانی بنانے کا (ایک پنتھ دو کاج نہیں؟)

گیس کے بڑے چولھے۔ یعنی جسے اوون کہا جاتا ہے اور جس میں کئی چولھے ہوتے ہیں۔ ماچس کی بچت کی خاطر۔ درمیان میں ذرا سی ایک تیلی جتنی پتلی چمنی ہوتی ہے اسے پائلٹ کا نام دیا گیا ہے۔ اس کو ایک بار ماچس یا لائٹر سے روشن کریں۔ جلتا رہے گا چراغ کی مانند۔ اس کے ہاتھ پاؤں بلکہ آنتیں بھی اندر ہی اندر پھیلی ہوتی ہیں۔ تاکہ حسب ضرورت اس کا بٹن دبا کر اس کے شعلے سے دوسرے چولھے روشن کر لیے جائیں۔

پرانے زمانے کی بڑی بوڑھیاں۔ رات کو اسے غیر ضروری سمجھ کر پھونک مار کر بجھانے کی ایکسپرٹ تھیں۔ "خواہ مخواہ جل رہا تھا۔" (یوں بھی پائلٹ کو رات میں کھلا رکھنے میں نقصان ہو سکتا ہے۔ صبح کی ایک تیلی بچانے کے لیے رات بھر گیس کا ننھا شعلہ جلتے رکھنا۔ غیر ضروری ہے۔ اندیشہ الگ۔) بھئی اس پائلٹ کا ایک کان مروڑ کر اسے بند کر دو۔ (کیسا پائلٹ ہے۔ جو کان مروڑنے پر اپنی افادیت کھو دیتا ہے۔)

ہمارے ایک عزیز ہیں۔ وہ ایئرلائن میں پائلٹ ہیں۔

انہیں بہت شکوہ ہے کہ چولھے کے اس ننھے سے شعلے کو پائلٹ کس نے بنایا۔ یہ نام کس نے رکھا۔ دراصل تو انہیں اعتراض یہی ہے کہ اسے کان مروڑ کر بند کرنے والا محاورہ کس نے دیا۔ ارے بھئی پہلے زمانے کے لوگ ریڈیو کی ناب کو یہی کہتے تھے۔ کان مروڑ کر بند کر دیا۔ اسٹیشن تبدیل کرنا ہو۔ تو۔

"ارے بھئی بیچ والا کان مروڑ کر ادھر ادھر گھماؤ۔ کوئی دوسرا اسٹیشن لگاؤ۔ یہاں تو نری بوریت"، اچھا

بھئی، ہمیں تو ریڈیو یا ٹی وی کے چینل کو اسٹیشن کہنے پر بھی ہنسی آتی ہے لطیفہ ہی ہے۔ دراصل پچھلے زمانے کے لوگ تبدیلی کے خوگر نہ تھے۔ جو ہے، جس طرح ہے۔ جہاں ہے۔ بس وہی درست ہے۔ نام بدلنے سے معنی تو نہیں بدلتے۔ نہ تقدیر بدلتی ہے تو پھر کیا حاصل؟

ہمارے ایک عزیز ہیں۔ جو عرصہ دراز سے پاکستان میں ہیں۔ لیکن اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے انڈیا جاتے ہیں۔ تقریباً" ہر پانچ سال بعد وہ انتہائی ذوق و شوق کے عالم میں انڈیا کا سفر کرتے ہیں۔ شروع میں تو کافی عرصہ جا نہ سکے تھے۔ پھر ایک بار گئے تو انہیں لطف آیا۔ رشتے دار 'عزیز' پڑوسی 'سمدھیانے۔ (نہ جانے کس کس کے) ان سے ملنے آتے۔ ہر بار بے حد تپاک اور گرم جوشی کا مظاہرہ ہوتا۔ پاکستانی ہونا سب کے لیے بے حد خوشی کا بلکہ اعلیٰ وارفع ہستی کے لیے تعظیم و تکریم کا متقاضی تھا۔ "عزت ماب 'اعلیٰ مرتبت 'حضور عالی۔" کہنے کی تو نوبت نہ آتی۔ مگر سلوک ویسا ہی ہوتا۔ جیسے کوئی بادشاہ کے دربار میں آئے ہیں۔

ہمارے عزیز ان لوگوں کے اس طرز عمل سے شرمندہ ہوتے۔ مگر ان لوگوں کی قدر و عزت بھی کرتے۔ وہ واپس آکر ہم لوگوں کو وہاں کے قصے سنایا کرتے۔

"اتنے اچھے لوگ۔ خوش اخلاق اور محبت کرنے والے ..... صاحب عزت کرنا تو کوئی انڈیا والوں سے سیکھے۔ صاحب یہاں تو کوئی سیدھے منہ بات نہیں کرتا اور وہاں..... واہ واہ..... واہ۔"

وہ لوگ واقعی سادہ لوگ ہیں۔ یہ ہم نے مان لیا۔ مہمان کی پذیرائی کسی اعلیٰ مرتبت شہزادے کی طرح کرنے والے واقعی قابل قدر ہوتے ہیں۔

پھر باتوں باتوں میں انہوں نے اس گھر کا نقشہ بیان کیا۔ "بہت وسیع و عریض حویلی۔ فراخ صحن۔ گول ستونوں والے برآمدے تقریباً" سب رشتے داروں کے گھر خوب فراغ اور پرانے نقشوں کے بنے ہوئے تھے۔ ہمارے عزیز بھی ان ہی گھروں میں رہتے تھے مگر پاکستان بنا تو ان کے والدین یہاں آگئے۔ وہ اپنا بچپن جو وہاں گزارا تھا۔ بھول چکے تھے۔ اس لیے یہاں کے گھر سے تقابل کرتے ہوئے افسردہ ہو جاتے۔ چونکہ وہاں بقیہ عزیز موجود تھے۔ تو ان کے والد نے یہاں کلیم نہیں کیا۔ چند سال بعد کسی طور ایک مختصر سا گھر بنا سکے۔ اور گوکہ وہ مناسب ہی تھا۔ مگر حویلیوں کا مقابلہ بھلا کیسے ممکن ہے۔

گو کہ حویلی والوں کی طرز رہائش۔ رہن سہن بہت ہی عامیانہ تھا۔ ان کے چچا جو اس حویلی میں رہائش پذیر تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ ایک ڈاکٹر دوسرا انجینئر۔ خاصی اچھی کمائی تھی لیکن رہن سہن عام سا تھا۔ کم خرچ بالانشیں۔ برآمدے میں ایک لکڑی کی چوکی تھی ..... کونے میں نعمت خانہ (جی فریج نہیں) گھڑونچی پر گھڑے۔ حسب ضرورت موسم کے لحاظ سے گرمی میں گھڑونچی صحن میں پہنچادی جاتی۔ شام کو۔ صبح کو واپس اپنے مقام پر۔ صرف گھڑونچی کو ہلنے جلنے کی اجازت تھی۔ حسب ضرورت۔ ورنہ ان کے تین یا چار کے انڈیا یاترا کے سفر میں۔ جو چوکی جہاں تھی۔ وہیں رہی ہر بار اب آخری بار انہوں نے اس چوکی کے پیروں میں دو انچ مٹی کی تہہ دیکھی۔ اس سے پہلے مٹی شاید ایک انچ کی پایوں میں منڈھی تھی۔ اب اس میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ان کا اپنا خیال تھا کہ شاید کبھی..... کبھی دیمک ان پایوں میں لگ گئی۔ تو حضرت سلمان کے عصا کی طرح وہ..... دھڑام سے گر کر.....

اس چوکی کے بہت فائدے تھے۔ اس پر نماز پڑھی جاتی تھی۔ دستر خوان بچھا کر کھانا چن دیا جاتا گھر والے پیڑھیوں پر بیٹھ کر تناول فرمالیتے۔ دن میں وہ چوکی بڑی بوڑھیوں کی نشست گاہ ہوتی۔ حالات حاضرہ پر تبصرہ 'پان کھانے کا مقابلہ۔ اور کچھ اعتراضات نصیحتیں وغیرہ وغیرہ۔ ایک پنتھ دو کاج نہیں۔ بلکہ کئی بلکہ بے شمار کاج اس چوکی کو تفویض کیے گئے تھے۔ بس ایک خطرہ صرف ہمارے پاکستانی عزیز کو لاحق تھا۔ اگر حضرت سلیمان کے عصا کی طرح۔ چوکی کے پائے۔ دیمک نے کھالیے۔ تو..... اور اگر ——— بڑی

بوڑھیاں اس وقت اس چوکی پر براجمان ہوئیں۔ تب ان خواتین کو یقیناً" اس چوکی کی ناپائیداری پر غصہ ہو گا جو ایک لیکچر کی صورت میں حاضرین کو سننا پڑے گا۔

اور... سب سے بڑا نقصان یقیناً" پاندان کے کتھا چونا چھالیہ تمباکو کے گڈمڈ ہو کر ملیا میٹ ہونے پر جو صدمہ سہنا ہو گا۔ اس کی عیادت زخموں پر نمک بلکہ مرچ چھڑکنے کے مترادف ہونے کا احتمال ہے۔ کیونکہ

پاندان کی حاضر اشیا کے بارے میں خواتین انتہائی جذباتی ہو جاتی ہیں۔ اپنے جسمانی زخموں چوٹوں کی پروا کیے بغیر مرثیہ برائے کتھا چونا شروع ہو سکتا ہے۔

نعمت خانہ بے چارہ۔ اپنی قسمت پر صابر و شاکر۔ یوں بھی اس میں کوئی قابل ذکر گیلی چیز... سالن دال وغیرہ رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ دوپہر کو سالن دال اگر بچ گیا۔ اسے پیالے میں ڈال کر برآمدے کے درمیان ستونوں کے بیچ میں چھینکے میں رکھا جاتا۔ جی ہاں پھر رات کو نئے کھانے کے ساتھ اسے بھی گرم کر کے دسترخوان پر رکھ دیا جاتا۔ رات کو بچا ہوا کھانا پکانے والی کے حوالے۔ وہ گھر لے جاتی۔ باسی کھانا (ہمارے گھروں کی طرح فریج کا رکھا ہوا) کھانے کا رواج نہ تھا۔ یہ اچھی روایت ہے۔ مگر وہاں بھی قصباتی زندگی تک محدود ہے۔

شہروں میں گھروں میں فریج بھی ہوتے ہیں۔ ڈائننگ ٹیبل وغیرہ بھی۔ اندازہ یہ ہی ہے کہ فریج فریزر کے رکھے ہوئے باسی تباسی کھانا کھانے سے لوگوں کو بیماریاں بھی ہو جاتی ہیں۔ تازہ کھانا۔ صحت مند ہوتا ہے۔ یہ ثبوت ہے۔ وہاں لوگ ہمارے عزیز کے مشاہدے کے مطابق۔ نوے سال تجاوز کر چکے تھے۔ ایک نانی۔ چشم بد دور۔ ننانوے عبور کر چکی تھیں۔ اچھی بھلی۔ کمر پر ہاتھ رکھے صحن میں چہل قدمی کرتیں۔ دور کی نظر بھی قابل رشک تھی۔ قرآن شریف پڑھنے کے لیے عینک لگاتیں۔ ایک بانوے سالہ نانا جان۔ کبھی کبھی ٹخنہ پکڑ کر بیٹھے ہوتے۔

"کمال ہے۔" وہ ہمارے عزیز کو مخاطب کرتے۔ "نوے سال میں کبھی ٹخنے میں درد نہیں ہوا۔ اب کچھ دن سے۔ بھئی بازار جانا مشکل ہو گیا ہے۔ واپسی میں درد شروع ہو جاتا ہے۔ پتا نہیں کیا وجہ ہے۔ زیتون کی مالش کرا لوں؟؟"

ہائے معصوم نانا جان۔

خیر یہ واقعہ سنانے کا مقصد اس کو لطیفہ شمار کرنا ہرگز نہیں۔ اور یہ کہ گھر میں صفائی بھی پابندی سے روز ہوتی تھی۔ لیکن تبدیلی کے لیے کوئی راضی نہ تھا۔

ہمارے گھروں میں تو ہر ماہ سیٹنگ تبدیل ہوتی ہے۔ سامان اتھل پتھل۔ اکثر ضروری اشیا منظر سے غائب۔ اور خاتون خانہ کا اصرار۔

"اچھا لگ رہا ہے نا... کھلا کھلا۔ دل گھبرا گیا تھا ایک طرح کی سیٹنگ سے۔"

صاحب خانہ دل مسوس کر بلکہ دانت پیس کر تبدیلی کو فیل کر دیتے۔ ان کی چپلیں مخصوص جگہ سے غائب۔ ان کی سائڈ ٹیبل پر رکھا مینا کاری کا خوب صورت پیتل کا گلدان ندارد۔ دراز کے اندر بھی طوفان نظر آتا۔ اف۔ اس کونے میں کھڑا لیمپ۔ ہاں کتنا خوب صورت شیڈ تھا۔ اب وہ ایک ڈنڈے کے روپ میں... بغیر شیڈ کے ننگا کھڑا تھا۔ کیونکہ شیڈ نے بہت جگہ گھیری ہوئی تھی۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ حرکت میں برکت ہے۔ تبدیلی ناگزیر ہے۔

✲ ✲ ✲

تقسیم ہند سے پہلے ہمارے علاقے میں ایک میراثی خاندان رہائش پذیر تھا۔ نام تو ان کے سربراہ کا ضرور کوئی رکھا گیا ہو گا۔ مگر عرف عام میں وہ چوہا بھانڈ کہلاتے تھے۔ گھر گھر جا کر مبارکبادی گاتے۔ یعنی منگنی شادی بچے کی پیدائش کہیں سن گن مل جائے۔ چوہا بھانڈ اپنی کمپنی کے ساتھ ڈفلی بجاتے دروازے پر موجود۔ ہر خوشی کے موقعے پر اس کی مناسبت سے گانے۔ دعائیں، در خواستیں جدا جدا تھیں۔ لطیفے بھی سنا کر خوش کرتے عوام الناس کو۔ آخر میں معاوضہ طلب ہوتا۔ گھر میں موجود مہمان بھی ادائیگی کے پابند تھے۔ قاعدہ ہی یہ تھا۔ کافی مشہور ہستی تھے یہ حضرت

چوہا بھانڈ۔ اور بے حد مصروف بھی۔

پاکستان بنا۔ ہم لوگ پاکستان آگئے۔ انہوں نے بالآخر ہمارے خاندان کے لوگوں کو تلاش کرلیا۔ آگئے ایک دن۔ ابا باہر کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ آتے ہی گھٹنے چھوئے۔ پیر چھونے کو جھکے تو ابا نے اٹھالیا۔ تو بغلگیر ہو گئے۔ آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ چند خوشامدانہ الفاظ۔

"آپ ہی تو ہمارے ججمان ہیں۔ ہمیشہ آپ کا نمک کھایا۔ آپ کی اترن پہنی۔ آئندہ بھی آپ کی خدمت کریں گے وغیرہ۔

خدمت؟ خیر بھئی دعائیں بھی تو دے رہے تھے۔ ہمارے ہاں سے ان کی فرمائش پوری ہو گئی تو دوسرے چچا کے گھر گئے۔ دوسرے لوگوں کے بارے میں معلومات لیں اور دونوں گھروں سے بکس بھر کپڑے جیب بھر کر نوٹ لیے۔ پھر دوسروں کی تلاش میں چل دیے۔ آئندہ خدمت کرتے رہنے کا اعادہ پھر وہ باقاعدہ ہر خوشی کے موقع پر آنے لگے۔ انعامات وصول کرتے دعاؤں کا احسان لاد کر چل دیتے۔

ہمارے چچا ابا ایک مزدور لیڈر تھے۔ کئی بار اپنی شعلہ فشاں تقریروں کے انعام میں جیل جاچکے تھے۔ پاکستان بنا تب بھی جیل میں تھے۔ کئی سال کی جیل بھگت کر پاکستان آئے۔ آتے ہی انہوں نے سب کے کلیم کروائے۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر مہاجرین کے لیے گھر زمین، کاروبار کی کوششیں کیں۔ واقعی ایک لیڈر کی طرح ان تھک محنت کی۔ کسی مزدور کو ننگے بدن دیکھ کر اپنی قمیص اتار کردے دی۔ فقیر کو سردی میں سکڑتے دیکھا۔ پہنا ہوا سوئٹر اس کے حوالے کیا۔ کسی کو کمبل دے کر آگئے جو سخت سردی کی وجہ سے صبح لپیٹ کر گئے تھے۔ عام خیال یہ تھا کہ اب نوبت یہ آگئی ہے کہ کسی غریب کو اپنا پاجامہ پہنا کر اس کی لنگی لپیٹ کر آجائیں گے۔ بنیان لنگی میں انہیں کوئی پہچانے گا بھی نہیں۔ ممکن ہے کوئی مخیر انہیں ضرورت مند سمجھ کر اپنی قمیص یا لنگی بخش دے۔

یہ ان کی بہت پرانی عادت تھی۔ سب واقف تھے۔

یہاں آکر تو ان کو مواقع بھی بہت ملے۔ بے ٹھکانے لوگوں کو الاٹمنٹ کی کوششیں کر کے گھر دلوائے۔ زمین وغیرہ کے لیے بھی مدد کرتے رہے۔ جب اپنے لیے دفاتر کے چکر لگائے تو پتا چلا کہ ان کی زمین کا کلیم کسی اور نے کر رکھا ہے۔

ہنس کر بیان کیا۔ "لو بیوی ہماری زمین پر کسی اجمل خان نے دعوا کر رکھا ہے۔ اب صبر کرو۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

"سنو میاں!" چچی نے ہاتھ اٹھا کر یاد دلایا۔ "تم اکیلے اس زمین کے مالک نہیں ہو۔ بھائی بہن بھی حصہ دار ہیں۔ ویسے تو وہاں بھی تم بھائیوں نے زمینوں کی خیر خبر کبھی نہیں لی۔ اللہ بھلا کرے منشی فتح محمد کا۔ جو ہر مہینے زمین کی آمدنی لا کر دے جاتا تھا اور پتا نہیں کتنی آمدنی تھی۔" (اور کتنی وہ دیتا تھا) یہ کہا نہیں۔ شک کرنا عورت کا حق ہے۔

"تو باقی وہ اپنا محنتانہ بھی لیتا تھا۔ چلو نہ منشی رہا۔ نہ زمین، مل جاتی تو کون دیکھتا؟ اچھا ہوا۔ جان چھوٹی۔ بس اب کفایت سے کام لینا شروع کر دو۔ بھائیوں کو میں خود سمجھادوں گا۔"

چچا ابا تو شکرادا کر کے لیٹ گئے۔ چچی کے دل کو پنکھے لگ گئے۔ یہ ان کا مخصوص فقرہ تھا۔ کسی بھی فکر پریشانی کا اظہار وہ اسی طرح کرتی تھیں۔ ہائے ہائے میرے دل کو پنکھے لگ گئے۔ اس بار پنکھے زیادہ تیز رفتار تھے۔ ان کے اٹھنے بیٹھنے کے انداز سے ہی پتا چل رہا تھا۔ چلتے چلتے رک جاتیں۔ ٹھٹک کر کچھ کہنے کی کوشش کرتیں۔ پھر چل پڑتیں۔ کسی کام میں۔ بقول ان کے۔ دل نہیں لگ رہا۔ (کیسے لگے؟ پنکھے لگ گئے تھے نا)

چچا ابا اپنے ایک دوست کے کام کے سلسلے میں ملتان گئے۔ دوست کا کوئی کام پھنسا ہوا تھا۔ چچا ابا ہر قسم کی پھانس نکالنے کے ماہر۔ ملتان میں بھی انہیں کئی بے گھر مہاجرین ملے۔ ان کا کام کرنے۔ وہ کمشنر صاحب کے آفس گئے۔ کمشنر صاحب بہت تپاک سے پیش آئے۔ چچا ابا نے مسئلہ پیش کیا۔ اپنے علاقے کا

نام لیا۔ اور بے گھر مہاجرین جو اسی علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی الاٹمنٹ کے لیے بات کی۔ کمشنر صاحب کچھ چونک گئے۔ انہوں نے بتایا۔

"آپ کے علاقے کے ہی ایک صاحب نے چونسٹھ گاؤں کا کلیم کر رکھا ہے۔ عرصے سے تقاضا کر رہے ہیں۔ مگر ہمیں سراغ لگانے میں دشواری ہو رہی ہے۔ یہی سمجھ میں آیا کہ ادھر کا کوئی معزز آدمی گواہی دے دے تو ان کا معاملہ بھی ختم ہو۔ اجمل خان نام ہے۔ آپ غور کریں۔ ویسے وہ صاحب آنے والے ہوں گے۔ آپ ملاقات بھی کرلیں۔"

اسی دوران کمشنر صاحب کے پاس فون آگیا۔ انہیں عجلت میں جانا پڑا۔ معذرت کر کے اور چچا ابا کو اگلے دن کا کہہ کر وہ چلے گئے۔ جاتے جاتے چپراسی سے کہہ گئے "اجمل خان آئیں تو انہیں بٹھانا۔"

چچا ابا نے پوچھ لیا۔ "آپ ان صاحب کا حلیہ بتا سکتے ہیں؟"

"جی بہت خوش لباس، کبھی اجلا سفید چوڑی دار پاجامہ اور شیروانی۔ کبھی علی گڑھ کٹ پاجامہ شیروانی ٹوپی.... بہت مہذب با اخلاق۔ میٹھا لہجہ، سفید ہلکی سی داڑھی ہے۔ دبلے پتلے سانولے سے ہیں۔"

کمشنر صاحب چلے گئے اور چچا ابا غور کرتے رہ گئے۔ اس نام اور حلیے کا کوئی شخص یاد نہ آیا۔ خان؟ خان تو دور دور نہیں تھے۔ سید اور شیخ ہی زمین دار تھے۔ چونسٹھ گاؤں الجھ گئے۔ کمشنر کے جانے کے بعد وہ بھی واپس جانا چاہتے تھے لیکن اس گتھی کو سلجھانا تھا۔ انتظار ہی سہی۔

دس منٹ بعد چپراسی نے مطلع کیا۔ "خان صاحب آگئے ہیں۔"

چچا ابا اس معتبر اور معزز ہستی کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ وہ صاحب اندر داخل ہوئے۔ ادھر ادھر دیکھے بغیر کرسی پر ڈٹ گئے۔

چچا ابا کے منہ سے نکلا "چوبا بھانڈ....؟" دوسری طرف اس معزز ہستی پر جیسے بجلی گری۔ تڑپ کر نظر اٹھائی۔ رنگ اڑ گیا۔ اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ لڑکھڑا کر کرسی پر گرے۔ کرسی الگ گری۔ وہ سنبھل کر آگے آئے۔ چچا ابا کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گھٹنے چھونے کو بڑھے پھر اور جھکے۔ شاید سجدہ ہی کرنا چاہ رہے تھے۔ **گھگھیانے** لگے۔ منہ سے الفاظ نہ نکلے۔ جسمانی کیفیت متزلزل تھی۔ گونگوں کی طرح لا، لا ہی ادا ہوا۔ چچا ابا نے ان کے لرزتے ہاتھوں سے فائل لے لی۔ گرنے والی تھی۔ اس کے اندر کے کاغذات بکھر گئے۔ خیر چچا ابا نے کاغذات جمع کر کے بیٹھ کر پڑھنا شروع کیے۔

"ابے۔ یہ اجمل خان کون ہے؟" ان کے منہ سے تھوک نکلا۔

"میں، میں میں—" فوراً "بکری بن گئے۔" مگر نہیں وہ شیر بن کر آئے۔ اور بلی بن گئے۔

چچا ابا کو اب پتا چلا۔ ان تینوں بھائیوں کی زمین کا کلیم کس نے کیا ہوا تھا۔ اب وہ زمین پر اکڑوں بیٹھ کر ممیانے اور **گھگھیانے** لگے۔ خطاؤں کی معافی۔ زار زار رونا شروع کر دیا۔

"مائی باپ معافی۔" چچا ابا کو افسوس ہو رہا تھا۔ سمجھانے لگے "اس طرح فریب کر کے مستحق لوگوں کا حق غصب کرنا تو ناجائز ہے۔ نہ جانے اس فریب کی وجہ سے کتنے لوگ اپنے حق سے محروم ہو گئے ہیں۔ یہ ملک بہت مشکل سے لاکھوں جانوں کی قربانی کے بعد ملا ہے۔ شہیدوں کا خون قیامت کے دن تمہارا گریبان تھامے گا۔ جواب دے سکو گے؟"

دراصل وہ تو اس گمان میں تھے کہ چچا ابا تو انڈیا سے آئے نہیں۔ بڑے اور چھوٹے بھائی کو زمینوں کا زیادہ علم نہیں.... یہاں تو معاملہ ہی پلٹ گیا۔ اب ان کی خوشامدیں۔ معافیاں۔ کمشنر صاحب کو علم نہ ہو۔ ان کی اصلیت اور حیثیت نہ بتائیں۔ ساتھ جوڑے روتے ہوئے الٹے قدموں دروازے سے نکل گئے۔ اچھا ہوا بے چارے چلے گئے۔ چند منٹ بعد کمشنر صاحب آئے پوچھا۔

"وہ صاحب آئے تھے؟ آپ نے پہچانا....؟"

چچا ابا نے انکار کر دیا۔ کیا کہتے کہ پہچانا بھئی۔ وہ

شیروانی جو انہوں نے زیب تن کی ہوئی تھی۔ میرے چھوٹے بھائی کی تھی۔ جو کرتا پاجامہ پہنا ہوا تھا میرے بیٹے کا تھا۔ چونسٹھ گاؤں سے آمدنی ان کی ضرور بند بھی ہوئی تھی۔ فائل وہیں میز پر رکھ کر واپس آگئے۔ ہنس ہنس کر سب کو قصہ سنایا۔ ملتان میں ہی کئی دن بعد کسی محفل میں کمشنر صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے بتایا۔

''اجمل خان تو پھر آئے ہی نہیں لاپتا ہی ہو گئے۔ ان کی فائل بھی ہم نے ضایع کر دی۔'' تھے شریف آدمی جو ہابھانڈ۔ کسی کا سامنا پھر نہ کیا۔

تقسیم ملک کے وقت ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگ اپنے حق سے محروم ہو گئے۔ جن کے پاس وہاں کچھ نہ تھا انہوں نے مفت میں جائدادیں حاصل کر لیں۔ جعلی کاغذات کی بدولت۔ ایک ہمارے عزیز ہیں۔ وہ بھی کمشنر ہیں۔ وہ اپنی متروکہ جائداد کے عوض یہاں مکان اور زمین حاصل بھی کر چکے تھے۔ کسی نے ان ہی کی جائداد کے لیے کلیم کیا۔ انہوں نے ان صاحب کو سمجھایا۔

''کہ بھائی یہ میری پراپرٹی ہے۔ اور میں نے یہاں کلیم کر دیا تھا۔ مل گئی ہے۔ آپ حد کرتے ہیں۔ بغیر تصدیق نہ جانے کہاں سے یہ کاغذات لے آئے۔''

وہ صاحب حجت کرتے رہے۔ ڈھٹائی۔



ایک دلچسپ واقعہ ہمارے ساتھ پیش آیا۔ ہماری خالہ نے اپنے پوتے کی شادی میں اپنے وطن کی ایک نائن کو بلایا۔ جی' حجام کی بیگم۔ انڈیا میں بھی وہ شادی بیاہ اور بچے کی پیدائش کے موقع پر بلائی جاتی تھیں۔ دلہن کی خدمت کے لیے۔ زچہ کی دیکھ بھال' مالش بچے کو نہلانا وغیرہ ان کے ذمے تھا۔ گھر والی خواتین کے ناخن وغیرہ بھی تراش دیتیں۔ ان کا میاں مردوں لڑکوں کے بال کے علاوہ ناخن کترتا۔ ایڑیاں چکنی کرنے کا فن آزماتا۔ یہ پرانے زمانے کے طریقے تھے۔

خیر بھئی۔ خالہ نے ان نائن کو بلوایا کرایہ بھیج کر۔ دونوں میاں بیوی یہاں بھی سب کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ ہم نے انہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ ہماری دادی کے ہاں بھی نائن آتی تھی۔ اسی قسم کی خدمت کے لیے وہ ہمارے بال دھونے کی خدمت بھی کرتی تھی۔ نہ جانے کن کن مسالوں سے بالوں کو دھوتی اور فخر سے کہتی۔

''میرے بنائے ہوئے مسالوں سے تمہارے اور تمہاری بہن کے بال اتنے گھنے اور لمبے ہوئے ہیں۔ (ہو سکتا ہے) خیر۔

ایک بار ہم اپنے میاں کے ساتھ کسی دوسرے شہر گئے۔ وہاں ایک دعوت میں جانا ہوا۔ ایک صاحبہ کو بہت تجسس ہوا۔ سوالات۔

''بچہ کیوں نہیں ہوا۔ علاج کیوں نہیں کرایا؟؟''

بہت ہمدردی ہو رہی تھی۔ پھر دوسری خاتون نے سرگوشی کی۔

کہ ''ارے بھئی موقعہ اچھا ہے۔ انہیں پیرانی صاحبہ کے پاس لے جائیں۔'' پھر وہ پیرانی صاحبہ کے کمالات معجزات ان کے تعویزوں کے پر اثر ہونے کے حیران کن واقعات سنانے لگیں۔

''بہت پہنچی ہوئی ہیں وہ۔'' یہ ان کی گفتگو کا لب لباب تھا۔ بہت ہی حیرانی ہوئی۔ مارے تجسس کے ہم بھی راضی ہو گئے۔

میاں سے اجازت لے کر ہم اگلے دن ان صاحبہ کے ہمراہ پیرانی صاحب کے آستانے پر پہنچے۔ حویلی نما گھر..... صحن اور برآمدے میں خواتین آتی اور جاتی نظر آئیں..... ہم انتظار گاہ میں جا بیٹھے۔

ہمارے ساتھ آنے والی خاتون نے اپنے تعلقات کی بنا پر ہمارے لیے پہلے ملاقات کرنے کا جواز تلاش کر لیا۔ کہ ''ہمیں کل ہی اپنے شہر جانا ہے۔'' سفارش میں بہت طاقت ہے۔ واقعی۔

ہمیں اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ ایک نوجوان لڑکی نے دروازہ کھولا۔ اندر..... بہت ہی افسانوی بلکہ ڈرامائی ماحول نظر آیا۔ سفید براق چاندنی پر سرخ ریشمی غالیچہ اس کے اوپر مخملی گاؤ تکیے لائن سے لگے ہوئے۔

ان سے ٹیک لگائے محترمہ پیرانی صاحبہ سر جھکائے تسبیح گھما رہی تھیں۔

ہم نے ایک نظر میں انہیں پہچان لیا۔ خالہ کے پوتے کی شادی میں انہوں نے ہمارے ناخن کاٹے تھے۔ چوٹی گوندھی تھی۔ بڑی اسٹائلش قسم کی۔ لڑکی کاغذ پنسل لے کر بیٹھی۔

"ہاں جی۔ آپ کس مسئلے کے لیے تعویذ لینے آئی ہیں۔"

اس کے بعد انہوں نے پیرانی کے تیر بہدف تعویذوں۔ ان کی بزرگی اور روحانی کمالات کی لمبی فہرست سنائی۔ پروپیگنڈا سیکرٹری۔ ہم پیرانی کو گھورتے رہے۔ چند منٹ بعد لڑکی نے کہا۔

"جلدی بتائیں۔ باہر حاجت مندوں کی بھیڑ ہے۔ سب سے نمٹنا ہے۔"

ہاں بھئی یہ سچ تھا۔

"مجھے تعویذ نہیں لینا۔ میں عنایت سے ملنے آئی ہوں۔" ہم نے کہا۔

اب پیرانی نے پہلو اور انداز بدلا۔ سر اور نظر اٹھائی۔ پھر۔۔۔ جیسے اڑتی ہوئی وہ ہم پر آ پڑیں۔ پہلے ہمیں لپٹایا۔ پھر روایتی قسم کی دعائیں دیں۔ "نیک نصیب ہو۔ نیک اولاد ہو وغیرہ۔" پھر بیٹی سے کہا۔ نہ جانے جلدی جلدی کیا کیا ہدایات۔ وہ اچھل کر باہر بھاگی۔

ہم عنایت بی بی کو ڈانٹ ڈپٹ کر باہر آ گئے۔ اف نہایت افسوسناک ملاقات رہی۔ دھوکے دہی کی وارداتوں کی لمبی تفصیل ہے۔ اور اب تو عادی ہو گئے ہیں۔ کچھ دن بعد سنا کہ چوہا بھانڈ فوت ہو گئے۔ سب کو افسوس ہوا۔ واقعی شریف آدمی تھا۔

ہاں بھئی۔ وقت گزر جاتا ہے۔ بات رہ جاتی ہے۔ چوہا بھانڈ اپنی حرکت پر اس قدر شرمندہ تھے کہ پھر شکل نہ دکھائی۔ اعلا ظرفی کسی کی میراث نہیں ہوتی۔ لیکن ایک جاہل میراثی نے اعلیٰ ظرفی کی مثال قائم کر دی۔ جبکہ خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ کئی پڑھے لکھے اعلیٰ خاندان کے لوگوں نے کم ظرفی کے ریکارڈ قائم کیے ہیں۔

چند سال ان کی فوتگی کو ہوئے تھے۔ کہ ایک دن ملازم لڑکے نے آ کر ہماری امی سے کہا۔

"بی بی' آپ سے ملنے کوئی آیا ہے۔ باہر کھڑا ہے۔"

امی نے کہا "نام پوچھ کر آؤ۔" باہر سے گیلری میں منہ ڈال کر آنے والے نے بلند آواز بلکہ کھرج دار آواز میں کہا۔

"چھوٹی بیگم۔ یہ ہم ہیں۔ الائچی دانہ۔"

ہائیں۔ الائچی دانہ؟ آواز اور نام (اگر یہ نام تھا) میں ہرگز مماثلت نہ تھی۔

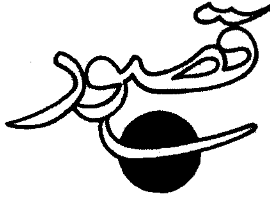
"چھوٹی بیگم۔ ہم ہیں چوہا بھانڈ کے بیٹے۔ ابا جی کی فوتگی کے بعد ہم نے گدی سنبھالی ہے۔ جی اور پہلا کام آپ کے در پر آ کر انجام دیا۔ اللہ آپ کو اور چھوٹے میر صاحب کو سلامت رکھے۔ آپ جیسے ججمانوں کی بدولت ہمارے کنبے پل رہے ہیں۔ کچھ عنایت ہو جائے۔ آپ کی دو بیٹیوں کی شادیوں کی مبارکباد گا کر دیں گے۔ انعام لے کر جائیں گے۔ آپ کے گھر خوشی کے موقعے پر ہم آ نہیں سکے ابا جی کی بیماری کی وجہ سے۔"

الائچی دانہ اپنی بلند بانگ آواز میں شادی میں نہ آنے کی وجہ بیان کر کے۔ مبارک بادی گانے لگے۔ ابھی انہیں بڑے میر صاحب منجھلے میر صاحب یعنی ہمارے دونوں چچا حضرات۔ اور پھر پھوپھیوں کے در دولت پر بھی حاضری دینی تھی۔ انعام وصول کرنا تھا۔ آج پہلی بار علم ہوا۔ بھانڈوں کی میراثیوں کی بھی بادشاہت ہوتی ہے۔ جو نسل در نسل چلتی ہے۔ کل جو باپ تھا۔ اس کے بعد بیٹا گدی کا حق دار۔ پھر پوتا۔

بادشاہت تو ہو گئی ختم۔ اب رہ گئی میراثیوں کی میراث۔ شکر ہے۔ جمہوریت میں ایسا نہیں ہوتا۔ ورنہ وہاں بھی کوئی الائچی دانہ آ جاتا۔ جس کی آواز اور۔۔۔ انداز حکومت میں مماثلت نہ ہوتی۔ مگر مانگنے کے طریقے وہی ہوتے۔ رہے نام اللہ کا۔

☆

## شازیہ جمال طارق



مشکوۃ بیاہ کر بڑی پھپو کے گھر آئی تو اس نے "زبیدہ چچی" کا بڑا چرچا سنا۔ ہوں گی تو وہ اپنے مرحوم میاں صاحب کے بھتیجے بھتیجیوں کی چچی لیکن نجانے ان کی ذات سے ایسا کون سا "چچاپن" جھلکتا کہ محلے کے سبھی چھوٹے بڑے انہیں بلا تکلف "چچی" بلاتے۔

گو کہ عمر نانی 'دادی کہلوانے کی تھی۔ بوٹا سا قد' سرخ و سفید رنگت 'تانبے کے تاروں کی طرح چمکتے بال اور ٹوپی والا سفید برقع!

جی ہاں یہی مشہور زمانہ "برقع" محلے بھر میں ان کی شناخت کی وجہ تسمیہ تھا۔ جسے سر پر ٹکائے وہ دن کے اکثر و بیشتر پہر محلے میں بلا تکلف گشت کرتی پائی جاتیں۔ ایک گھر سے دوسرے 'دوسرے سے تیسرے۔ ان کی معلومات عامہ کی پٹاری ہمہ وقت بھری ہی رہتی۔ یونہی باتوں ہی باتوں میں کبھی ساتھ مٹر چھلوانے لگ جاتیں تو کبھی بالٹی میں پڑے کپڑے نچوڑ کر خود ہی جھٹک جھٹک کر تار پر پھیلانے لگتیں۔

مشکوۃ کو ان کی آمد بہت ناگوار گزرتی۔ وہ انہیں زیادہ منہ لگانا پسند نہیں کرتی تھی۔ جبکہ باتوں کی شوقین پھپو کی ان سے گاڑھی چھنتی۔

پھپو کے ساتھ ہی چولہے پر چوکی گھسیٹ کر بیٹھ جاتیں پھپو باتوں کے دوران توے پر پھلکے ڈالتیں تو وہ اتارتی جاتیں۔

مشکوۃ ناپسندیدگی سے یہ منظر دیکھتی اور ناگواری سے سر جھٹک کر وہاں سے ہٹ جاتی۔ کھانے کا وقت ہوتا تو پھپو بصد اصرار انہیں کھانے پر روک لیتیں اور وہ یقیناً "تینوں وقت کی پیٹ پوجا ایسے ہی گھر گھوم کر خوب ڈٹ کر کر لیا کرتیں۔ شکیلہ ان کی اکلوتی بیٹی شہر سے باہر بیاہی ہوتی تھی۔ صرف سال' چھ مہینے بعد اس کی آمد پر ہی زبیدہ چچی دن رات کے سارے ہی پہر اپنے گھر میں پائی جاتیں۔ ان دنوں نہ تو کسی گلی سے ان کا گزر ہوتا نہ ہی محلے کے کسی گھر میں ان کی آمد کا پتا ملتا۔

شکیلہ کے قیام کے ان دو ہفتوں میں وہ بیٹی سے خوب گپیں لگاتیں 'نواسیوں کے ناز نخرے اٹھاتیں۔ مشکوۃ دل میں سوچتی۔ ایسا احساس انہوں نے کبھی بہو کا تو نہیں کیا جو سارا دن چھوٹے بچے کے ساتھ اکیلی گھر کا کام نپٹاتی ہے۔ اتنا نہیں کہ چھوٹے موٹے کاموں میں بہو کا ہاتھ بٹا دیں یا پھر پوتے کو ہی لے کر گود میں بہلاتی پھسلاتی رہیں۔

"سچ کہتے ہیں 'بہو کبھی بیٹی کی جگہ نہیں لے سکتی۔"

حالانکہ یہ بھی ان کی خوش قسمتی تھی جو انہیں زرنین جیسی سلجھی ہوئی بہو مل گئی۔

پڑھی لکھی 'سلیقہ مند' خوش اخلاق زرنین نے ان کے چھوٹے سے گھر کو جنت کا نمونہ بنا رکھا تھا۔ مشکوۃ تو جب جب اس سے ملی اس کی خوش اخلاقی کی گرویدہ سی ہو گئی۔ اور دوسری طرف یہ ہیں سر پر برقع ٹکائے لور لور پھرنے والی زبیدہ چچی!

خدائے مہربان اپنا کرم کرے ورنہ تو ساری جنمی عادتیں پائی ہیں زبیدہ چچی کی بہو نے.... ہائیں ارے یہ کیا بہو؟ لیکن بات تو زبیدہ چچی کی ہو رہی تھی۔ ارے سنیں تو....!





توماجرا کچھ یوں ہے کہ۔
پھپھو اور پھوپھا کی عمرے کی منظوری کا مژدہ سنتے ہی یہاں گھر میں خوشگوار چہل پہل سی ہونے لگی۔ وہیں پورے اٹھائیس دنوں کے لیے ان کے اتنی دور چلے جانے کا سوچ کر مشکوۃ کو ڈھیر ساری اداسی نے گھیر لیا۔
عیاض کو بھی ان دنوں چھٹی نہیں مل رہی تھی۔ پھپھو لوگوں کے واپس آنے پر ہی اس کا مہینے کی چھٹی لے کر گھر آنا ممکن ہو پاتا۔ وہ خود بھی مشکوۃ کے اکیلے پن کی وجہ سے پریشان تھا۔
چند روز تک تو دعوتوں تیاریوں وغیرہ میں گزر گئے۔ لیکن جاتے وقت وہ پھپھو سے لپٹ کر خوب روئی۔ ان کے درمیان روایتی ساس بہو والے تعلقات کبھی نہیں رہے تھے۔ پھپھو اگر اس کے لیے ماں سے بڑھ کر ثابت ہوئی تھیں۔ تو اس نے بھی سگی بیٹیوں کی طرح ان کی خدمت اور فرمانبرداری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔
"بیٹی! کیوں اپنا جی بھاری کرتی ہو۔ کیسے نیک اور مبارک سفر پر جا رہے ہیں۔ انہیں خوشی خوشی رخصت کرو۔ ہاں اکیلے پن کا تمہارا خدشہ بجا ہے۔ نہ کوئی نند' نہ جٹھانی' میکہ بھی دوسرے شہر ہے۔ پر تم فکر کاہے کو کرتی ہو میں ہوں ناں' آتی جاتی رہا کروں گی تمہیں دوسراہٹ میسر رہے گی۔"
زبیدہ چچی کے "دلاسے" پر اس نے دانت کچکچائے "پھپھو چلی جائیں' آپ کا تو میں اچھے سے ناطقہ بند کروں گی۔ ہونہہ دوسراہٹ میسر رہے گی۔"
اس نے "زبیدہ چچی" نامی بلا کو اپنے سر سے ٹالنے کے لیے دل ہی دل میں پروگرام ترتیب دے ڈالے تھے۔

✲ ✲ ✲

اور یہ پھپھو کے جانے کے بعد دوسرا دن تھا۔
اس نے کام وغیرہ نپٹا کر دروازے کی اندر سے کنڈی لگائی۔ اور خود صوفے پر پاؤں پسارے مزے سے ٹی وی لگا کر بیٹھ گئی۔ بمشکل چند منٹ گزرے ہوں گے۔ بیرونی دروازے پر دستک ہونے لگی۔
"یقیناً" زبیدہ چچی ہی ہوں گی۔" وہ جان بوجھ کر بہری بن گئی۔ بالآخر وقفے وقفے سے ہونے والی دستک دم توڑ گئی تو اس نے اطمینان کی سانس لی اور اپنی کامیاب ترکیب پر خود کو داد دیتی وہ کشن سر کے نیچے رکھے صوفے پر نیم دراز پاؤں پھیلانے لگی تھی۔

✲ ✲ ✲

"یا اللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔"
شام کو وہ پھپھو کے تخت پر سر جھکائے سبزی کاٹنے میں مگن تھی کہ زبیدہ چچی کی آواز پر سرعت سے سر اٹھایا اور گہری سانس کھینچ کر رہ گئی۔
جبکہ وہ اس کے تاثرات سے بے خبر وہیں تخت پر آتی پالتی مارے' اس کے ہاتھ سے غیر محسوس انداز میں چھری لے کر سبزی کاٹتے کہہ رہی تھیں۔
"خدا لگتی کہوں میں نے تو دروازہ خوب دھڑدھڑایا پر کم بخت کھل کر ہی نہ دیا۔ میرے تو دل کو پتنگے لگ گئے۔ جوان جہان معصوم لڑکی اور ایسی کڑکتی دوپہر میں

اکیلے پن کی وحشت توبہ توبہ۔
کیسے کیسے وسوسے نہ جاگے دل میں لیکن شکر خدا کا تم ساتھ خیریت کے آنکھوں کے سامنے ہو۔"
"ہاں وہ ایر کولر کے شور میں شاید مجھے دروازہ بجنے کی آواز سنائی نہیں دی۔ ویسے آپ نے ناحق تکلیف اٹھائی۔ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں مجھے بھلا کیا ہونا ہے۔ ویسے بھی اپنے گھر سے بڑھ کر عورت کے لیے اور کوئی جائے اماں نہیں۔ آپ میری خاطر خوامخواہ خود کو پریشانی میں مبتلا نہ کیا کریں۔"
بے مروتی سے جتاتے ہوئے اس نے زبیدہ چچی کے جھریوں زدہ چہرے کی پھیکی پڑتی مسکراہٹ کو دیکھا اور بے اعتنائی سے سبزی کی ٹوکری اٹھا کر کچن کی طرف چل دی۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز ترکیب میں ردوبدل کرتے اس کے لبوں پر محظوظ مسکراہٹ امڈ آئی تھی۔ زبیدہ چچی سے کچھ بعید نہیں آج پھر بھری دوپہر میں دروازہ دھڑدھڑانے آ کھڑی ہوں۔ اس نے کام وغیرہ سمیٹ کر دروازے کو لاک لگایا اور چادر اوڑھ کر زبیدہ چچی کے گھر چلی آئی۔
محض دو قدم کے فاصلے پر سامنے والا دروازہ ان ہی کا تھا۔ اس کے یہاں آنے کی وجہ زبیدہ چچی نہیں بلکہ ان کی بہو زرنین تھی۔
مشکوٰۃ پر نظر پڑتے ہی اس کے ہونٹوں پر خوب صورت خیر مقدمی مسکراہٹ در آئی تھی۔ پر تکلف چائے کے ساتھ ہر موضوع پر ڈھیر ساری باتیں کرنے اور دو سالہ علی کے ساتھ ہنستے کھیلتے اسے وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا۔
زرنین کے اصرار پر وہ اسے آئندہ اپنے آنے کی یقین دہانی کروا کر وہاں سے اٹھ آئی۔ دل ہی دل میں وہ زرنین کی خوش مزاجی کی کچھ اور گرویدہ ہو گئی تھی۔
"اور ایک وہ ہیں ان کی لٹو نما ساس..." اپنے گھر میں قدم رکھتے ہی اس نے گویا سر جھٹکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"دلہن کیا پکا رہی ہو؟"
"دال۔" سنجیدہ سپاٹ جواب۔
"دال؟ معدے میں اینٹھن سی محسوس ہو رہی ہے۔ دال کھانے سے تکلیف بڑھ نہ جائے۔ آج کچھ اور پکا لیتیں۔"
"افوہ اماں! ایک تو میں آپ کے ان فرمائشی پروگراموں سے بڑا تنگ ہوں۔ کچھ نہیں ہوتا دال کھانے سے۔"
"اچھا جیسی تمہاری مرضی۔"
کچن سے آتی آوازیں وہ لاؤنج میں بخوبی سن رہی تھی۔ زرنین کے شوہر کی دوسرے شہر پوسٹنگ ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ بے تکلفی سے اس کے گھر آنے اور گھومنے پھرنے لگی تھی۔ اسے یوں ان کی باتیں سننا اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن کچھ اور بھی تھا جو اسے اچھا نہیں لگا تھا لیکن کیا؟
تب ہی زرنین لاؤنج میں چلی آئی۔ مشکوٰۃ پر نظر پڑتے ہی چہرے پر ہمیشہ والی خیر مقدمی مسکراہٹ رچ گئی۔
باتیں کرتے کرتے وہ دونوں کچن میں آ گئیں۔ زرنین نے اپنے اور اس کے لیے پھلکے ڈال کر وہیں کچن میں دستر خوان لگا دیا۔
"زبیدہ چچی کھانا نہیں کھائیں گی کیا؟" وہ پوچھے بنا رہ نہ سکی۔
"ان سے کہاں کھائی جائے گی دال۔ ویسے بھی جب وہ اپنے سفارتی دورے پر ہوں تو کچھ کھا پی کر ہی واپس آتی ہیں۔" زرنین ہنس کر کہہ رہی تھی۔ مشکوٰۃ مسکرا نہیں سکی۔ وہ بمشکل دو نوالے ہی کھا سکی تھی۔

☼ ☼ ☼

عیاض کی ان دنوں ڈے ڈیوٹی تھی۔ لیکن مشکوٰۃ کے اکیلے پن کی وجہ سے وہ کام کے دوران۔۔۔ کئی بار فون کر کے اس کی خیریت پوچھتا۔
اسے اپنے ٹھیک ٹھاک ہونے کی یقین دہانی کروا کر مشکوٰۃ نے فون رکھا اور زرنین کے ہاں چلی آئی۔
"کیا ہو رہا ہے؟" زرنین لاؤنج میں ہی صوفے پر بیٹھی کسی حساب کتاب میں الجھی تھی۔ سر اوپر اٹھا کر

مسکرائی۔

"اس جمعہ کو علی پورے دو سال کا ہو جائے گا۔ میں سوچ رہی تھی قریبی دوستوں رشتہ داروں کو بلا کر گھر میں برتھ ڈے پارٹی رکھ لوں۔ بریانی کی دو دیگیں کافی رہیں گی ناں؟"

وہ ہاں میں ہاں ملانے ہی والی تھی کہ اسی وقت زبیدہ چچی نماز کی طرز پر دوپٹہ لپیٹے اپنے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں چلی آئیں۔

"دلہن! میں تو کہوں سالگرہ والگرہ کو چھوڑو۔ کیسا مبارک دن ہے جمعہ کا دوستوں رشتہ داروں کو تو بلا ہی رہی ہو تو خیر سے قرآن خوانی کروالو۔ گھر میں بھی خیرو برکت ہو جائے گی۔ شام کو خود ہی ہلا گلا کر کے کیک کاٹ لینا۔ مشکوۃ بیٹی بھی تو ہو گی پاس۔"

زرنین کے چہرے پر واضح ناپسندیدگی جھلکی تھی۔

"قرآن خوانی بھی کسی دن کروا لوں گی ابھی تو میں برتھ ڈے پارٹی ہی کروں گی۔ ویسے بھی آپ کو بھلا کیا پتا ایسی تقریبات کا۔"

مشکوۃ دانستہ چپ رہی' اسے ان کے ذاتی معاملے میں بولنا اچھا نہیں لگا۔

زرنین نے زبیدہ چچی کی بات کو سرے سے رد کر دیا تھا۔ بلکہ انہیں مکمل نظر انداز کیے مشکوۃ کے ساتھ پارٹی کے انتظام وغیرہ کے بارے میں بات چیت کرنے لگی۔

زبیدہ چچی قالین پر بیٹھ کر علی کو گود میں لیے گدگدانے لگی تھیں۔

زرنین سرعت سے اٹھی تھی۔ "لائیں اماں! اسے مجھے دیں اس کے سونے کا ٹائم ہو گیا ہے۔"

جس طرح اس نے جھپٹنے کے سے انداز میں علی کو ان سے لیا تھا مشکوۃ متحیر سی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

علی کی سالگرہ کی تقریب بخیر و عافیت گزر گئی تھی۔ تقریب کے دوران زبیدہ چچی نے زرنین کو چھوٹے موٹے مشورے دیے بھی تو زرنین نے انہیں درخور اعتنا نہ سمجھا۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق سب کچھ کرنے کی عادی تھی۔

"آ مانو بلی! محمد علی کو اٹھا کر لے جا....

آ کالا کوا محمد علی کو اڑا کر لے جا...."

زبیدہ چچی علی کو قالین پر لٹائے گدگداتیں تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتا۔ چچی اس پر جھکی محبت سے کبھی اس کے پھولے رخسار چومتیں تو کبھی انگلی سے پلکیں چھوتیں۔

"آ موٹے چوہے محمد علی کو بھگا کر لے جا...."

اسی اثنا میں زرنین نے گویا چیل کی طرح جھپٹ کر علی کو اٹھا لیا تھا۔ چہرے پر سخت برہمی تھی۔

"اماں! آپ کو میری بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کتنی بار کہا ہے ایسے جاہلانہ طریقوں سے علی کو مت کھلایا کریں' نہ جانے مجھے تنگ کر کے آپ کو کون سی خوشی ملتی ہے۔ میں آخری بار کہہ رہی ہوں اپنے فرسودہ چاؤ چونچلوں سے میرے بیٹے کو دور ہی رکھیں تو اچھا ہے۔"

مشکوۃ کے قدم دہلیز پر جم سے گئے۔ اس کے اندر مزید کچھ سننے کا یارا تھا نہ ہی زبیدہ چچی کے دھواں دھواں ہوتے چہرے کو دیکھنے کا۔ بالکل نہیں۔

وہ سرعت سے پلٹی اور وہاں سے نکلتی چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

کبھی کبھی ہوتا ہے نا ایسا' جو ہم سوچتے ہیں' جو سمجھتے ہیں حقیقت اس کے برعکس نکلتی ہے۔ تب ہمارے سارے مفروضے' سارے اندازے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ جیسے کسی تصویر کا دوسرا رخ۔

جیسے کوئی پیاز پرت در پرت....

منصف کے کٹہرے میں آج اس نے خود کو کھڑے پایا تھا۔ لاچار' لاجواب اور شرمندہ' چھوٹے موٹے بیسیوں واقعات اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔

گنتی کے ان چند دنوں میں اس کے گزشتہ تین سالوں سے قائم مفروضے غلط ثابت ہو گئے تھے۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ بظاہر اتنی خوب صورت'

☼ ☼ ☼

پھپھو، پھوپھا کے آنے میں محض دو دن رہ گئے تھے۔ آج شام کو عیاض بھی پہنچنے والا تھا۔ اگلی صبح چند خوش مزاج، سلیقہ مند زرنین اندر سے اتنی بدصورت نکلے گی۔

اس کا اخلاق جھوٹا، مسکراہٹ مصنوعی اور دل کھوٹا تھا۔ عجیب تسلط پسند طبیعت کی مالک تھی وہ۔

زبیدہ چچی کو وہ اپنے شوہر کی ماں، بزرگ، ساس کسی بھی حیثیت میں اہمیت دینے کی روادار نہیں تھی ۔ زرنین کے نزدیک ان کی کوئی حیثیت تھی بھی تو اتنی جیسے گھر کے کسی کونے میں پڑا بے جان پتھر۔

ان سے مشورہ لینا تو درکنار، ان کی دی گئی رائے کو وہ چٹکیوں ــــــــ میں اڑا دیتی۔ یہی اپنے پن، مان کی تشنگی ہی تو تھی جو دل کے اندر کہیں ترستی، بلکتی منہ تکتی انہیں گھر گھر پھرنے پر مجبور کر دیتی۔

اور اس محلے میں نہ جانے کتنی ہی مشکوۃ ہوں گی جو اپنی کج فہمی کی بنا پر انہیں منہ لگانا پسند نہیں کرتی ہوں گی۔

مشکوۃ نے ندامت سے سر گھٹنوں پر جھکا لیا۔

دوستوں کزنز کے ہمراہ پھپھو وغیرہ کو ریسیو کرنے اسے ملتان ایئرپورٹ جانا تھا۔

وہ خوش تھی لیکن خوشی کو محسوس نہیں کر پا رہی تھی۔ یونہی بے کل سی سارے گھر میں پھرتی رہی۔ زرنین کے ہاں جانے کا سوچ کر ہی اس کا دل مکدّر ہونے لگتا۔ لاشعوری طور پر سماعتیں دروازے پر ہونے والی دستک کی منتظر تھیں۔ انتظار جان لیوا تھا۔ اس نے یونہی بے ارادہ آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے گلی میں زبیدہ چچی سر پر برقع ٹکائے اس کے گھر کے سامنے سے گزر کر آگے نکل گئیں۔

"چچی! زبیدہ چچی۔" زور سے پکارتے وہ دو قدم باہر نکل آئی تھی۔

"ارے بیٹی! خیر تو ہے، یہاں کیوں کھڑی ہو؟"

"سب خیر ہے چچی! آپ اندر آئیں ناں۔" انداز ایسا تھا جیسے زبردستی ان کا بازو تھام کر اندر لے جائے گی۔

"میں دراصل نکڑ والے حاجی صاحب کے گھر جا رہی تھی۔ ان کی بیگم غسل خانے میں پھسل کر گر گئی تھیں۔ میں نے کل جا کر مالش کر دی تو کہنے لگیں۔ تمہارے ہاتھ میں بڑی شفا ہے اگر زحمت نہ ہو تو چند ایک دن اور ایسے تیل لگانے آجایا کرو۔ میں نے کہا زحمت کاہے کی۔ تو ابھی ان ہی کی طرف جا رہی تھی۔"

"چھوڑیں ناں چچی! آپ اندر آئیں پلیز۔" وہ اگر حیران ہوئی بھی تھیں تو ظاہر نہیں کیا۔

"آپ کے پیٹ کی تکلیف میں کچھ افاقہ ہوا؟"

"افاقہ کہاں سے ہو پرہیز جو نہیں کرتی ہوں۔ موا درد ہے کہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔"

مشکوۃ نے ان کے چہرے کی جھرّیوں سے جھانکتے ان کہے دکھ آج پہلی بار دیکھے۔

"اچھا چلیں، اب تو کھانے کا بھی وقت ہو گیا ہے۔ میں آپ کے لیے ابھی مزے دار سی کھچڑی بنا کر لاتی ہوں۔ ان شاء اللہ ہلکی پھلکی غذا لیں گی تو کچھ نہ کچھ افاقہ تو لازمی ہو گا۔"

ان کے نہ نہ کرنے کے باوجود مشکوۃ نے بہت دل سے کھچڑی پکائی۔ پھر ان سے پھپھو وغیرہ کی آمد اور انتظام وغیرہ کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔

"آج آپ یہیں رہ جائیں ناں چچی! سب لوگ پھپھو کو لے کر آنے کے بعد شام کو کھانا یہیں کھائیں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا اکیلے سب کچھ کیسے کروں گی.... گھر کی تھوڑی بہت سیٹنگ وغیرہ بھی کرنی ہے۔ آپ ساتھ ہوں گی تو مجھے سہارا رہے گا۔"

ان کے ہاتھ تھامے وہ لجاجت سے بول رہی تھی۔ زبیدہ چچی کی ملگجی آنکھیں نمکین پانی سے بھر آئیں۔ مشکوۃ کو اس نمی سے اپنے دل کا آنگن بھیگتا محسوس ہوا۔

"کاش میرا کوئی ایک عمل اس بھری دوپہر کا ازالہ کر سکے جب میرے اکیلے پن کا احساس کر کے وہ دروازہ بجا بجا کر مایوس لوٹ گئی تھیں!"

☼

نعیمہ ناز

# فسانۂ زندگی



ٹیکسی سے اتر کر میں نے کرایہ دینے سے پہلے قریب گزرتے ایک صاحب کو روک کر تصدیق کی۔

"برکت قریشی صاحب کا مکان یہی ہے؟"

"ہے تو ان ہی کا۔" موصوف نے جواب دینے سے پہلے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ یوں لیا جیسے کوئی قربانی کے بکرے کو بیک وقت رحم اور دلچسپی کی نظر سے دیکھتا ہے۔

"رشتہ دار ہو؟" ان کی تفتیش شروع ہو گئی۔

"جی!" میں کرایہ دینے کے لیے جیب سے والٹ نکال رہا تھا۔

"کہاں سے آئے ہو؟" ان کی جانچتی ہوئی نظریں اب بھی مجھ پہ جمی بلکہ گڑی ہوئی تھیں۔

مجھے تو اب سچ مچ ان گڑی ہوئی نگاہوں سے تکلیف کا احساس ہونے لگا تھا۔ میری اماں مجھے یوں ہی تو نازک مزاج کے لقب سے نہیں پکارتی تھیں۔ مجھے ان کے سوالات سے بھی الجھن ہونے لگی تھی۔

جب تک میں نے کرایہ کی رقم ڈرائیور کے ہاتھ پہ رکھی، بے چارے نے میرا سوٹ کیس اور دو عدد بڑے بڑے بیگز نکال کر باہر رکھ دیے تھے۔

زندگی میں بارہا ایسے مواقع آتے ہیں جب میں دل سے اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں پاکستان میں رہتا ہوں جہاں بے چارے نیک دل ڈرائیور ٹیکسی میں آپ کا بھاری بھر کم سامان رکھ بھی دیتے ہیں اور نکال بھی دیتے ہیں۔

اگر میں ہوتا دیس کے بجائے بدیس میں، تو کاہے کو یہ ڈرائیور ایسی مدد کرتا، وہ تو لارڈ صاحب بن کر ایک طرف کھڑا ہو جاتا، جتنا سامان ہے، مسافر کا کام ہے اسے ڈھونا، ہو سکتا ہے کہ آپ لوگوں کے لیے یہ ایک معمولی سی، عام سی بات ہو، مگر مجھ جیسے آرام طلب (بقول اماں، ابا، کاہل ست اور پوستی وغیرہ) کے لیے یہ بڑا اہم معاملہ ہے۔

خیر یہ ایک الگ اور بحث طلب موضوع ہے۔ فی الحال تو میں اپنے سامان سمیت اس سیاہ رنگ کے بڑے سے آہنی گیٹ کے سامنے کھڑا تھا اور اطلاع

## مکمل ناول



گھنٹی کی تلاش میں نظریں دوڑا رہا تھا' جو کہیں نظر نہیں آئی۔ ناچار میں نے کنڈا بجایا۔ ایک بار' دو بار' تین بار' چوتھی بار میرا ہاتھ اٹھا کا اٹھا رہ گیا۔ گیٹ کھٹاک سے کھل گیا۔ کھچڑی بالوں والا سر باہر آیا پھر وہ خود پورے کے پورے سامنے آگئے۔ گوری رنگت پہ غلافی آنکھوں اور کھڑی ناک اور پتلے پتلے ہونٹ والا جاذب نظر چہرہ بڑھاپے میں بھی ایسا ہے تو جوانی میں کیسا ہوگا۔ میں نے بڑے میاں کے دبلے پتلے سراپے پہ تفصیلی اور تعریفی نگاہ ڈالی۔

"معائنے سے فارغ ہوگئے تو پتا دو کون ہو؟" ان کے لہجے میں طنز نہیں تھا' ملائمت تھی۔

"السلام علیکم!" مجھے جیسے اچانک ہی ہوش آیا تھا۔ میں نے گڑبڑا کر انہیں سلام کیا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ "میں بلال ہوں۔ بلال کریم قریشی۔"

"ہائیں!" ان کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ "تمہیں تو تیس تاریخ کو آنا تھا نا۔"

"تیس کو نہیں بیس کو اور آج بیس ہے۔" میں نے تصحیح کرتے ہوئے انہیں بتایا۔

"اچھا؟" انہوں نے کچھ یوں مجھے دیکھا جیسے انہیں یقین تو نہیں آرہا' مگر مروت میں آکر یقین کر رہے ہوں۔

"آؤ' اندر آجاؤ۔" انہوں نے گیٹ پورا کھول دیا۔

"کوئی ملازم ہے تو اسے بھیج دیں ذرا۔" میں نے حسب عادت اپنی نوابی دکھائی تو وہ پھر سے مجھے یوں گھورنے لگے جیسے خدانخواستہ میرا دماغ چل گیا ہو۔

"ملازم تو یہاں کوئی نہیں ہے۔" چند لمحے مجھے گھورنے کے بعد انہوں نے رسان سے جواب دیا۔

"ملازم نہیں ہے؟" میں نے ہونق پن سے انہیں دیکھا۔

(بغیر ملازم کے یہ لوگ کیسے رہتے ہیں) میرا معصوم دماغ اور بھولا بھالا دل یہ سمجھنے سے قاصر تھا' مگر بہر حال اپنا سامان اٹھا کر جی نہیں گھسیٹ گھسیٹ کر میں جیسے تیسے اندر لے آیا۔

"کیا ہوا شہاب صاحب! کون ہے؟" اندر سے کسی خاتون کی آواز آئی۔

"اپنے کریم بھائی کا لڑکا ہے۔" وہ مجھے اپنے ساتھ لیے اندر چلے۔

اونچی چھت والا ایک بڑا سا کمرہ تھا جس میں ایک طرف بڑے نواڑی پلنگ پر ایک بڑی بی بیٹھی تھیں' وہی گورا چٹا رنگ غلافی آنکھیں ستواں سی ناک اور پتلے پتلے ہونٹ' حیرت انگیز طور پر وہ بڑے میاں سے مشابہہ لگ رہی تھیں (یہ تو مجھے بعد میں علم ہوا کہ یہ دونوں میاں بیوی آپس میں خالہ زاد بھی ہیں)

"السلام علیکم!" میں ان کے قریب جاکر تعظیماً" جھکا۔ انہوں نے جواب دیتے ہوئے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر بڑے میاں کو گھور کے دیکھا۔

"آپ تو کہہ رہے تھے کہ لونڈا تیس تاریخ کو آئے گا۔"

"غلطی ہوگئی۔ کریم بھائی بیس بولے' میں تیس سمجھا۔" بڑے میاں نے سر جھکایا۔

"آپ بھی حد کرتے ہیں' کہو کچھ سنتے کچھ ہیں۔ ہمارے ساتھ تو ساری عمر یہی کیا۔ اب دوسروں کے ساتھ بھی کرنے لگے ہیں۔" وہ بڑبڑانے لگیں۔ پھر اچانک مجھے کھڑا دیکھ کر چونکیں۔

"ارے میاں! تم تو بیٹھ جاؤ۔"

"جی۔" میں نے فوراً" تابعداری دکھائی اور قریبی دیوار کے ساتھ لگی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔

"نوال کو دیکھیں۔ کمرے میں ہوگی۔ اس سے کہیں کچھ کھانے کا بندوبست کرے۔"

وہ بڑے میاں کو ہدایت دے رہی تھیں اور پہلی بار (اس گھر میں آنے کے بعد) میں نے سکون اور اطمینان کی گہری سانس لی۔ بھوک کے مارے دم نکلا جارہا تھا' میں ویسے ہی بھوک کا بہت کچا ہوں۔ سوچا تھا کہ دعوت وغیرہ کا سماں ہوگا' مگر یہاں تو...

خیر کچھ نہ کچھ بندوبست تو ہو ہی جائے گا' وہ جو نام ابھی لیا تھا بڑی بی نے... نوال ہاں نوال کے ہاتھوں...؟ مگر اگر؟ مجھے اچانک ہی ایک خیال آیا اور میرا دل اگر' مگر کے درمیان چک پھیریاں لینے لگا' اگر جو

یہ نوال' اخفش والی نوال کی طرح ہوئی تو... تو کیا کھانا تیار کرے گی میرے لیے؟ وہ تو ایک دو سیب ٹرے میں چھری کے ساتھ رکھ کر لے آئے گی یا پھر نوڈلز کا کوئی بڑا سا باؤل میرے آگے رکھ دیا جائے گا' لو بھئی اس سے اپنی بھوک مٹالو۔

"تم جب تک نہا دھولو' سفر کی گرد اور تھکن اتر جائے گی' پھر کھانا کھالینا۔" بڑے میاں کچھ دیر بعد اندر آئے تو مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"چلو میرے ساتھ۔" مجھے اپنے ساتھ لیے وہ برابر کے کمرے میں لے گئے۔

"یہ تمہارا کمرہ ہے' اپنا سامان یہاں لے آؤ۔ کسی شے کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔" وہ جانے کے لیے مڑے۔

"چچا میاں!" مجھے اچانک کچھ یاد آیا تو میں نے انہیں مخاطب کیا۔

"جی بھتیجے!"

"مجھے اپنا موبائل چارج کرنا ہے' میرا چارجر سامان میں اندر کہیں ٹھنسا ہوا ہے۔ باریک پن کا چارجر مل جائے تو....."

"مل جائے گا۔ کسی نہ کسی لڑکی کے پاس ہوگا۔" انہوں نے اپنے مخصوص رسان بھرے لہجے میں مجھے تسلی دی اور تھوڑی دیر بعد چارجر بھی لا کر دے دیا۔

مجھے تھکن تو ہو رہی تھی' مگر پھر بھی میں نے نہانے سے پہلے اپنا سامان برآمدے سے لا لا کر کمرے میں رکھا۔ پھر نہانے گھسا۔

نہا کر نکلا تو تھکن کا احساس بڑی حد تک زائل ہو چکا تھا۔ میں گنگناتے ہوئے تولیے سے بال رگڑ رہا تھا۔ جب برابر والے کمرے سے بڑے میاں.... اوہ سوری' چچا میاں کی آواز آئی۔

"نہا لیے تو آجاؤ۔ کھانا کھالو۔"

"جی میں آرہا ہوں۔ دل و جان سے آرہا ہوں۔"

میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا' مگر بظاہر میں بڑا سنجیدہ سا منہ بنا کر بیبا سا بچہ بن کر وہاں جا کر بیٹھ گیا۔ جس کرسی پہ میں بیٹھا تھا اسی کے آگے ایک سینٹر ٹیبل رکھی تھی

جس پر کھانا لگ رہا تھا۔ چچا میاں نے ٹرے لا کر میز پر رکھ دی تھی۔

"چلو بھئی بسم اللہ کرو۔"

بڑی بی نے مجھے ہدایت دی۔ ویسے آئندہ سے میں انہیں چچی بیگم کہا کروں گا' ابا نے یہی رشتہ بتایا تھا۔

"جی!" میں نے میز پہ رکھی ٹرے پہ نظر دوڑانے سے پہلے آنکھیں بند کرکے دعا کی یا اللہ اگر جو یہ کھانا کسی نوال نے بنایا ہے تو سیب اور نوڈلز ہرگز نہ ہو' پھر آنکھیں کھول کر دیکھا تو دعا قبول ہو چکی تھی۔ ایک ڈش میں قیمہ مٹر' آلو کا سالن' ہرے دھنیے کی مزے دار سی خوشبو کے ساتھ' چپاتیاں' سلاد اور کباب۔

میں نے بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کیا اور پھر واہ واہ سبحان اللہ۔ ویسے یہ کباب بھی کیا نعمت ہیں اللہ کی' سنا ہے انہیں بنانے میں بڑی محنت اور وقت لگتا ہے' واللہ اعلم۔ مجھے تو بس یہ معلوم ہے کہ اس کے کھانے میں زیادہ وقت نہیں لگتا' نہ ہی محنت لگتی ہے۔



رات میں جب سامان اور میں ذرا ٹھکانے سے لگ گئے تو میں نے اپنی امی جان کو فون کھڑکایا۔

"کیا حال ہے میرے بچے؟"

امی تو پھر امی تھیں' ملکہ جذبات' ابا شہنشاہ تو تھے' مگر جذبات کے نہیں عقل کے' دل کے نہیں دماغ کے' تب ہی تو میں یہاں اتنی دور' اپنوں سے الگ' غیروں کے گھر بیٹھا تھا۔ خیر میری داستان غم تو چلتی رہے گی' امی کے حال پوچھنے پہ میں آب دیدہ ہو گیا۔

"کیا حال پوچھتے ہو میرا پورب کے ساکنوں؟" میں جواب میں کچھ کہنے کے بجائے فقط ایک آہ بھر کر رہ گیا۔

"بولتا کیوں نہیں' کھانا وانا تو ٹھیک سے مل رہا ہے نا۔"

"دوپہر میں ہی کھایا تھا۔ ٹھیک ہی تھا۔ رات کا ابھی کھایا نہیں اس لیے کچھ پتا نہیں۔"

"پتا نہیں تمہارے ابا کو کیا سوجھی لڑکے کو اتنی دور بھیجنے کی' میرے بس میں ہوتا تو فوراً واپس بلا لیتی۔"

امی کی مامتا (مجھ پر) اور غصہ (ابا پر) ابل ابل کر باہر آرہے تھے' مگر ان کا بس ہی تو تھا جو نہیں چلتا تھا ورنہ میں یہاں ہوتا؟

"بھائی صاحب اور بھابھی بیگم' کیا حال ہے ان کا؟" اس سے پہلے کہ میں مزید رقیق القلبی کا مظاہرہ کرتا' امی نے موضوع بدل دیا۔

"ٹھیک ہیں۔" میری افسردگی اپنی جگہ قائم و دائم تھی۔

"سامان سیٹ کرلیا اپنا؟"

"ہاں' کچھ کرلیا ہے' کچھ کل کروں گا۔"

"ہاں بیٹا! وہاں تو سارا کام اکیلے ہی کرنا پڑے گا' ملازم کوئی ہے نہیں' بھائی صاحب کے علاوہ کوئی مرد نہیں گھر میں' لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں۔ اللہ کی شان ہے۔" امی نے ایک آہ بھری۔ "بن مانگے ملیں موتی' مانگے نہ ملے بھیک' ہم دعائیں کر کر کے تھک گئے' ایک بیٹی نہ دی اللہ نے' مصلحت اس کی' مرضی اس کی اور کہیں گھر میں فوج کی فوج بیٹھی ہے لڑکیوں کی' ہم تو ترس کر رہ گئے کہ اللہ کی رحمت اپنی گود میں دیکھیں۔"

امی شروع ہو گئیں اور جب وہ شروع ہو جاتی ہیں' خاص طور پر اس موضوع پر تو انہیں خاموشی سے بس سنا ہی جا سکتا ہے' خاموش نہیں کروایا جا سکتا' سو میں بھی کئی بار کا حفظ ہو جانے والا قصہ ایک بار پھر سن رہا تھا۔

"تیرے دنیا میں آنے سے پہلے بڑی دعائیں کیں میں نے' اے اللہ تین بیٹے دے دیے تو نے' تیرا شکر ہے' بس اب کی بار اپنی رحمت سے نواز دے' تیرے ابا کو مولوی صاحب کے پاس بھیجا کہ بیٹی کی پیدائش کا کوئی وظیفہ' کوئی دعا پوچھ کے لے آئیں' وہاں سے بھی ناکامی ہوئی' اللہ بھلا کرے' مولوی صاحب نے جواب دیا کہ لڑکے کی پیدائش کے لیے تو وظیفے اور دعائیں بہت ہیں' بیٹی کے لیے کوئی نہیں' ویسے ہی دعا کرلیں' انہوں نے مشورہ دے دیا' بتاؤ ذرا' کوئی بات ہے

بھلا؟" امی کی بات ختم ہوئی تو میرا بیلنس بھی ختم ہوگیا۔ خدا حافظ کے بغیر ہی رابطہ منقطع ہوگیا۔



اگلے روز ناشتا کرنے کے بعد سب سے پہلا کام وہ کیا جس کے لیے ابا نے مجھے یہاں بھیجا تھا۔ اس علاقے میں میزبانوں کے گھر سے ذرا دور ابا نے ایک تین منزلہ مکان خریدا تھا۔ مکان کیا تھا بس ایک چیلنج تھا۔ جسے مجھے پورا کرنا تھا۔ مکان دیکھ کر پتا چلا کہ یہ چیلنج پورا کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے' مکان تھا تو مضبوط مگر اس میں کام بہت تھا۔ بجلی کی ساری فٹنگ نئے سرے سے ہونی تھی۔ پلمبر کے لیے بھی کمائی کے بہت مواقع تھے یہاں' پھر کھڑکی' دروازے کی مرمت' رنگ و روغن اچھا خاصا دردِ سر میرے لیے یہاں موجود تھا۔

مکان کا مکمل جائزہ لے کر اور ساری تفصیلات نمٹا کر۔ میں واپس ہوا تو تھکن اور گرمی کے مارے برا حال تھا۔ حالانکہ سردی کا مہینہ شروع ہوچکا تھا۔ ملک کے بیشتر علاقوں میں سردی شروع ہو کر اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی' مگر ہمارے شہر کراچی کو تو موسم گرما نے اپنا محبوب بنایا ہوا ہے' خود کو نہ تو کراچی کی نظروں سے اوجھل کرتا ہے نہ ہی یہاں سے جاتا ہے' وہ تو اگر سائبیریا سے قندھار' وہاں سے کوئٹہ اور کوئٹہ سے کراچی سردی کی لہر قدم رنجہ نہ فرمائے تو گرمی نام کا یہ محب اپنے محبوب سے یونہی التفات برتتا رہے اور ہمیں پسینوں میں نہلاتا رہے۔ ایک آدھ ماہ کے لیے یہ موسم یہاں سے جاتا بھی ہے تو طوعاً" و کرہاً"۔ انتہائی بے دلی سے بلکہ بچوں کی طرح ایڑیاں رگڑتے ہوئے' ذرا مہلت ملی اور پھر حاضر۔ کبھی کبھی تو عین سردی میں بھی آن موجود ہوتا ہے ڈھیٹ کہیں کا' چیپکو۔

موسم گرما کے بارے میں ایک سے ایک زریں خیالات میرے دماغ میں آرہے تھے اور یہی سوچتے سوچتے میں گھر پہنچ گیا' گھر پہنچتے ہی پہلے سوال و جواب کا سیشن شروع ہوا۔

"آگئے؟"

"جی!" میں کھلے دروازے کے سامنے کرسی ڈال کر بیٹھ گیا جہاں ہوا کے جھونکے وافر مقدار میں آتے تھے۔ چھت کا پنکھا تو لوڈشیڈنگ کی مہربانی کی وجہ سے بند تھا۔ جنریٹر گھر میں تھا نہیں' سانس اور حواس ذرا قابو میں آئے تو میں نے کولر میں سے پانی نکال کر پیا۔

"سبحان اللہ' کیا کیا نعمتیں ہیں اس رب کی' ٹھنڈی ہوا' ٹھنڈا پانی۔" میں نے انتہائی دل سے اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔

"نہاؤ گے؟" اگلا سوال۔

"جی!" (یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟)

"بالٹی میں پانی بھر کے نہانا پڑے گا' شاور میں پانی نہیں آرہا۔ پانی کی موٹر خراب ہوگئی' اوپر پانی نہیں چڑھا۔" چچا میاں نے اطلاع دی۔

"کوئی بات نہیں' میں بالٹی سے نہا لوں گا۔"

میں نے انتہائی ملائمت سے جواب دیا تھا' پتا نہیں کیا بات ہے یہاں آکر میرے اندر صبر و برداشت کا کافی مادہ پیدا ہوگیا تھا یا پھر شاید مجبوری کا نام صبر بن گیا تھا میرے لیے۔

نہا دھو کر کپڑے تبدیل کرکے' بال بنا کر میں اسی کمرے میں واپس آگیا' کھانے کے لیے دونوں میرا ہی انتظار کررہے تھے۔

"امرحہ! کھانا لگا دو بیٹی۔" چچا میاں نے آواز لگائی۔

"یا اللہ!" میں اک دم چونک اٹھا۔

میری پسندیدہ ساری ہیروئنیں اسی گھر میں جمع ہیں۔ پہلے نوال پھر امرحہ' کل کسی حنین کو آوازیں لگ رہی تھیں۔ میرے ہی ساتھ یہ اتفاق ہونا تھا؟ میں حیرت کے گہرے سمندر میں غوطے لگا رہا تھا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کب کون آیا اور کھانا کس نے لگایا' میں سر جھکائے عالم تحیر میں مراقبہ کی صورت بیٹھا تھا کہ چچی بیگم کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"بسم اللہ کرو بیٹا۔"

میں اپنے خیالات سے واپس پلٹا۔ دسترخوان سے کھانے کی مزے دار مہک اٹھ رہی تھی۔ اتنی محنت

کر کے آیا تھا تو بھوک اپنے پورے جوبن پر تھی۔
کھانا کھا کر میرا ارادہ قیلولہ کرنے کا تھا۔ بچپن سے یہی روٹین چلی آرہی تھی' لیکن بھلا ہو ابا حضور کا' جنہیں میری بچپن کی ساری عادتیں' مشاغل اور حرکتیں انتہائی زہر لگنے لگی تھیں۔ ان کے خیال میں' میں دنیا کا نمبر ایک کاہل' ست اور کام چور لڑکا تھا۔ ان کا ماننا تھا کہ مجھے سدھرنے کی انتہائی اور اشد ضرورت تھی' مگر یہ بھاری پتھر اٹھاتا کون؟
جب جب ابا جان نے یہ نیک کام خود کرنے کی کوشش کی امی حضور آڑے آگئیں۔ تنگ آکر انہوں نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا تھا' مگر صرف ظاہری طور پر اندر ہی اندر وہ منصوبہ بندی میں لگے ہوئے تھے۔ تب ہی تو یہاں کا رستہ دکھا دیا مجھے' جاؤ میاں' جو مکان خریدا ہے اسے ایسا نیا اور خوب صورت کروا دو' کہ وہ تاج محل کو بھی مات کردے۔ وائٹ ہاؤس اس کے آگے پانی بھرتا نظر آئے اور عربی و پاکستانی شاہی محلات اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہو جائیں' پیسہ ابا کا تھا اور عقل اور محنت مجھے استعمال کرنی تھی۔ کرہی لوں گا استعمال' دونوں کی دونوں نئی نویلی رکھی ہوئی ہیں۔ آج سے پہلے اتنی زیادہ استعمال جو نہیں ہوئیں۔
اپنے کمرے میں جا کر لیٹا اور سونے کے لیے آنکھیں بند ہی کی تھیں کہ کھٹا کھٹ' کھٹا کھٹ شروع ہو گئی' کوئی دو تین لوہے کی چیزیں فرش پر آکر گری تھیں۔ کیا؟ کہاں سے؟ کیوں؟ کیسے؟ ان سب سوالات کے جواب جاننے کے لیے ہی میں کمرے سے باہر نکلا تھا اور ادھر ادھر دیکھتا ہوا آواز تک پہنچ ہی گیا۔
چچا میاں پانی کی موٹر کے پاس بیٹھے ان اوزاروں کو نیچے سے اٹھا رہے تھے جن کے گرنے کی آواز مجھے یہاں لے آئی تھی۔ ان کے پاس ہی ایک لڑکی بھی بیٹھی تھی' جسے مخاطب کر کے وہ کہہ رہے تھے۔
"نوال! یہ پیچ کس اٹھا بیٹا اور یہ والے سارے نٹ کھول دے' میرا ہاتھ تو بالکل بے کار ہو رہا ہے' کام ہی نہیں کر رہا۔"
اور اب یہ لڑکی سارے نٹ کھول کھال کر' مشین ٹھیک کر دے گی' فوری طور پر میرے دماغ میں خیال آیا تھا' مگر اس خیال پر کوئی ہنس رہا تھا' جی ہاں نوال کا جواب' میرے اس خیال پر زور سے ہنسا تھا۔
"مجھے کہاں آتے ہیں یہ سب کام' ماہ نور کو بھیجتی ہوں' پہلے بھی اس نے ٹھیک کی تھی۔"
مجھ پہ ایک نگاہ غلط بھی ڈالے بغیر وہ نوال وہاں سے چل دی اور میں حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتا' بے اختیار احمد فراز کو داد دے رہا تھا' ظالم نے بعض باتیں بڑی سچی اور صحیح کہی تھیں۔
"کوئی تجھ سا ہو تو نام بھی تجھ سا رکھے۔"
اگر جو سائرہ رضا کو پتا چل جائے کہ ایسی ایسی نوال بھی دنیا میں موجود ہیں تو وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ پتا نہیں وہ کیا کریں گی؟ میں نے اپنے دماغ پہ اتنا بوجھ ڈالنا ضروری نہیں سمجھا' ویسے بھی میرا دھیان اس طرف چلا گیا تھا کہ نہ جانے حسن المآب' میں آگے کیا ہوگا؟ قارئین سوچ رہے ہوں گے کہ ایک لڑکا اور خواتین ڈائجسٹ کرداروں اور رائٹرز کی باتیں تو یہ کہانی میں ابھی تھوڑی دیر میں سناتا ہوں۔ ابھی ذرا چچا میاں کو دیکھ لوں' یہاں کیا ہو رہا ہے؟
"کیا ہوا چچا؟"
"موٹر ٹھیک کرنے بیٹھے تھے' ہاتھ ٹھیک سے کام نہیں کرتا نا' بچیوں سے مدد لینی پڑتی ہے۔"
وہ پانا' پیچ کس وغیرہ فرش پر ترتیب سے رکھتے ہوئے سادہ سے لہجے میں بتا رہے تھے۔ ان کا دایاں ہاتھ کانپتا تھا ہر وقت نہیں' بس جب وہ کوئی شے اپنے ہاتھ میں تھامتے یا خاص زاویے سے ہاتھ کو موڑتے' ان کا ہاتھ اس بری طرح کانپتا کہ ہاتھ میں پکڑا پانی کا گلاس چھلک جاتا۔ نوالہ بھی کبھی منہ تک لے جانا مشکل ہو جاتا۔ یہ رعشہ نہیں تھا' پارکنسن بھی نہیں تھا۔
"خدا جانے کیا مسئلہ ہے' ڈاکٹرز بس دوائیاں دے دیتے ہیں کچھ اور نہیں بتاتے۔" چچا میاں نے میرے پوچھنے پر بتایا تھا۔

اتنے میں ماہ نور آ گئی۔ "جی' آپ نے بلایا تھا مجھے؟"

میں آنکھیں نیچے کیے کھڑا تھا۔ مجھ میں بہت ساری خامیاں ہیں' مگر میں نظرباز نہیں ہوں' بہت بچپن سے ہی امی نے خواتین کی عزت کرنا سکھائی تھی' نظروں سے بھی اور لفظوں سے بھی' پھر یہاں تو رشتے داری کا بھی معاملہ تھا۔

"موٹر ٹھیک کروانی ہے۔" چچا میاں بولے۔

"چچا! میں ہیلپ کروا دیتا ہوں۔" میں جلدی سے درمیان میں بلکہ میدان میں کود پڑا۔ حالانکہ میرے فرشتوں کو بھی اس کی الف بے کا پتا نہیں تھا' مگر میری شرم غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ ایک بوڑھا اور ایک لڑکی مشقت کا کام کریں' میں ہٹا کٹا مسٹنڈا (یہ القابات میرے ابا نے مجھے دیے ہیں) اپنے کمرے میں لیٹ کر آرام کروں۔

"آپ رہنے دو بیٹا' ہم لوگ کر لیں گے' پہلے بھی کرتے رہے ہیں۔" چچا میاں اپنے مخصوص سادہ سے لہجے میں بولے' مگر میں اتنی آسانی سے باز آنے والا نہیں ہوں' جو ٹھان لی سو ٹھان لی (یہ تجزیہ بھی میرے ابا جی کا ہے)

"جب تک میں یہاں ہوں' جس کام آ سکتا ہوں' آؤں گا۔" (اگر جو میرا یہ عزم و ہمت میرے ابا جی دیکھ لیں تو مارے خوشی کے ضرور بے حال' بے ہوش ہو جائیں)

"تم جاؤ۔" چچا میاں نے ماہ نور کو اشارہ کیا۔ وہ چلی گئی' میں اکڑوں ان کے پاس بیٹھ گیا پھر ان کی ہدایات اور میں۔

سارے نٹ بولٹ کھول کر موٹر کا آپریشن کرنے سے پہلے وہ اس کا معائنہ کرتے رہے کہ خرابی کہاں ہے۔

"بوگیاں خراب ہیں' دوسری ڈلیں گی۔" کافی دیر معائنہ اور غور و خوض کے بعد وہ سر اٹھا کر گویا ہوئے۔

"لے آؤ گے' زیادہ دور نہیں ہے دکان؟" وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

میرے پاس "جی" کہنے کے سوا اور کیا آپشن تھا۔ اوکھلی میں سر دینے کے بعد موصلوں سے ڈرنا؟

میں نے ان سے ایک بڑا نوٹ لے کر گیٹ کا رخ کیا اور ان کے بتائے ہوئے پتے اور راستے کے مطابق "قریبی دکان" کی طرف روانہ ہو گیا۔ چچا میاں کا منگوایا ہوا مطلوبہ سامان لاتے ہوئے واپسی میں یہی سوچتا رہا کہ اگر یہ قریب ہے تو دور کیا ہو گا؟

پرانی بوگیاں نکال کر نئی ڈالیں' مٹی کے تیل سے پوری مشین صاف کی دوسرے چھوٹے موٹے کام کیے اور سارے وقت نیند کے مارے میرا برا حال ہو رہا تھا' مگر میں بڑی مہارت سے نیند کے جھونکوں کو گیٹ لاسٹ کرتا رہا اور جب سارا کام ختم کر کے میں آخری نٹ کس رہا تھا تب چچا میاں مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"بہت بہت شکریہ بیٹے! اب تم جا کر سو جاؤ' تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں کتنی سخت نیند آ رہی ہے تمہیں۔"

"اف' یہ چچا میاں بھی میرے ابا سے کم نہیں تھے' ایک نظر میں سب کچھ بھانپ لینے والے۔"

ان کا شکریہ قبول کر کے میں خاموشی سے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ آج صبح سے اس وقت تک مسلسل مصروف رہا تھا' تھکن اور نیند کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی بے خبر ہو گیا۔



ڈائجسٹ کا قصہ ادھورا رہ گیا تھا' وہ بتا دیتا ہوں' کوئی لمبا چوڑا قصہ نہیں ہے' مختصر سی بات ہے کہ یہ شوق اپنی امی سے ملا ہے مجھے۔ وہ ڈائجسٹ بڑے ذوق و شوق سے پڑھتی ہیں اور انہیں سنبھال کر بھی بڑے پیار سے رکھتی ہیں' مجھے بچپن ہی سے ڈائجسٹ کا شوق ہو گیا تھا جب پڑھنا نہیں آتا تھا تب سے سرورق اور اشتہارات میں چھپی تصویریں شوق سے دیکھتا تھا۔ پڑھنا آیا تو امی کی دیکھا دیکھی ڈائجسٹ پڑھنے لگا۔ خواہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ پھر جب سمجھ' عقل اور شعور آیا (یہ میرا اپنا خیال ہے میرے ابا کی رائے اس سے بالکل

مختلف ہے) تو بس پھر چل سو چل۔ حیرت کی بات نہیں بلکہ فطری بات ہے کہ میری امی کی اور میری پسند "تقریباً" ایک ہی ہے۔ وہ اکثر خطوط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی ہیں، کبھی کبھی یہ فریضہ میں بھی انجام دے دیتا ہوں ان کی طرف سے۔

ڈائجسٹ کا ذکر اس لیے نکل آیا کہ اس گھر میں آکر حیرت کے سمندر میں غوطے کھا رہا ہوں۔ میں نے تو سعد سلطان کی ماہ نور کو دل و دماغ میں بٹھایا ہوا تھا۔ کیسی پیاری سی، کچھ بھولی بھالی سی کچھ سیدھی سادی سی، یہاں آکر جس ماہ نور سے واسطہ پڑا وہ تو..... وہ سائرہ رضا کی نوال والی خوبیاں رکھتی ہے، وہ بجلی کے بلب، پنکھے اور موٹریں ٹھیک کر لیتی ہے، پلمبری کے کام سے بھی شغف ہے اس کو اور تو اور گھر کے رنگ و روغن میں بھی خاصا دخل رکھتی ہے یہاں جو نوال بی بی ہے بڑی اچھی شیف ہے اسے امور خانہ داری اور کچن سے خاصا لگاؤ ہے، فی الحال تو میں یہی جان پایا ہوں۔

ایک امرحہ بی بی ہیں، اللہ اللہ سمیرا حمید، تمہارے قلم کی جادوگری، میں امرحہ جیسی لڑکی کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ اتنی پیاری ٹوٹ کر چاہنے والی، چیونٹی کی طرح محنتی، ہمارے کسانوں کی طرح جفاکش، مگر اس امرحہ کو جان کر تو میرے خواب ریزہ ریزہ ہو گئے۔ اس امرحہ کا آئیڈیل وہ شوہر ہے، جو ہر فن مولا ہو۔ وہ کھانا پکا سکتا ہو، برتن اور کپڑے دھونے آتے ہوں، صرف صفائی پسند نہیں بلکہ "صفائی کرنا پسند" ہو۔ محترمہ کے یہ نادر نایاب خیالات میں نے خود اپنے گنہگار کانوں سے سنے ہیں۔

ارے۔ ارے..... قارئین، میرے بارے میں مشکوک ہونے کی ضرورت نہیں ہے، میں نے کبھی چھپ چھپ کر یا کان لگا کر کسی کی، خصوصاً "لڑکیوں کی باتیں سننے کی کوشش نہیں کی، میری امی کی اخلاقیات ان سب معاملات میں بڑی سخت ہے اور انہوں نے مجھے گھول گھول کر پلائی ہوئی ہیں۔ یہ سب باتیں خود بخود میری سماعت تک پہنچی ہیں۔ جب میرے کمرے کے پیچھے صحن میں آدھی رات کو لڑکیاں بیٹھ کر باتیں کر رہی تھیں مجھے سوتا سمجھ کر اور میں جاگ رہا تھا۔

اور رہ گئیں حنین بی بی تو..... آہ..... نمرہ احمد کے کمال کو نظر بد سے بچانے کے لیے جہاں خصوصی دعائیں کیں، وہیں کمپیوٹر کے خصوصی کورسز کرنے کے لیے ایڈمیشن بھی لے لیا کہ ایک لڑکی بل گیٹس کی جانشین اور ہم فقط بلال قریشی، کمپیوٹر میں ترقی پاس اور چچا میاں کی حنین کو جان کر دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ میری استاد، میری آئیڈیل، کمپیوٹر کی اے بی سی ڈی بھی معلوم نہیں تھی اسے۔ موبائل سے میسج تک نہیں بھیجنا آتا تھا۔ اس کی اپنی الگ ایک دنیا تھی۔ ہینڈی کرافٹس اس کا خاص اور پسندیدہ شوق تھا۔ اسی ہنر اور شوق سے حنین کی دنیا شروع ہوتی تھی اور اسی پر ختم ہو جاتی تھی۔ ٹھیک ہے کہ کمپیوٹر اور موبائل کے بغیر بھی ایک دنیا جی رہی ہے، مگر حنین؟ آہ حنین (چچا میاں کی حنین کے لیے) واہ حنین (نمرہ احمد کی حنین کے لیے)



تخت پر رکھے گاؤ تکیے کا غلاف بدلتے ہوئے ان کی پیشانی کی لکیریں بتا رہی تھیں کہ وہ کسی گہری سوچ یا فکر میں ہیں۔ شوہر آکر قریب رکھے نواڑی پلنگ پر دراز ہوئے۔ چاندنی بیگم نے ان کی طرف دیکھا۔

"لڑکیاں تو مان کے نہیں دے رہیں مہتاب صاحب!"

"اب کیا کریں؟"

"ہوں۔" مہتاب صاحب بھی یقیناً "کسی فکر میں غلطاں تھے۔

"ارے "ہوں" کیا ہوتا ہے؟ ڈھنگ سے جواب دیں۔" بیگم چڑ گئیں۔

"کیا جواب دوں۔ میں خود پریشان ہوں۔ بچیوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ انہوں نے الٹا مجھے سمجھا دیا۔ غور کرتا ہوں تو وہ بھی اپنی جگہ ٹھیک ہی ہیں۔"

"کیا خاک ٹھیک ہیں۔ اتنی مشکل سے رشتے جڑے تھے۔ اب ان لڑکیوں کے اعلا دماغ اور ارفع

خیالات ہماری تو سمجھ سے باہر ہیں۔" پریشانی کے عالم میں چاندنی بیگم کا پارہ اور بھی ہائی ہو جاتا۔

"جب لڑکا کسی اور کو پسند کرتا ہے۔ اس شادی پر راضی ہی نہیں تو ماہ نور کیسے آنکھیں بند کر کے شادی کرلے۔ جب کہ وہ فون کر کے بھی صاف صاف جتا چکا ہے کہ اس کے گھر والے زبردستی یہ شادی کررہے ہیں۔" چچا میاں تھکی تھکی سی آواز میں بول رہے تھے۔

"اونہہ' لڑکوں کی بھلی چلائی' ان کا کیا ہے شادی سے پہلے ادھر ادھر دس جگہ منہ مارتے ہیں پھر جہاں اماں باوا کھونٹے سے باندھ دیں' وہیں بندھے رہتے ہیں۔" چاندنی بیگم ہر صورت چاہتی تھیں کہ یہ رشتہ قائم رہے ٹوٹنے کی نوبت نہ آئے۔

"اب گیا وہ دور' کھونٹے سے بندھے رہنے کا۔ اب تو رسی تڑا کر بھاگتے ہیں۔ ایسی ایسی حرکتیں کر جاتے ہیں کہ سوچ کر کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ خبروں میں نہیں دیکھا ایک لڑکے کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی شادی کے چوتھے دن بیوی کو جان سے ماردیا۔"

"آے ہائے میاں! اب ایسی باتیں تو نہ کرو۔" چاندنی بیگم نے دہل کر سینے پہ ہاتھ رکھا۔

"جو ہو رہا ہے دنیا میں' وہی بتا رہا ہوں۔"

"خدا کی مار ان موبائلوں اور کمپیوٹروں پہ' انہوں نے ہی بگاڑا ہے نوجوان نسل کو' ساری واہی تباہی یہی تو سکھا رہے ہیں۔" چاندنی بیگم خالصتا" زنانہ انداز میں کوسنوں پر اتر آئیں۔

"یہ بھی خوب' ہے کمہار پر بس نہ چلے تو گدھے کے کان مروڑ دو۔"

"زبان دانی کے چسکے لینے بیٹھ گئے۔ مجھے تو بتادیں' کیا کروں ان لڑکیوں کا' چار چار بھاری سلیں سینے پہ رکھ کر بیٹھے ہیں۔ کوئی ایک آدھ تو سر کے۔" چاندنی بیگم جھنجلا اٹھیں۔ اللہ تو اپنی رحمت سے نوازتا ہے ہم انسانوں نے بیٹیوں کو بوجھ بنایا ہوا ہے۔" مہتاب صاحب نے تکیے پہ سر رکھ کر خود کو "بیلنس کیا۔"

"دنیاداری بھی تو نباہنی پڑتی ہے' دین سے دنیا بھاری ہے۔"

"ہوں۔" مہتاب صاحب مزید کسی بحث کے موڈ میں نہ تھے۔ ہنکارا بھر کر خاموش ہو گئے۔

"پھر وہی ہوں؟"

"ارے بھئی کچھ سوچ رہا ہوں۔ سوچنے تو دو۔" اب کی بار مہتاب صاحب جھنجلا اٹھے۔

"کیا بلال کے بارے میں کچھ سوچ رہے ہیں؟" بیگم آخر بیگم تھیں۔ جرح کرنے سے باز نہ آئیں۔

"بلال کے بارے میں؟ اس کا نام کیسے لے لیا۔ کیا سوچوں گا اس کے بارے ہیں۔" وہ سیدھے ہو بیٹھے۔ انداز اور سوال میں حیرت تھی۔

"امرحہ کے ساتھ جوڑ بنتا ہے اس کا' گھرانہ دیکھا بھالا ہے' لڑکا بھی شریف دِکھتا ہے' ایک لڑکی یہیں کھپ جائے تو کیا برا ہے؟" چاندنی بیگم بھی اپنے خیالات کی اڑان کہاں سے کہاں لے جاتی تھیں پھر فٹ سے اسے بیان بھی کردیتی تھیں۔

"اس کے اماں باوا نے اس مقصد سے یہاں نہیں بھیجا اسے' آپ اپنی نیت ٹھیک رکھیں' اللہ مسبّب الاسباب ہے۔ جب بیٹیاں دی ہیں تو ان کا جوڑا بھی کہیں نہ کہیں اتارا ہوگا۔ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے' اپنے وقت پر سارے کام ہوجاتے ہیں۔"

بیگم ان کی تقریر نیم دلی سے سن رہی تھیں' یہ سب باتیں تو انہیں بھی معلوم تھیں۔ ان کا عقیدہ اور خیال مجازی خدا سے مختلف نہیں تھا بس فکر اور پریشانی کے عالم میں سب کچھ بھول بھال جاتی تھیں۔

"وہ تو سب ٹھیک ہے مہتاب صاحب! مگر اب کریں کیا؟ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے تقدیر کے فیصلے کا انتظار کریں؟"

"اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟" مہتاب صاحب نے آنکھیں موندلیں جو اس بات کا اشارہ تھا کہ اب گفتگو ختم اور نیند شروع۔

"یہ اچھی کہی' چھلنی میں دودھ ڈالو اور تقدیر کو ٹٹولو۔" چاندنی بیگم بڑبڑا کر خاموش ہو گئیں۔

٭ ٭ ٭

انڈے باؤل میں ڈال کر نوال نے بیٹر چلا دیا۔ منٹوں سیکنڈوں میں چھ انڈے جھاگوں جھاگ ہوگئے۔

"تمہارا کیک بن گیا؟" ماہ نور نے کچن میں جھانکا۔

"ابھی تو شروعات ہے۔" وہ اب سب چیزیں مکس کر رہی تھی۔

"بھوک کے مارے دم نکل رہا ہے میرا۔"

"اس کیک سے ہی زندگی ملے گی تمہیں؟"

"کیا کریں اور تو کہیں ہے نہیں یہ کم بخت زندگی۔ کھانے پینے میں ہی تلاش کر لیں۔" ماہ نور نے ایک آہ بھری۔

"لوگ غم میں کھانا پینا چھوڑ دیتے ہیں' بھوک لگتی ہے نہ پیاس۔ تم کھا پی کر سوگ منا رہی ہو۔"

نوال مکسچر کو کیک کے سانچے میں ڈال رہی تھی۔

"پتا نہیں' سوگ منانا بھی چاہیے یا نہیں؟" ماہ نور اس سے پوچھ رہی تھی' نوال کو ہنسی آگئی۔

"اب یہ بھی کوئی اور بتائے گا تمہیں؟ خود تمہیں کیا لگتا ہے' اپنا دماغ' اپنی عقل استعمال کرو۔" ماہ نور کو مشورہ دے کر وہ کیک کا سانچہ اوون میں رکھنے لگی جو وہ پہلے ہی گرم کر چکی تھی۔

"میں نے بہت سوچا' مگر کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی۔" ماہ نور نے کندھے اچکائے۔

"کبھی بہت بڑا غم لگتا ہے یہ زندگی جیسے سراپا درد بن گئی ہو۔ اپنی ذات کی مٹی پلید لگتی ہے اور کبھی سوچتی ہوں کیا بکواس ہے؟ جو میرا ہیرو بننے کو تیار نہیں' میں اس کے لیے ٹریجڈی کوئین کیوں بنوں؟"

"یہ کی ناجواں مردوں والی بات۔" نوال دوسری بات سن کر بھڑک اٹھی۔

"میں لڑکی ہوں۔" ماہ نور نے منہ بنایا۔

"محاورے میں مردوں کا ہی ذکر ہے نا۔" نوال نے صفائی پیش کی۔

"ایک تو یہ مرد ہر جگہ ہی چھائے ہوئے ہیں۔ محاوروں میں بھی عورتوں سے زیادہ جگہ اس مخلوق نے گھیری ہوئی ہے۔" ماہ نور "اس مخلوق" سے کچھ زیادہ ہی الرجک نظر آرہی تھی۔

"اب کچن سے تو باہر نکلو' بلاوجہ گرمی میں آگئیں۔" نوال اس کا کندھا ہلا کر کچن سے باہر آنے لگی۔ ماہ نور جیسے بادل نخواستہ اٹھی تھی۔

کمرے میں حنین اپنا نگار خانہ آباد کیے بیٹھی تھی۔ اس نے ایک آرائشی لیمپ بنایا تھا جس پر بڑی مہارت اور نفاست سے چھوٹے چھوٹے شیشے لگا رہی تھی۔

"ایک یہ ہیں' فکر نہ فاقہ عیش کر کاکا!" ماہ نور نے رشک بھری نظروں سے حنین کو دیکھا۔

"کیوں مجھے کیا فکر ہونی چاہیے۔" حنین نے نظریں اٹھائے بغیر استفسار کیا۔

"تمہاری ہونے والی ساس آئے دن فرمائشوں اور مطالبات کا ٹوکرا اپنے سر پہ اٹھا کر لاتی ہیں اور یہاں لا کر انڈیل دیتی ہیں۔" ماہ نور نے فکر کی وجہ بتائی جو حنین کو پہلے سے ہی معلوم تھی۔

"نہیں ٹوکری سر پہ لاد کے لانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ شریف خاتون خود ہی سراپا فرمائش ہیں۔ تب ہی تو میں نے ابا میاں سے کہہ دیا ہے کہ میں ان معزز خاتون کی بہو بننے میں ذرا دلچسپی نہیں رکھتی۔" حنین اپنے کام میں مصروف سنجیدگی سے بول رہی تھی۔

"حنین! تمہیں دکھ نہیں ہو رہا؟" المیہ ہیروئن ماہ نور کا غم پھر سے تازہ ہو گیا۔

"اتنی اسٹوپڈ باتوں پہ کون دکھی ہوتا ہے؟" حنین نے جیسے مکھی اڑائی۔

"دنیا والے کیا کہیں گے؟" ایک غمگین روایتی ڈائیلاگ ماہ نور بی بی نے انتہائی دکھی لہجے میں دہرایا۔

"دنیا والوں نے بھلا کیا کہنا ہے؟ ہو سکتا ہے اس ٹریجڈی پہ کوئی دھماکے دار ناول لکھ ڈالے یا کوئی مسالے دار فلم یا ڈرامہ بن جائے آخر دنیا والے تو فارغ بیٹھے ہیں نا ہر مصروفیت سے فارغ۔ حتیٰ کہ عقل سے بھی تمہاری طرح۔" نوال کے صبر کا پیمانہ لبریز

ہو گیا اور وہ دانت پیس کر ماہ نور کو لتاڑنے لگی۔

"تمہارے ساتھ یہ سب ہو تا نا تو پتا چلتا تمہیں۔" ماہ نور بلبلا گئی۔ دل اس وقت کچھ زیادہ ہی دکھی ہو رہا تھا۔ اپنا غم پھر حنین کا دکھ' دونوں مل کر سب سے زیادہ اسی پر اثر انداز ہو رہے تھے۔

"ہمیں اس غم سے گزرے بغیر ہی اس کی شدت کا اندازہ ہو گیا ہے۔ پچھلے ایک ہفتے سے الیہ ہیروئن بنی پھر رہی ہو' اب بخش دو ہمیں۔" امرحہ نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔

"دفع ہو جاؤ تم سب کی سب۔" ماہ نور نے دفع ہونے کا حکم نامہ تو ان تینوں کو جاری کیا اور احتجاجاً" خود ہی کمرے سے واک آؤٹ کر گئی۔



نئے مکان میں کام کرواتے ہوئے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ کام کرنے میں پسینہ نکلتا ہے اور کروانے میں بندے کا تیل ہی نکل جاتا ہے۔ یہ جو مستری صاحب دریافت ہوئے تھے چچا میاں کی کوششوں سے' ضرور لکھنؤ یا اودھ کے تاجداران سے ان کا شجرہ ملتا تھا۔ اتنے نازک مزاج اور اتنے ہی آرام طلب' مشکل سے تین گھنٹے کا کام تھا جس میں صبح سے شام کر دی۔

اللہ اللہ کر کے اس کا کام ختم ہوا۔ ان سے زیادہ سکون کا سانس میں نے لیا۔ الیکٹریشن اور پلمبر بے چارے شریف تھے' زیادہ پریشان نہیں کیا۔ بس ہر ایک گھنٹے بعد چائے کے ایک کپ کا مطالبہ تھا جس کے لیے میں نے قریبی ہوٹل کے ایک "چھوٹے" کی ڈیوٹی لگا دی تھی۔ آخر میں رنگ و روغن کے لیے جو "ہیرو" آیا وہ مجنوں' فرہاد' رانجھا اور اسی قسم کے دوسرے بزرگان محبت کے قبیلے کا جواں مرد تھا۔ خدا جانے عشق تازہ تازہ تھا یا منگنی نئی نویلی' وہ بندہ آدھے گھنٹے کام کرتا تو ایک گھنٹہ اپنے موبائل پہ صرف کرتا۔

"او بھائی صاحب!" دوپہر کے بعد میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو میں نے اس محبت کے مارے کو بعد عزت و احترام مخاطب کیا۔

"جی بھائی جی!" عزت کا جواب عزت سے ملا یہ اور بات کہ نظریں اٹھانے کی زحمت موصوف نے نہیں کی' جو بدستور موبائل اسکرین پر جمی تھیں۔

"جس رفتار سے آپ کام کر رہے ہیں مجھے نہیں لگ رہا کہ یہ دو ہفتے میں ختم ہو جائے گا۔" میں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"کیوں بھائی صاحب آپ کو یہ خیال کیسے آیا؟" بڑے اطمینان سے سوال کیا گیا۔

"کیونکہ ابھی تک اتنے گھنٹے آپ نے کام نہیں کیا جتنے گھنٹے موبائل استعمال کیا ہے۔" میں بھنا گیا (معصومیت تو دیکھو ہیرو کی)

"یہ... " ہیرو کھسیا گیا۔ "یہ تو بس یوں ہی... ویسے بھی اس کی بیٹری اینڈ پر ہے۔ بند ہو جائے گا ابھی خود ہی۔" اس کی وضاحت پر بھی میں مطمئن نہیں ہوا تھا۔

"آپ کل سے یہ موبائل اپنے گھر چھوڑ کر آئیں گے ورنہ یہ ٹھیکہ کینسل۔" میں نے صاف صاف اپنا فیصلہ سنایا تو اس کا چہرہ اتر گیا۔

"یہ تو زیادتی ہے بھائی جی!" ہیرو نے احتجاج کیا۔

"مجھے کام وقت پر مکمل چاہیے۔ دو ہفتے سے ایک دن بھی اوپر میں افورڈ نہیں کر سکتا۔" میں نے اپنا لہجہ سخت کیا۔

"اچھا جی!" نوجوان کا منہ لٹک گیا۔

مجھے غلط نہ سمجھیے گا عزیز قارئین۔ میں ہرگز ہرگز بھی دو محبت بھرے دلوں کا دشمن نہیں ہوں۔ نہ ہی ان کے درمیان سماج کی دیوار بننے کا کوئی شوق ہے۔ مجھے بس یہ ہے کہ کام کے دوران بندے کو پروفیشنل ہونا چاہیے' کام کے وقت کام' یہ قول بڑے بھائی صاحب کا تھا اس وقت پتا نہیں کیسے یاد آ گیا ٹھیک ہے کام خود کرنے کے معاملے میں' میں ذرا (بقول ابا) کافی سے زیادہ) ڈھیلا ہوں' مگر کام کروانے کے معاملے میں بھی سستی کا مظاہرہ کرتا تو ابا کا سرمایہ اور میرا وقت ضائع ہوتے اور ابا پھر مجھے ضائع کر دیتے اور اس بھری جوانی میں یہ ہرگز مجھے منظور نہیں۔

بات کہاں سے کہاں نکل گئی تو آمدم بر سر مطلب یہ کہ "ہیرو صاحب" کو میں نے اس حد تک "ٹائٹ" کردیا تھا کہ اگلے دن انہوں نے سارا دن قائد اعظم کے قول پر ہی عمل کیا یعنی کام' کام اور بس کام۔ میں اتنا خوش ہوا کہ موبائل میں بیلنس لوڈ کروانے کے لیے اسے سو روپے دیے۔ وہ مجھ سے بھی زیادہ خوش ہوگیا۔

"بھائی جی' آپ تو بڑے اچھے انسان ہو۔" فقط سو روپے اضافی پاکر اس کی باچھیں کھل گئی تھیں۔

"تم بھی بڑے معصوم ہو۔" میں نے مسکرا کر اس کا گال تھپتھپایا۔ بے چارا معصوم ہی تو تھا اگر میرے ابا کی رائے میرے بارے میں جان جاتا تو کبھی بھی ایسا خوب صورت بیان میرے حق میں نہیں دیتا۔

گھر پہنچا تو حنین' چچا میاں اور چچی بیگم کی گرما گرم بحث چل رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر تینوں خاموش ہوگئے۔ حنین اندر چلی گئی۔

میں بہرا تو نہیں ہوں نہ ہی اتنا گھامڑ اور کوڑھ مغز۔ جتنا میرے ابا حضور مجھے سمجھتے اور کہتے ہیں۔ گھر میں رہتے ہوئے اور چلتے پھرتے ادھر ادھر سے کانوں میں آوازیں پڑ ہی جاتی ہیں۔ اتنا تو پتا چل گیا تھا مجھے کہ حنین صاحبہ اپنے لالچی سسرال کی وجہ سے وہاں شادی پر آمادہ نہیں اور ماہ نور کا منگیتر ماہ نور سے شادی پر آمادہ نہیں۔ تو یہاں کے معاملات بڑے گمبھیر تھے گو چچا اور چچی نے ابھی تک مجھے شریک راز یا شریک غم نہیں کیا تھا' مگر ان کے چہروں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ دونوں کتنے پریشان تھے۔ میں نے سوچا کہ ان کی دلجوئی کروں' مگر کیسے؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ میری اس دخل در معقولات کا برا مان جاتے اور پھر میرے اپنے ہی سیاپے بہت تھے۔ نہیں' سیاپا تو دراصل ایک ہی تھا' لیکن وہ ایک مسئلہ ہی اتنا بڑا اور اہم تھا کہ بقول شخصے میں گوڈے گوڈے اس میں غرق ہوا پڑا تھا اور نکلنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آرہی تھی۔

یہ سیاپا آخر تھا کیا؟ وہی جو اس عمر میں ہر ایک کے گلے پڑ جاتا ہے' عارضہ محبت' بھری جوانی میں مجھے بھی لاحق ہوگیا تھا۔ مسئلہ صرف ایک تھا۔ میرے ابا حضور جو شہنشاہ اکبر بنے "انار کلی نامنظور" کا فیصلہ دے چکے تھے اور میں شہزادہ سلیم بنا محبت زندہ باد کے نعرے لگا رہا تھا۔ اپنے ابا کے سامنے نہیں "دل ہی دل میں"۔ اپنے ابا کے سامنے یہ جرأت بھلا کر سکتا ہوں میں۔ ابا تو بعد میں لٹکائیں گے مجھے' امی حضور پہلے میرے کان کھینچیں گی۔ گستاخ کا لقب الگ مل جاتا۔ ویسے تو ماشاء اللہ القابات کے معاملے میں خود کفیل ہوں۔ ابا کی زبان نامہربان کی وجہ سے ایک اور کا اضافہ ہو جاتا کوئی بات نہیں' مگر امی کی کڑی تربیت کہ باادب بانصیب' بے ادب بے نصیب۔ اسی لیے ابا کے سامنے کھل کر کبھی اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکا' امی کو حال دل سنایا ڈھکے چھپے لفظوں میں' مگر وہ بھی ابا کی ہی ہم نوا نکلیں۔

"مجھے پسند نہیں نہ عافیہ نہ اس کی فیملی۔" امی کی عدالت عالیہ نے کیس اور فریقین کو سنے بغیر ہی فیصلہ سنادیا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے وجہ پوچھی۔

"لالچی ہیں۔" کھٹاک سے جواب ملا۔

"اس دنیا میں کون ہے جو لالچی نہیں۔" میں نے نامعلوم فلسفی کا یہ فلسفہ امی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"اب ایسا بھی کوئی کال نہیں پڑا دنیا میں۔ اچھے لوگ ابھی موجود ہیں جن کے دم سے دنیا قائم و دائم ہے اور چل رہی ہے۔"

امی نے حقیقت پسند بنتے ہوئے میرا (یا کسی اور کا) فلسفہ مسترد کیا بیک جنبش زباں۔ ایک لمحہ نہیں لگایا انہیں سنانے میں اور میرا دل ٹوٹنے میں۔ اپنا ٹوٹا ہوا دل لے کر امی ابا کو منانے کی کوششوں میں مصروف تھا کہ ابا نے یہاں بھیج دیا جیسے انگریز اپنے شوریدہ سر باغیوں کو کالا پانی بھیج دیا کرتے تھے۔ خیر میں اتنا شوریدہ سر باغی تو نہیں تھا اور یہاں آکر اندازہ ہوا کہ یہ جگہ کوئی اتنا "کالا پانی" بھی نہیں تھی۔

قصہ مختصر کہ ان کی یاد روز آتی ہے اور فون کال بھی۔ کبھی سوچتا ہوں کہ یاد اور رابطے کا آپس میں کتنا

گہرا تعلق ہے اگر جو یہ روز رابطے نہ ہوں تو یادوں کے نقش گہرے ہونے کے بجائے مدہم پڑتے جائیں۔ محبت پھر کیا ہے؟ جو رابطوں کی، تعلق کی محتاج ہو وہ محبت ہی ہے؟ رات کے تین بجے اپنی محبت کے بارے میں سوچتے ہوئے بندہ شاید تھوڑا قنوطی تھوڑا فلسفی سا ہو ہی جاتا ہے۔ کیوں؟



صبح یعنی تقریباً" دس بجے ناشتے سے فارغ ہو کر میں اپنے وائٹ ہاؤس کا رنگ و روغن کروانے کے لیے نکلنے ہی والا تھا جب چچی بیگم اور امرحہ کی آوازیں کانوں میں پڑیں۔ وہ امرحہ کو ہدایات دے رہی تھیں کہ بجلی کا بل بھروانے کے بعد کیا کیا سودا لانا ہے بازار سے۔ گوشت ذرا دیکھ کر لانا ــــــ ںرے چھیچھڑے بھر دیتا ہے۔

ان کا ہدایت نامہ ختم ہوا تو میں اندر چلا گیا۔

"بل اور سامان کی لسٹ مجھے دے دیں۔" میں چچی بیگم سے مخاطب ہوا۔

"مگر بیٹا! تم تو وہاں جا رہے ہو نا رنگ و روغن کروانے۔ گھر کو دیکھو گے یا سودا سلف کی خریداری کرو گے؟" چچی بیگم ہچکچائیں۔

"میں مینج کر لوں گا۔ لائیے بل دیجیے۔" میں نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"آپ رہنے دیں۔ ہم لوگ اپنے کام خود ہی کرنے کے عادی ہیں۔ آپ کل چلے جائیں گے تو تب بھی اپنی ذمہ داریاں ہمیں خود ہی اٹھانی ہیں۔" امرحہ نے پہلی بار مجھے مخاطب کیا تھا اس کا لہجہ درشت تھا نہ انداز طنزیہ پھر بھی اپنی پیش کش کا رد کیا جانا مجھے اچھا نہیں لگا۔

"مستقل تو دنیا میں کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ زندگی بھی ایک روز ختم ہو جانی ہے پھر بھی ہم اسے گزارنے کے کتنے جتن کرتے ہیں، منہ چھپا کر ایک کونے میں تو نہیں بیٹھ جاتے کہ زندگی آج ہے کل نہیں ہو گی اور ویسے بھی کل تو آپ بھی یہاں نہیں ہوں گی۔"

میں نے بڑی متانت سے کہتے ہوئے چچی بیگم کے ہاتھ سے بل اور سودے کی لسٹ لی اور پلٹا۔

"ارے بیٹا! پیسے تو لیتے جاؤ۔" چچی بیگم نے پیچھے سے آواز لگائی۔

"آکر حساب کر لوں گا۔" میں نے پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا اس لیے نہیں کہ پتھر ہو جانے کا خدشہ تھا بلکہ اس لیے میں جلدی میں تھا۔

پہلے نئے نویلے مکان گیا، وہاں ہمارے ہیرو صاحب آکر کام شروع کر چکے تھے۔ انہیں مزید کام کام اور بس کام کی ہدایات دے کر میں مشن پر نکل پڑا، جی ہاں مجھے بعد میں علم ہوا کہ بل بھرنا اور خریداری کرنا کتنا بڑا مشن بلکہ مشن امپاسیبل ہے۔ داد دیتا ہوں اپنے ہم وطنوں کو، مرد ہوں یا خواتین، ایسی لمبی لمبی لائنوں میں کھڑے ہو کر بل بھروانا جیسی امریکن ویزا قونصلیٹ کے سامنے ہوتی ہیں "نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاک کاشغر تک۔"

سودے سلف کے لیے بازار کی خاک چھاننا ایک دکان سے دوسری دکان، دوسری سے تیسری بینک کے آگے لگی لمبی سی قطار بھگتا کر بل بھر کر میں سودا سلف لینے کی مہم پر نکلا پھر مجھے خیال آیا کہ بازار میں دکان در دکان خوار ہونے کی کیا ضرورت ہے آخر سپر مارٹ کس مرض کی دوا ہے۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ سپر مارکیٹ ہے تو مرض کی دوا، لیکن یہ دوا یہاں سے کافی دور تھی۔ رکشہ کر کے وہاں گیا، لسٹ کے مطابق سودا خریدا اور سیدھے گھر آکر چچی بیگم کو سارا سامان دیا۔ حساب کتاب کیا (ان کے حکم کے مطابق) اور پھر "ایک زیر مرمت گھر ہے اور ہم ہیں دوستوں۔"

رنگ ساز ہیرو کے سر پہ کھڑے ہو کر کام کروانے کی سزا یہ ملی کہ ڈھیروں ڈھیر باتیں بھی موصوف کی سننی پڑیں، داستان عشق طولانی ہی نہیں بے حد سنسنی خیز اور طوفانی بھی تھی جو منگنی پر ختم ہوئی۔ "ایک کہانی بڑی پرانی" سنتے ہوئے مجھے اپنے دل میں بھی کچھ کچھ ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اپنی نئی نویلی محبت کو نہ تو میں

بھولا تھا نہ ہی فراموش کیا تھا' بس یہی سوچا تھا کہ جب کوئی خوش خبری ہو دامن میں' اسے سنانے کے لیے تو رابطہ کروں گا اس سے' مگر ایک محبت کے مارے کی قربت اور ہم نشینی کا یہ اثر ہوا کہ دھڑکنیں ایک ہی گیت الاپنے لگیں۔

مجھے بھی حیرت ہو رہی تھی کہ آخر میں نے یہاں آنے کے بعد اس سے رابطہ کیوں نہ کیا اور اس نے بھی لاتعلقی اختیار کی ہوئی تھی۔ یہ تو مجھے اندازہ تھا کہ اس کی لاتعلقی دراصل اس کی ناراضی تھی' مگر خیر' یہ ناراضی ختم ہو جائے گی۔ ناراضی کے نمک پہ محبت کی پھوار پڑے تو اسے پگھلنے میں بھلا کتنی دیر لگتی ہے۔

رات میں اس دشمن جاں کو فون کیا' توقع کے عین مطابق وہ سر سے پاؤں تک ناراضی سجائے بیٹھی تھی۔

"جب میرا رشتہ کہیں اور طے ہو جائے گا تب منا لینا اپنے امی ابا کو۔" گلے شکوے ختم ہوئے تو مجھ پہ طنز شروع ہو گیا۔

"امی ابا مان جائیں گے' یہ نوبت نہیں آنے دوں گا میں۔" میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

"اپنی امی کو بڑی مشکل سے روکا ہوا ہے میں نے' اتنے اچھے اچھے رشتے آئے ہوئے ہیں میرے۔"

"اچھا!" میں نے ایک بے چاری سی آہ بھری' خوب صورت لڑکی سے محبت کرنا بھی مصیبت ہی ہے آئے دن رقیبوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔

"رانی! میرے دل کی رانی تم ہی بنو گی' یہ یاد رکھنا۔" میں جذباتی ہوا۔

"تم بس ڈائیلاگ جھاڑتے رہنا' میری ڈولی کوئی اور لے جائے گا' دیکھتے رہنا کھڑے ہو کر۔" جذباتی ڈائیلاگز مارنے میں ہماری رانی بھی کسی سے کم نہ تھی۔

"ایسی باتیں تو مت کرو۔" میرے دل کو کچھ کچھ ہونے لگا۔

"رشتہ بھیج دو' نہیں کروں گی ایسی باتیں۔"

"میرے بس میں ہو تو میں صبح سورج نکلنے کا انتظار بھی نہ کروں' رات کے گیارہ بجے ابھی رشتہ بھیج دوں'

مگر ساری بات ہی یہی ہے کہ نہ میرا بس چلتا ہے نہ ہی امی ابا کے سامنے میری چلتی ہے۔" میں نے پھر بے بسی کا اظہار کیا تو وہ بھنا گئی۔

"پتا نہیں کیسے لڑکے ہو تم' دنیا جہان کے لڑکے اپنے پیرنٹس کو چٹکی بجاتے منا لیتے ہو' تم سے اتنا ذرا سا کام نہیں ہو رہا۔"

"کہاں ہیں ایسے "استاد" لڑکے' کسی ایک آدھ کا پتا دے' دو کوئی ترکیب پوچھ آؤں گا۔"

"کہیں جانے کی کیا ضرورت ہے ایک آدھ ترکیب تو میں بھی بتا سکتی ہوں۔" رانی پرجوش ہوئی خودکشی کی دھمکی دے دو۔"

"خودکشی؟" میری آواز ہی بند ہو گئی یہ لفظ سن کر۔

"کرنے کو نہیں کہہ رہی ڈفر' دھمکی دینے کو کہہ رہی ہوں۔" اس نے ڈانٹا۔ "تم میرے ابا کو ٹھیک سے جانتیں تو کبھی یہ مشورہ نہیں دیتیں' میں اگر ان کے سامنے خودکشی کی دھمکی دوں تو وہ میرے کچھ کرنے سے پہلے خود ایسا بہت کچھ کر ڈالیں گے کہ میری دھمکی افغان صدر یا بھارتی وزیراعظم کی محض گیدڑ بھبھکی بن کر رہ جائے گی۔"

"ایک تو تم عجیب عجیب باتیں بہت کرتے ہو۔" رانی پتا نہیں کیوں جھلا گئی۔

اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس سے اظہار محبت کے علاوہ میں اور کون سی "عجیب عجیب" باتیں اس سے کرتا ہوں؟

رانی نے آف موڈ کے ساتھ فون آف کیا تو میں نے امی کو ملا لیا۔

"کیسا ہے میرا بچہ؟" امی عادت اور فطرت کے مطابق فوراً" جذباتی ہو گئیں۔

"ٹھیک ہوں' یہاں میرپور خاص میں پڑا ہوا کراچی کے سپنے دیکھتا رہتا ہوں۔"

"صحت کیسی ہے تیری' کمزور تو نہیں ہو گیا؟" امی کی مامتا ویسے تو ہر وقت بے دار ہی رہتی تھی' مگر دور ہو کر تو پہلے سے بھی زیادہ جاگنے لگی تھی۔

"ابھی تک تو نہیں ہوا۔ امکان' مگر یہی ہے کہ

ہو جاؤں گا۔"

"ارے کمزور ہوں تیرے دشمن' یہ بتا اس مہینے کے خواتین اور شعاع پڑھے؟"

"کل گیا تھا بک اسٹال پر' ملا ہی نہیں' ایک دو دن میں آئے گا۔"

"اچھا' یہاں تو آگیا' میں نے پڑھ بھی لیا۔"

"ہاں جی بڑے شہروں کی بڑی باتیں' میں نے یوں کہا جیسے اپنی اب تک کی زندگی کراچی میں نہیں میر پور میں گزاری ہو۔

"تیرے ابا بڑا اُدھم مچا رہے ہیں شادی کے لیے۔"

"ہیں؟" امی کی اگلی بات سن کر میں بھونچکا رہ گیا۔

"ابا کو یہ کیا سوجھی اس عمر میں' اب اپنے بچوں کی شادیاں کرنے کا وقت ہے یا اپنے سر پہ سہرا سجانے کا؟"

امی کی بات سن کر میں ایسا حق دق ہوا کہ جو منہ میں آیا بولتا گیا۔

"فضول باتیں کیوں کرنے بیٹھ گیا۔ میں تو کمال کی بات کر رہی تھی' اس کی شادی کے لیے تیرے ابا اُدھم مچا رہے ہیں کہ بس جلدی سے کردو۔ اب اتنی جلدی لڑکی کہاں تلاش کروں' اپنے بھائی کو تو تو جانتا ہی ہے لڑکی دیکھنے میں بھی اچھی ہو' کوکنگ میں بھی ماہر ہو' اب پہلی دوسری ملاقاتوں میں کیسے پتا چلے کہ لڑکی کو پکانا آتا ہے یا نہیں' لوگ تو بازار کے سموسوں اور گلاب جامن سے تواضع کرکے دھڑلے سے کہہ دیتے ہیں کہ بچی نے خود اپنے ہاتھوں سے گھر پر بنائے ہیں۔ سمجھایا بھی تمہارے بھائی کو کہ بیٹا کوئی شریف فیملی دیکھ لیتے ہیں۔ شکل و صورت اللہ کی بنائی ہے' مجھے تو سب ہی لڑکیاں پیاری لگتی ہیں' کھانے پکانے کا کیا ہے' شادی کے بعد جب سر پر پڑتی ہے تو سب ہی سیکھ جاتی ہیں' مگر یہ جو کمال ہے نا اوندھی کھوپڑی ہے بالکل تیرے ابا کی طرح' کوکنگ ایکسپرٹ ہونی چاہیے لڑکی' جیسے اپنے ولیمے کا کھانا اسی سے پکوائے گا الو کہیں کا۔" امی کی خفگی جو مجھ سے شروع ہوئی تھی کمال پر آکر ختم ہوئی۔

ان کی خفگی پر ہنسنے کے بعد میں سوچ میں گم ہو گیا۔

"تو بڑے بھائی کو چن (چاند) بھی چاہیے اور باورچن بھی؟"

دنیا میں کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کا حل نہ ہو' کوئی کام ایسا نہیں جو ناممکن ہو' سوچنے بیٹھا تو سوچ کے کئی در وا ہو گئے اور ان ہی کے درمیان مسئلے کا حل بھی نظر آگیا۔

میں نے امی کو اگلے دن دوبارہ فون کیا۔

"میں نے کمال بھائی کے لیے ایک لڑکی دیکھی ہے۔" میں نے چھوٹتے ہی انہیں خوش خبری سنائی۔

"کہاں؟"

"یہیں اسی گھر میں' چچا میاں کی بیٹی ہے نا نوال' بڑی اچھی کوکنگ کرتی ہے' ذائقہ ہے ہاتھ میں۔" میں نے بالکل سچی سچی تعریف کی اس کی۔

"اچھا!" امی کی آواز میں خوشی کی جھلک نمایاں تھی۔

"دیکھنے میں کیسی ہے؟ میں نے تو سالوں پہلے کبھی دیکھا تھا' چھوٹی چھوٹی سی تھیں چاروں بہنیں۔"

"اچھی ہے' بقول آپ کے سب ہی لڑکیاں اچھی ہوتی ہیں پیاری ہوتی ہیں۔" میں نے انہیں یاد دلایا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس معاملے میں بھی میں امی کا ہم خیال تھا۔ مجھے ہر لڑکی پیاری لگتی ہے۔۔۔ ایک منٹ محترم قارئین' اس سے پہلے کہ آپ لوگ میرے بارے میں کوئی غلط رائے قائم کریں' میں اپنی بات کی وضاحت کردوں' دراصل اللہ کی یہ تخلیق جسے انسان کہتے ہیں' مرد عورت سے قطع نظر دنیا کا ہر انسان' ہر فرد اپنی جگہ خوب صورت ہے' پیارا ہے۔ حسین ہے' انہیں رنگ و روپ اور شکل و صورت کے معیار سے جانچنا بڑی سطحی سی بات ہے۔ میرا اس بات پر یقین ہے اور میں اسی پر عمل کرتا ہوں تو اس تناظر میں میرا کہنا ہے کہ مجھے ہر لڑکی پیاری ہی لگتی ہے۔ نوال بھی پیاری ہے۔ رہا ہمارے بھائی صاحب کا معیار حسن تو یقیناً" انہیں بھی نوال پسند آجائے گی کیونکہ اگر یہ مقولہ درست ہے کہ مرد کے دل کا راستہ معدے سے ہو کر جاتا ہے تو ہمارے بھائی صاحب کے دل پر براجمان

ہونے کے لیے نوال کو کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔

ویسے میں اس مقولے کو سوچتا ہوں جو خدا جانے کسی چٹورے مرد کی ایجاد ہے یا کسی گھر گرہستن نیک بی بی کا' مجھے کچھ اور بھی خیالات آتے ہیں۔ **مثلاً** "یہ مرد کے دل کا راستہ معدے سے ہو کر نہیں گزرتا' کچھ مردوں کے دلوں کا راستہ آنکھوں سے اور کچھ کا دماغ سے بھی ہو کر گزرتا ہے۔

یہ اور بات کہ دنیا میں ذہین خواتین سے متاثر ہونے والے مرد بہت ہوتے ہیں' مگر انہیں پسند کر کے زندگی میں شامل کرنے والے افراد کم' کیوں بھئی؟ خیر یہ ایک بحث طلب موضوع ہے' کسی رائٹر کو خیال آئے تو اس پر بھی کوئی تحریر ہونی چاہیے۔ میں تو بات کرتے کرتے کہیں سے کہیں نکل جاتا ہوں' میں امی سے کمال اور نوال کے رشتے کی بات کر رہا تھا اور اس کے بعد اپنی درخواست بھی ان کی خدمت میں پیش کرنے والا تھا۔

"نہ تیرے ابا راضی ہیں نہ میں۔" امی نے کوئی نئی بات کرنے کے بجائے وہی پرانا جواب نشر مکرر پیش کر دیا۔

"رانی اچھی لڑکی ہے امی!" اف' میرا دل احتجاج اور بغاوت پر آمادہ تھا۔

"اس کے ماں باپ کی عادت اچھی نہیں ہے بیٹا۔ لالچی لوگ ہیں وہ۔" امی کی وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔

"اس کے ماں باپ سے کیا لینا دینا ہمیں' ضروری ہے کہ وہ بھی اپنے اماں ابا جیسی ہو۔" میں جھنجلا اٹھا۔

"ضروری ہے' اولاد عموماً" اپنے والدین جیسی ہی ہوتی ہے' چاہے کم ہو یا زیادہ' والدین کی خصلت' عادت مزاج' خوبیاں' خامیاں' ان سب کا کچھ نہ کچھ اثر تو بچوں میں آتا ہے۔" امی کی باتوں میں ان کا تجربہ بول رہا تھا یا مشاہدہ' میں اس پر توجہ دینے کے بجائے بس اپنی ہی بول رہا تھا۔

"ضروری نہیں ہے کچھ بچے اپنے والدین سے مختلف بھی ہوتے ہیں' میں ابا سے کتنا الگ ہوں۔" میں نے دلیل دی۔

"تم سمجھتے ہو ایسا' مگر ایسا ہے نہیں' آدھے سے زیادہ تم اپنے ابا کی طرح ہو' بس لاپروائی اور لاابالی پن کا ایک خول ہے' جو تم نے خود پر چڑھا لیا ہوا ہے۔ جس دن یہ اتر گیا' اندر سے بالکل دوسرے کریم قریشی نکلو گے۔"

"اف امی جی! جذباتی **ڈائیلاگز** بول کر مجھے میرے موضوع سے نہ ہٹائیں ابا کو کسی طرح منا لیں نا۔"

"اور مجھے کون منائے گا؟"

"آپ کو تو میں منا لوں گا یوں ہی چٹکی بجاتے میں۔" میرے دعوے پہ وہ ہنس پڑیں۔

"اچھا دیکھتے ہیں۔" امید کا ایک ننھا سا جگنو انہوں نے میرے ہاتھ میں تھمایا اور میں اسے پا کر ہی خوشی سے جھوم اٹھا۔



نیم کی چھاؤں میں چارپائی پر دونوں چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ ان گنت خیالات ذہن کے کواڑوں پہ دستک دیتے اور گزرتے چلے جاتے۔ حنین کی شفاف پیشانی پہ دو تین لکیریں غماز تھیں کہ وہ کسی گہری سوچ میں گم ہے۔ ماہ نور کتنی دیر سے اپنے ناخن کتر رہی تھی' اس شغل سے بے زار ہوئی تو وہی بے زاری چہرے پہ سجائے حنین کو دیکھنے لگی۔

"تمہیں کس بات کا دکھ ہو رہا ہے' جو چاہتی تھیں' وہ ہو تو گیا۔ تمہاری شادی بھی کینسل ہو گئی' میری بھی۔"

حنین نے پہلے تو چونک کر اسے دیکھا پھر اس کے لبوں پہ خفیف سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"نہیں کوئی دکھی نہیں ہوں' ابا میاں اور اماں کے بارے میں سوچ رہی تھی' وہ دونوں خاصے پریشان ہو گئے ہیں۔"

"پریشانی کی ہی بات ہے' آج کل اچھے رشتوں کا کال ہے' لوگ خوبصورتی بھی چاہتے ہیں' ساتھ ڈھیروں ڈھیر جہیز بھی اور اگر لڑکے کو اسٹیبلش کرنے کے لیے وسائل موجود ہوں تو سونے پہ سہاگہ۔" ماہ نور بہت قنوطی ہو رہی تھی اور ہمارے پاس تو کچھ بھی وافر

مقدار میں نہیں۔ ہر شے بس درمیانے درجے کی ہے۔ خوبصورتی بھی' ذہانت بھی' قابلیت صلاحیت بھی' مادی وسائل اور پیسہ بھی۔ ہمارے لیے کون آئے گا؟"

"خود کو اتنا ڈی گریڈ مت کرو' شکر کرنے کی عادت ڈالو' ہم جیسے بھی ہیں' بہت سوں سے پھر بھی بہتر ہیں اور تم آنکھیں بند کرکے یا کھول کے کسی شہزادے کی آمد کے خواب مت دیکھو' اپنی فیوچر پلاننگ کرو اور کچھ کرو' کوئی کورس' کوئی ڈپلومہ' کوئی مصروفیت تلاش کرو اپنے لیے۔" حنین کا لیکچر نرا لیکچر ہی نہیں تھا بلکہ اس میں ڈانٹ کا عنصر بھی شامل تھا۔

"کی تو تھی "فیوچر پلاننگ" اپنی منگنی کے بعد' منگنی ٹوٹ گئی' سارے خواب ہی ٹوٹ گئے۔" ماہ نور پہ حنین کے لیکچر کا فقط اتنا اثر ہوا تھا جیسے چکنے گھڑے پہ پانی بوندیں۔

"اور بھی غم ہیں زمانے میں شادی کے سوا۔" حنین نے سنجیدگی سے ماہ نور کی "غیر سنجیدگی" کو دیکھا۔ "شادی کا جب وقت آئے گا ہو جائے گی' جب تک نہیں ہو رہی اس کے غم میں گھلنے کے بجائے خود کو کسی اور مصروفیت اور محنت میں گھلالو۔"

"کیا کروں؟ جو کام تم کرتی ہو اس کی صلاحیت نہیں ہے مجھ میں' ماسٹرز کے بعد آگے پڑھنے کی ہمت نہیں ہے اب۔ سلائی کڑھائی اور اس طرح کے دوسرے کاموں میں دل نہیں لگتا میرا' کمپیوٹر' موبائل کی دنیا میں جو انقلاب لانا تھا' وہ بل گیٹس' مارک زکر برگ اور اسٹیو جابز لا چکے۔ مجھے اس فیلڈ سے صرف تھوڑی دیر کی تفریح کی حد تک دلچسپی ہے اور اس سے زیادہ نہیں۔ لکھنے کا شوق ہوا تھا' بڑے شوق سے دوچار افسانے لکھے تھے' اس میں مزید مطالعے کا مشورہ مل گیا ایڈیٹر صاحبہ کی طرف سے۔ اب بتاؤ کیا کروں میں؟"

"ماسٹرز کرنے کے بعد بھی پوچھ رہی ہو کیا کروں؟ کچھ نہیں کر سکتیں تو ٹیچنگ ہی کرلو۔"

"دیکھا' اسی سوچ نے تو ہمارے شعبۂ تعلیم اور طلبہ کا بیڑا غرق کیا ہوا ہے۔ "کچھ نہیں کرسکتے تو ٹیچنگ ہی کرلو" بچے کا مستقبل استاد کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔" ماہ نور نے چمک کر اسے جتایا۔

حنین مسکرا دی۔

"تمہاری سوچ اچھی ہے' تم اسی لائن میں قدم رکھو۔ جب تم دوسروں کی استاد بنو گی تو اپنے لیے تمہیں دوسرے استاد کی ضرورت نہیں ہوگی۔ تم خود ہی اپنی رہنمائی کرسکتی ہو۔"

"اچھی بھلی شادی ہو رہی تھی۔ عیش کی زندگی گزارتی۔" ماہ نور نے ملازمت کا سنتے ہی منہ لٹکا لیا۔

"کس گدھے نے کہا ہے کہ شادی کے بعد عیش کی زندگی ہوتی ہے۔" حنین نے اسے گھور کے دیکھا۔

"کسی نے نہیں' مجھ گدھی کا ہی خیال تھا یہ۔" ماہ نور نے سادگی سے اعتراف کرتے ہوئے اسے دیکھا تو دونوں کی ہنسی نکل گئی۔



موبائل کی چمکتی اسکرین پر نمبر دیکھ کر میری جان نکل گئی گو کہ وہ میری جان کا ہی نمبر تھا۔ عافیہ عرف رانی' مگر اپنے نام کے بالکل برعکس عافیت سے مجھے رہنے ہی نہیں دے رہی تھی۔ ناراضی کیا ختم ہوئی' دن رات فون کالز کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا اور یہ فون کالز اگلی ناراضی کا پیش خیمہ تھیں۔

"کیا ہوا' تم نے بات کی گھر میں؟" میری معصوم سی "ہیلو" کے جواب میں پتھر مار کر سوال ہوا۔ "مختصر بات کروں گی۔ بیلنس تھوڑا ہے۔" ہدایت بھی جاری ہو گئی ساتھ میں۔

"میں اسکائپ پہ رابطہ کرلوں گا رات میں' تفصیل سے بات کریں گے۔" اس کے سوال کا جواب گول کرتے ہوئے میں نے اسے بہلانے کی کوشش کی مگر وہ ہتھے سے اکھڑ گئی۔

"ہلو! میری بات غور سے سنو' تمہارے پاس کل صبح دس بجے تک کا وقت ہے' اگر اپنے ماں باپ کو منا سکتے ہو تو منالو ورنہ مجھے بھول جاؤ۔"

"کیا ہوا' عدالت عظمیٰ بنی ڈیڈ لائن کیوں دے رہی

ہو؟"

"میرا پرپوزل آیا ہوا ہے۔ امی کو بڑی مشکل سے روکا ہے میں نے اگر کل تمہارے گھر والے رشتہ لے کر نہیں آئے تو یہ رشتہ فائنل ہو جائے گا میرے لیے۔ امی کسی صورت اس رشتے کو ہاتھ سے نہیں جانے دیں گی۔ ڈاکٹر ہے لڑکا۔" اس کے جتاتے ہوئے لہجے پہ میں بھنا گیا۔

"انسانوں کا؟"

"نہیں، تم جیسوں کا۔" میرے سوال پہ وہ مجھ سے زیادہ بھنا گئی اور چڑ کر فون ہی بند کر دیا۔

اب ایکشن لینے کی باری میری تھی' میں نے فوراً امی جان کو فون کھڑکایا۔

"امی! آپ آج ہی عافیہ کے گھر چلی جائیں رشتہ لے کر۔"

"ایسی کیا ایمرجنسی ہو گئی؟" ان کے اطمینان بھرے لہجے پر میں جھنجلا گیا۔

"ایمرجنسی تو تب ہو گی جب میں کچھ کر بیٹھوں گا۔ آپ لوگ یہی چاہتے ہیں نا۔" میں انہیں ایموشنل بلیک میل کر رہا تھا۔

"کیا کر بیٹھو گے صاحبزادے؟" ابا کی آواز سن کر میری روح فنا ہو گئی۔ میں امی کی عادت کیوں بھول گیا وہ اکثر اسپیکر کھول کر بات کرتی ہیں اور میری بدقسمتی کہ ابا وہیں بیٹھے تھے۔

"ابا! آپ؟" اضطراب کے عالم میں میرے منہ سے یہی نکل سکا۔

"آگے کہو برخوردار! کیا کرنے کا ارادہ ہے' میری مدد کی ضرورت ہو تو حاضر ہوں میں۔" ابا کا طنزیہ لہجہ مجھے بھگو بھگو کر جوتے مار رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میری پیشانی مزید عرق آلود ہوتی میں نے فون ہی بند کر دیا۔

یا اللہ میں کیا کروں' ایک طرف محبت' ایک طرف ظالم سماج۔

"او نہوں' غلط' ماں باپ ظالم سماج نہیں ہوتے۔" اندر سے ایک کمزور سی آواز نے مجھے گھر کا' مگر میں تو اپنی محبت کا غم منا رہا تھا۔ ایسی کمزور آوازوں پہ دھیان کیا دیتا۔



کمال بھائی کا فون آتے ہی میں نے الٹا سیدھا سامان پیک کرنے کی کوشش کی' مگر نہیں ہوا' اپنی ضروری چیزیں ایک بیگ میں ڈالیں' باقی وہیں چھوڑیں اور دیوانوں کی طرح کراچی بھاگا۔

اسپتال کے کاریڈور میں ہم سب ہی خاموش بیٹھے تھے۔ باقی سب لوگ اپنے اپنے دلوں میں کچھ سوچ رہے تھے یا دعائیں مانگ رہے تھے۔ مجھے نہیں معلوم مجھے تو بس اپنے دل کا حال معلوم تھا۔ اپنی پریشانی' دکھ اور اضطراب دعاؤں کے ذریعے اللہ کو سونپ کر میں اب کچھ اور سوچ رہا تھا۔ میں گھر میں چوتھا بچہ تھا' تین بیٹیوں کے بعد چوتھا بیٹا' امی نے بیٹی کے لیے بڑی دعائیں کی تھیں' انہیں اس وقت میری دنیا میں آمد پر کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی تھی' بیٹی نہ ہونے کی مایوسی نے بیٹے کی خوشی کو دھندلا سا دیا تھا یہ اور بات کہ یہ وقتی جذبات تھے' بعد میں ان کی محبت اور دعائیں ویسے ہی میرا نصیب بنیں جو کہ ایک ماں کی فطرت ہے۔

امی بتاتی ہیں کہ ابا نے بچپن میں میرے بڑے لاڈ اور ناز نخرے اٹھائے تھے (میرے بگڑنے کی وجہ بھی وہ یہی بتاتی ہیں) ابا پہلے مزدور بھی تھے اور شٹرنگ کے ماہر کاریگر بھی' وہ بچپن سے یہی کام کر رہے تھے' اینٹوں کی چنائی سے لے کر چھت ڈالنے تک' پلاستر سمیت ہر کام میں ماہر ہوتے چلے گئے پھر انہوں نے چھوٹے موٹے ٹھیکے لینے شروع کر دیے۔ وہ روزانہ جب بھی کام سے واپس گھر آتے' تھکن' سیمنٹ' بجری اور کوئی نہ کوئی چھوٹی موٹی چوٹ ان کے وجود کا حصہ بنی ہوئی ہوتی تھی۔ رات کو لیٹنے کے بعد سوتے میں ان کے منہ سے کراہیں ضرور نکلتی تھیں۔ پھر بھی وہ ہمیں روزانہ آئس کریم کھلانے ضرور لے جاتے تھے اور جھولا جھلانے بھی۔

میں تین سال کا ہو گیا تھا پھر بھی ان کی گود میں چڑھ

کے باہر جاتا تھا۔ ایک بار ان کے سیدھے ہاتھ اور کندھے میں چوٹ لگی ہوئی تھی 'میں نے حسب روز کی طرح جھولا جھولنے کی ضد کی تو وہ حسب معمول اپنی گود میں چڑھا کے اس پارک میں لے گئے جو ہمارے گھر سے کافی دور تھا۔ مجھے اب خیال آتا ہے کہ مجھ سے گپلو اور فربہ بچے کو ایک ہاتھ سے اٹھائے اٹھائے آنے جانے میں ان کے دوسرے ہاتھ اور کندھے میں بہت درد ہوا ہوگا 'مگر خیر ہمیں بچپن میں اور نہ بڑے ہونے کے بعد 'بہت کم اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ہمارے والدین ہماری ضدوں' فرمائشوں' ضرورتوں اور خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے کس طرح خود کو تھکاتے ہیں۔

ماں کی محبت ضرب المثل ہے 'مگر باپ کی شفقت کا چرچا ذرا کم ہی ہوتا ہے۔ وہ جو چلچلاتی دھوپ میں' کڑکتی سردیوں میں' برستی بارش میں اپنی تھکن اور تکلیف کو ایک طرف کرکے اپنے بچوں کے لیے محنت میں لگا رہتا ہے۔ وہ گھر آتا ہے تو اس کے ہاتھ میں ہماری پسند کا کوئی نہ کوئی پھل' چاکلیٹ یا کھانے پینے کا کچھ نہ کچھ تھیلی میں ضرور ہوتا ہے۔ امی بتاتی ہیں کہ جب گھر میں اتنی خوش حالی اور پیسے کی فراوانی نہیں تھی' ابا ہر عید' بقر عید پر ہم بچوں کو بازار لے جاتے اور کپڑے' جوتے' گھڑی' چشمے ہر وہ شے دلاتے جس پہ ہم ہاتھ رکھ دیتے۔ ہمارے لیے قیمتی سے قیمتی چیزیں خرید کر وہ اپنے لیے معمولی سا جوڑا بنا لیتے۔ جوتے بھی لیے' کبھی نہیں لیے' ہمارے لیے رقم خرچ کرنے کے بعد ان کا مخصوص فقرہ تھا۔

''بس بچوں کا دل چھوٹا نہ ہو باقی سب خیر ہے۔''

ہمارے دل چھوٹے نہ ہوں' اس کے لیے انہوں نے اپنی ضروریات محدود کرلی تھیں اور خواہشات تو شاید انہوں نے اپنی ذات کے لیے پالی ہی نہیں تھیں۔

ہر سال جب ہم نئی کلاس میں جاتے تو ہم سب کے لیے نیا یونی فارم' نیا بیگ' جوتے' اسٹیشنری ہر چیز نئی آتی۔ امی احتجاج بھی کرتیں کہ پچھلے سال کا بیگ ابھی استعمال کے قابل ہے۔ جوتے بھی پورے آرہے ہیں اور یونی فارم کا بھی کچھ نہیں بگڑا 'مگر وہ ہنس کر کہتے۔

''بھلی مانس! بچے کے پاس نئی چیزیں ہوں تو اس کا دل پڑھائی میں خوب لگتا ہے۔''

''یہ ان کی اپنی منطق تھی' مگر میرے تینوں بھائی تعلیم کے شعبے میں مجھ سے بہت اچھے رہے۔ سب سے بڑے جمال بھائی انجینئر بن گئے' دانیال بھائی آئی بی کرکے ایک فرم میں جاب کررہے ہیں۔ کمال بھائی فوڈ ٹیکنالوجسٹ ہیں۔ ایک میں ان تینوں کے مقابلے میں ذرا نکما نکلا۔ انٹر بڑی مشکلوں سے کیا پھر ابا نے ڈپلومے کروادیے۔ اپنے ساتھ کئی بار کام پر بھی لے گئے' مگر میرا ان کے کام میں زیادہ دل نہیں لگتا یا پھر شاید میں نے دل لگانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ وہ چاہتے تھے۔ جن گھروں کے وہ ٹھیکے لیتے ہیں' ان میں الیکٹرک اور پلمبری کا سارا کام میں کروں کہ میں اس میں ماہر ہوں' مگر میری آرام طلبی' سستی اور کاہلی آڑے آجاتی تھی۔ یہی وجہ ہے بڑے ہونے کے بعد ان کی ''نظر کرم'' کا زیادہ مستحق میں ہی تھا اپنے بھائیوں کے مقابلے میں' مگر آج جب وہ ایک شدید ہارٹ اٹیک کے سبب اسپتال کے آئی سی یو میں تھے' مجھے ان کی سختیاں' ڈانٹ سرزنش کچھ یاد نہیں تھیں۔ بس مجھے اپنا بچپن یاد آئے جارہا تھا اور ان کی محبتیں' شفقتیں' نہ جانے کیوں؟''

سچ تو یہ ہے کہ ابا نے بڑی محنت کی۔ اپنے لیے کم اور ہمارے لیے زیادہ۔ ہم سے مراد ہم چاروں بھائی اور امی' انہوں نے اپنا آرام اور نیند دونوں ہی بہت مختصر کی ہوئی تھیں۔ ان کی اس جاں توڑ محنت کا نتیجہ تھا کہ کرائے کے کئی گھروں میں دھکے کھانے کے بعد وہ اپنا ذاتی گھر لینے میں کامیاب ہوگئے اور پھر اب تو تینوں بھائی کمانے لگے تھے 'مگر ابا تو ابھی تک بھی اپنے بیٹوں سے زیادہ محنت کرتے ہیں اور زیادہ کماتے ہیں تو کچھ میری امی کی کفایت شعاری اور سلیقہ ہے تو ایک ایک کرکے دو گھر اور ابا نے خرید لیے ہیں۔ ان کا ٹاسک ہے کہ ہم چاروں بھائیوں کے لیے ایک ایک گھر ہو جائے' بقول ان کے' سارے مرغوں کو ایک ہی

ڈربے میں بند کر کے مت رکھو' الگ ڈربوں کا بھی بندوبست ہونا چاہیے تاکہ جب مرغیاں اور چوزے آئیں تو ڈربہ چوں چوں کا مربہ نہ بن جائے۔

میرے پیارے ابا زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھے' مجھے اپنے بچپن کی عیدیں یاد آرہی تھیں' جب میں تیار ہو کر ان کی انگلی پکڑ کر عیدگاہ جایا کرتا تھا۔ ہم بچوں کو عموماً "پیچھے جگہ ملتی تھی" وہ بہت سمجھا بجھا کر ہمیں پیچھے کھڑا کرتے تھے۔

اپنے ہوش سنبھالنے کے بعد میں نے نہیں دیکھا کہ انہوں نے کبھی اپنے کام کا ناغہ کیا ہو یا چھٹی کی ہو۔ ہفتے کے ساتوں دن وہ کام کرتے تھے' چھٹی صرف بیماری کی صورت میں ہوتی تھی۔

ابا کی حالت اب خطرے سے باہر تھی' مگر پھر بھی احتیاطاً" دو چار دنوں کے لیے ان کا اسپتال میں رہنا ضروری تھا۔ رات میں سارے بھائی ابا کے پاس رکنے کو تیار تھے' مگر میں نے امی سمیت سب کو ہی گھر بھیج دیا تھا۔

ابا بیڈ پر پرسکون دوائیوں کے زیر اثر گہری نیند میں تھے' میں ان کے قریب کرسی پر بیٹھا انہیں غور سے دیکھ رہا تھا' اک دم سے وہ بوڑھے لگنے لگے تھے اور کمزور بھی یا پھر شاید میں نے کبھی اتنے قریب سے اور اتنے غور سے انہیں دیکھا ہی نہیں تھا۔ چادر سے ان کے ہاتھ باہر نکلے ہوئے تھے۔

اپنی جوانی کا بہترین وقت محنت مشقت میں گزارنے والا وہ محنتی ہاتھ اس وقت میرے ہاتھ میں تھا۔ سانولے سلونے ہاتھ کی پشت پر ابھری ہوئی رگوں کا جال سا بچھا ہوا تھا' سخت اور کھردرے ہاتھ خود پہ گزرے وقت کی داستان سنا رہے تھے۔ مجھے نہیں معلوم میں کتنی دیر تک اپنے ہاتھوں میں ان کا ہاتھ لیے بیٹھا رہا' سوچتا رہا اور پھر کب ان ہی پر سر رکھ کر سو گیا۔



میرپور سے چچا میاں اور ان کی بیگم کا فون آیا تھا۔ وہ ابا کی بیماری اور صحت کے حوالے سے اپنی تشویش کا اظہار کر رہے تھے' میں نے انہیں ساری تفصیلات سے آگاہ کر کے تسلی دے دی تھی۔ امی سے بھی دونوں کی بات کروا دی تھی۔

رانی نے اس دن (جس دن اس نے مجھے اکتالیس گھنٹوں میں رشتہ لانے کا الٹی میٹم دیا تھا) کے بعد سے مجھے کوئی فون نہیں کیا تھا۔ میں نے بھی رابطہ نہیں کیا پھر ابا بیمار پڑ گئے' میں پچھلے دس دنوں سے مسلسل خود کو ٹٹول رہا تھا' غور و فکر کر رہا تھا۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کے اپنی محبت سے دست بردار ہونے اور اس راستے پہ آگے کی طرف سفر کرنے کے بجائے پیچھے ہٹ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ابا کی مرضی اور خوشی پہلے تھی میری مرضی اور خوشی ان کے آگے کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی۔

ابا کے اس اچانک ہارٹ اٹیک سے میں بہت خوف زدہ ہو گیا تھا۔ وہ اسپتال سے گھر تو آگئے تھے' مگر دوائیاں اور پرہیز بہت عرصے کے لیے تھا۔

رات میں' میں نے امی سے بات کرنے کے لیے تمہید باندھی۔

"آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" میں نے امی کو مخاطب کیا۔ وہ ابھی عشا کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھیں۔ سر کے گرد لپیٹا ہوا دوپٹا کھولتے ہوئے انہوں نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"آپ کی اور ابا کی جو مرضی ہو' میں اس پر راضی ہوں۔"

"کس معاملے میں؟" چند لمحے خاموشی سے دیکھنے کے بعد انہوں نے مجھ سے سوال کیا۔

"رانی کے معاملے میں۔"

"کیوں؟ کیا ہوا؟" وہ چونکیں۔

"بس یوں ہی۔" میں نے سر جھکا لیا۔ "مجھے لگتا ہے کہ میری بے جا ضد کی وجہ سے ابا کی یہ حالت ہوئی ہے۔"

"تمہارے ابا کو بہت عرصے سے دل کی تکلیف تھی' ٹیسٹ کروائے تھے علاج چل رہا تھا' ڈاکٹر نے سختی سے پرہیز کا کہا تھا' مگر مانتے کب ہیں جو چیزیں منع

تمہیں وہی کھاتے رہے 'تب ہی تو یوں اچانک.....''
امی کے انکشاف پہ میں چونکا تھا۔ مجھے تو کبھی اس بات کی بھنک بھی نہیں پڑی تھی' میں کس دنیا میں رہتا تھا؟ مجھے خود پر بہت افسوس ہو رہا تھا اور غصہ بھی آرہا تھا۔
''کمال کو پتا تھا بس' اسی نے ڈاکٹروں اور لیبارٹریوں کے چکر کاٹے ہیں۔ تمہارے ابا نے بتانے سے منع کیا ہوا تھا پھر تم یہاں تھے بھی نہیں' پچھلے تین مہینوں سے تو تم میرپور میں تھے۔''
''میرپور کوئی مریخ پر تو نہیں ہے' اب تو انسان وہاں بھی رابطے کر رہا ہے' آپ مجھے فون پر تو بتا سکتی تھیں۔ تقریباً" ہر دوسرے دن آپ سے بات ہوتی تھی۔'' میں نے احتجاج کیا۔
''تمہارے ابا نے منع کیا تھا اور مجھے بھی اندازہ نہیں تھا کہ معاملہ اتنا سنگین ہو جائے گا اور تکلیف اتنی بڑھ جائے گی۔ دراصل انہوں نے کبھی اپنی تکلیف کو زیادہ ظاہر بھی نہیں کیا۔ برداشت کر لیتے ہیں یا نظر انداز کر دیتے ہیں۔''
''اسی کا نتیجہ ہے کہ اسپتال پہنچ گئے۔'' میری آواز میں ناراضی چھلک آئی۔
''تو سچ مچ رانی کو پسند کرتا ہے؟'' امی نے اچانک سے موضوع بدل دیا۔
''اب کیا جواز ہے یہ سوال کرنے کا؟'' میں جزبز ہوا۔
''تیرے ابا راضی ہو گئے ہیں رانی کے لیے۔'' امی نے عین فلمی انداز میں انکشاف کیا۔ میرے دھڑکن جیسے اک لمحے کو تھم سی گئی۔
''کیا کہہ رہی ہیں؟'' مجھے اپنے کانوں پہ یقین نہیں آرہا تھا۔
امی کچھ نہ بولیں' مسکرا دیں۔
''ویسے اگر تم چاہو تو تمہارا فیصلہ ''انہیں'' بتا دیتی ہوں۔'' امی کی پیش کش میں ظرافت کا رنگ نمایاں تھا۔
''جگ جگ جئیں میری پیاری امی! اور میرے عظیم ابا۔'' اپنی بے پناہ خوشی کو میں سنبھال نہیں رہا تھا۔ پتا نہیں کیا سوچ رہا تھا اور خدا جانے کیا بول رہا تھا۔



رانی کو ڈرتے ڈرتے فون کیا خوش خبری سنانے کے لیے' ڈر یہ تھا کہ کہیں وہ ڈاکٹر رقیب روسیاہ ہی نہ بن گیا ہو' رانی نے حسب روایت آٹھ دس نخرے دکھائے' دس بارہ باتیں سنائیں پھر پٹڑی پہ آگئی۔
''بھگا دیا میں نے اس ڈاکٹر کو' تمہارے سوا کسی کو دل قبول ہی نہیں کرتا۔'' رانی رومانٹک ہوئی۔
دل تو میرا بھی یہی چاہ رہا تھا کہ رانی سے زیادہ رومانٹک ہو جاؤں' مگر کام بہت تھے اور وقت کم' سو تھوڑی دیر اور بات کر کے فون آف کر دیا۔ دراصل ابا کی علالت اور پھر اب بیڈ ریسٹ کی وجہ سے ان کی جگہ کام پر میں ہی جا رہا تھا۔ ان دنوں انہوں نے جو ٹھیکہ لیا ہوا تھا۔ اس کا آدھا کام ہو چکا تھا۔ آدھا رہ گیا تھا جسے اب میں مکمل کروا رہا تھا۔ جی ہاں میں ذرا کاہل اور سست ضرور تھا' مگر نکما اور نالائق نہیں۔ اپنی کاہلی اور لاپروائی کو گڈ بائے جب ہی کہہ دیا تھا جب میرپور میں تھا اور اب ابا کی بیماری کے بعد ان دونوں مہمانوں کو میں نے گیٹ آؤٹ (اپنی ذات سے) کر دیا تھا ویسے تو ابا نے پہلے ہی مجھے کافی کچھ سمجھا دیا تھا۔ پھر بھی اگر کوئی مسئلہ ہوتا تو میں ان سے پھر پوچھ لیتا۔ سو یوں گاڑی چل رہی تھی بلکہ بھاگ رہی تھی اور میری مصروفیات بھی بہت بڑھ گئی تھیں۔
کمال بھائی کا رشتہ طے کرنے میرپور جانا تھا۔ چچا میاں اور چچی بیگم سے امی' ابا نے فون پہ بات کر کے انہیں اپنے آنے کا عندیہ دے دیا تھا۔ چونکہ کمال بھائی بڑے تھے اس لیے حفظ مراتب کے تحت پہلے ان کی نیا پار لگتی پھر میری باری تھی۔ بڑے دونوں بھائی خیر سے پچھلے سال ہی منگنی شدہ ہوئے تھے اور اب بہت جلد دونوں کی شادی متوقع تھی۔ کچن میں مختلف پکوانوں کی اشتہا انگیز خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں۔

چاروں چولہوں پہ کچھ نہ کچھ چڑھا ہوا تھا۔ نوال شامی کباب کی ٹکیاں بنا رہی تھی امرحہ نے جب چوتھی بار آمیزہ اٹھا کر کھایا تو نوال کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"اب اگر تم نے اس میں ہاتھ لگایا تو یہ کفگیر پڑے گا ہاتھ پہ۔" نوال غرائی۔ "ساری برکت ختم ہو جاتی ہے کھانے سے۔"

"نمک مرچ چکھ رہی ہوں یار!" امرحہ کی معصومیت قابل دید تھی۔

"نمک مرچ بالکل صحیح ہے، تمہیں دادی اماں بننے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ویسے میں ایک بات سوچ رہی تھی۔" امرحہ نے ایک بار پھر ندیدے پن سے آمیزے کو دیکھا۔

"کیوں بے کار میں اپنے ننھے منے دماغ کو زحمت دیتی ہو۔" نوال نے مذاق اڑانے کی کوشش کی، مگر امرحہ بے نیازی سے بول رہی تھی۔

"موصوف کو پہلی بار دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ کھانے اور سونے کے شوقین ہیں فقط، موٹا جسم ہے عقل بھی موٹی ہو گی، مگر یار! بندہ تو بڑے کام کا نکلا۔" بولتے بولتے وہ اک دم پر جوش ہوئی۔

"کام تو اللہ ہی بناتا ہے۔" نوال نے لقمہ دیا۔

"بے شک، مگر وہ ہمارے کاموں کے لیے دوسرے انسانوں کو وسیلہ تو بناتا ہے نا۔"

"ہوں۔" نوال خاموشی سے کبابوں کی ٹکیاں بناتی رہی۔

"سنا ہے "موصوف" کی اپنی منگنی بھی ہو رہی ہے؟"

"ہوں!" نوال نہ جانے کن خیالوں میں الجھی ہوئی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟ مہمانوں کے بارے میں؟ یا کسی خاص مہمان کے بارے میں؟" امرحہ کا لہجہ شریر ہوا۔

"میں یہ سوچ رہی تھی کہ پلاؤ بنا لیتی۔ بریانی بہت بھاری ہو جائے گی اتنی گرمی میں؟" نوال نے سادگی سے بولتے ہوئے اسے دیکھا۔

"تمہارا دماغ کبھی کچن سے باہر نکلتا ہے یا نہیں؟" امرحہ نے انتہائی سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔

"دماغ تو میرا کچن میں ہی رہتا ہے، اس کے بغیر یہاں کے کام میں گڑبڑ ہو سکتی ہے ہاں دل کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی، یہاں ہے، وہاں ہے، کہاں ہے؟" سنجیدہ سا منہ بنائے بولتے بولتے نوال آخر میں مسکرا دی۔ امرحہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"بہت گھنی ہو تم۔" اس نے سر ہلایا۔

"سچ میں؟" نوال نے معصومیت سے کہا۔



ابا گھوم پھر کے مکان کا جائزہ لے رہے تھے۔ ان کی نظروں میں ستائش تھی، مگر وہ میری تعریف کرنے کے زیادہ قائل نہیں تھے۔

"کام تو ٹھیک ٹھاک کر لیا، محنت نظر آ رہی ہے۔" یہ دو جملے بھی مجھے بانس پہ چڑھانے کے لیے کافی تھے اچھا ہی ہوا ابا نے زیادہ مغرور نہیں کیا مجھے۔

"مکان تو بالکل تیار ہے۔ اچھے کرائے پہ آرام سے چلا جائے گا۔" واپسی پہ ابا سے میں نے یوں ہی کہا۔ (ظاہر ہے کہ کرائے پہ ہی دیا جائے گا گھر، یہاں رہے گا کون؟)

"کرائے پہ کیوں دیں گے، جس کا گھر ہے وہ خود رہے گا یہاں۔" ابا کی بات سن کر مجھے جو محسوس ہوا تھا اسے شاید سٹی گم ہونا کہتے ہیں۔

"یہ گھر کس کا ہے ابا؟" میں نے انتہائی ملائمت سے پوچھا تھا۔

"میرے دوست کا ہے ٹھیکہ لیا تھا میں نے، تمہیں بھیج دیا تھا تاکہ ہاتھ پاؤں اور دماغ چلانے کی عادت پڑے۔"

ابا واقعی میرے بھی "باپ" تھے۔ میں سارے راستے اش اش کرتا رہا۔



کمال بھائی کا رشتہ ہنسی خوشی طے ہو گیا جیسا کہ عموماً "کہانیوں کے آخر میں ہوتا ہے اور ہم ہنسی خوشی واپس آ گئے، مگر میری کہانی ابھی ادھوری تھی۔ میرا

اور رانی دونوں کے بڑوں میں زبانی بات چیت ہو چکی تھی۔ اگلے ہفتے ہماری منگنی تھی' اس سے اگلے ہفتے ماہ رمضان المبارک شروع ہو رہا تھا۔

رانی اور میں مستقبل کے سہانے سپنے دیکھنے میں مگن تھے۔ تقریباً" روزانہ ہی ہماری بات ہو رہی تھی۔

"بات سنو۔" رانی نے بڑے رومینٹک لہجے میں مخاطب کیا۔

"تمہیں ہی سن رہا ہوں' کہو؟"

"میری انگیج منٹ رنگ کیسی ہے؟"

"اچھی ہے' پسند آجائے گی تمہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"میرا مطلب ہے کہ گولڈ ہے یا ڈائمنڈ؟"

"ڈائمنڈ؟" میرے حلق میں کچھ پھنسنے لگا۔ "گولڈ ہے۔" میں نے یوں اعتراف کیا جیسے کوئی مجرم اپنے جرم کا اقرار کرتا ہے۔

"اچھا!" رانی کے اس ایک لفظ میں ہزاروں اداسیاں چھپی ہوئی تھیں جو محسوس کرکے میں بھی اداس ہو گیا۔

"تمہیں ڈائمنڈ رنگ پسند ہے؟" میں نے نہایت ہمدردی سے سوال کیا تھا۔

"ڈائمنڈ رنگ کسے ناپسند ہوتی ہے بے وقوف' میں نے سوچا تھا کہ تمہاری طرف سے آئی ہیرے کی انگوٹھی پہن کر اپنی سہیلیوں کو جتاؤں گی' دیکھو' یہ ہوتی ہے محبت۔ ایسے کرتے ہیں پیار' مگر تم نے تو میرے سارے ارمانوں پہ پانی پھیر دیا۔" رانی کا دکھ بھرا لہجہ مجھے دکھی کر رہا تھا۔

"تم گولڈ کی انگوٹھی پہن کر بھی اپنی سہیلیوں کے سامنے اترا سکتی ہو۔" میں نے ذرا محتاط لہجے میں اسے بہلا دیا تھا۔

"سونے کی صرف انگوٹھی پہن کر کون اتراتا ہے' گولڈ کا پورا سیٹ ہوتا تو اترانے کی وجہ بھی بنتی۔" رانی نے منہ بسورا۔

"گولڈ کا پورا سیٹ؟ منگنی پر؟" میری اوپر کی سانس اوپر نیچے کی نیچے رہ گئی۔ لگتا ہے میری پیاری منگائی سے نابلد اور سونے کے بھاؤ سے لاعلم ہے۔

"تم اپنی امی سے کہہ کر گولڈ کا پورا سیٹ لے آو نا منگنی میں۔۔۔ دیکھو ہمارا پورا خاندان جمع ہوگا اس دن' تمہاری شان کتنی بڑھ جائے گی سب کے بیچ۔" رانی بڑے لاڈ سے فرمائش کرتے ہوئے مجھے بانس پہ چڑھانے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔

"میری شان کے لیے میری اپنی ذات کافی نہیں؟" میں رانی کی باتوں پر غور کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تم تو پتا نہیں کیسی عیب و غریب باتیں کرنے بیٹھ جاتے ہو' میری بات نہیں سن رہے۔" رانی نے ٹھنک کر کہا۔

"سن ہی تو رہا ہوں۔" میں بے چارگی سے گویا ہوا۔

"صرف سنو گے ہی یا کچھ عمل بھی کرو گے؟"

"یہ عمل میرے بس سے باہر ہے میری پیاری!" میں دل ہی دل میں بے بسی سے کراہا۔

"اب چپ کیوں ہو' تم میری خوشی کے لیے اتنا سا بھی نہیں کر سکتے؟"

"اتنا سا؟" میں بھونچکا ہو رہا تھا اس کی باتوں پر۔

"ایک سونے کا سیٹ' میری کم از کم چار مہینے کی محنت کا صلہ ہوگا۔" میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے جتایا۔

"تم اپنے امی ابو سے اپنی ذرا سی فرمائش بھی پوری نہیں کروا سکتے؟ اتنے سارے مکان خریدے ہوئے ہیں اور کنجوسی دیکھو۔" رانی کی آواز میں ناراضی در آئی۔

"کنجوسی نہ دکھاتے تو یہ مکانات کیسے خریدتے؟" میں نے ایک گہری سانس لی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ رانی اتنی ضدی' اور اپنی بات منوانے پر ایسا اصرار بھی کر سکتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں' رانی کی فرمائش امی' ابا تک پہنچانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا جو بات مجھے ہی غلط اور عجیب لگ رہی تھی' اس کی وکالت کیسے کرتا۔ اف یہ رانی اور اس کی فرمائشیں جو میری جان لینے پر تلی ہوئی تھیں۔ ہائے یہ محبت جو بندے کا بیڑا غرق کر دیتی ہے' مت مار دیتی ہے'

ہر اچھے عاشق کی طرح میں بھی محبت کو ہی قصور وار ٹھہرا رہا تھا۔
کسی نہ کسی طرح میں نے رانی کو بہلا ہی لیا۔ شادی پہ گولڈ کے ایک سے زیادہ سیٹ لانے کے وعدے پہ بلکہ پرزور وعدے پہ میری جان بخشی ہوئی اور منگنی خیر و خوبی کے ساتھ انجام پذیر ہو گئی۔
بڑے خوب صورت خمار میں دن گزر رہے تھے فقط پندرہ دن ہی گزرے تھے کہ میری سسرال سے میرا بلاوا آ گیا۔
"کل امی نے بلایا ہے تمہیں۔" رانی نے فون پر اطلاع دی۔
"خیریت؟" میں چونکا۔
"ہاں ہاں۔ خیریت ہی ہے۔" رانی کی بے ساختہ ہنسی نے جلترنگ بجائے۔
"اچھا!"
"آؤ گے نا؟"
"سر کے بل آؤں گا۔" میں دیدار یار کے خیال میں خوش تھا۔
اگلے روز شام میں وہاں پہنچا تو بڑا پرتپاک استقبال ہوا۔ وی وی آئی پی پروٹوکول کے ساتھ۔ میں اپنی سسرال کی آؤ بھگت سے مرعوب ہو کر مؤدب سا بیٹھا تھا جب میری مستقبل کی ساس یعنی رانی کی امی نے گفتگو کا آغاز کیا۔ رانی کے پاپا بھی وہیں موجود تھے' بیچ بیچ میں وہ بھی لقمے دیتے رہے۔
ایک طویل لیکچر میں نے اپنے ان گنہگار کانوں سے سنا جس کا لب لباب یہ تھا کہ رانی کے اور اپنے سنہرے مستقبل کے لیے ابا کے خریدے ہوئے مکانات میں سے ایک مکان رانی کے نام کر دینا چاہیے۔
"مگر میں یہ کیسے کر سکتا ہوں' میں نے تو ابھی کمانا شروع کیا ہے' ابا کے پاس جو بھی جائیداد ہے' وہ ان کی اور تھوڑی بہت میرے بڑے بھائیوں کی محنت کی کمائی ہے۔ میرا ان سب پر بھلا کیا حق ہے۔ میں تو کوئی گھر اپنے نام بھی نہیں کروا سکتا تو رانی کے نام کیسے کروا سکتا ہوں۔"
میں نے ان کی فرمائش پر غور کرنے کے بعد بڑا متانت اور سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔
"دعوا تو محبت کا کرتے ہو اور اتنا سا مطالبہ بھی پورا نہیں کر سکتے؟" رانی کی والدہ ماجدہ نہ جانے کیوں بگڑ گئی تھیں۔
"اف..... پھر وہی "اتنا سا"۔" میں دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر رہ گیا۔ اب پتا چلا' رانی کا وہ مرغوب تکیہ کلام اسے کہاں سے ورثے میں ملا تھا؟
"محبت کا صرف دعوا نہیں کرتا' محبت کرتا بھی ہوں' صرف رانی سے ہی نہیں بلکہ اپنی فیملی سے بھی' میں انہیں اس امتحان میں نہیں ڈال سکتا۔"
میں وہاں سے اٹھ کر آ گیا۔ اب یہ میرا دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے اٹھ کر آیا تھا' جی ہاں وہی دل جو رانی کی محبت سے لبالب بلکہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وہ دل بھاری بھاری ہو رہا تھا۔ گھر' پیسہ' دولت' اعلا جہیز' بھاری مہر' ان میں سے کون سی شے کامیاب شادی' خوش و خرم زندگی کی ضمانت ہے؟ میں دو چار دن تک ان ہی خیالات میں غلطاں و پیچاں رہا۔
امی کے کئی بار پوچھنے پر بھی میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا دراصل میں اس معاملے میں کسی کی بھی رائے یا مشورہ لینے کے بجائے خود ہی سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ ویسے یہ "فیصلہ" بھی عجیب معاملہ ہے۔ اپنی دانست میں بڑا اہم اور مضبوط فیصلہ کیا تھا رانی کے ساتھ پوری زندگی گزارنے کا' مگر اب ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھے ایک اور فیصلے کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ جو منیر نیازی نے کہا تھا نا۔
ایک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا
یکے بعد دیگرے کچھ ایسی باتیں ہو رہی تھیں کہ میں سنجیدگی سے ایک اور فیصلے کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ قارئین یہ نہ سوچیں کہ میں کمزور قوت ارادی کا مالک ہوں' مجھ میں درست فیصلہ کرنے کی اہلیت نہیں ہے یا پھر میرا ارادہ ڈانوا ڈول ہوتا رہتا ہے۔ نہیں' ان میں سے کوئی بھی بات نہیں تھی۔!

بات وہی بات کہ جو میں رانی سے اور اس کی فیملی سے کہہ چکا ہوں کہ میں بے شک رانی سے پیار کرتا تھا' مگر اس سے زیادہ میرے والدین اور میری فیملی اہم تھے میرے لیے۔



رمضان کا برکتوں اور رحمتوں سے بھرا مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ دوسرا روزہ تھا کہ سسرال (ہونے والی) سے پھر میرا بلاوا آیا۔ ویسے تو اس طرح کے "بلاوے" مجھے بلاوے کم اور پیشیاں زیادہ لگتے تھے۔

تراویح کے بعد میں وہاں گیا تو رانی کا منہ پھولا ہوا تھا۔

"کہا بھی تھا تم سے۔ روزہ یہاں نہیں کھول سکتے تھے؟" مجھے دیکھتے ہی اس کا شکوہ نامہ شروع ہو گیا۔

"میں نے بتایا تو تھا کہ میں روزہ اپنے گھر پر ہی افطار کرتا ہوں سب گھر والوں کے ساتھ۔"

میں نے اپنے لہجے میں متانت برقرار رکھنے کی کوشش کی' ورنہ سچ تو یہ ہے کہ میں آئے دن کے ان "شکوے ناموں" سے اب اکتانے لگا تھا۔

"اوہ' گھر والوں کو نہیں بلایا' اس لیے تم بھی نہیں آئے۔" رانی نے ہونٹ سکوڑ کر طنز کیا۔

"یہ بات نہیں ہے' مجھے روزہ اپنے گھر پر افطار کرنا ہی اچھا لگتا ہے اور بس۔"

"اچھا بھئی' جیسے آپ کی مرضی۔" رانی نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ (انتہائی ناراضی کا سگنل)

"مجھے کیوں بلایا تھا؟" میں جھنجلا اٹھا۔

"امی بتائیں گی۔" وہ احتجاجاً اٹھ کر چلی گئی۔

اب امی کی انٹری ہوئی۔

حال احوال پوچھ کر ماہ رمضان' روزے اور گرمی پر تبصرہ کر کے وہ کچھ دیر بعد اصل بات پہ آئیں جس کے لیے مجھے زحمت دی گئی تھی۔

"بلال میاں! تمہارے گھر والے عیدی تو لائیں گے نا' رانی کی؟" بے حد میٹھے لہجے میں سوال ہوا۔

"جی؟ جی ہاں' ضرور آئے گی رانی کی عیدی۔" میں نے اس غیر متوقع سوال پر سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں' ماشاء اللہ کھاتا پیتا خوش حال گھرانہ ہے تمہارا۔ عیدی تو بھیجیں گے بہو کی' بس یہ خیال رکھنا بیٹا! کہ عیدی ایسی ہو کہ دیکھنے والے بس دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں۔"

"جی؟" ان کی بات سن کر فی الحال تو میں' انہیں دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

"بھئی برا نہ ماننا' منگنی کے موقع پر تو زیادہ دھوم دھڑکا اور لین دین ہوا نہیں تھا' چلو کوئی بات نہیں' نہ میں ان سب کی لالچی ہوں نہ میری بیٹی' بات ساری یہ ہے کہ ہمارے خاندان میں ماشاء اللہ سب بڑے ویل آف ہیں' اونچے مزاج' اونچے دماغ' منگنی کے سامان پر بھی سب نے باتیں بنائی تھیں' اب میں یہ نہیں چاہتی کہ عیدی کو لے کر یہ لوگ باتیں بنائیں' تمہاری عزت ہمیں اپنی عزت سے زیادہ پیاری ہے بیٹے' بس اسی لیے تمہیں بلایا تھا کہ عیدی ایسی ہو کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں کھل جائیں اور بولنے والوں کے منہ بند ہو جائیں۔"

"ایسی اسپیشل عیدی میں کیا ہونا چاہیے؟" میرے ذہن میں ابھرنے والا پہلا سوال یہی تھا۔ اس سوال کا جواب مجھے ایسا ملا کہ اس نے میرے ہوش اڑا دیے' بلکہ چودہ طبق روشن کر دیے۔

گھر واپسی میں' راستے بھر میرے دماغ میں اس اسپیشل عیدی کے لوازمات' چکراتے رہے' جو مجھے بتائی گئی تھی۔ عید کے تینوں دنوں کے تین جوڑے' کسی معروف ڈیزائنر کے ہوں' قیمتی' خوب صورت اور مہنگے۔ ان کے علاوہ جوڑوں کی میچنگ کی جوتیاں' چوڑیاں' جیولری' پھل' خشک میوے اور مٹھائی کے ٹوکرے' میک اپ کا جدید اور قیمتی سامان اور ان سب کے ساتھ سونے کا کوئی بھاری زیور اور بھی کچھ الا بلا اشیا ان کے علاوہ تھیں' گھر پہنچ کر بستر پر لیٹا تو میرا سر چکرا رہا تھا۔

رانی سے بات ہوئی تو دماغ مزید گھوم گیا۔

"دیکھو بلو! عیدی ایسی ہی آنی چاہیے جیسی امی نے

بتائی ہے۔ ورنہ....."

"ورنہ کیا....."

"ورنہ نتیجے کے ذمہ دار تم خود ہوگے۔"

"کس قسم کا نتیجہ نکلے گا' ذرا بتاؤ مجھے۔" میرے غصے کی شروعات ہوگئی تھی۔

"امی کہہ رہی تھیں' تم لوگ تو ابھی سے اتنی کنجوسی دکھا رہے ہو۔ شادی کے بعد کیا کروگے۔"

"میرا خیال ہے کہ منگنی تم نے بغیر سوچے سمجھے کرلی' اب شادی کے بارے میں اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔" میں نے سرد مہری سے کہہ کر موبائل آف کردیا۔

اپنی ہونے والی بیوی اور ساس کی فرمائشیں سن سن کر میرے کان پک گئے تھے اور صبر کا پیمانہ لب سے لبریز ہو کر چھلک چھلک رہا تھا۔

کئی بار سوچا امی کو سارا معاملہ بتاؤں' مگر پھر شرم کے مارے خاموش رہا۔ وہ کیا سوچیں گی' میری محبت' میرا انتخاب ایسا ہے؟ مجھے اب معلوم ہوا تھا کہ محبت کبھی باعث ندامت بھی بن جاتی ہے۔ اپنے امی' ابا سے کچھ کہنے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ ناچار اپنا غصہ' ناراضی ایک طرف کرکے رانی کو ہی سمجھانے کی کوشش کی تو وہ الٹا مجھ پہ پھٹ پڑی۔

"تمہیں مجھ سے محبت ہوتی تو ہر بات پر صفاچٹ انکار نہ کرتے' کوئی بات تو رکھتے میری' کچھ تو مانتے' منگنی پہ گولڈ کا سیٹ کہا اسے منع کردیا' شادی پہ مکان نام کرنے کو کہا' وہ انکار کردیا۔ میرے پیرنٹس کو مکان کا لالچ نہیں ہے۔ سارے والدین اپنی اولاد کی سیکورٹی چاہتے ہیں۔ میرے ماں' باپ نے ایسا سوچا تو کیا غلط سوچا۔ تم ہمیں لالچی سمجھ رہے ہونا' تب ہی اتنے اکھڑے اکھڑے رہنے لگے ہو۔"

ایک لمحے کو اس کا جوش خطابت ماند پڑا' پھر وہ دوبارہ شروع ہوگئی۔

"عیدی کا کہا تو اس پہ بھی تمہارا منہ بن گیا۔ تم آخر چاہتے کیا ہو؟ میری چارج شیٹ سنا کر' فرد جرم عائد کرکے آخر میں مجھ سے میری مرضی پوچھی گئی۔"

"شکر ہے' تم نے اپنی مرضی بتانے کے بجائے آج میری مرضی پوچھی۔" میری طنزیہ ہنسی پہ اس کا غصہ فرو ہوگیا۔

"مجھے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ تم ایسے نکلوگے۔"

"یہ اندازہ تو مجھے بھی نہیں تھا۔" میں نے اپنے دل میں سوچا۔

"تم نے گھر پہ بات کی عیدی کے بارے میں؟"

"نہیں۔"

"اچھی بات ہے۔" رانی کا موبائل آف ہوگیا۔

میں نے بھی اپنے کان سے اپنا موبائل ہٹایا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔



اگلے دن کا سورج میرے لیے وہ دن لایا تھا' جو بہت عرصے تک مجھے یاد رہنا تھا۔ ویسے یادگار ہونے کے ساتھ ساتھ یہ ایک سبق آموز دن بھی تھا۔

اس دن میں دیر سے گھر آیا تھا۔ افطار کا وقت بس ہونے ہی والا تھا۔ گھر میں سب غیر معمولی طور پر خاموش تھے۔

"کیا بات ہے' سب بڑے چپ چپ ہیں' کیا روزہ زیادہ لگ رہا ہے آج؟" میرے مذاق پر کوئی رسماً بھی نہیں مسکرایا۔

افطار کے بعد نماز مغرب ادا کرکے میں گھر آیا تو امی نے اس بات سے آگاہ کیا' جس کی وجہ سے سب کے لبوں پہ خاموشی کے قفل لگ گئے تھے۔ امی نے جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ تھا کہ.....

دوپہر میں میرے ساس اور سسر دونوں کی ہمارے گھر تشریف آوری ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنے کچھ مطالبات بلکہ شرائط سامنے رکھیں۔ وہی سب کچھ جو مجھ سے کہا گیا تھا' اب میرے ابا' امی سے کہا گیا۔

"اچھا!" امی کی بات سن کر میں نے ایک گہری سانس لی۔

امی الماری کی طرف گئیں اور وہاں سے کچھ نکال کر لائیں۔

"یہ انگوٹھی واپس دے گئی ہیں' کہہ گئی ہیں کہ اگر

ان کے مطالبات منظور ہوں تو عیدی کے ساتھ یہ انگوٹھی بھی لے آنا۔"

"لائیں 'یہ انگوٹھی مجھے دے دیں۔" میں نے ہاتھ بڑھا کر ان سے انگوٹھی لے لی۔

"میرے لیے اب فیصلہ کرنا نسبتاً" آسان ہو گیا تھا۔"

☼ ☼ ☼

"کتنا ہی سوچ لو' کتنے ہی جتن کر لو' پھر بھی عین وقت پر کچھ نہ کچھ رہ ہی جاتا ہے۔ اب ایک اکیلی میں کیا کیا کروں؟"

"جبکہ اتنی مدد میں نے کروائی۔" مٹھائی کے ٹوکرے کی پیکنگ مکمل کرتے ہوئے میں نے لقمہ دیا۔

"ہاں... تو میرا بیٹا نہیں بیٹی ہے' بیٹیوں کی طرح گھر کے کاموں میں میرا مددگار بن جاتا ہے۔" امی نے مسکراتے ہوئے اعتراف کیا۔ ان کے چہرے سے خوشی جھلک رہی تھی۔

"بڑی خوش ہو رہی ہیں' بہو کی عیدی لے جاتے ہوئے' اتنا خرچا کر کے کون خوش ہوتا ہے؟" میں نے انہیں چھیڑا۔

"خرچے کی کیا بات ہے بیٹا! بہو بھی ہماری بیٹی ہے اور بیٹیوں کے تو ارمان ہوتے ہی ہیں۔ ویسے لڑکیوں کو سسرال سے عیدی آنے کی جتنی خوشی ہوتی ہے' اتنی تو شاید منگنی پر بھی نہ ہوتی ہو۔"

"یہ تجربہ بول رہا ہے؟" میں نے شرارتی نظروں سے انہیں دیکھا۔ ویسے بھی بقول ان کے میں ان کا بیٹا کم اور بیٹی اور سہیلی زیادہ تھا۔

"چل ہٹ شریر!" وہ ہنس پڑیں۔

"اللہ بخشے تمہاری دادی بڑے چاؤ سے میری عیدی لاتیں' مجھے بھی اور لڑکیوں کی طرح بڑا شوق اور ارمان تھا اس کا۔ زیادہ خوش حالی نہیں تھی۔ اس وقت۔ غربت کے قریب قریب گھرانہ تھا' مگر شاید محبت تھی یا قناعت' خلوص تھا' حرص و ہوس نہیں تھی دلوں میں۔ عیدی آئی' سستا' معمولی اور تھوڑا سا سامان' مگر وہ بھی اس وقت میرے لیے بہت قیمتی تھا۔ چاند رات کو تمہاری دادی آئیں عیدی لے کر اور میرا ماتھا چوم کر خوش رہنے' پھلنے پھولنے اور خوش حالی کی اتنی دعائیں دیں' میں اب بھی کبھی یہی سوچتی ہوں کہ شاید وہ قبولیت کی گھڑی تھی۔ اللہ نے وہ سب ہی کچھ دے دیا۔

پرانی یادوں میں گھری امی جذباتی ہو گئیں' آنکھوں میں نمی جھلملانے لگی۔

"ارے میری پیاری جذباتی سی ڈائجسٹی امی!" میں نے اٹھ کر ان کے کندھے کے گرد بازو دراز کیا' وہ اپنی آنکھیں خشک کر رہی تھیں۔

"کیا نئے نئے نام دیتا رہتا ہے ماں کو' اب یہ ڈائجسٹی کیا ہوتا ہے؟" وہ نم آنکھوں کے ساتھ مسکرائیں۔

"جیسے فلمی امی ہوتی ہیں' ایسے ہی ڈائجسٹی امی بھی ہوتی ہیں۔ ڈائجسٹیں پڑھ پڑھ کر کہانیوں والی امی بن جاتی ہیں۔" میں نے جیب سے موبائل نکالا۔

"اسی خوشی میں ایک سیلفی ہو جائے۔"

"ہر وقت سیلفیاں لیتا رہتا ہے' ٹیڑھے میڑھے منہ بنا کر۔" ان کے بولتے بولتے میں نے سیلفی بنالی۔

"اے ہائے کتنا برا منہ آیا ہے۔ ٹیڑھا میڑھا سا' منہ تو بند کرنے دیتا مجھے۔" سیلفی دیکھ کر وہ مجھے ڈانٹنے لگیں۔

"ابا کو دکھاؤں گا۔"

"خبردار جو اپنے ابا کو میری ایسی تصویریں دکھائیں۔" وہ میرے پیچھے لپکیں۔

☼ ☼ ☼

ارے یہ زندگی تو واقعی کچھ عجیب و غریب شے ہی ہے۔ کبھی تو برسوں یکسانیت کے ساتھ گزرتی چلی جاتی ہے۔ کبھی ہر ہر قدم پہ موڑ آتے ہیں اور کچھ اندازہ نہیں ہوتا کہ اس موڑ کے بعد کون سا منظر ہمارا منتظر ہے' کوئی اجاڑ بیاباں یا کوئی خوش رنگ وادی؟ گھٹنوں پہ تھوڑی ٹکائے وہ خیالات میں گم تھی۔

"اور زندگی کا یہ موڑ تو بالکل ہی غیر متوقع ہے' منظر بھی واضح نہیں' اللہ جانے کیا ہے آگے؟"

"ابھی سے ہی خوابوں میں گم ہو گئیں۔" ماہ نور نے امرحہ کو چھیڑا۔

"خواب کون دیکھ رہا ہے۔ میں تو آگے کا منظر دیکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آرہا' یکایک ہوا کیا ہے' بڑی خوشی خوشی اپنی مرضی اور پسند کی منگنی کی تھی۔ اتنی جلدی وہ ختم بھی ہو گئی' پھر یہاں رشتہ لے کر آگئے' میرے لیے۔" امرحہ کی آنکھوں میں الجھن تھی۔

"زندگی میں اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب واقعات ہوتے ہیں۔ یہ تو کچھ بھی نہیں' یہ تو ایک عام سی بات ہے' رشتے کہیں سے ٹوٹتے ہیں۔ کہیں جڑ جاتے ہیں۔"

"اور دل کے رشتے؟ نہ اتنی آسانی سے ٹوٹتے ہیں' نہ اتنے آرام سے' کہیں اور جڑتے ہیں۔" امرحہ آنکھوں اور چہرے پہ بدستور الجھن سجائے کھڑی ہو گئی۔



جی ہاں' خدشات تو ہوتے ہی ہیں۔ یہ فطری بات ہے۔ مجھے بھی بہت سے خدشات لاحق تھے۔ رشتہ ختم کرنے کی صورت میں دل ٹوٹنے کا خدشہ تھا اور قائم رکھنے کی صورت میں' بہت سے مسائل اور مشکلات کا خدشہ' پھر میں نے دل ٹوٹنے کا رسک لے لیا۔

میرا خیال ہے (جس سے ہر کسی کا متفق ہونا ضروری نہیں۔) کہ ٹوٹے ہوئے دل کو انسان جوڑ سکتا ہے' مگر فیملی ٹوٹنے کے بعد خود کو اور فیملی کو جوڑنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ رانی اور اس کے والدین کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر کچھ اندازہ ہو چلا تھا کہ آگے زندگی کا نقشہ کیسا ہوگا اور ایسی نقشے باز زندگی کے لیے میں تیار نہیں تھا۔ سو بہتری اسی میں تھی۔ (میری بھی اور میرے گھر والوں کی بھی) کہ محبت کو خیرباد کہہ کر دل کو سمجھا لیا جائے۔

اور میرا دل نہ تو اتنا بچہ ہے' نہ کچا' رو دھو کر بات کو سمجھ ہی گیا اور حقیقت کا سامنا کرنے کو تیار ہو گیا۔

امی اور ابا تو جیسے تیار ہی بیٹھے تھے۔ فوراً ہی "نیکسٹ" تجویز کر دی۔ میں سنتے ہی بھونچکا رہ گیا۔

"امی! اسے گھر داری کا قطعی شوق نہیں ہے۔" میں نے دبے دبے خوف اور واضح احتجاج سے انہیں بتایا۔

"تجھے کیسے معلوم؟" امی نے مشکوک نگاہوں سے مجھے گھورا۔

"میں نے خود اپنے کانوں سے ان کی باتیں سنی تھیں۔ وہ ایسے شوہر کے خواب دیکھ رہی تھی جو امور خانہ داری میں طاق ہو' کھانا پکانا اسے آتا ہو۔ برتن اور کپڑے خوشی خوشی دھو لیتا ہو اور گھر کی صفائی ستھرائی میں طاق ہو۔" میں نے بڑے جوش و خروش سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں یقین دلانے کی کوشش کی۔

"اوہو!" وہ ہنس پڑیں۔ "ایسے خواب تو ہر لڑکی دیکھتی ہے' میں خود شادی سے پہلے کبھی کبھی سوچتی تھی کہ جیون ساتھی ایسا ہو جو بوقت ضرورت گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹا دے۔"

"آپ نے تو پھر بھی بوقت ضرورت کا لحاظ کر لیا' یہاں تو ضرورت ہی ایک سگھڑ اور تابعدار شوہر کی ہے۔" میں نے انہیں جتایا وہ پھر بھی لاپروا اور بے نیاز بن گئیں۔

"ارے سب لڑکیاں شادی سے پہلے ایسے ہی معصوم خواب دیکھتی ہیں' شادی کے بعد خود ہی ٹھیک ہو جاتی ہیں۔"

"آپ سمجھ نہیں رہیں امی حضور.... وہ...."

"اچھا بس.... اتنی باریکیاں چھانٹنے کی ضرورت نہیں ہے' کبھی وقت پڑے تو بیوی کے ساتھ گھر کا کوئی کام کروانے میں شان نہیں گھٹ جائے گی تمہاری' ماں کے ساتھ بھی تو کراتے ہو۔" امی نے مجھے ایسے جھاڑا کہ میں بے چارہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

فون پہ چچا میاں سے اور چچی سے بات کر لی گئی اور

طے یہ پایا کہ رمضان میں جب نوال بھابھی کی عیدی جائے گی تو اسی موقعے پہ میرا بھی کام تمام کردیا جائے۔

یوں عید سے ایک ہفتے پہلے میرا اور امرحہ کا رشتہ طے ہوگیا۔ میں کچھ پریشان پریشان سا تھا۔ سنا ہے وہ بھی کچھ اسی طرح پریشان سی تھی اور جیسا کہ شاعر صاحب پہلے ہی بیان کرگئے ہیں کہ۔۔۔۔

دلوں کی الجھنیں بڑھتی رہیں گی
اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے

تو تمام بہنوں کی باہم مشاورت سے فیصلہ کیا گیا کہ بات کرنا ضروری ہے۔ دلوں میں اٹھنے والے سوالات کے جوابات اور خدشات کی تسلی و تشفی ضروری ہے۔ لہٰذا۔۔۔ لہٰذا مجھے عدالت امرحہ کے کٹہرے میں کھڑا کردیا گیا۔ بنفس نفیس نہیں بلکہ موبائل کے ذریعے۔

"میں نے سنا ہے' آپ نے دھواں دھار محبت کے بعد منگنی کی تھی؟" توپ کا پہلا ہی گولا ایسا فائر ہوا کہ میں لڑکھڑا گیا۔

"جی ٹھیک سنا ہے۔" میں نے سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر۔۔۔ منگنی کے بعد وہ محبت کہاں گئی؟"

"وہ۔۔۔" میں نے اک گہری سانس لی۔ "وہ بے جا مطالبات اور لالچ کے ملبے میں دفن ہوگئی۔" میں نے سوچ سمجھ کر جواب دیا۔

"محبت میں انسان نے تاج محل بنادیا۔ آپ ایک مکان نہیں بنا سکتے تھے؟" امرحہ بی بی کا "ہوم ورک" پورا تھا۔ دے دھنا دھن' سوال پہ سوال داغ رہی تھیں۔

"محبت میں جس انسان نے تاج محل بنوایا تھا وہ ایک شہنشاہ تھا۔ وہ بھی اس نے محبوبہ کی زندگی میں نہیں' بلکہ آخری آرام گاہ کے طور پر بنوایا تھا۔ میں ایک غریب مزدور ہوں' وہ صبر اور انتظار سے کام لیتی تو میں اپنی حیثیت کے مطابق ایک گھر اس کے لیے ضرور بناتا' مگر اپنے ابا اور بھائیوں کی محنت کو اپنی محبت کے ثبوت کے لیے نہیں دے سکتا۔"

میرے دوٹوک لہجے میں' سچائی تھی۔ شاید تب ہی کچھ دیر خاموشی رہی۔ سوالات کی گولہ باری تھم گئی۔

"کیا گارنٹی ہے کہ مطالبات اور لالچ کے ملبے تلے جو کچھ دفن ہوا' وہ دوبارہ کبھی دل میں نہیں آئے گا؟"

اف یہ لڑکیاں؟ میں نے بے اختیار اپنا سر کھجایا۔ انہیں کسی نہ کسی معاملے میں "سیکیورٹی رسک" رہتا ہی ہے۔

"بات یہ ہے کہ دفن وہی چیز ہوتی ہے جو مردہ ہوچکی ہو اور مردے کے دوبارہ زندہ ہونے کا کوئی امکان کبھی نہیں ہوتا۔" میں نے نرم لہجے میں سمجھایا۔

"محبت کبھی مردہ نہیں ہوتی جو مرجائے وہ پھر محبت نہیں ہوتی' کچھ اور ہوتی ہے۔"

"ہوسکتا ہے' ایسا ہی ہو۔" میں نے جاں بخشی کے لیے ہاں میں ہاں ملانے میں ہی عافیت سمجھی۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم نے اس سے محبت نہیں کی' ٹائم پاس کیا تھا؟" گولہ باری پھر شروع ہوگئی۔

"یا اللہ!" میں کراہا۔ "اپنی دانست میں تو میں نے محبت ہی کی تھی' اسی لیے اسے منگنی کے منطقی انجام تک پہنچایا تھا۔"

"اب بس بھی کرو' کیا جان لوگی' غریب کی۔" نوال کی دبی دبی سی آواز میری سماعت تک پہنچی۔

"تم ابھی سے ہی سسرال کا حق ادا کرنے لگیں۔ ابھی تو وہاں پہنچی بھی نہیں ہو۔" یہ امرحہ بی بی تھیں جو نوال کی تنبیہہ پہ انہیں لتاڑ رہی تھیں۔

"میرے لیے کیا حکم ہے؟" میں نے جلدی سے مداخلت کی' مبادا میں موبائل کان سے لگائے' ان کی جھڑپ سنتا رہوں۔

"آپ دل سے تو راضی ہیں نا اس رشتے پہ؟ میرا مطلب ہے کہ کسی نے مجبور تو نہیں کیا' کوئی زبردستی تو نہیں کی؟"

"پہلے یہ بتایئے یہ آخری سوال ہے نا؟"

"جی!" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد جواب آیا۔

"سچ تو یہ ہے کہ ایسی لڑکی سے رشتہ جوڑتے ہوئے مجھے کچھ تحفظات تھے جو ایک سگھڑ اور امور خانہ داری میں ماہر شوہر چاہتی ہو تو۔۔۔"

"آپ نے چھپ چھپ کر ہماری باتیں سنیں؟ بلند لب ولہجہ کچھ اس قسم کا تھا جیسے مجھے کچا چبانے کا ارادہ ہو۔" (واللہ اعلم 'نیتوں کے حال تو صرف اللہ ہی جانتا ہے۔)

"میں نے چھپ چھپ کر کبھی کسی کی باتیں نہیں سنیں۔ خصوصا" لڑکیوں کی' لیکن اگر بآواز بلند انسان اپنے خوابوں' خواہشوں کو بیان کرے جو میری سماعت تک بہ آسانی پہنچ رہی ہو تو میں کیا کرتا' سوائے سننے کے؟ اس وقت میرے آس پاس روئی بھی نہیں تھی جو کانوں میں ٹھونس لیتا۔" میری آواز میں شاید برہمی کا رنگ آچلا تھا۔ تب ہی دوسری طرف سے کچھ نرمی اختیار کی گئی۔

"وہ ہمارا آپس کا مذاق تھا' عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔"

"اس یقین دہانی نے مجھے بالکل ہلکا پھلکا کردیا ہے' اب میں مطمئن بھی ہوں اور خوش بھی۔"

"بڑی جلدی اور آسانی کے ساتھ آپ ہر خوشی کو اپنے ساتھ ایڈجسٹ کرلیتے ہیں۔" طنزیہ لہجے نے پھر وار کیا۔

"جو لوگ ایسا نہیں کرتے' وہ زندگی کو خود پہ نامہربان اور مشکل کرلیتے ہیں۔" میں نے آخری جواب دے کر فون آف کردیا۔

یہ عدالت تو شاید اب عمر بھر کی تھی۔ نبٹتے رہیں گے بشرط زندگی بھگتتے رہیں گے۔

ہر ماہ تو نہیں' مگر دو چار مہینوں بعد امی ایک کام میرے سپرد کرتی تھیں۔ ان کے نام سے خط لکھ کر سپرد ڈاک کردیتا' وہ بولتی جاتیں اور میں لکھتا جاتا۔

جولائی کا خواتین جیسے ہی ہاتھ میں آیا' حسب معمول شروع سے شروعات کی۔ احادیث رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پڑھ کر سب سے پہلا خیال یہی آیا کہ کاش انہیں وہ نام نہاد مسلمان بھی پڑھ اور سمجھ سکتے جو اسلام کے نام پر دوسرے مسلمانوں کی جانیں لیتے ہیں۔ آگے چل کر انشاء جی کا کالم جو آج بھی قند مکرر کا سا مزا دیتا ہے۔ "معروف اینکر" منصور علی خان صاحب کا پروگرام کبھی سنا نہیں' دیکھا نہیں' اس لیے انٹرویو بھی سرسری سا ہی دیکھا' پھر اپنے "حالم" پہ آگئے۔

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی نمرہ احمد اچھوتے موضوع اور بھرپور معلومات کے ساتھ میدان میں اتری ہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ سے زیادہ کہ ان کی کوئی تحریر مقصدیت سے خالی نہیں ہوتی اور اب تو تجسس سے بھی۔ حالم کی کہانی جیسے جیسے آگے بڑھے گی شوق اور دلچسپی کا عنصر بھی مزید بڑھتا چلا جائے گا۔ ان کی تحریر کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ پڑھنے کے دوران اور پڑھنے کے بعد بھی قاری تحریر کے اثر اور گرفت سے باہر نہیں نکل سکتا۔

عنیزہ سیدہ میری بہت پسندیدہ مصنفہ' اپنے مخصوص رنگ میں آئیں اور چھا گئیں۔ اسلامی و مشرقی تہذیب و روایات جنہیں آہستہ آہستہ فراموش کرتے جارہے ہیں۔ خوب صورت انداز میں یاد دلائیں۔ ان کی تحریروں میں ایک خاص کلاسک ٹچ ہوتا ہے جو یوں اپنا گرویدہ بنالیتا ہے کہ مدتوں وہ تحریر ذہن میں محفوظ رہتی ہے۔ یہ تحریر بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔ میں نے بھی اپنے لیے اس کہانی سے سبق لیا ہے' نیت اور نظر نیک رکھنے کا اور زندگی پہ چھائے اللہ کے رنگوں کو میلا ہونے سے محفوظ رکھنے کا۔

فرزانہ کھرل کا افسانہ اچھا تھا۔ آسان الفاظ' سادہ سا انداز' افراح سکندر کا منہاری دل کو چھو گیا' پہلی بار اندازہ ہوا کہ وہ چوڑیاں جو ہم اپنی کلائیوں میں بڑی خوشی خوشی سجاتے ہیں' ان کی تیاری کے پیچھے کیسی محنت اور مشقت ہے' مینا کو اس کی ثابت قدمی کا اچھا صلہ ملا۔ فوزیہ اشرف نے اپنے "فیصلے" میں صغریٰ بیگم کو بڑی سخت سزا دلوادی' صحیح کیا۔

سمیرا حمید کو بڑے شوق سے اور سمجھ سمجھ کے پڑھتی ہوں۔ دل من محرم یارم' پورشے' گیت' برہا بھاگ اور اسی طرح کی دوسری تحریروں کے مقابلے میں یہ ناولٹ اور اس قسم کی ان کی اور تحریریں (جو قلیل ہیں) کو پڑھ کر کچھ دیر بعد محسوس ہوتا ہے کہ

جیسے "دشت تنہائی میں" "کھماج" یا "ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو" سنتے ہوئے اچانک سے "ڈسکو دیوانے" یا "چھنو کی آنکھ میں اک نشہ ہے" شروع ہو جائے۔ خیر کبھی خاص موڈ میں انہیں سننے میں بھی مزا آتا ہے۔ تو کہانی پڑھ کر ہنسی بھی بہت آئی اور مزا بھی' نہلے پہ دہلا قسم کے سوال و جواب اور فقرے بہت خوب تھے۔

فریدہ سیفی کی تحریر بس سو سو تھی۔ بی سحر ملک کا ناولٹ' روایتی سی کہانی تھی۔

"دشت جنوں" کی ابھی صرف سترہویں قسط ہے۔ خدا جانے اس تھیلے سے بلی کب برآمد ہوگی۔ تجسس بڑھتا جارہا ہے۔ "حسن المآب" ہر قسط میں بعض جملے تو بہت ہی خوب صورت اور دل کو چھو لینے والے ہوتے ہیں۔ کہانی بڑے آرام آرام سے آگے بڑھ رہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ان ڈھیروں ڈھیر کرداروں کو ہماری باکمال سائرہ بڑی ذہانت اور مہارت کے ساتھ ان کے منطقی انجام تک پہنچائیں گی۔ ابھی تک کے لیے ویل ڈن سائرہ' مہ ناز نعیم کا "فلک نامہ" مزے کا تھا' خاص طور پر یہ شعر میرے بیٹے کے حسب حال تھا۔

میٹھے میں شکر' سالن میں دہی بن جائیے
ایسے شوہر بنیے کہ کچن کی زندگی بن جائیے

"رنگ رنگ پھول" میں عذرا اور اقصیٰ ناصر کا "کوشش جاری رکھیں" اچھا لگا۔ میرا بیٹا آپ کے ڈائجسٹ بڑے شوق سے پڑھتا ہے۔ دیکھیے' مجھے منع کررہا ہے کہ یہ بات نہ لکھواؤں' کیوں بھئی' جب پڑھتے ہو تو اعتراف کرنے میں کیا حرج ہے؟ یہ ڈائجسٹ رہنمائی کا ذریعہ ہے' اچھی باتیں سیکھنے کی جتنی ضرورت لڑکیوں کو ہے' اتنی ہی لڑکوں کو بھی اور آخر میں وہ تمام پیاری مصنفات جو ٹی وی کو پیاری ہوچکی ہیں اور وہ بھی جو مستقبل میں ہونے والی ہیں' ان سب سے درخواست ہے کہ برائے مہربانی ڈائجسٹ کو اپنا میکہ سمجھیے اور ٹی وی کو سسرال اور سسرال چاہے کتنا ہی مصروف کردینے والا ہو۔ لش پش قسم کا ہو' میکے آنا تو کوئی نہیں بھولتا نا؟ سلسلہ اختتام پذیر ہے۔ باقی ان شاء اللہ آئندہ۔

اللہ آپ سب کو اور ہم سب کو خوش رکھے۔

منشا محسن علی

# پتنگ یار سجنا

"دنیا سے کوئی سات بدتمیز رخصت ہوئے ہوں گے تب آٹھویں تمہاری پیدائش ہوئی ہوگی۔"

میں نے شاکر کی اچھی خاصی طبیعت صاف کی۔ وہ حساب کی کاپی پر جھکا ہوا تھا۔ گھنی مونچھوں تلے جیسے لب مسکرائے تھے۔

"تو کیا سارے محلے کے بچوں کے بگڑنے کی جہ میں ہی ہوں؟" اگر وہ طنز تھا تو بڑا میٹھا تھا۔

"جی ہاں... تمہاری ہی پڑھائی ہوئی پٹیاں انہیں گمراہ کر رہی ہیں۔" لحاظ رکھنا اور مجھے آئے؟ ناممکن۔

اس نے جھکا سر اٹھا کر بغور مجھے دیکھا۔ "گمراہ" شاید کافی قابل اعتراض لفظ کہہ گئی تھی میں۔

"میں انہیں کیسے گمراہ کر سکتا ہوں... اور رہی بات پٹیوں کی تو مجھ معصوم کو یہ کام نہیں آتے۔"

میں نے کاؤنٹر پر ہاتھ مارا۔ "خود کو معصوم کہتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے۔"

"بھابھی کہتی ہیں میں خاصا بے شرم واقع ہوا ہوں۔"

ٹافیوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے جگنو کے میں نے دھموکا جڑا۔ "ٹانگیں توڑ دوں گی تمہاری۔"

جگنو بے چارہ دبک گیا تھا۔ شاکر مسکرایا اور میں جیسے جلکڑی گئی۔

"بچہ ہے بے چارہ... آپ تو بہت ظالم ہیں استانی جی۔"

جگنو کو میں نے دکان سے باہر کی طرف دھکیلا۔

"تم میرے شاگرد ہوتے تو دو دن میں سیدھا کر دیتی۔" مجھے جی بھر کے تاؤ آیا تھا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں، آپ کو ہی مسئلہ ہوگا۔"

"ہونہہ...!" میں نے سر جھٹکا۔

ساری گلی راوی، چناب کا نظارہ پیش کر رہی تھی۔ ساون جل تھل برساتا تھا۔ اینٹوں پر قدموں کو آہستہ حرکت دیتے میں اور جگنو آگے بڑھے تھے۔ گرتے ہوئے میں نے بمشکل دیوار تھامی۔

"استانی جی!" میں نے مڑ کر دیکھا۔ "خیال سے جائیے گا۔ آپ ہمارے لیے بہت قیمتی ہیں۔"

کاش! میں اس کے پورے بتیس دانت توڑ سکتی۔

"شاکر بھائی بڑے اچھے ہیں استانی جی! مجھے پتنگ اڑانا انہوں نے ہی سکھایا تھا۔" جگنو نے فخر سے بتایا اور جواب میں دھموکا کھایا۔

"بھاڑ میں جائے تمہارا شاکر بھائی۔" پوری گلی کی دیواریں گیلی تھیں۔

"بھاڑ کیا ہوتا ہے؟"

"میرا سر ہوتا ہے... خبردار جو مزید سوال کیا تو۔"

جگنو خاموشی سے آگے آگے چل رہا تھا اور میں پیچھے تھی۔ گلی کا کونا مڑتے ہوئے جانے کیوں میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ کچھ کام ہم جانے کیوں غیر ارادی طور پر کرتے ہیں۔

جگنو کو گھر کا رستہ دکھا کر میں چلی آئی تھی۔ دادی پودینہ کاٹ رہی تھیں۔

"کیا ضرورت تھی روشنی؟"



میں نے آلو اپنی طرف کیے "دادی.... اشد ضرورت تھی۔ اول درجے کا بدتمیز ہے۔ سارے بچوں کو بگاڑ رکھا ہے۔"

"بیٹا! اب بچوں نے کھیل کو بھی تو وقت دینا ہے نا؟" دادی نے ہمیشہ کی طرح آفت کے پرکالوں کی طرف داری کی۔

"کچھ زیادہ ہی کھیل کو وقت دیتے ہیں گرو جی کی صحبت میں۔"

دادی ہنسی تھیں۔ "تم بھی نا۔"

میں نے پکوڑوں کے لیے آلو کاٹنے شروع کردیے تھے۔ "کل کلاں فیل ہوئے تو مجھ پر الزام آئے گا کہ استانی کو پڑھانے کا ڈھنگ نہیں۔"

دادی نے پودینہ الگ رکھا اور میتھی صاف کرنے لگیں۔ "شاکر نے کیا کہا پھر؟"

"کہنا کیا تھا" میں بولتی رہی اور وہ حساب کی کاپی پر ڈھیٹ بنا جھکا کھڑا رہا۔ میں نے بھی اچھی عزت افزائی کی۔ بچوں کے اگلے ہفتے سے پیپر شروع ہو رہے ہیں اور ان کی بسنت ہی ختم نہیں ہو رہی۔ گرو جی کو بھی اور کوئی کام نہیں۔ بات کرتے ہوئے دل جلاتا ہے۔"

"تو تم کیوں دل جلانے پہنچ جاتی ہو؟"

میں نے دادی کو دیکھا۔ "بورڈ کے پیپر ہیں۔ اس وقت تعلیم پر توجہ لازم ہے۔ کل بھی گرو جی کے ساتھ پچھلے گراؤنڈ میں پتنگیں اڑا رہے تھے۔ ذرا جو احساس ذمہ داری ہو۔"

دادی نے بمشکل ہنسی دبائی۔ "روشنی! بچے ہیں بے چارے۔" میں نے دھنیے کی گٹھی کھولی تھی۔

"پانچویں میں پڑھتے ہیں۔ بچے کہاں سے ہو گئے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ بچہ تو ان کے گرو جی ہیں۔"

موسم خوش گوار تھا۔ املی کے پودے ہوا سے ہل رہے تھے۔ میں ممتاز مفتی کی "تلبیک" لے کر سیڑھیوں پر بیٹھ گئی تھی۔ جانے مجھے اس کتاب سے کیسی انسیت تھی کہ سو بار پڑھ چکی تھی۔ ساون کی ٹھنڈی ہوا تھی۔ ہاتھ میں کتاب تھی 'سیڑھیاں تھیں اور مزے دار پکوڑے تھے۔ میں خوب لطف اندوز ہو رہی تھی۔ یوں ہی نظر اٹھی تو آسمان رنگ برنگی پتنگوں سے سجا ہوا نظر آیا۔

لگا پیچا تو مچ گیا شور.... او دل ہوا بو کاٹا۔

گرو جی "فریحہ پرویز" بنے ہوئے تھے۔

جگنو کی آواز بلند ہوئی۔ "شاکر بھائی.... کٹ گئی۔"

تالیاں.... سیٹیاں....

اگلے دن گرو جی کا چیلا ٹیوشن پر آیا تو میں نے مرغا بنا دیا۔ آہ و بکا کا سلسلہ طویل ہو گیا۔

"دادی جی.... مجھے بچالیں۔"

سدا کی نرم مزاج دادی جی پگھل ہی تو گئیں۔ "نی روشنی.... بچہ ہے 'غلطی ہو گئی۔ معاف کردے۔"

"غلطی نہیں 'غلطیاں کرتے ہیں۔"

سارے ڈھیٹ میرے شاگرد تھے۔ کورس میں چلائے۔ "سوری.... استانی جی۔"

اور میں نے معاف کردیا۔

"شاکر بھائی کا مشورہ کام کر گیا۔" کھسر پھسر شروع ہو گئی۔ میں دانی کے سر پر جا کھڑی ہوئی۔

"کیا کہہ رہا تھا تمہارا گرو؟" میرا لہجہ ٹھنڈا تھا۔ "ذرا میں بھی تو سنوں کہ میرے بارے کیا کیا ارشاد ہوتا تھا۔"

"کہہ رہے تھے تمہاری استانی بڑے نرم دل کی ہے۔ موم بتی جیسی ہے 'سوری کرو گے تو پگھل جائیں گی۔"

میں نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ نیلا آسمان رنگوں سے خالی تھا۔ آسمانوں کو رنگوں سے سجانے والے رنگریز تو میرے سامنے بیٹھے تھے۔ میں بس انہیں ہی دیکھتی رہی۔

✡ ✡ ✡

میں نے کرم گلی کے تنگ مکان میں خود کو پایا اور اپنے پاس صرف دادی کو ہی دیکھا۔ اور پھر دادی ہی میرا سب کچھ ہو گئیں۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ میرا نام روشنی کیسے اور کیونکر تھا۔

میں خوب صورت نہیں تھی مگر میرا نام خوب صورت تھا۔ دادی کے ساتھ چھوٹے موٹے کام کرواتے میں نے گھرداری سیکھ لی تھی۔

"دادی! میرا نام روشنی نہیں ہونا چاہیے تھا۔" میں نے نفی میں سرہلایا۔

"ارے کیوں؟" دادی نے سوجی کا حلوہ بھونتے ہوئے مجھے دیکھا۔

"روشنی خوب صورت لڑکیوں کا نام ہوتا ہے۔"

دادی ہنس دی تھیں۔ "تم بھی تو خوب صورت ہو۔"

مجھے حیرت ہوئی تھی۔ سیب کی قاش منہ میں رکھ لی۔ "آپ کو لگتی ہوں نا۔"

دادی نے دیگچی ڈھکی۔ "تن خوب صورت ہو تو دنیا ملتی ہے روشنی! اور اگر من خوب صورت ہو تو رب ملتا ہے۔"

مجھے دنیا کبھی نہیں چاہیے تھی۔ پورے محلے میں میری واحد سہیلی رانی تھی۔ لکن میٹی' شٹاپو' گلی ڈنڈا' ہم نے زمانے بھر کے سارے کھیل کھیلے تھے۔ کرم گلی کی گلیاں تنگ تھیں، مگر لوگوں کے دل بڑے تھے۔

لڑکپن کا سنہری موسم آیا تو سب سنہری سا لگنے لگتا تھا۔ تانگے پر ہم کالج جاتی تھیں۔

"روشنی! نظر اٹھاؤ' اس لڑکے کو دیکھو' ادھر ہی دیکھ رہا ہے۔ وحید مراد کہیں کا۔"

لڑکپن کہتا نظریں اٹھاؤ اور دادی کہتیں۔

"نظر کی چوری کبھی معاف نہیں ہوتی روشنی۔"

رانی' شبانہ فٹ پاتھ پہ کھڑے لڑکوں کو دیکھ دیکھ ہنستی تھیں۔ میرا دل گستاخ ہونے لگتا تھا۔ ذرا سا دیکھ لوں تو کون سی قیامت آجائے گی۔ مگر میں وہ "نظر" کی چوری کبھی نہیں کرسکتی تھی۔

وہ خوشبوؤں سے مہکتے گلابی رقعے پڑھتی تھیں۔

چاندنی چاند سے ہوتی ہے ستاروں سے نہیں
محبت ایک سے ہوتی ہے ہزاروں سے نہیں

گلابی رقعے شعروشاعری سے بھرے ہوتے تھے۔ وہ سر سے سر ٹکرائے پڑھتی تھیں اور قل قل ہنستی تھیں۔

میں نے اسے پہلی بار تب دیکھا تھا جب رانی سے مسٹر چپس کے نوٹس لینے گئی تھی۔ میں باہر نکل رہی تھی اور وہ اندر آرہا تھا۔ ہم دونوں ٹکرائے تھے۔ مسٹر چپس کے نوٹس زمین بوس ہوگئے تھے۔

"یہ تم لڑکیوں کو چپس اور کیتھرین کی رومانٹک اسٹوری میں اتنا انٹرسٹ کیوں ہے؟"

میری آنکھیں کھل گئی تھیں' کتنا بدتمیز تھا۔

"تمہاری آنکھیں بہت بڑی بڑی ہیں۔ دنیا دیکھی جاسکتی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ نوٹس مجھے تھماتا آگے بڑھ گیا تھا اور اس دن میں نے مسٹر چپس کو تین بار پڑھا تھا۔ مسٹر چپس اور کیتھی کے رومانوی ابواب کے علاوہ مجھے سب پسند آیا تھا۔

"ہونہہ۔۔۔ بدتمیز کہیں کا۔"

ایک دن چھاتا سر پر تانے برستی بارش میں وہ ہمارے ہاں آیا تھا رانی کے ساتھ۔۔۔ جاتے جاتے مسکرایا تھا۔

"چائے اچھی بناتی ہو' مگر مجھ سے زیادہ اچھی نہیں۔" اگلے دن علم ہوا بے چارے کو نمونیا ہوگیا۔

کالج میں رانی سے دریافت کیا تھا۔ "تمہارا بھائی

کیسا ہے؟"
وہ پیمانے سے حاشیے لگا رہی تھی۔ "بہتر ہے کچھ... کہہ رہا تھا، تمہاری دوست کی چائے نے بیمار کر دیا۔"
میں ہنسی۔ "کتنا ڈرامے باز ہے تمہارا بھائی۔"
"ہاں واقعی بہت ہے۔"
پھر اکثر میں نے اسے اپنی گلی کے نکڑ پر کھڑے دیکھا تو حیرت ہوئی۔ میں اسے نظرانداز کرتی رہی، مگر پھر بھی نہ کر سکی۔ دل کے چاروں خانے کھٹاک سے کھل گئے تھے۔
ادھر نظر کی چوری ہوئی اور ادھر دادی چونک گئیں۔
"روشنی! تم ٹھیک تو ہو نا؟"
میں بیسن گھول رہی تھی۔ "جی دادی۔"
"بہت ہنسنے لگی ہو۔"
میں ٹھٹک گئی۔ "سچ میں دادی؟"
"میں اس عمر میں جھوٹ تھوڑی بولوں گی۔"
دادی جھوٹ واقعی نہیں بول رہی تھیں۔ سارے جھوٹ تو میں پیدا کر رہی تھی۔ پھر مجھے بھی گلابی خوشبوؤں سے مہکا رقعہ ملا۔ وہ شاید محبت کا طلسم تھا جو مجھے جکڑ گیا تھا۔
"تمہارا نام بہت خوب صورت ہے روشنی!" اور پہلی بار مجھے اپنا نام سب سے پیارا اور اچھا لگا تھا۔
میں رانی کے گھر جانے لگی تھی۔ ہر بار وہ چائے بنا کر لاتا تھا۔
"میں صرف تمہارے لیے چائے بناتا ہوں۔"
چائے واقعی زبردست ہوتی تھی۔ چھوٹی الائچی کی خوشبو کمرے میں پھیل جاتی تھی۔
"شکریہ!" خاموشی پھیل جاتی تھی۔
"نان لے آؤں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔
"نہیں... نہیں۔"
میں نے انکار کر دیا تھا۔
"تم عجیب سی ہو۔"
میں نے جھکا سر اٹھایا۔ "عجیب...؟"
وہ مسکرایا تھا۔ "ہاں... عجب اسرار سا ہے تم میں... کسی پسندیدہ جاسوسی ناول جیسا۔"
میں ناخنوں کو دیکھتی رہی۔
"وصی شاہ کو کبھی پڑھا ہے؟"
میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں۔ فیض احمد فیض کو پڑھا ہے۔"
وہ اٹھا اور خوب صورت رنگین کاغذ میں لپٹی کتاب لے آیا۔ "یہ لو، یہ وصی شاہ کی کتاب ہے، پڑھنا۔"
میں گھر آئی تو "مجھے صندل کر دو۔" پڑھتی رہی۔ کڑھی بناتے ہوئے گنگناتی رہی تھی۔

اپنے احساس سے چھو کر مجھے صندل کر دو
میں کہ صدیوں سے ادھورا ہوں مکمل کر دو

اگلی ملاقات میں پوچھنے لگا۔ "کیسی لگی کتاب؟"
"بہت اچھی تھی۔"
وہ مجھے دیکھتا مسکرا دیا۔ "تم مجھ سے ڈرتی ہو؟"
"نہیں تو... "بھلا محبوب سے بھی کوئی ڈرتا ہے۔
رانی کمرے میں آئی تھی۔
"روشنی... تمہاری تو فیضی بھائی سے اچھی خاصی دوستی ہو گئی۔"
وہ طنز تھا یا نہیں، مگر مجھے محسوس ہوا تھا۔ میں خاموش رہی۔ جانے کیوں مجھے برا لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

میں اور دادی پچھواڑے میں موتیے کے پودے لگا رہے تھے۔ بقول دادی کے موتیے کے پودے گھر کی فضا کو سکون دیتے تھے۔ جانے کیوں اب دادی کو سکون رخصت ہوتا نظر آ رہا تھا۔
رانی، فیضی کے ساتھ ملنے آئی تھی۔ ہمارے ایف اے کے پیپر ہو چکے تھے اور اب چھٹیاں تھیں۔ میں نلکے پر ہاتھ دھو رہی تھی۔ رانی، دادی کے ساتھ اندر گئی۔
"تم مجھے نظرانداز کر رہی ہو؟" کافی سنجیدہ سوال تھا۔
"نہیں تو، تم نے غلط سمجھا۔"
وہ اپنی بات پر مصر تھا۔ "پھر مجھے ایسا کیوں لگا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ "جانے کیوں۔"
وہ آگے بڑھنے لگا تھا' میں بھی دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی کمرے کی طرف جارہی تھی۔
"اگلے اتوار گھر آنا ہے تمہیں... میں انتظار کروں گا۔" میں نے فقط سر اثبات میں ہلایا تھا۔
میں رانی کے پاس بیٹھ گئی تھی۔
"واقعی امتحانات کے بعد کتنے بورنگ دن ہوتے ہیں۔ کچھ کورسز ہی کرلیتے۔"
چھٹیوں کی دلدادہ رانی نے جھٹ انکار کیا تھا۔
"ہائے نہیں روشنی... بڑی مشکل سے تو سکون کی سانس آئی ہے۔"
میں نے اسے گھورا تھا۔ "کالج میں تو جیسے تم روزانہ ہی جاتی رہی ہو۔"
ہفتے میں دو چھٹیاں تو وہ ضرور کرتی تھی۔
"خیر' تم بتاؤ آگے پڑھوگی یا نہیں؟" دادی لوازمات سجائے اندر آئی تھیں۔
"ارے بھئی... پوری سولہ جماعتیں پڑھے گی۔"
رانی ہنسی۔ "دادی! اب اس کا رشتہ بھی دیکھیں۔"
دادی نے ہنکارا بھرا۔ "سچ کہتی ہو بیٹی... تعلیم مکمل کرے گی تو کوئی سبب بن جائے گا۔" دادی صابرو شاکر تھیں۔
میرے تصور میں فیضی کا چہرہ لہرا رہا تھا۔ میں نے رانی کو شرارت سے دیکھا تھا۔
"تمہاری پھپھو تمہیں کب بہو بنا کر لے جارہی ہیں؟"
وہ ہنسی تھی۔ "اصغر دو مہینے بعد سعودیہ سے آئے گا تو پھر ڈیٹ رکھیں گے۔"
رانی اپنے کزن سے منسوب تھی جو سعودیہ میں ملازمت کرتا تھا۔
"اللہ ہر بیٹی کو عزت آبرو کے ساتھ اپنے گھر کا کرے' آمین۔" دادی نے دعا دی۔
وہ دونوں جانے لگے تو وہ پاس سے گزرتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔
"کچن کی کھڑکی کے پاس تمہارے لیے کچھ رکھا

ہے۔ دیکھ لینا۔"

وہ چلے گئے تو میں کچن کی کھڑکی کی طرف آئی تھی۔ میرے سامنے ادھ کھلا لال گلاب رکھا تھا۔ میں نے سونگھا تو یوں لگا جیسے محبت میری پوری ہستی میں رچ بس گئی ہو۔ اس دن جیسے کرم گلی کی گلیاں، دریچے لال گلابوں کی خوشبو سے اٹ گئے تھے۔

رات کو دادی نے سوتے وقت مجھے مخاطب کیا "روشنی!"

میں غنودگی میں تھی۔ "جی دادی!"

دادی نے رات کے اندھیرے میں روشن سوال کیا تھا۔

"یہ رانی کا بھائی کیا کام کرتا ہے؟" محبوب کے نام پر میری غنودگی ٹوٹی تھی۔

"رانی کے ابو کی کپڑے کی دکان ہے بند بازار میں.... فیضی بھی وہیں ہوتا ہے اور پرائیوٹ بی اے کر رہا ہے۔" میں نے دادی کو مطلع کیا تھا۔

دادی غنودگی میں جا رہی تھیں۔ "ویسے لڑکا تو بہت اچھا ہے۔"

دادی سو گئی تھیں، مگر میں آسمان پر سجے تارے دیکھتی رہی تھی۔ نیند اڑ گئی تھی۔ محبت یوں ہی تو نیندیں اڑاتی ہے۔

☆ ☆ ☆

اگلا اتوار آیا تو پھر بادل گھر گھر آ گئے۔ پکوانوں کی خوشبو سے گلیاں مہک اٹھی تھیں۔ دکانوں پر ریکارڈ بج رہے تھے۔

مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ۔

میں بوگن ویلیا سے سجے اس گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھی۔ لان خالی تھا، پودے بارش میں نہائے ہوئے کھڑے تھے۔

اس گھر میں ہمیشہ میں نے خوشبوؤں کے قافلے اترتے دیکھے تھے، مگر اس دن ہواؤں میں کافور کو گھلتا ہوا محسوس کیا تھا۔ لاؤنج کے جالی والے دروازے پر میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔ وہ بلاشبہ فیضی کی آواز تھی۔

"ارے ہزاروں لڑکیاں مرتی ہیں مجھ پر.... اپنی پرسنالٹی ہی کچھ ایسی ہے۔ رانی کی دوست تو میرے پیچھے پاگل ہے۔ پیاری نہیں ہے، مگر سادہ ہے۔ روشنی نام ہے۔ جان بھی دے سکتی ہے میرے لیے۔"

میں نے آنکھوں کو برستا اور جان کو نکلتا ہوا پایا تھا۔

تو یہ اوقات تھی میری؟ میری نظر کی پہلی چوری آخری ٹھہری تھی۔

میں گلیوں کے تالاب میں بھاگتی ہوئی گھر آئی تھی۔ آنکھوں کے پار تو دھندلی دیواریں تھیں، چار بار گرتے گرتے بچی تھی۔ تاپ چڑھا، اگلے دن اتر گیا اور تو کچھ نہ ہوا، مگر میں نے اپنی خاموش محبت کو خاموشی سے سلا دیا تھا۔

"میں محبتوں کا بار بار سوگ منانے والوں میں سے نہیں ہوں۔ مجھے اپنی عزت نفس، خودداری سے بڑھ کر کچھ عزیز نہیں۔"

رانی کی دو ماہ بعد شادی تھی، وقت آن پہنچا تھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ مجھے لینے آئی تھی مگر میں نے منع کر دیا تھا۔

"نہیں رانیہ.... دادی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ شادی کے دن پکا آؤں گی۔"

شادی کے دن اس کافور کھلے گھر گئی، وہاں میری محبت کو ہی تو موت آئی تھی۔ برقی قمقمے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ زرق برق ملبوسات تھے۔ میں کولڈ ڈرنک لیے ایک الگ تھلگ کونے میں جا بیٹھی تھی۔

وہ میرے سر پر نازل ہو گیا۔ آج نہ تو دل میں ڈھول بجے اور نہ شور مچا تھا۔ میں پرسکون بیٹھی تھی۔

"بہت پیاری لگ رہی ہو؟" وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔

"مجھ سے تم سچ کہہ سکتے ہو، میں واقعی حقیقت پسند لڑکی ہوں۔" اس کی پیشانی پر بال بکھرے ہوئے تھے۔

"تم دو مہینوں میں اتنی کیسے بدل گئیں؟"

میں نے گلاس کے کنارے پر انگلیاں پھیری تھیں۔ "تمہیں یہ کیسے لگا فیضی کہ میں دو مہینوں میں

بدلی ہوں۔"
وہ روشنیوں میں گھرا حیران ہوا تھا۔ "تو پھر؟"
"مجھے تو ایک لمحے نے بدل دیا۔" میں نے لمحوں کی گوٹ آگے سرکا دی تھی۔
"وجہ پوچھ سکتا ہوں؟" کولون کی خوشبو پھیل رہی تھی۔
"پہلے بھی بدلنے کی وجہ تم تھے اور اب دوسری بار بدلنے کی وجہ بھی تم بنے۔"
وہ خاموش بیٹھا رہا تھا' جانے بت تھا کہ۔۔۔ میں نے بیگ سے کتاب نکال کر اسے تھمادی تھی۔
"وصی شاہ اچھا شاعر ہے' مگر فیض احمد فیض سے زیادہ نہیں۔"
وہ ساکت بیٹھا تھا۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔
"کتاب کھول کر صفحہ نمبر بیس پر دیکھنا۔ تمہیں اپنا وہ لال گلاب بھی مل جائے گا جو تم نے کچن کی کھڑکی کے پاس رکھا تھا۔ معذرت خواہ ہوں کہ گلاب سوکھ چکا ہے' مگر تمہیں یقین دلاتی ہوں اس کی ایک پتی بھی نہیں ٹوٹی۔"
میں نے اسے یقین دلایا اور وہ بے یقین ہوا تھا۔
"تو پھر ٹوٹا کیا روشنی؟"
وہ پوچھ رہا تھا میں نے نظرانداز کردیا اور اٹھ کر کھڑی ہوئی۔
"پتا ہے فیضی! ہم لڑکیاں لال گلابوں کی بڑی حفاظت کرتی ہیں۔ کیونکہ جب دل ٹوٹتا ہے نا' تب یہ گلاب واپس کرنے پڑتے ہیں۔ مگر افسوس ہماری محبت کی طرح یہ گلاب بھی سوکھے ہوکر مرچکے ہوتے ہیں۔"
روشنیوں کے ہجوم میں وہ جیسے اندھیرے میں کھڑا تھا۔ کالا' سیاہ گھپ اندھیرا۔
"روشنی!" میں نے قدم آگے بڑھائے' پیچھے سے صدا بلند ہوئی تھی۔ "آئی ایم سوری۔"
میں نے بڑی دقتوں سے مسکرانے کی کوشش تو کی' مگر دو گستاخ آنسو لڑھک ہی گئے۔
"سونا تھا یا پھر سونے جیسا دل تھا میرا۔۔۔ تم نے توڑا اور پھر سوری کا لفظ مرہم کردیا۔ میں نے تم سے محبت کی۔ پہلی اور آخری غلطی کی۔ اس بات کا ساری زندگی مجھے افسوس رہے گا۔"
فیضی کے ہاتھ سے کتاب چھوٹ گئی تھی۔ صفحہ نمبر بیس پر لال گلاب سوکھا نظر آرہا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا میرے پاس آیا۔
"ایک مرتبہ دوبارہ یقین تو کرکے دیکھو روشنی!"
میں نے ٹشو پیپر سے آنکھیں رگڑ ڈالی تھیں۔
"یقین کرلوں؟ اتنا آسان ہوتا ہے یہ؟"
"مجھے ایک اور موقع تو دو۔" وہ پریشان تھا' بہت زیادہ۔
"میں جیتا جاگتا' سانس لیتا انسان ہوں فیضی۔ چوٹ لگتی ہے تو درد ہوتا ہے۔ کٹھ پتلی ہوتی تو تمہیں ایک اور موقع ضرور دیتی۔"
وہ میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ دنیا چھپ گئی تھی' وہ ہی وہ تھا اب۔۔۔
"تو تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں؟"
میں نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھا۔
"محبت کرتی تھی' مگر اب نہیں کرتی۔"
وہ پیچھے ہٹنے لگا۔ "تم اتنی کٹھور کیسے ہوسکتی ہو؟"
مجھے اس شکوے پر ہنسی آئی۔ "فیضان علی فریبی ہوسکتا ہے' اسے سب معاف ہے' روشنی کٹھور بھی نہیں ہوسکتی۔ واہ۔۔۔ خیر اب میرے راستوں میں نہ آنا۔ مجھے اذیت اٹھانی پڑے گی اور تمہیں شرمندگی۔"
وہ ہولے ہولے پیچھے ہٹتا مڑ گیا۔ میں اس کی نشست دیکھتی رہی۔ دیکھتی رہی۔ پہلی نظر کی کہانی اور پہلی محبت کا باب میں اسی کافور کھلے گھر چھاڑ آئی تھی۔ چیزیں سو بار ٹوٹیں اور جڑ جائیں' مگر دل۔۔۔ خیر دل کو چھوڑیں۔

✲ ✲ ✲

شفیق گول گپے والے کے ٹھیلے کے پاس کھڑے میں اور جگنو گول گپے کھا رہے تھے۔ ہفتے میں بس میری یہ واحد تفریح ہوتی تھی۔ چار پلیٹیں کھانے کے بعد ہم دونوں کا مرچوں سے برا حال تھا۔ جگنو تو مرنے کو

تھا۔ ہم نے کھٹے پانی کے گلاس بھر لیے تھے۔
پانی پیتے پیتے میں نے نظروں کی تپش محسوس کی تھی۔ وہ شاکر تھا جو بھتیجے کو کندھوں پر اٹھائے ہوئے تھا۔
"کیسی ہیں آپ؟" صاف دل جلاتا لہجہ تھا۔
"تم سے مطلب؟" میں نے نظر انداز کرنے کی ٹھانی تھی۔
"آپ کو کبھی مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔"
میں نے گھور کر دیکھا تھا۔ "یہ کسر آپ جو پوری کر دیتے ہیں' ہونہہ۔۔۔"
وہ ہنس دیا تھا۔ "ارے اتنی خفگی اچھی نہیں ہوتی۔"
کمینہ خواہ مخواہ فری ہو رہا تھا۔ میں نے جگنو کو دھمو کا جڑا تھا۔
"جلدی کرو۔۔۔ سال لگاؤ گے۔"
جگنو مزے سے کھٹا پانی پی رہا تھا۔
"میں اتنا برا بھی نہیں ہوں۔"
مجھے غصہ آیا تھا۔ "اتنے اچھے بھی نہیں ہو۔"
وہ دوبارہ مسکرایا تھا۔ ایک تو بدتمیز مسکراتا بہت پیارا تھا۔
"روشنی۔۔۔ آپ مجھ سے اتنی ناراض' ناراض کیوں رہتی ہیں؟"
وہ ٹھیلے سے ٹیک لگائے کھڑا مجھے جواب طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
"خوش تو ہونے سے رہی؟ تم میرے اسٹوڈنٹس کو بھٹکا رہے ہو۔ ان کے ایگزامز ہو رہے ہیں اور وہ بالکل بھی سیریس نہیں۔ ان کے دماغ سے کنچے اور پتنگ بازی کا خناس ہی نہیں نکلتا اور اس کی وجہ آپ ہیں۔"
میں نے دل کی بھڑاس نکالی تھی۔
"اوکے۔۔۔ آج سے آپ کو آسمان نیلا ہی ملے گا۔"
وہ دعوا تھا شاید۔۔۔ میں تھیلے اٹھائے جگنو کے ساتھ آگے بڑھی تھی۔
"سنیں۔" وہ پکار تھی' میں رکی تھی مگر پلٹی نہیں تھی۔
"کبھی کبھی مسکرا دیا کریں۔"
میں سلگ کر رہ گئی' دل چاہا تھیلے سے ایک بینگن نکال کر اس کے سر پہ دے ماروں۔۔۔ کاش میں ایسا کر سکتی۔
دو سے تین اور پھر تین سے چار بج گئے۔ میں کوئی ساتویں بار آسمان دیکھ آئی تھی اور آسمان نیلا ہی ملا تھا۔
دادی بینگن کاٹ رہی تھیں۔
"روشنی! آج تمہارے شاگرد پتنگیں نہیں اڑا رہے؟"
میں شربت گھول رہی تھی۔ "گرو جی کی طبیعت صاف کی تھی میں نے۔۔۔ یقیناً" اسی کا اثر ہو گا۔"
شام سے ذرا پہلے سارے پڑھنے آئے تو منہ لٹکے ہوئے تھے۔ میں نے باری باری سب کو دھمکایا۔
"زیادہ یتیم' مسکین نظر آنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ پیپرز کی طرف دھیان دو۔ ذرا جو پروا ہو تم لوگوں کو۔"
دادی کچن کی کھڑکی سے سن رہی تھیں۔
"روشنی۔۔۔ جب ان کے والدین کو پروا نہیں تو تم کیوں فکر میں دبلی ہوتی ہو؟" لہجے میں شرارت تھی۔
"دادی۔۔۔ جو میرا کام ہے' وہ مجھے ہی کرنا ہے۔ انہیں بھیجنا ان کے ماں' باپ کا کام ہے اور انہیں پڑھانا میرا کام ہے۔"
میں نے بھی "پیاسا کوا" اور "میرا اسکول" کا ٹیسٹ لے لیا' جو میں پچھلے دو ہفتوں سے تیار کروا رہی تھی۔ مگر ٹیسٹ دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ میں نے سب کو ایک قطار میں مرغا بنا دیا۔ دادی دیکھ دیکھ ہنستی رہیں۔
"کوئی شرم ہوتی ہے' کوئی حیا ہوتی ہے اور تم سب میں یہ بالکل بھی نہیں۔ امتحان سر پر ہیں اور کھیل کود سے فرصت نہیں۔ اب تم لوگوں کو ڈنڈوں سے سیدھا کروں گی۔"
ڈنڈوں پر مرغا بنی قطار شمال کو لڑھک گئی۔ وہ کورس میں بولے تھے۔
"استانی جی معاف کر دیں۔ اب شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔"

انہیں ڈپٹ کر "پیاسا کوا" یاد کرنے کا کہہ کر میں "باون سے" لے کر پڑھنے بیٹھ گئی تھی۔ دادی چائے لے آئی تھیں۔

"ہائے روشنی! بے چارے بچے ہیں۔ اتنی سختی کیوں کرتی ہو۔"

میں نے "بچوں" کو بغور دیکھا تھا۔

"دو ہفتوں سے کہانی اور مضمون یاد کروا رہی ہوں' مگر نتیجہ صفر۔"

دادی نے سر اٹھا کر آسمان کی نیلی چادر کو دیکھا تھا۔

"آج کتنا خالی خالی لگ رہا ہے نا آسمان؟"

میں نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ آسمان ویران تھا۔ ویسی ہی ویرانی میرے سامنے بیٹھے نفوس کے چہروں پر تھی۔ میں نے کچھ سوچا اور پھر ان سب کو مخاطب کیا تھا۔

"چلو کھیل کود کر لیا کرو' مگر یاد رہے' پڑھائی کا وقت پڑھائی کو دینا ہے۔"

آنکھوں میں دیپک جل اٹھے۔ میں ان کی ویران آنکھیں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اگلے دن آسمان رنگ برنگی پتنگوں سے اٹ چکا تھا۔ سارے آسمان پر رنگ تھے۔

✡ ✡ ✡

میں سو کر اٹھی تھی۔ باہر آئی تو دیکھا وہ اپنے بھتیجے کے ساتھ دادی کے ساتھ تخت پر براجمان تھا۔ دادی نے مجھے مطلع کیا۔

"شاکر تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

میں ان ہی کی طرف آگئی۔ "فرمائیں۔"

وہ شریف بنا سر جھکائے بیٹھا تھا۔ میں نے بمشکل ہنسی دبائی تھی۔

"جی یہ میرا بھتیجا ہے۔ کیا آپ اسے شام کو ٹیوشن پڑھا دیا کریں گی؟"

میں نے بھتیجے کو اپنی طرف بلایا۔ دادی کچن کی طرف اٹھ گئی تھیں۔

"اپنے چچا کی طرح نالائق تو نہیں؟"

وہ چونک اٹھا۔ "آپ تو میرے بارے میں کافی کچھ جانتی ہیں۔"

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ "مجھے کوئی ضرورت نہیں۔"

وہ مسکرایا تھا۔ "کیا واقعی ضرورت نہیں؟"

میں نے دانت پیسے تھے۔ "جی بالکل۔"

دادی کولڈ ڈرنک لے آئی تھیں۔ وہ کافی مہمان نواز تھیں۔ وہ شرمندہ ہوا تھا۔

"ارے آپ نے کیوں زحمت کی؟"

دادی نے اسے ڈپٹا۔ "پتر... مہمان اپنا رزق ساتھ لاتے ہیں۔"

وہ ہولے سے بولا۔ "مہمان دل بھی ساتھ لائے ہیں۔"

میں نے اسے گھورا تھا۔ "ضرورت نہیں۔"

وہ خاموشی سے کولڈ ڈرنک پیتا رہا۔

کچھ دنوں بعد اس کا بھتیجا پڑھنے آنے لگا تھا' شکر تھا کہ اپنے چچا جیسا نالائق نہیں تھا۔

شاکر کا بھتیجا پڑھنے آنے لگا تو ہمارا بھی ان کے گھر آنا جانا ہو گیا تھا۔ شاکر کی بھابھی نازش عجیب سی تھیں' جنہیں کم از کم میں تو نہیں سمجھ سکی۔ البتہ شاکر کی بہن ہانیہ سے میری اچھی خاصی دوستی ہو چکی تھی۔ وہ ایک ملنسار اور پیاری لڑکی تھی۔ اکثر اپنے بھتیجے اسد کو چھوڑنے آتی تھی۔ بہت دیر تک بیٹھی رہتی تھی۔

"ہانیہ... تمہارا بھائی کوئی کام کیوں نہیں کرتا؟" میں نے دریافت کیا تھا۔

"ارے روشنی باجی... وہ تو بے چارے نوکری ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک چکے جو مل کر ہی نہیں دے رہی۔ بھابھی اور بڑے بھیا کی باتیں الگ سننا پڑتی ہیں۔"

وہ بہت دکھی لہجے میں بول رہی تھی۔ میں نے چائے کا کپ اس کی طرف بڑھایا۔

"تعلیم کتنی ہے شاکر کی؟"

وہ کپ تھامے بیٹھی تھی۔ "ان کے ایم اے کے آخری سال کے پیپر تھے' جب ابا فوت ہوئے تھے تو

انہوں نے پیپر ہی نہیں دیے۔"

مجھے سخت حیرانی ہوئی۔ "ماسٹر ڈگری تو مکمل کرلیتا ہانیہ!"

اس پیاری لڑکی کی آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے تھے۔ "بھائی آگے پڑھنا چاہتے تھے، مگر بڑے بھیا نے کہہ دیا کہ آگے تعلیم کا خرچ نہیں اٹھائیں گے۔ شاکر بھائی نے پہلے پہل مزدوری کی۔ شام کو گھر آتے تو ہاتھوں پر چھالے ہوتے تھے۔ سارا جسم درد کرتا تھا، میں ٹکور کرتی تھی۔ ابا نے ہمیں پھولوں کی طرح رکھا باجی، مگر والدین کے لاڈلوں کی زمانے نے ذرا بھی پروا نہیں کی۔ پھر شاکر بھائی نے ابا کی چھوٹی سی دکان سنبھال لی۔ زندگی گزر رہی ہے۔"

وہ آنسو پی رہی تھی، میں نے اس کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھا۔ "اسے ماسٹر مکمل کرنا چاہیے۔"

وہ چپ چاپ سر ہلا رہی تھی۔

"تمہاری تعلیم کتنی ہے؟"

اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ "ایف اے ہے۔"

میں نے سر ہلا دیا۔ "میں تمہیں بی اے کا کورس منگوا دوں گی۔ تم پرائیویٹ بی اے کرو۔ تمہارا خرچا میں اٹھالوں گی۔"

وہ نفی میں سر ہلاتی رہی، پھر کچھ خیال آنے پر اپنے دونوں کانوں سے ٹاپس اتار کر میرے سامنے کردیے۔

"آپ یہ بیچ دیجیے گا۔"

میں ساکت بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔ کتنی خوددار تھی وہ۔ میری آنکھیں نم ہوگئیں۔ اسے گلے سے لگالیا۔

"پگلی! ٹاپس پہن لو۔ اور میں تم پر کوئی ترس نہیں کھا رہی، بلکہ جب بھی تمہارے بھائی کی جاب لگے واپس کردینا۔ اب بالکل نہیں رونا۔"

"کس کس بات پر چپ کروائیں گی باجی۔" وہ تلخی سے ہنسی تھی۔

صحن میں بچے پڑھ رہے تھے۔ دادی پڑوس میں گئی تھیں۔ املی کے پودوں پر کالی کلیچیاں بیٹھی تھیں، میں انہیں دیکھتی رہی۔

"پتا ہے ہانیہ! زندگی کبھی بھی آسان نہیں ہوتی۔ سو طرح کی مشکلیں ہوتی ہیں مگر زندگی کو آسان بنانا ضرور انسان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اگر ہم روتے دھوتے رہیں گے تو کبھی کچھ نہیں کرپائیں گے۔ ہر مسئلے کا حل رونے میں نہیں۔ کوشش کرنا پڑتی ہے۔ مجھے دیکھو، میں نے بھی کم و بیش تمہارے جیسے حالات گزارے ہیں۔ مگر میں نے جدوجہد جاری رکھی۔ آج کل تعلیم کا دور ہے، ورنہ یہ دنیا نوچ کھاتی۔"

وہ غور سے مجھے دیکھتی رہی۔ "شکریہ باجی!"

شام گہری ہو رہی تھی۔



میں پڑھا کر اسکول سے آرہی تھی، جب میں نے اسے گلی کے نکڑ پر دیکھا تھا۔ وہ مجھے دیکھتا قریب چلنے لگا تھا۔

"کیسی ہیں آپ؟" وہ کتنا شوخ و چنچل نظر آتا تھا، ورنہ دل میں تو کیسے کیسے طوفان اٹھتے ہوں گے۔

"ٹھیک ہوں..... تم کیسے ہو؟" وہ فوت ہوتے ہوتے بچا تھا۔

"یہ آپ مجھ سے ہی مخاطب ہیں نا؟"

میں نے چلتے چلتے بغور اسے دیکھا تھا۔ گھسی ہوئی جینز پر بلیو شرٹ پہنے، بال سائیڈ پر کیے وہ مجھے زمانے بھر سے بے نیاز سا نظر آیا تھا۔

"تو کیا دیواروں سے مخاطب ہوں؟" میں نے ڈپٹا۔

وہ ہنس دیا۔ "ارے نہیں..... آپ کہاں دیواروں سے بات کریں گی؟ یہ کام تو ہم غریبوں کے کرنے والے ہیں۔"

لہجے میں سنجیدگی غوطے کھا رہی تھی۔

"کسر نفسی سے کام لے رہے ہو؟"

"حقیقت بیان کررہا ہوں۔"

اس نے سفید پتھر کو ٹھوکر لگائی۔ پتھر سامنے والی دیوار سے جا ٹکرایا۔ ہلکی سی آواز گونجی۔

"دیواروں سے باتیں کرتے ہو؟" میں نے حیرت کا اظہار نہ کیا تھا۔

"ہاں.... انسان کم پڑ گئے ہیں۔" وہ مجھ سے فاصلہ رکھے اطمینان سے چل رہا تھا۔

"ڈھونڈنے پر لوگ خدا ڈھونڈ لیتے ہیں۔ تم سے انسان نہ ڈھونڈے گئے۔" میں ہولے سے ہنسی۔

"آپ بات کریں گی مجھ سے؟"

میں ٹھٹک کر رکی۔

"دیکھا' آپ بھی مجھ سے بات نہیں کرتیں۔"

وہ تلخ لہجے میں بولا تھا۔

میں نے بیگ سے ڈائری نکالی اور اپنا نمبر لکھ کر چٹ اسے پکڑا دی۔ وہ حیرت آمیز خوشی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"ہر کسی کو ایک ہی پیمانے سے نہیں تولنا چاہیے۔"

میں آگے بڑھ گئی تھی' گھر آ گیا تھا۔

وہ پیچھے سے پکارا تھا۔ "روشنی جی!"

میں نے پلٹ کر سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"جی؟"

"آپ بہت اچھی ہیں۔"

میں نے دروازے پر ہاتھ رکھا۔ "اور تم بالکل بھی اچھے نہیں ہو۔" یہ کہہ کر میں غڑاپ سے اندر گھس گئی تھی۔ وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتا' سر ہلاتا گنگناتا آگے بڑھ گیا تھا۔ ساری گلی سنسان پڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

شام ہو چکی تھی۔ کھانا کھا کر میں صحن میں ٹہل رہی تھی۔ جب موبائل بجا تو میں نے کان سے لگایا۔

"ہیلو.... جی کون....؟"

"آپ اپنا تعارف ہوا' بہار کی ہے۔"

میں نے آواز پہچان لی تھی۔ "اچھا تو یہ تم ہو؟"

وہ شاید مسکرایا تھا۔ "جی میں ہی ہوں۔"

میں نے آسمان کی طرف نگاہ کی تھی۔ کوئی دو تین بھولے بھٹکے تارے نظر آئے تھے۔

"کیا کر رہی ہیں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"صحن میں ٹہل رہی ہوں۔" میں نے بتایا تھا۔

"کتنا اچھا مشغلہ ہے نا۔" اس نے تبصرہ کیا تھا۔

"تم کیا کر رہے ہو؟"

ادھر اس نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔ "زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔" وہ تھکا تھکا سا لہجہ مجھے محسوس ہوا تھا۔

"زندگی مشکل نہیں شاکر!"

وہ چھت پر کھڑا تھا۔ دور' دور روشنیوں کے سائے تھے۔ عجب....

"آسان بھی تو نہیں روشنی جی۔"

"ہو تو سکتی ہے۔"

وہ دور تک دیکھ رہا تھا۔ "ہزار کوششیں کر چکا ہوں۔"

وہ لہجہ مجھے اس گلی والے چنچل لڑکے کا تو نہیں لگا تھا۔

"دو چار اور بھی کر لو۔" میں نے کہا۔

"دل مر چکا ہے۔"

دل مرا تھا تو وہ زندہ کیسے تھا؟

"دل آسانی سے نہیں مرتے۔" دل کہاں آسانی سے مرتے ہیں؟

"یہ بھی ہے.... سوچ رہا ہوں باہر ملک چلا جاؤں۔"

مجھے حیرت ہوئی۔

"دوست کے ساتھ.... یہاں بہت مسائل ہیں' انہیں حل کرنا ہو گا۔"

"وہاں رہ کر مسائل حل کرو گے؟"

"نہیں کہاں کروں گا۔"

"تو پھر....؟" یہاں کے مسائل پیسے سے شروع ہو کر پیسے پر ختم ہوتے ہیں۔

"واپس لوٹو گے؟" جانے میں نے کیوں وہ سوال دہرایا تھا۔

"آپ میرا انتظار کریں گی؟"

میں خاموش رہ گئی تھی۔ پھر ہولے سے کال کاٹ دی تھی۔ اس سوال کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں تھا۔ سوال مشکل نہیں تھا' بس جواب آسان نہیں تھا۔

٭ ٭ ٭

"نفیسہ خاتون! ہم معذرت خواہ ہیں' ہم یہ رشتہ نہیں کر سکتے۔ آپ کی پوتی کی عمر بھی ذرا زیادہ ہے۔ جہیز کی بھی کوئی امید نہیں۔ اوپر سے پرائیویٹ اسکول میں پڑھاتی ہے۔ پرائیویٹ اسکولوں والے تو خون نچوڑ لیتے ہیں مگر ہتھیلی پر پانچ ہزار رکھتے ہیں۔"

آخر میں تبصرہ کر کے کھا پی کر رشتے والے چل دیے تھے۔ میرے لیے یہ معمول کی بات تھی' مگر دادی جانے کیوں ابھی تک اس بات کی عادی نہیں ہوئی تھیں۔

تسبیح کے دانے گراتی پھپک پھپک کر روتی رہیں۔

میں ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔

"کیوں رو رہی ہیں آپ؟ جب مجھے فرق نہیں پڑ رہا تو آپ کو بھی نہیں پڑنا چاہیے۔"

بھیگی آنکھیں میری طرف اٹھی تھیں۔ "تم تو پتھر کی ہو۔"

میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ کیا واقعی میں پتھر کی تھی؟ میں نے ان کے ہاتھ تھامے۔

"دادی... آپ ہی تو کہتی ہیں کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ میرا بھی بنا ہوا ہو گا۔ جلد سامنے بھی آجائے گا۔" میں نے انہیں تسلی دی تھی۔ وہ ذرا سنبھل گئی تھیں۔

"اچھا... وہ جو تو نے شامی کباب بنائے تھے؟"

"جی... لے کر آتی ہوں۔"

میں کچن میں آگئی تھی۔ میں جانتی تھی دادی نے بات بدلی تھی۔ یہ بھی ہمارے گھر کا جیسے معمول ہو چلا تھا۔

کچھ دیر بعد پلیٹ میں سموسے' کباب اور نگٹس رکھے میں ہانیہ کی طرف چلی آئی تھی۔ وہ کپڑے الگنی پر پھیلا رہی تھی۔ مجھے دیکھا تو خوشی سے چلا اٹھی۔

"ارے آپ آئی ہیں۔"

وہ میری طرف چلی آئی تھی' گرمجوشی سے گلے ملی اور مجھے کمرے میں لے آئی۔

"آج تو ہفتہ وار صفائی کر کے جان نکل گئی۔" میں ہنسی۔ "اب یہ مت کہہ دینا کہ ٹیوشن کا کام یاد نہیں کر سکیں۔"

وہ بھی ہنس دی۔ "نہیں... نہیں وہ تو بھائی رات کو ہی یاد کروا دیتے ہیں۔" ہانیہ نے مجھے مطلع کیا تھا۔

تب ہی نازش نے اندر جھانکا تھا۔ "ہانی... کون آیا ہے؟" میری طرف نظر اٹھی تو میری طرف آئیں۔

"ارے روشنی تم آئی ہو۔ میرے کمرے میں چلی آتیں۔" میں نے ہانیہ کا بجھتا چہرہ دیکھا تھا۔

"ارے نہیں بھابھی میں یہیں کمفرٹیبل ہوں۔" میں نے انہیں مطمئن کر دیا تھا۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ اچھا یہ تو بتاؤ میرا اسد پڑھائی میں کیسا ہے؟" وہ بیٹے کا پوچھ رہی تھیں۔

"جی بھابھی! آپ بے فکر رہیں۔ بہت ذہین ہے اور پڑھائی میں دلچسپی لیتا ہے۔"

وہ مطمئن ہو کر چلی گئی تھیں۔

"اچھا... میں اس کے ہاتھ بوتل بھجواتی ہوں۔"

میں کمرے کو دیکھ رہی تھی۔ کمرہ تو اتنا خاص نہیں تھا' مگر صاف ستھرا تھا۔ پینٹ اکھڑا ہوا تھا۔ تب ہی کونے میں رکھے سلنڈر پر میری نظر پڑی تھی۔

"ارے ہانی... تم الگ کھانا پکاتی ہو کیا؟" مجھے حیرانی ہوئی تھی۔

"جی باجی... بھابھی نے جھگڑا کیا تھا کہ ہم دونوں بہن' بھائی مفت کی روٹیاں توڑتے ہیں۔ تب سے ہم الگ پکاتے ہیں۔" وہ بے چاری سخت شرمندہ نظر آرہی تھی۔ میں نے اسے پلیٹ کی طرف متوجہ کیا تھا۔

"یہ لو... میں تمہارے لیے لائی ہوں۔" وہ ممنون سی نظر آئی تھی۔

"اس کی ضرورت نہیں تھی۔"

"کیوں ضرورت نہیں تھی؟"

وہ خاموش ہو گئی تھی۔ اسد اندر آیا' بوتل مجھے پکڑا کر باہر بھاگ گیا تھا۔

"آج تو ان لوگوں نے آنا تھا نا؟" ہانیہ نے دریافت

کیا تھا۔

میں نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔ ”ہاں۔۔۔ آئے تھے۔“

”تو پھر کیسا رہا؟“

وہ پوچھ رہی تھی۔ اور میں بس ہنس دی تھی۔

”وہی جو ہمیشہ سے ہوتا آرہا ہے۔“

”اور آپ پھر بھی مسکرا رہی ہیں۔“

میں نے اس کی حیرت دیکھی تھی۔ ”میں دوسروں کے لیے مسکرانا نہیں چھوڑ سکتی۔“

ہانیہ نے کباب منہ میں رکھا تھا۔

”انکار کی وجہ کیا رہی؟“

میں نے ٹھنڈی آہ بھر کے فرش پر بچھے بوسیدہ قالین کو دیکھا تھا۔ ”انہیں بہو نہیں چاہیے تھی‘ بلکہ ایک تنخواہ کمانے والی نمائشی گڑیا‘ ڈھیروں جہیز لانے والی لڑکی چاہیے تھی اور ان سب خصوصیات میں سے مجھ میں ایک بھی نہیں۔“

”آپ کو دکھ نہیں ہوتا؟“ کھلے دروازے کے باہر سوکھے نیم کے پتے بکھرے نظر آتے تھے۔

”پہلے ہوتا تھا‘ اب نہیں ہوتا۔“ میں نے بے نیازی سے کہا تھا۔ وہ مجھے رشک سے دیکھتی رہی۔

”آپ بہت بہادر ہیں۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ ”تمہیں بہادر لگتی ہوں اور دادی کو پتھر لگتی ہوں۔“

”اور اپنے آپ کو کیا لگتی ہیں؟“ وہ شرارت سے پوچھ رہی تھی۔

”اپنے آپ کو کبھی سوچا ہی نہیں۔“ میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”ارے میں چائے بناتی ہوں۔ پی کر جائیے گا۔ باتوں میں یاد ہی نہیں رہا۔“

وہ شرمندہ نظر آرہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ تھامے تھے۔

”بے فکر رہو۔ میں گھر سے پی کر آئی تھی اور کی طلب نہیں۔“

سہولت سے انکار کر کے میں گھر آگئی تھی۔ دادی عصر پڑھ رہی تھیں۔

شام کو آندھی آئی تو موسم ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ موتیے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ڈھابوں پر ریکارڈ بج رہے تھے اور ادھر دھرا میرا موبائل بج اٹھا تھا۔ میں نے کال پک کی تھی۔

”آج نہیں پوچھوں گی کہ کون بات کر رہا ہے؟“

میں سیڑھیوں پر بیٹھ گئی تھی۔ خوش گوار سی ہوا چل رہی تھی۔

”اب میں ایک ہی سوال تو بار بار نہیں کر سکتی۔“

”اچھا۔۔۔ میں شکریہ ادا کرنا چاہ رہا تھا۔“ برآمدے کے بلب کی روشنی بکھر رہی تھی۔

”شکریہ کیوں؟“

”شامی کباب بہت مزے کے تھے۔“ وہ تعریف کر رہا تھا۔ میں تعریف پر خاموش رہنے والوں میں سے تھی۔

”لوگوں کو آپ کی قدر نہیں۔“

وہ کس بات کا آغاز تھا۔ مجھے علم تھا۔

”میرے سامنے دلاسے‘ تسلیوں کے ڈھیر لگانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے کوئی دکھ نہیں‘ کوئی اداسی نہیں۔“ میں نے صاف کہہ دیا تھا۔

”آپ باقی لڑکیوں سے جدا تو نہیں ہیں نا؟“ وہ جانے کن لڑکیوں کی بات کر رہا تھا۔

”اچھا۔۔۔ کتنی لڑکیوں کو جانتے ہو؟“

وہ گھبرا گیا تھا۔ ”قسم لے لیں۔۔۔ صرف آپ سے بات کرتا ہوں۔“ میں نے ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں کہا تھا۔ ”یقین نہیں آتا۔“

وہ سنجیدہ ہوا تھا۔ ”آپ نے مجھ پر یقین نہیں کیا؟“

وہ پوچھ رہا تھا۔ میں نے بات بدلی تھی۔

”تو پھر تم پیپر زدے رہے ہو نا؟“

وہ غصہ ہوا۔ ”آپ بدلیں مت بات کو؟“

میں نے سیڑھیوں پر ہاتھ پھیرا۔ تم مجھے اس مقام تک نہ لے کر آیا کرو جہاں بات بدلنی پڑ جائے۔“

وہ خاموش ہو گیا تھا۔ خاموشی میرے سامنے سیڑھیوں پر ٹہلتی پھر رہی تھی۔

"چاند کو دیکھا آج؟" خاموشی کھسک گئی۔
"نہیں دیکھا۔" وہ چھت پر کھڑا آسمان دیکھ رہا تھا۔
"دیکھیں آج بہت روشن ہے۔" میں سیڑھیوں سے اٹھ کر ٹہلتی ہوئی صحن کی طرف آگئی۔ نظر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ بادلوں کے پار چاندی سا چاند نظر آرہا تھا۔
"دیکھ لیا..... بہت پیارا ہے۔" مجھے واقعی خوشی ملی تھی چاند کو دیکھ کر۔
"آج کل پتنگیں نہیں اڑاتے؟"
"نہیں....." اس نے نفی میں جواب دیا تھا۔
"اچھا..... وہ کیوں؟" میں نے پوچھا تھا۔
"ڈر گیا ہوں۔"
میں ہنسی تھی۔ "کس سے؟"
"تھی ایک لڑکی جسے میرے پتنگ اڑانے سے چڑ تھی۔ اکثر مجھ سے لڑنے آجاتی تھی۔ اب اس نے لڑنا چھوڑ دیا اور میں نے پتنگ اڑانا چھوڑ دیا۔" وہ ہنستا ہوا مجھے بتا رہا تھا۔
"تم نے صرف اس چھوٹی سی وجہ سے پتنگ اڑانا چھوڑ دی؟"
"میرے لیے یہ وجہ چھوٹی نہیں تھی روشنی جی!"
وہ مدھم لہجہ بڑی کشش رکھتا تھا۔ میں چپ چاپ سنتی رہی تھی۔



رات سوچ کے دھاگوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ شاکر جانے کیوں اور کیسے میری زندگی میں داخل ہو گیا تھا اور مجھے خبر بھی نہ ہوئی تھی۔ وہ مجھے عزت دیتا تھا اور میں عزت کی قدر کرنے والوں میں سے تھی۔ اگر ہم دونوں میں "کچھ" تھا بھی تو ایسا ڈھکا چھپا تھا کہ جس کی ہم دونوں کو بھی خبر نہیں تھی۔

میری بزم دل تو اجڑ چکی، میرا فرش جاں تو سمٹ چکا
سبھی جا چکے میرے ہم نشیں، مگر ایک شخص گیا نہیں

درو بام سب نے سجا لیے، سبھی روشنی میں نہا لیے
مری انگلیاں تک جھلس گئیں مگر اک چراغ جلا نہیں

"تمہارے ماں، باپ بڑے چالاک تھے روشنی! دونوں مجھے آدھا آدھا تقسیم کرکے چل دیے۔ اب مجھے دیکھو میں کبھی تمہاری ماں ہو جاتی ہوں اور کبھی باپ بننا پڑتا ہے۔ اگلے جہان پوچھوں گی دونوں سے....."

وہ دونوں مرحومین سے سخت خفا تھیں۔ وہ عشاء کی نماز کے بعد تخت پر بیٹھی تھیں۔ میں حسب معمول اپنی پسند کی جگہ یعنی برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔
"دادی ایک بات تو بتائیں۔" میں سر اٹھا کر انہیں دیکھ رہی تھی۔
"ہاں..... بولو....."
"کبھی آپ کی اور اماں کی لڑائی بھی ہوئی؟"
سوال مزاحیہ تو نہ تھا، مگر دادی ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئیں۔
"میں اور تمہاری ماں بڑی بزدل عورتیں تھیں، ہمیں کبھی لڑنا آیا ہی نہیں۔"
میں خوش ہوئی۔ "ارے پھر تو آپ دونوں آئیڈیل ساس، بہو تھیں۔"
دادی جیسے سوچ کے رتھ پر سوار تھیں۔
"خاک آئیڈیل..... مرنے کے میرے دن تھے، مگر مر وہ گئی۔ چپ چاپ دنیا چھوڑ گئی اور زمانے بھر کا گھنا تمہارا باپ بھی پیچھے چل دیا۔ دونوں نے میرا خیال تک نہ کیا بھلا۔ اکیلی بڑھیا کیا، کیا کرے گی۔ اگلے جہان پوچھوں گی دونوں سے....." ان کی آواز بوجھل ہو رہی تھی۔
"میں نے تمہاری تربیت میں خیانت نہیں کی، روشنی تمہیں پہلا لفظ ہی "ابو" کہنا سکھایا..... باقی پیچھے کیا رہ جاتا ہے؟" جانے کیوں دادی کا سوال نمی میں بوجھل ہو گیا تھا۔
"میں تمہاری وجہ سے بہت پریشان ہوں روشنی!"
دادی کی آواز بڑی غیر معمولی سی تھی اور مجھے غیر معمولی چیزوں سے ہمیشہ خوف آتا تھا۔
میں دھیرے دھیرے چلتی ان تک آئی تھی۔

"کیوں دادی؟"
"تمہاری عمر کی لڑکیاں تو اپنے گھربار کی بھی ہو چکیں مگر تمہارا کوئی سبب ہی نہیں بن رہا۔"
میں نے انہیں تسلی دی تھی۔ "پریشان نہ ہوں دادی، سبب بنانے والا تو اللہ ہے۔"
دادی نے میرا ہاتھ تھاما تھا۔ "مگر کوشش انسان کو ہی کرنا پڑتی ہے۔"
ہلکا اندھیرا تھا۔ زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔
"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے انہیں تسلی دی تھی۔
"تسلی دے رہی ہو؟" وہ بوجھل ہنسی ہنسیں تھیں۔
"نہیں..... تو..... بتا رہی ہوں۔"
وہ کچھ دیر بیٹھی رہیں، پھر اندر چلی گئیں۔ موسم خنک سا تھا۔ میں تخت پر بیٹھ گئی تھی۔ رات سے تو کبھی خوف نہ آیا تھا۔ میں موتیے کی خوشبو سانسوں میں اتارتی رہی تھی۔ موبائل بج اٹھا تو میں نے کان سے لگالیا۔
"تم مجھے یاد کر رہی تھیں نا؟" بڑا پُریقین لہجہ تھا۔
"جی نہیں۔" میں نے یقین کے غبارے میں جیسے سوئی چبھو دی تھی۔ "پھر مجھے پچھلے بیس منٹ سے ہچکیاں کیوں آرہی ہیں؟" کافی ناراض اور غور طلب سا لہجہ ہو گیا تھا۔
"تمہارے جو اتنے افیئرز چل رہے ہیں، ہو گی کوئی یاد کرنے والی۔" میں نے یاد دلایا تھا۔
"مجھے ایسا سمجھتی ہو؟" بے تکلفی نے "آپ" کو "تم" کر دیا تھا۔
"میں تخت کو ناخن سے کھرچ رہی تھی۔
"سنو....."
میں چونکی۔
"تمہارا شکریہ..... تم نے ہانیہ کو بی اے کا مشورہ دیا تھا اور اس نے پاس بھی کر لیا۔" وہ بہت خوش تھا۔ میں اچھل ہی تو پڑی تھی۔
"ہیں..... رزلٹ آگیا۔ ہانیہ نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔"
وہ ہنسا تھا۔ "کیونکہ میں نے ابھی اسے نہیں بتایا۔"
مجھے بہت خوشی ہو رہی تھی۔ "حق دار کو زیادہ دیر تک اس کے حق سے محروم نہیں کرنا چاہیے۔" میں نے اسے سمجھایا تھا۔
"ہاں جی..... واقعی محروم نہیں کرنا چاہیے۔"
وہ مجھے سمجھا رہا تھا اور میں سمجھ بھی گئی تھی۔
"مٹھائی کب کھلا رہے ہو؟" میں نے پوچھا تھا۔
"آج کل جیب تھوڑی تنگ ہے۔"
وہ زمانے بھر کا مسکین ہو گیا تھا۔ میں ہنسی تھی، وہ تھم سا گیا تھا۔
"ہنستی رہا کرو۔" میں نے ہمیشہ کی طرح یہ بات نظر انداز کر دی تھی۔
"میں تم سے پوری بیکری لے کر دینے کو نہیں کہہ رہی۔ جو تمہاری جیب تنگ پڑ رہی ہے۔" میں نے بھی سنا دی تھیں۔
وہ شریر ہوا تھا۔ "کتنی سستی چیز مانگ رہی ہو۔"
میں جل ہی تو گئی تھی۔ "قیمتی تو تم بھی نہیں ہو۔"
ادھر ایسی خاموشی چھائی کہ گرتی ہوئی سوئی کی آواز بھی سنائی دے جاتی..... لمحے..... سیکنڈ..... منٹ.....
"ناراض ہو گئے؟" مجھے خاموشی سے خوف آیا تھا۔ مجھے خاموشیوں سے خوف آتا تھا۔
"اس کا حق مجھے نہیں دیا تم نے....." لہجے میں زمانے بھر کی اداسی تھی۔
میں سہولت سے انکار کر گئی تھی۔ میں ٹھٹک گئی تھی۔ رات تھی..... میں تھی..... موتیا تھا اور ہوا کے دوش پر گنگناتی اس کی آواز تھی۔
یونہی اداس ہے دل، بے قرار تھوڑی ہے
مجھے کسی کا کوئی انتظار تھوڑی ہے

مجھے بھی نیند نہ آئے، اسے بھی چین نہ ہو
ہمارے بیچ بھلا اتنا پیار تھوڑی ہے

خزاں ہی ڈھونڈتی رہتی ہے دربدر مجھ کو
میری تلاش میں پاگل بہار تھوڑی ہے

نہ جانے کون یہاں اپنا کر چھوڑ جائے
یہاں کسی کا کوئی اعتبار تھوڑی ہے

نظر ملا کے بھی ان سے گلہ کروں کیسے؟
ان کے دل پہ میرا اختیار تھوڑی ہے

وہ رات بہت خوب صورت تھی۔ میری نیند پر جیسے سلوٹ پڑ گئی تھی۔ دل میں جو دھڑکن تھی بار بار بجتی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ رات تو بڑی غیر معمولی تھی، میں اندر آئی تو میں نے دادی کو فرش پر گرے دیکھا تھا، میری جان نکلنے لگی تھی، سانس مدھم اور مدھم ہوتی جارہی تھی۔ میں نے انہیں آواز دی تھیں۔

"دادی! آنکھیں کھولیں۔"

آنکھیں کھلیں... پلکیں لرزیں اور پھر بند ہو گئیں۔ میں نے شاکر کا نمبر ملایا تھا۔ "جلدی آؤ دادی کی طبیعت بہت خراب ہے۔" میں رو رہی تھی۔ وہ اگلے پل پریشانی سے بوجھل چہرے کے ساتھ ہانیہ کو ساتھ لایا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم اسپتال میں تھے۔ ٹھنڈے فرش میں موت تھی، مجھے بے تحاشا خوف آرہا تھا۔

"باجی... سنبھالیں خود کو... دادی ٹھیک ہو جائیں گی۔" ہانیہ مجھے تسلی دے رہی تھی۔

"نہیں ہانی! میرا دل بیٹھا جارہا ہے۔"

دادی آئی سی یو میں تھیں۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" شاکر میرے پاس آیا تھا۔ "دادی بہتر ہو جائیں گی روشنی۔"

"وہ ٹھیک ہو جائیں گی نا؟" میں نے تصدیق چاہی تھی۔

"ہاں... ہاں... تم فکر مت کرو۔"

میں فکر کیسے نہ کرتی، جبکہ آج رات کا سب کچھ غیر معمولی تھا اور غیر معمولی پن مجھے کبھی بھی تو نہیں بھایا تھا۔

میں بینچ پر بیٹھی رو رہی تھی۔

"روشنی!" اس آواز پر میں نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ دھند کے پار "وہ" کھڑا تھا۔ اتنے سالوں بعد ایسے مقام پر ملا تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ فیضی تھا، جس نے بازوؤں کے گھیرے میں ایک کمبل میں ننھا وجود اٹھایا ہوا تھا۔

"کیسی ہو؟" وہ سوال موت جیسی تکلیف رکھتا تھا۔ اسے میرے بہتے آنسو نظر نہیں آرہے تھے۔ وہ آگے آیا تو میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"یہ دیکھو... میرا بیٹا ہے۔" وہ خوش تھا۔ آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"اللہ لمبی عمر دے، آمین!" میں دعا ہی تو دے سکتی تھی۔

"تمہاری شادی ہو گئی؟" لڑکیوں سے ایسے سوالات براہ راست کون کرتا ہے؟ وہ جلدی میں تھا۔

"او کے... خدا حافظ چلتا ہوں۔"

وہ چلا گیا تھا۔ اسپتال کے طویل کوریڈور میں وہ چلتا جارہا تھا۔ میں اس کی پشت دیکھتی رہ گئی تھی۔ میرے آنسو لڑھک آئے تھے۔ میں نے اسی وقت پونچھ ڈالے تھے۔ میں اپنی آنکھوں کو "اس" پر آنسو بہانے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔

تب ہی میری نظر سامنے اٹھی تھی، شاکر جوس تھامے ادھر ہی آرہا تھا۔ "یہ پی لو" اس نے جوس میری طرف بڑھایا تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"نہیں پلیز..." ہم دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔

"وہ کون تھا؟"

"وہ میرا کوئی نہیں تھا۔"

میں جیسے ماضی کے گول چکر میں گھوم رہی تھی۔
مجھے دادی کی بات یاد آئی تھی۔
"روشنی... یاد رکھنا نظر کی چوری معاف نہیں ہوتی۔"
میں جو ہمیشہ دادی کی باتیں بھول جاتی تھی' اب مجھے ساری باتیں ہمیشہ کے لیے یاد رہنے والی تھیں۔
ڈاکٹر آئی سی یو سے باہر آیا تھا۔
"سوری... ہم نے بہت کوشش کی' مگر جو اللہ کی مرضی...."
میں دیوار کے ساتھ بیٹھتی چلی گئی تھی۔ میں نے کہا تھا نا رات غیر معمولی تھی۔ کچھ بھی تو پہلے جیسا نہیں تھا۔ میں رو رہی تھی۔ ہانیہ مجھے سنبھال رہی تھی۔
"دادی... میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی' آپ مجھے اکیلا چھوڑ گئیں۔"
زندگی ایسے ہی تو ختم ہوتی ہے... دبے پاؤں... بغیر کسی چاپ کے... دادی مجھے بھی روتا بلکتا چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ پیچھے فقط تسلیاں اور دلاسے رہ گئے تھے۔ کتنا ظالم جملہ ہے نا یہ کہ مرنے والے کے ساتھ مر نہیں جاتے۔ مگر سچ بھی تو تھا اور کیسا تھا؟
میرے لیے بھی وقت مرہم ہو گیا تھا۔ دن' ہفتے گزر گئے۔ بات مہینوں تک جا پہنچی تھی۔ پیچھے یادیں' باتیں ہی تو رہ گئی تھیں۔
"روشنی! رنگین کپڑوں کو الگ سے دھویا کرو۔ سفید کپڑوں پر رنگ چڑھ جائے گا۔"
"ارے بکھار لگانا تم کب سیکھو گی۔"
"پاندان سے چھالیہ کہاں غائب ہو گئی' میں تو اس لڑکی سے بڑی تنگ ہوں بھئی۔"
"تمہارے بنائے کوفتے ہمیشہ ہی ٹوٹ جاتے ہیں۔"
محلے کی سعیدہ بوا میرے پاس رات کو سونے آجاتی تھیں۔ اب راتوں کو ڈر نہیں لگتا تھا۔ دادی جاتے جاتے ساری رونق ساتھ لے گئی تھیں۔ مجھے اب خبر ہوئی تھی کہ کبھی کبھی ہماری ساری زندگی کی رونقیں کسی ایک انسان کے ساتھ جڑی ہوتی ہیں... آہ...
ہانیہ دل جوئی کرنے کے لیے دن میں تین چکر لازمی لگاتی تھی۔
"باجی... کب تک روتی رہیں گی؟"
"آنسو ختم ہی نہیں ہو رہے۔" میں نے آنکھوں کی نمی صاف کی۔
"دل پتھر کا کرلیں۔" مشورہ حاضر تھا۔
"یہ بھی نہیں۔" سعیدہ بوا ٹھنڈی آہ بھرتی تھیں۔
"یہی ریت ہے انسان کی اور حیاتی کی... قدرت کا نظام ہے جو چلتا رہتا ہے بھلا ہمارے تمہارے تڑپنے' رونے سے کیا ہو گا۔ ایک دن' دو دن بھلا کب تک رویا جا سکتا ہے؟ پھر تو صبر آ ہی جاتا ہے۔"
میں چپ چاپ زمین کریدتی رہی تھی۔
ہانیہ نے بی اے کر لیا تھا۔ شاکر نے ماسٹرز کے پیپر دیے ہوئے تھے۔ وقت سے بڑا مرہم واقعی کوئی نہیں ہوتا۔ مجھے اب خبر ہوئی تھی۔ مجھے بھی تو وقت کے ساتھ سمجھوتا کرنا آ گیا تھا۔ شاید ہر کسی کو آ جاتا ہے۔

ساری اسی تضاد میں گزری
ہو کچھ اور' سوچنا کچھ اور....



وہ باہر ملک جا رہا تھا' جانے سے پہلے ملنے آ گیا۔ عصر ڈھلنے کو تھی۔ پرندے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔
"مجھے لگا تھا میں تمہیں اپنے جانے کا بتاؤں گا تو تم مجھے روک لو گی۔"
وہ ہنسا تھا اور میں نے اس ہنسی کو غور سے دیکھا تھا۔
"نہیں... تمہیں غلط لگا۔" میں نے اس کے چہرے کو تاریک ہوتا پایا تھا۔
"میں... میں تو سمجھتا رہا کہ تم..." اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا سا تھا۔
"میں یہیں رہ کر تمہارا انتظار کروں گی۔ تم تم آؤ گے نا؟"
تاریک چہرے پر اتنے دیپک جل اٹھے کہ شام روشن ہو گئی تھی۔

"میں تمہارے لیے ضرور آؤں گا۔"

اور پھر وہ چلا گیا تھا' میں انتظار کے دھاگوں میں موتی پروتی رہ گئی تھی۔ دن پہلے جیسے تھے' بس لفظ "انتظار" خاموشی سے میری زندگی میں شامل ہو گیا تھا۔ شاکر کے جانے سے گلیاں' کوچے' دریچے سب کچھ ویران ہو گیا تھا۔ نیلا آسمان رنگوں سے خالی تھا۔ میرا اور نیلے آسمان کا انتظار سانجھا تھا۔

ہانیہ ایم اے کے بعد میرے ساتھ اسکول میں پڑھانے لگی تھی۔ ہم اکٹھے آتی جاتی تھیں۔

"باجی... اب آپ مسکرانے لگی ہیں۔"

میں ہنسی تھی۔ "کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ہنستے ہوئے بہت پیاری لگتی ہوں۔"

وہ شریر ہو جاتی۔ "کس نے کہا؟"

میں صاف چھپا جاتی۔ "بس تھا کوئی۔"

اور بس وہ ہی تو تھا... اکثر فون کرتا تھا۔

"آج تم روتی رہی ہو؟"

میں صاف نہیں' نہیں کہہ سکتی تھی' مکر جاتی تھی۔ "نہیں تو۔" وہ انکار کرتا تھا۔

"یہاں ایسے ہی تو بارش نہیں برسی۔" عجیب منطق اور دلائل ہوتے تھے اس کے پاس... میں حیران ہو جاتی تھی۔

"سنو... کب آؤ گے؟" میرا انتظار چیخ جاتا تھا۔

"تھکنے لگی ہو؟"

"نہیں' تمہاری تھکن کا احساس رہتا ہے۔"

وہ ہنستا تھا۔ "وہاں تھا تو قدر نہیں کرتی تھیں۔ یہاں ہوں تو میری تھکن بھی تمہیں محسوس ہوتی ہے۔"

"طنز کر رہے ہو؟" میں ٹھنک کر پوچھتی تھی۔

"نہیں... اپنے آپ پر فخر محسوس کر رہا ہوں۔"

میں پرسکون ہو جاتی تھی۔ "پھر ٹھیک ہے۔"

اسٹوڈنٹ سہ پہر کو پڑھنے آتے تھے۔ جگنو بار بار پوچھتا تھا۔ "استانی جی گول گپے کھانے چلیں؟"

میں نفی میں سر ہلاتی تھی۔ "نہیں جگنو' اب دل نہیں کرتا۔"

البتہ ہانیہ ڈھیروں کے حساب سے منگوا کر کھاتی تھی۔

میری زندگی سے جیسے رنگ ختم ہو گئے تھے۔ میرے بالوں میں چاندی کے تار چمکنے لگے تھے۔ مجھے آئینوں سے خوف آتا تھا۔ پہلی بسنت' دوسری' تیسری اور پھر جانے کتنی گزر گئیں۔ میں انتظار کی ڈور میں آس پروتی رہ گئی۔ ڈور کا پہلا منکا تب ٹوٹا جب میں ہانیہ کے گھر گئی تو نازش بھابھی' ہانیہ سے کہہ رہی تھیں۔

"ارے... سمجھاؤ اپنے بھائی کو' عقل ہے کہ نہیں۔ اس بوڑھی گھوڑی لال لگام سے شادی کا کہہ رہا ہے۔"

میں روتی ہوئی الٹے پیر واپس آگئی تھی۔ گلی میں لڑکھڑاتی ہوئی چل رہی تھی' تین بار گری۔ آنسوؤں کے پار جگنو کھڑا تھا۔

"جگنو! مجھے گھر چھوڑ آؤ' مجھے کچھ نظر نہیں آرہا۔"

ہانیہ شام کو آئی تو بجھی بجھی سی تھی۔ ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتی رہی... دیکھتی رہی۔

"روشنی باجی!" میں نے جگنو کو کریمر رول سمجھاتے سر اٹھایا تھا۔

"آپ اتنی اچھی ہیں؟" وہ سوال بڑا عجیب تھا۔ وہ ہولے سے چلتی مجھ تک آئی تھی۔ "مجھے کبھی خبر ہی نہ ہوئی کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ بھائی کی باتوں میں آپ کا تذکرہ رہنے لگا تھا۔ وہ تو کل کہنے لگے انہیں آپ سے عشق ہو گیا ہے۔"

میں نمی سے بھرپور ہنسی ہنسی تھی۔ "مجھے تو محبت کا کہہ رہا تھا۔"

شام کو فون آیا تو میں نے پوچھ لیا۔ وہ مسکرایا تھا۔

"وہاں تھا تو محبت کرتا تھا' یہاں ہوں تو عشق کرنے لگا ہوں۔" یہ سچ تھا شاید۔

"سنو..." میں نے صدا دی تھی۔

"ہاں... ہاں... بولو۔" میں سوچتی رہی' پھر کہہ دیا۔

"کب لوٹو گے؟"

وہ سنجیدہ ہوا تھا۔ "تھک گئی ہو روشنی؟"

میرے انتظار پر سوال اٹھا تھا۔

"نہیں... نہیں تو..."

گھر بن گیا تھا۔

ہانیہ کا رشتہ طے ہو گیا تھا۔ میں ہاتھوں کی لکیریں دیکھتی رہ گئی تھی۔ ایک دن رانیہ ، فیضی کے ساتھ چلی آئی تھی۔ فیضی نے بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ جانے کیا وجہ تھی۔ میں نے نہیں پوچھا تھا۔ وہ میرے سامنے بیٹھا ہنستا رہا تھا۔

"وہ بھی کیا دن تھے۔" میں خاموشی سے اسے دیکھتی رہی تھی۔

"ہاں... وہ دن میں کبھی بھول ہی نہیں سکتی۔" وہ سارا گھر دیکھتا رہا تھا۔

"اکیلی رہتی ہو۔" میں نے چاروں طرف دیکھا تھا۔ "نہیں۔"

وہ حیران ہوا تھا۔ "کون ہوتا ہے ساتھ؟"

میں تخت کی لکڑی پر ہاتھ پھیرتی رہی تھی۔ "اللہ ہوتا ہے۔"

وہ ٹھٹکا... پھر چپ کر گیا... خاموشی برآمدے میں ٹہل رہی تھی۔

"میں تم سے شرمندہ ہوں۔ معاف کرسکوں گی مجھے؟"

میں نے سر اٹھایا۔ "میں تو کب کا کر چکی۔"

وہ مجھے دیکھتا رہا۔ "اب بھی فیض احمد فیض کو پڑھتی ہو؟"

"نہیں... پروین شاکر کو پڑھتی ہوں۔"

وہ سر ہلاتا رہا تھا۔ پھر سرگوشی میں بولا تھا۔ "میرے خط تو اب بھی تم چپکے چپکے پڑھتی ہوں گی نا؟"

میرے دل میں جیسے نیزے کی انی گھسی تھی۔ درد تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ مجھے میرا ماضی یاد دلا رہا تھا۔

"نہیں... میں سب کچھ جلا چکی ہوں۔"

وہ میرے قریب آن بیٹھا اور ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ لمس تھا کہ انگارہ... میں جھلس گئی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ہی خوب صورت تھا۔ اب شاید زیادہ ہو گیا تھا۔ میری آنکھوں میں دھند چھانے لگی تھی۔

"دیکھو روشنی! تمہیں ہمیشہ سے میری محبت چاہیے تھی نا... اور مجھے میرے بچے کی ماں چاہیے۔"

کمرے کی دیواریں آئینہ ہو گئیں... دائیں بائیں میرا ماضی سج گیا تھا۔ میں کپکپانے لگی تھی۔ تب ہی فیضی کا ہاتھ جھٹکے سے پرے ہوا تھا اور ایسا کرنے والی رانیہ تھی۔ وہ فیضی کے بیٹے کی انگلی تھامے کھڑی تھی۔

"بس کرو فیضی! روشنی کی ماضی میں کی گئی چھوٹی سی غلطی کو اس کے لیے پہاڑ مت بناؤ۔ تم اتنے خود غرض کیسے ہو سکتے ہو۔"

وہ خوبرو شخص اٹھا اور میرے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔

"میری بات پر غور کرنا روشنی۔" یہ کہہ کر وہ اپنے بیٹے کو لے کر باہر نکل گیا تھا۔

میرے آنسو میرے ہاتھوں کی پشت پر گر رہے تھے۔ رانیہ نے مجھے خود سے لپٹا لیا تھا۔

"میں تم سے بہت شرمندہ ہوں روشنی!"

میں نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ "چھوڑو رانی... تمہاری سہیلی زمانے کے لیے کٹھ پتلی ہو گئی ہے۔ جو جب چاہتا ہے ڈوریاں ہلا کر تماشا دیکھتا ہے۔ تمہارے بھائی نے بھی محبت کے نام پر ایسا کرنا چاہا تو کیا غلط کیا۔" وہ منہ پر ہاتھ رکھتی اٹھ گئی تھی۔ میں تنہائیوں کے بیچ بیٹھی رہی۔ فون اٹھا کر کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی۔ اور فون کان سے لگا لیا۔

"پتا ہے شاکر... یہ جو محبت ہوتی ہے نا یہ کبھی نہیں تھکتی۔ مگر یہ جو انتظار ہوتا ہے' یہ تھک جاتا ہے اور پھر مر جاتا ہے۔ بعد میں کہیں جا کر علم ہوتا ہے کہ انتظار کی موت ہی اصل میں محبت کی موت تھی۔ میں تم سے اور کچھ بھی نہیں کہوں گی۔ میں ساری رات ٹہلتی رہی تھی۔ ایک دن... دو... تین... چوتھے دن آسمان رنگوں سے سج گیا تھا۔ نیلی' پیلی' ہری' لال' رنگ برنگی پتنگیں تھیں... تو کیا وہ آگیا تھا؟ دستک ہوئی اور وہ آ کر میرے قریب بیٹھ گیا ہم سیڑھیوں پر بیٹھ گئے تھے۔ میں نے نظر اٹھائی اور پھر جھکا نہ سکی تھی۔ وہ ہمیشہ سے

زیادہ خوب صورت ہو گیا تھا۔
"وہ تمہیں مجھ پر یقین نہیں تھا؟"
"وہ نہیں..... نہیں..... میں بوڑھی ہو رہی ہوں۔" وہ ساکت ہو گیا تھا۔ میرے سر کی طرف جھکا اور میرے چاندی کے تاروں سی پیشانی پر ہونٹ رکھ دیے تھے۔ میں نے دیکھا تھا وہ رو رہا تھا۔
"میں بھی تھک گیا ہوں روشنی..... زندگی نے مجھے تھکا دیا ہے۔" وہ مجھے برسوں کا تھکا ہارا مسافر نظر آیا تھا۔
"پتا ہے روشنی! اگر تم مجھے فون کر کے لوٹنے کا نہ کہتیں تو جانے کب تک میں زنجیروں میں جکڑا رہتا۔ مجھے آزاد کرنے کا شکریہ۔"
"میں نہیں چاہتی تھی کہ تمہیں ایسا لگے کہ روشنی تمہارا انتظار نہیں کر سکتی۔ میں مشکل میں تھی، ورنہ میں تمہارا برسوں انتظار کر سکتی تھی۔"
وہ نم سا مسکرایا تھا۔ "ہم اپنا ایک اچھا سا، چھوٹا سا گھر بنائیں گے۔" وہ خوابوں کی سیڑھی پر پہلا قدم تھا۔ "ہم موتیا بھی لگائیں گے۔"
میں اٹھنے لگی تھی۔ "چائے بناؤں تمہارے لیے؟"
وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ جسم بھرا بھرا سا تھا۔
"نہیں۔"
آسمان پر سجے بادلوں کی کھڑکیاں کھل گئیں۔ ہم دونوں پھوار میں بھیگنے لگے تھے۔
"تم نے بارشوں میں مجھے یاد کیا؟"
"ہاں میں نے کیا۔"
"تم نے بہاروں کے موسم میں مجھے یاد کیا؟"
"ہاں میں نے کیا۔"
"تم نے نرم گرم دوپہروں میں میری کمی محسوس کی؟"
"ہاں میں نے کی۔"
"پتا ہے روشنی! تمہاری یاد نے مجھے تھکنے نہیں دیا۔ میں نے دن رات تمہاری کمی محسوس کی۔ کتنا پیارا احساس ہوتا ہے نا یہ کہ دور دیس میں کوئی آپ کا منتظر ہو۔ آپ کی چاہت رکھتا ہو۔ آپ کی قدر کرتا ہو۔"

وہ محبت پاش نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔
"اگر تم لوٹ کر نہ آتے تو تمہاری روشنی کب کی بجھ چکی ہوتی۔" میں جیسے پھڑپھڑاتی ہوئی لو تھی۔
"میں تمہارے لیے بہت کچھ لایا ہوں۔" وہ مجھے بتا رہا تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا تھا۔
"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"
وہ بارش میں کھڑا بھیگتا رہا، میں برآمدے میں جا کھڑی ہوئی تھی۔
"روشنی! تمہیں کاغذ کی کشتیاں بنانا آتی ہیں کیا؟"
میں نے حیرت سے بارش میں بھیگتے اس خوبرو شخص کو دیکھتے سر اثبات میں ہلایا تھا۔
"کیا تم مجھے بنا کر دے سکتی ہو؟"
میں اسے کاغذ کی کشتیاں بنا کر دے رہی ہوں اور وہ بارش کے گدلے پانی پہ کشتیاں تیراتا بچپن ڈھونڈ رہا ہے۔
"روشنی..... تم مجھ سے محبت تو کرتی ہو نا؟" وہ کچھ سوچ کر سوال کرتا ہے۔
"محبتوں کے بغیر انتظار نہیں کیا جاتا۔"
"کشتیاں آنگن میں تیر رہی ہیں۔ موتیے کی خوشبو بکھر گئی ہے۔"
"کیا تمہیں پتنگ اڑانا آتا ہے؟"
"نہیں آتا۔" میں نے مایوسی سے سر ہلایا۔
"میں تمہیں سکھا دوں گا۔"
"محبت سب سکھا دیتی ہے، ہنسنا مسکرانا، تو پتنگ اڑانا کیوں نہیں؟"



**سرورق کی شخصیت**

ماڈل ..... نشاء مغل
میک اپ ..... روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافی ..... موسیٰ رضا

سارہ عرفان

# تیرا انتظار ہے

کھٹمنڈو ایئر پورٹ کے ویٹنگ لاؤنج میں بیٹھے ' جہاز میں فنی خرابی کا اعلان سن کر عزوہ حسیب کا موڈ بے حد خراب ہو چکا تھا۔ بیگ میں سے اپنا لیپ ٹاپ نکال کر میٹنگ میں ڈسکس کیے گئے پوائنٹس کو ترتیب دینے کا ارادہ کر کے گویا وقت گزاری کا بہانہ تلاشا۔ موبائل پر آنے والی ممی کی کال دیکھ کر سرد آہ بھری۔

"فلائٹ ایک گھنٹہ لیٹ ہے ممی۔۔۔!"

"میرا دل بہت گھبرا رہا ہے عزوہ۔۔۔!"

"ممی پلیز۔۔۔ پریشان نہ ہوں۔۔۔ میں چند گھنٹوں میں پاکستان پہنچ رہی ہوں۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں۔"

اس نے ممی کو تسلی دینی چاہی۔

"کیسے بے فکر ہو جاؤں میرے بچے۔۔۔ سچ پوچھو
دل کر رہا ہے ابھی جہاز سے اتر جاؤں۔"

"میری پیاری ممی۔۔۔ آپ کو ساری دنیا کی فکر
ہے۔۔۔ سوائے اپنے آپ کے خود کو ریلیکس کریں او
ابا کی بالکل فکر نہ کریں۔ وہ شام تک گھر آجائیں
گے۔"

"اس دفعہ بہت زیادہ ناراض ہو کر گئے ہیں۔۔۔ او
تو اور موبائل بھی گھر پر چھوڑ گئے ہیں۔۔۔ اگر سیٹ
کنفرم نہ ہوتی تو میں کبھی ایسے نہ آتی۔" ممی کی پریشا

## مکمل ناول



بجا تھی۔

"میں نے کہا ناں شام تک ابا گھر پر ہوں گے۔ مجھے ان کے سارے نئے پرانے دوستوں کا پتا ہے۔ ان ہی میں سے کسی کے گھر ہوں گے۔ ابا کے غصے کا پتا تو ہے بس پانی کے بلبلے جیسا ہوتا ہے......" وہ خود کو بھی تسلی دے رہی تھی گویا۔

"لیکن عزہ.....!"

"کوئی لیکن ویکن نہیں..... آپ بس یہ سوچیں کہ دس منٹ میں آپ کا جہاز اڑنے والا ہے اور آپ اپنی اماں سے ملنے جارہی ہیں..... سترہ سال بعد..... پلیز ممی! اتنی ایموشنل فیلنگز کو ابا کے غم میں خراب نہ کریں....." اپنی پریشان ماں کو بہت محبت سے سمجھا رہی تھی۔

"میرا دل ہول رہا ہے اور تم باپ بیٹی یوں ریلیکس



ہو جیسے روز ہی تو انا پتا بتائے بغیر نکل جاتے ہوں۔۔۔۔۔"
وہ ٹینشن پر قابو پانے میں بے بس تھیں۔

"پھر وہی بات۔۔۔۔۔ ممی۔۔۔! ڈیڈی کے ساتھ پہلی دفعہ اتنا لمبا سفر کر رہی ہیں۔۔۔۔۔ پلیز انجوائے کریں۔۔۔۔۔ اور جہاں تک ابا کی بات ہے۔۔۔۔۔ مجھے گھر پہنچنے دیں۔ ابا ڈنر میرے ساتھ کریں گے۔ ہیو سیف جرنی۔۔۔۔۔ لویو۔۔۔۔۔ اللہ حافظ۔"

ایک تھکا دینے والا ٹور اختتام پذیر ہوا تھا۔ کمپنی کی طرف سے یہ ٹور چار دن پر محیط تھا۔ تین دن کام اور چوتھا دن نیپال گھمانا تھا۔ لیکن عزوہ حسیب کو ابا کی غیر سنجیدہ حرکت کی وجہ سے تیسرے دن ہی واپس آنا پڑ رہا تھا۔ جو ابا نے سالوں پرانی دشمنی کے لگائے گئے درخت کو مزید تناور بنانے کے لیے کی تھی۔

"ابا۔۔۔۔۔ سدھر جائیں آپ۔" دل ہی دل میں ابا سے مخاطب ہوئی۔ بیگ پیک کر کے کندھے پر ڈال لیا۔۔۔۔۔ جہاز میں جانے کا اعلان ہوتے ہی لاؤنج میں ہلچل شروع ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اور پھر شام تک وہ اس قدر پریشان تھی کہ زندگی میں کبھی نہ ہوئی ہوگی۔۔۔۔۔ ابا کے سب نئے پرانے دوستوں سے رابطہ کر لیا تھا۔ جن کے گھروں کا پتا تھا۔ وہاں خود جا کر دیکھ آئی تھی۔۔۔۔۔ ابا کے موبائل کے تقریباً" تمام کانٹیکٹس پر کال کر کے دیکھ لی تھی۔ ہر طرف سے مایوس کن خبر تھی۔ ابا کہاں جا سکتے ہیں۔ سوچ سوچ کے دماغ پھٹ رہا تھا۔

"ربیعہ پلیز۔۔۔۔۔ آج میری طرف آجاؤ۔۔۔۔۔ میں بہت پریشان ہوں۔" خالی گھر سے ویسے ہی خوف آ رہا تھا۔ اپنی عزیز از جان سہیلی کو فون کر کے پاس بلا لیا۔ اب جیسے تیسے کر کے رات تو گزارنی تھی۔

"ابا مل جائیں گے۔۔۔۔۔ تم پریشان نہ ہو۔ بس اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ پیپر کی تیاری کرو۔" سات سمندر پار بیٹھا چھوٹا بھائی حسن الگ پریشان تھا۔ اس کو بھی تسلی دے رہی تھی۔ ممی ڈیڈی جب جرمنی پہنچ کر فون کریں گے تو ان کو کیا بتائے گی۔ یہ بھی ایک پریشانی تھی۔ سو راتوں پہ بھاری یہ رات کیسے گزرے گی' وہ نہیں جانتی تھی۔ ربیعہ کے آجانے سے یہ ہوا کہ اس نے تسلی اور حوصلہ دینے کے ساتھ ساتھ کھانا بھی کھلایا۔ بہر حال تھکاوٹ پریشانی پر غالب آگئی اور وہ سو گئی۔



رات تو جیسے آنکھوں میں کٹ گئی۔ نئی جگہ ہونے کی وجہ سے کروٹیں بدلتے رات گزری۔ "اللہ اکبر" کی آواز کیا آئی گویا کسی نے زندگی کی نوید سنا دی ہو۔ فوراً" ہی بستر سے اٹھے' وضو کیا اور کمرے سے باہر نکلے۔ گھر بھر میں ایسی خاموشی کہ پاؤں دھرنے کی بھی آواز آئے۔ آہستگی سے گیٹ کھولا اور پھر اسی آہستگی سے بند کر کے نکل پڑے۔ ابھی مسجد بھی تلاش کرنا تھی۔ گلی مڑتے ہی ایک اور شخص ٹوپی پہنے گھر سے نکلا سو اس کے پیچھے پیچھے چلتے مسجد جا پہنچے۔

جب واپسی ہوئی تو سفید دودھیا روشنی پھیل چکی تھی۔ نکلتے وقت سائیڈ سے ایک پتھر اٹھا کر گیٹ کے باہر رکھ گئے تھے مبادا واپسی پہ گھر ڈھونڈتے ڈھونڈتے خود ہی گم نہ ہو جائیں۔ سو پتھر والے گیٹ پر پہنچ کر بیل بجائی۔ کچھ دیر انتظار کرنے پر کوئی نہ آیا تو پھر بجائی۔ کتنی ہی بار بیل بجائی۔ وقفے وقفے سے بیل بجاتے ان کا ازلی غصہ عود آیا۔ چہرے کے خدوخال میں غصہ بھر گیا۔ پھر کیا تھا انگلی بیل پر رکھ دی۔ اب یہ تب ہٹنی تھی جب دروازہ کھلنا تھا۔

"کیا قیامت آگئی۔۔۔۔۔ کون ہے صبح صبح۔۔۔۔۔؟" اندر سے بھی غضب ناک آواز آئی۔

"میں ہوں' دروازہ کھولو۔۔۔۔۔" گرج دار آواز میں کہا۔ البتہ انگلی ہٹا دی۔

"آپ۔۔۔۔۔؟ آپ تو رات کو اندر سوئے تھے۔" سوئی سوئی آنکھیں کھول کر حیرت سے کہا گیا۔

"نماز پڑھنے گیا تھا۔" اندر داخل ہوتے وقت غصہ تھوڑا کم ہوا۔

"تو انکل۔۔۔! بیل بجانے کا بھی کوئی طریقہ ہوتا ہے۔" دروازہ بند کرتے ہوئے منمنایا۔

"سارے طریقے آزما چکا تھا برخوردار۔۔۔ اب یہی طریقہ رہ گیا تھا۔۔۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ تمہارے ہاں نماز کے لیے اٹھنے کا رواج نہیں ہے تو بیل بجاتا ہی کیوں۔ گیٹ ہی پھلانگ کر آجاتا۔" اپنے میزبان کا کسی بھی طرح کا لحاظ کیے بغیر وہ حسب عادت شروع ہو چکے تھے۔ سہیل منہ کھولے سب سنتا رہا۔

"عجیب رشتے دار ہے اماں کا۔" حیران ہوتا ان کے کمرے میں جانے سے پہلے ہی اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"غضب خدا کا۔۔۔ دن سر پر چڑھ آیا ہے۔۔۔ اور گھر میں ایسی خاموشی۔۔۔ اور تو اور حسن آرا کی بھی کوئی خبر نہیں۔۔۔ بھوک لگی ہے مجھے۔۔۔ خدا جانے کچن کہاں ہے۔" خود سے باتیں کرتے۔۔۔ بلکہ کڑھتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر کمرے میں ٹہلتے رہے۔

"سعیدہ! تمہارے ہاتھ کے پراٹھے کھانے کی ایسی عادت ہو گئی ہے کہ۔۔۔ لیکن نہیں، محض زبان کے مزے کے لیے میں تمہاری خطا معاف نہیں کر سکتا۔۔۔ اب حسن آرا کی بہو کے ہاتھ کے ہی پراٹھے کھاؤں گا۔ کیا ہوا جو ذرا دیر سے کھالوں گا۔۔۔ مر نہیں جاؤں گا۔" اپنے پیٹ اور دل کو تسلی دیتے پھر گھر سے باہر نکل آئے۔۔۔ اب وہ کوئی پارک ڈھونڈ رہے تھے۔



مومن ایاز 'ماماز بوائے' نہیں تھا۔ لیکن اسے لگتا تھا کہ وہ کبھی امی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور امی کا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن اب چھ ماہ سے اپنی پیاری امی اور لاڈلی بہنوں کے بغیر رہ رہا تھا بلکہ خوش بھی تھا۔ شروع کے دو ہفتے بہت مشکل تھے۔ بہت بار نوکری کو لات مار کر جانے کا سوچا۔۔۔ لیکن بارو زگار دوستوں کی لعنت ملامت نے یہ حرکت کرنے سے باز رکھا۔ زمر کی شادی اور کشف کی پڑھائی' دو بڑی وجوہات تھیں جس کی وجہ سے وہ امی کو ساتھ نہیں لے جا سکا۔۔۔ اب اگلے مہینے زمر کی شادی طے تھی۔ جبکہ کشف کے ابھی دو سمسٹرز رہتے تھے۔۔۔ سو تب تک اسے اپنی پیاری امی کے بغیر ہی رہنا تھا۔ گو کہ ہر مہینے میں ایک چکر لگا لیتا تھا۔۔۔ اور فون پہ تو زیادہ تر رابطہ رہتا۔۔۔ اور آج تک ایسی کوئی صبح نہیں ہوئی تھی جس کا آغاز ان سے بات کیے بغیر ہوتا۔ مارننگ واک کی عادت اسے اپنے ابو سے ورثے میں ملی تھی۔ لہٰذا ہر روز ایک۔ گھنٹہ کی واک مطلب 'ایک گھنٹہ امی سے بات۔

آج بھی ہینڈ فری لگائے' وہ امی سے معمول کی باتیں کرتا' جاگنگ ٹریک پر تیز تیز چل رہا تھا۔ کہ ایک بزرگ پر نظر پڑی۔۔۔ ان کو پہلے کبھی اس پارک میں نہیں دیکھا تھا۔ سفید کپڑوں کے ساتھ سر پر سفید ہی نماز والی ٹوپی پہنے' اپنی سیاہ فریم کی عینک کو بار بار آنکھوں پر ٹھیک کرتے' نیچے کچھ تلاش کر رہے تھے۔ اور بڑبڑاہٹ بھی تلاش کا پورا ساتھ دے رہی تھی۔۔۔ اسے لگا شاید ان کو مدد کی ضرورت ہے۔

"بابا جی۔۔۔ کیا میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟" امی کو ہولڈ کروا کر انہیں مخاطب کیا۔

"بابا جی۔۔۔ کسے کہا۔۔۔؟" وہ اپنی تلاش چھوڑ کر اس کی خبر لینے کو سیدھے ہوئے۔

"اوہ سوری۔۔۔ انکل! کیا کھو گیا؟" مسکراہٹ دبا کر انہیں دیکھا جو انکل سن کر مطمئن سے ہو کر دوبارہ کچھ ڈھونڈنے کے لیے جھک گئے تھے۔ اس نے توجہ سے دیکھا۔ سفید داڑھی حتی کہ بھنوؤں اور پلکوں کا رنگ بھی دودھیا سفید تھا۔۔۔ اسے "بابا جی" بہت دلچسپ لگے۔

امی کو اللہ حافظ کہہ کر وہ بھی ان کے ساتھ جھک گیا۔

"اب تو میں نے انکل کہہ دیا ہے۔۔۔ اب تو آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ کیا کھو گیا؟"

"ہوں۔۔۔ بھلے انسان معلوم ہوتے ہو تم مجھے۔۔۔ یہ میری گھڑی کی پن گر گئی ہے اور اب مل

نہیں رہی۔"
بلیک کلر کی رسٹ واچ ہاتھ میں پکڑے اس کی پن ڈھونڈ رہے تھے جو نہ جانے کہاں گر گئی تھی۔ اب وہ بھی پوری توجہ سے ان کے ساتھ مل کر پن ڈھونڈ رہا تھا۔"
"مجھے لگتا ہے انکل۔۔۔ ایسے نہیں ملے گی' ایک کام کرتے ہیں' آپ مجھے اپنی گھڑی دے دیں۔ میں آج دفتر سے واپسی پر پن ڈلوادوں گا۔ کل اسی وقت اسی جگہ آپ کو لوٹا دوں گا۔۔۔" اسے آفس کے لیے بھی نکلنا تھا سو اسے یہی حل مناسب لگا۔ مگر "انکل" نے تو ایسے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔۔۔ گویا یہ گھڑی چرانے ہی تو ان کے پاس آیا ہو۔
"یا پھر شام کو آپ مجھے پارک کے باہر ملیں۔۔۔ آپ میرے ساتھ شاپ پہ چل کر پن ڈلوا لیجئے گا۔" مشکوک نظریں تھوڑی نرم ہوئیں۔
"بہت شکریہ میاں! میں پن خود بھی ڈلوا سکتا ہوں۔۔۔ بڑا شوق ہے سوشل ورک کا۔ لاوارث نہیں ہوں میں۔" اس کی نیت پر شک کرتے' پن کی تلاش ترک کرکے اس کے قریب سے نکل کر گیٹ کی طرف چل پڑے۔
"واقعی یار! مجھے کیا ضرورت ہے۔ ان کے بچے وچے ہوں گے ڈلوادیں گے پن۔۔۔"
اپنی اس فلاحی عادت کو دو چار سناتا وہ بھی گھر کی طرف چل پڑا۔۔۔ مسٹر موجو گجراتی صاحب ابھی تک سوئے پڑے ہوں گے۔۔۔ ناشتا کرکے جانے کی عادت اتنی پختہ نہ ہوتی تو ان محترم کو جگانے کی کوفت سے گزرنے سے بہتر خالی پیٹ ہی نکل پڑتے۔

✡ ✡ ✡

"یا اللہ۔۔۔ ابا مل جائیں۔۔۔ ان کا کچھ اتا پتا تو چلے۔۔۔ میرے اللہ۔۔۔ آخر کہاں جاسکتے ہیں وہ۔۔۔" نماز پڑھ کے وہ سچے دل سے دعائیں کررہی تھی۔ ممی ڈیڈی کو اس نے بتا دیا تھا کہ ابا گھر آگئے ہیں اور ابھی سو رہے ہیں۔ ان کو پریشانی سے بچانے کے لیے جھوٹ تو بول دیا تھا' لیکن اپنا دل بے حد پریشان تھا۔
"ربیعہ! یقین مانو۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" ربیعہ سلائس پر مکھن لگا کر اسے ناشتے کے لیے آمادہ کررہی تھی۔
"آفس جاؤ گی۔۔۔؟"
"کیسے جاسکتی ہوں یار۔۔۔ ابا نہیں مل رہے۔" دونوں کہنیاں میز پر ٹکا کر' دونوں ہاتھوں میں سر گرا کر بے بسی سے بولی۔
"وہ اکثر غصے میں کہتے' میں چلا جاؤں گا اور ہم اس کو صرف غصہ ہی سمجھتے۔۔۔ ایک بار۔۔۔ اوہ۔۔۔" کچھ کہتے کہتے رک گئی۔
"کیا ہوا؟" ربیعہ نے اس کے عجیب سے تاثرات کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔
"اولڈ ہوم۔۔۔ ایک بار ابا نے کہا تھا کہ وہ اولڈ ہوم چلے جائیں گے۔۔۔ چلو اٹھو۔" وہ ناشتا وہیں چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
"اوبی بی۔۔۔! اولڈ ایج ہوم تمہارے دادا گئے ہیں میرے نہیں۔۔۔ سو میں تو ناشتا پورا کروں گی۔ اکیلی جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ۔۔۔ ورنہ انتظار کرو۔" ربیعہ نے اطمینان سے ناشتا کرتے' عزوہ کو ہری جھنڈی دکھائی۔
"بہت ہی خود غرض ہو تم قسم سے۔۔۔ جلدی ٹھونسو۔" وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر اسے گھور کر خود بھی سلائس اٹھالیا۔

✡ ✡ ✡

اب کی بار جب وہ پتھر والے گیٹ کے پاس پہنچا تو گھنٹی نہیں بجانی پڑی۔ سہیل کے دونوں بچے کالج کے لیے نکل رہے تھے۔ اب خاموشی کے بجائے بہو نے ان کا استقبال کیا۔
"ارے بھائی صاحب! کہاں رہ گئے تھے آپ؟ ناشتے پر آپ کا انتظار کررہے تھے۔" حسن آرا نے دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ گویا ناشتے کی دعوت دی۔ انہوں نے غور سے دیکھا۔ حسن آرا بہو اور بیٹے کے ساتھ ڈائننگ چیئر پہ بیٹھی ہمیشہ کی طرح پروقار

رہی تھیں۔ "بھائی جان!" یہ تھوڑا سا کھٹکے۔

"ارے حسن آرا! نام بھول گئی میرا کیا... فضل الٰہی... اور تم تو مجھے فیضی کہا کرتی تھیں۔ پیار سے..."

سہیل کو دیکھ کر جو صبح کی بات یاد آئی تو منہ کڑوا ہو گیا تھا اور باقی کسر حسن آرا کے لگاوٹ بھرے بھائی جان کہنے نے نکال دی اور زبان کے آگے کھدی خندق تو ان کی ذاتی تھی۔ اب ان کو کون روک سکتا تھا۔

"ارے وہ تو پرانی بات ہے... تب تم تھے بھی چھوٹے بھائیوں کی طرح... اب ڈاڑھی سے تھوڑے بزرگ لگتے ہو... اب تو فیضی اچھا نہیں لگے گا نا۔" ذرا سا ہچکچانے کے بعد حسن آرا نے بات بنا ہی لی۔

"ہاں... تم تو ابھی بھی ننھی ہو۔"

"چھوڑیے انکل... یہ ناشتا کیجئے۔" بہو بیگم نے اخلاقاً ان کے سامنے پلیٹ رکھ کر دو سلائس رکھے اور گلاس میں جوس ڈالنے لگی۔

"یہ کیا... پراٹھے کہاں ہیں؟" پیٹ میں دوڑتے چوہوں کو تو جیسے اچھو لگ گیا۔

"پراٹھے؟ ہمارے ہاں پراٹھے نہیں بنتے۔" بہو بیگم تو ایسے حیران ہوئیں جیسے انہوں نے پراٹھا نہیں ایٹمی ساخت کا بم مانگ لیا ہو۔

"پراٹھے نہیں بنتے تو بنا کے دو... مجھے یہ بھور چور کھانے کی عادت نہیں ہے۔" ایک لمحے کے لیے وہ بھول گئے کہ نہ تو وہ اپنے گھر کی میز پر بیٹھے ہیں اور نہ ہی یہ سمیعہ ہے جو "جی ابا" کہہ کر کچن کی طرف چلی جائے گی۔ یہ تو حسن آرا کی نک سک سے تیار بہو ہے۔

"ایسا ہے کہ مجھے آفس جانا ہے... ساڑھے دس بجے تک نسیمہ آئے گی' ہماری کام والی۔ اس سے کہیے گا' وہ بنا دے گی اور اماں پلیز' آپ پراٹھا نہیں کھائیں گی... کولیسٹرول لیول بڑھ جاتا ہے آپ کا ورا..."

ٹشو سے ہونٹ صاف کرتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ساتھ ہی اس کا میاں بھی... وہ ہکا بکا ان کو کمرے میں جاتا اور پھر چند سیکنڈز میں نکلتا دیکھتے رہے... ہاتھ میں بریف کیس پکڑے سہیل تھوڑی دیر ان کے پاس کھڑا ہوا۔

"کب کی فلائٹ ہے آپ کی...؟ میں آپ کو آفس سے آ کے چھوڑ دوں گا۔ تکلف مت کیجئے گا پلیز..." سہیل شاید آخری بار مروّت برت رہا تھا۔

"حسن آرا...! تم نے بتایا نہیں کہ میری فلائٹ کب کی ہے؟" دانت پیس کر حسن آرا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ کچھ دن رکیں گے بیٹا..." حسن آرا نے جز بز ہو کر شرمندہ سی ہو کر بیٹے کو بتایا۔ جس نے بھنویں اچکا کر بھرپور حیرت کا اظہار کیا اور بنا کچھ کہے اپنی بیگم کے پیچھے نکلتا چلا گیا۔

"تم ہی بنا دو پراٹھا حسن آرا!" آخری تھپکی چوہوں کو دیتے ہوئے بولے۔

"نہ بابا نا... مجھے تو مدت ہو گئی کچن کا کام چھوڑے۔ ایسے ہی ہاتھ پاؤں جلا لوں گی۔" چائے کا گھونٹ بھرتے حسن آرا نے بھی ہاتھ کھڑے کیے۔

انہوں نے کچھ دیر سوچا اور پھر سلائس والی پلیٹ گھسیٹ کر زہر مار کرنے لگے۔ پیٹ کے چوہے اب ساڑھے دس بجے تک انتظار کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔

"اپنی بہو سے کہنا' کل سے دفتر جانے سے پہلے پراٹھا بنا کے دے۔ بلکہ یاد آیا۔ تم بھی فجر کی نماز نہیں پڑھتیں...؟" صبح کی خواری یاد آئی تو بولے۔

"کیا بتاؤں تمہیں... بیماری نے تو نیند ہی چھین لی ہے... نیند کی گولیاں کھا کر سوتی ہوں۔ جب تک ان کا اثر ختم ہوتا ہے' دن چڑھ آتا ہے۔" تھوڑا سا پہلو بدل کر توجیہہ پیش کی۔

"اچھا تو عشقیہ شعر تم اپنے چھوٹے بھائیوں جیسے فیضی کو بھیجتی تھیں اور تحفے بھی تم چھوٹا بھائی سمجھ کے وصول کرتی تھیں۔" طنز بھرے لہجے میں بولے۔

"بس بھی کرو... نادانی تھی وہ اک میری... اب ہمارے بچوں کے بھی بچے جوان ہیں۔" وہ یوں بولیں

جیسے دیواریں بھی سُن رہی ہوں۔

"اچھا! اور تمہاری اس نادانی میں تمہیں تو فائدہ ہی فائدہ ہوا... سارا نقصان تو میرا ہوا... اس بے چاری مرحومہ کو میں نے ایک دن سکھ کا سانس نہیں لینے دیا۔ یاد کرنے پر بھی یاد نہیں آتا کہ اسے کوئی تحفہ دیا ہو میں نے... اپنی ساری زندگی کی آدھی کمائی تو میں نے تمہیں فون کرنے اور تحائف دینے میں لٹادی بلکہ برباد کردی اور اب جب میں ساری کشتیاں جلا کے تمہارے پاس آیا ہوں تو تم کہتی ہو کہ وہ تمہاری نادانی تھی۔" وہ ناشتا بھول کر اس نئے صدمے کے زیر اثر آچکے تھے۔

"خدا کا خوف کرو فضل الٰہی! تم تو ایسے بات کررہے ہو جیسے سارا قصور میرا ہو' میں نے گن پوائنٹ پہ تحائف وصول کیے ہوں یا زبردستی تم سے فون کروائے ہوں۔ تم خود ہی دیوانے ہوئے پھرتے تھے۔ میرا قصور اتنا ہے کہ میں نے تمہاری حوصلہ شکنی نہیں کی اور اب جب ہم دونوں ہی اپنی عمر کے آخری حصے میں ہیں تم سروں میں خاک ڈلوانے کا منصوبہ بنا رہے ہو... نا بابا نا۔ اگر اس نیت سے آئے ہو تو باندھو اپنا سامان اور رستہ ناپو اپنا... توبہ توبہ..." کانوں کو ہاتھ لگاتی وہ اپنی کرسی سے اٹھیں اور کمرے میں جاکر دھڑام سے دروازہ بند کردیا۔

"مجھے معاف کردینا بھلیے لوکے..." اپنی بھلی مانس مرحومہ بیوی سے مخاطب ہوئے جواب ان کا یہ جملہ سننے کے لیے کہیں بھی نہیں تھی۔

✵ ✵ ✵

"حسن! میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔" آج سارا دن شہر بھر کے اولڈ ایج ہوم اور اسپتالوں میں ابا کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک چکی تھی۔ خود کو کبھی اتنا اکیلا اور بے بس محسوس نہیں کیا تھا۔

"ابا کے ساتھ کچھ غلط نہ ہو گیا ہو عزوہ... وہ جتنے بھی ناراض ہوں ایسا بھی نہیں کرسکتے... مجھ سے اور تم سے تو کبھی ناراض نہیں ہوسکتے۔" حسن بھی دل میں اٹھنے والے اندیشوں کا اظہار کررہا تھا۔

"ان کے فون میں موجود تمام کانٹیکٹس سے تو پوچھ لیا ہے... اب باقی کے رشتہ داروں کا تو ڈیڈی کو ہی پتا ہوگا' لیکن ڈیڈی سے کیسے پوچھوں...؟"

"عزوہ... ابا کی ایک ڈائری بھی ہوتی تھی کانٹیکٹس والی... وہ ملی کہیں سے؟" حسن نے پتے کی بات بتائی تھی۔

"ارے' وہ تو مجھے یاد ہی نہیں... ابا کے کمرے میں دیکھتی ہوں۔" ایک نظر بے فکر سوئی ربیعہ پر ڈالی اور پھر ابا کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ ابا کی الماری کی درازیں چیک کرنے کے بعد اب سائیڈ ٹیبل کی دراز دیکھ رہی تھی۔ جہاں سے مذکورہ ڈائری مل ہی گئی۔

"مل گئی حسن... شکر ہے۔" امید کی ایک کرن نظر آئی تھی۔

"فون کرو سب کو۔"

"ارے یار... رات کا ایک بج چکا ہے... اب صبح کروں گی۔ اب سوؤں گی یار... بہت تھک گئی ہوں۔"

"اوکے... ٹیک کیئر۔ یہی سوچ کر سو جاؤ کہ ابا مل گئے ہیں۔" وہ اپنی بڑی بہن کو تسلی دے رہا تھا۔

"نہیں سوچ سکتی حسن... سی یو... گڈ نائٹ..." اس نے میلے کچیلے اوراق والی ڈائری اپنے تکیے کے نیچے رکھ دی۔

اسے اب صبح کا انتظار تھا۔

✵ ✵ ✵

اگلی صبح جب فجر کے لیے جانے لگے تو کل کے تجربے کو مدنظر رکھتے ہوئے دروازہ کھلا ہی چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کیا' لیکن واپسی پر بند دروازے نے پھر کوفت میں مبتلا کردیا۔ اب کی بار وقفہ دینے کے بجائے پہلی بار ہی انگلی بٹن پہ چپکادی۔ چند سیکنڈ کے بعد سہیل نے غضب ناک ہوکر دروازہ کھول دیا۔

"تم جاگ رہے تھے... مجھے لگا..." کھسیانے سے ہوکر وضاحت دینے لگے' مگر سہیل نے بات کاٹ

دی۔

"کس ایجنڈے کے تحت آئے ہیں آپ ہمارے گھر...؟ ہمیں لوٹنے آئے ہیں یا کرائے کے ڈاکوؤں سے لٹوانے آئے ہیں۔"

"کیا مطلب ہے؟ اب تم حد سے بڑھ رہے ہو میاں..." آگے آگے چلتے مڑکر وہ بھی غصے میں آ گئے۔

"اگر نیازی صاحب نماز کے لیے نکلتے ہوئے ہمارے کھلے گیٹ کو نہ دیکھتے اور مجھے نہ بتاتے تو اب تک تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔" اس کی بات سن کر تھوڑے سے شرمندہ ہوئے پھر چل پڑے۔

"ہاں تو کیا کرتا... سوچا تھا دروازہ کھلا ہو گا تو تمہیں بھی تکلیف نہ ہو گی، لیکن اب اگر تم اٹھ ہی گئے ہو تو اپنی بیوی کو بھی جگا دو... مجھے پراٹھے بنا کر دے۔" یہ کہہ کر رکے نہیں بلکہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد پراٹھے کھانے کے لیے باہر نکلے تو پراٹھے تو موجود نہ تھے البتہ حسن آرا بمع سہیل وہاں غصے میں فوں فاں کر رہی تھیں۔

"فضل الٰہی! کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ... کیوں بچوں کے پیچھے پڑے ہو؟"

"نہیں...؟ میں نے کیا کہا ہے تمہارے بچوں کو... وہ کیا ہے کہ سمیعہ نے ایسی عادت ڈال دی ہے فجر کے فوراً بعد ناشتے کی کہ اب برداشت نہیں ہوتا۔" اپنی طرف سے معقول وجہ بتاتے ڈائننگ چیئر پر بیٹھ گئے۔ گویا کہہ رہے ہوں۔ "لاؤ پراٹھے۔"

"ہر گھر کے اپنے طور طریقے ہوتے ہیں۔ اگر یہاں رہنا ہے تو پراٹھے بھول کر بریڈ کھانے کی عادت ڈالو..." بے مروتی سے حسن آرا نے اپنے فیضی کو اپنے پاس رکھنے کی شرط بتا دی۔

"یہاں رہیں کیوں اماں...؟" سہیل جز بز ہوا۔

"اور کہاں جائے بچے؟ بہو نے تو نکال دیا گھر سے۔" وہ کرسی پر بیٹھے دونوں ماں بیٹے کو بے تاثر چہرہ لیے تک رہے تھے کہ بہو بیگم بھی کمرے کا دروازہ کھول کر نکل آئیں۔

"سونا عذاب ہو گیا ہے اپنے ہی گھر میں جس طرح کی ان کی حرکتیں ہیں، میرے حساب سے تو ان کی بہو نے بہت لیٹ نکالا ہے گھر سے۔" جمائی روکتی بے زاری سے کہتی بہو بیگم نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔

"اور جس طرح کی تم نے بات کی ہے، میرے حساب سے تمہیں گھر سے نکالنے میں ایک منٹ کی بھی تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔" وہ بھی سمیعہ کے سسر تھے۔ ایسی بے عزتی کے بعد چپ ہو جاتے تو ان کی شان نہ گھٹ جاتی۔

"بس فضل الٰہی! بہت ہو گیا... میں نے کبھی اپنی بہو سے ایسے بات نہیں کی۔" حسن آرا کی تو نیند کی ساری گولیوں کا اثر ہوا ہو چکا تھا۔

"کی ہوتی تو اس کو زبان پہ بھی قابو ہوتا۔" ترکی بہ ترکی جواب...

"اماں اپنے رشتے دار کو وداع کریں پلیز۔" یہ کہہ کر دونوں میاں بیوی غصے میں پٹختے کمرے میں چلے گئے۔

"ایک روٹی مانگنے پہ اتنا ہنگامہ... یہ گھر ہے تمہارا!؟" تاسف سے دونوں بازو کھول کر بے بس کھڑی حسن آرا سے مخاطب ہوئے۔

"تمہاری ایک روٹی کے چکر میں، جو مجھے دو وقت کی روٹی ملتی ہے، میں اس سے بھی جاؤں گی۔" افسوس بھرے لہجے میں کہتی حسن آرا بھی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ وہاں صرف اب فضل الٰہی کھڑے تھے۔ آج بھی بغیر پراٹھے کھائے، خالی پیٹ واک کے لیے نکل پڑے۔ ان کو سوچنے پر بھی یاد نہیں پڑ رہا تھا کہ کل سے پہلے آخری بار کب وہ خالی پیٹ واک پر گئے تھے۔

"لیکن نہیں... سمیعہ! تمہاری خطا بہت بڑی ہے۔"

☼ ☼ ☼

ای زمر کی شادی کے سلسلے میں کی جانے والی شاپنگ کی تفصیلات بتا رہی تھیں جسے وہ ہمیشہ کی طرح نہ صرف توجہ سے سن رہا تھا بلکہ گاہے بگاہے مشورے بھی دے رہا تھا۔ اس نے کل والے باباجی کو سنگی بنچ پر سر نہوڑائے بیٹھے دیکھا... وہ کسی سوچ میں اتنے گم

تھے کہ دوبار ان کے سامنے سے گزرا، مگر انہوں نے نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔

"کیا ہوا انکل... گھڑی کی پن نہیں ڈلوائی۔"

تیسری بار وہاں پہنچا تو خود کو ان سے مخاطب کرنے سے روک نہ پایا۔ فون بند ہو چکا تھا۔

"ارے میاں... یہاں زندگی کی گھڑی کی پن گم گئی ہے۔ تم اس گھڑی کی بات کرتے ہو..." ذرا چونک کر سر اٹھایا۔ اس کو پہچان کر دوبارہ سر گرا دیا۔

"کیا مطلب؟"

"شادی ہو گئی تمہاری برخوردار؟"

"ابھی تو نہیں۔" وہ بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

"کب کر رہے ہو؟" سر ہنوز جھکا ہوا تھا۔

"جس دن میری والدہ لڑکی ڈھونڈ مشن میں کامیاب ہو گئیں... غالباً" اس کے اگلے دن میرے سر پر سہرا ہو گا۔" اسے امی کی بات یاد آ گئی۔ "آج لڑکی ملے تو کل تمہارے سر پر سہرا سجا دوں۔" وہ مسکرا رہا تھا۔

"خونی رشتوں کے علاوہ کسی عورت کا کبھی اعتبار نہ کرنا... خاص کر اس عورت کا جو تمہاری خاطر سب کچھ چھوڑ دینے کا دعوا کرے اور جو تمہیں دنیا کا بہترین مرد کہے... دراصل وہ تمہیں دنیا کا بہترین بدھو کہہ رہی ہوتی ہے۔" اپنے ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسائے جیسے وہ اپنے تجربے کا نچوڑ بتا رہے ہوں۔ اس نے دلچسپی سے دیکھا۔

"خونی رشتوں کے علاوہ صرف ایک عورت قابل اعتبار ہے اور وہ' وہ عورت ہے جو تمہارے نکاح میں ہو گی... وہ تمہاری خاطر سب چھوڑنے کا دعوا نہیں کرتی۔ وہ سب چھوڑ کر آ چکی ہوتی ہے اور وہ تمہیں بہت بار بدھو کہے گی، لیکن دراصل تم اس کے لیے بہترین مرد ہو۔" وہ حیران سا دیکھنے لگا۔ کل والی اکڑ جو بابا جی کے روم روم سے عیاں تھی۔ آج مفقود تھی۔

"ایسا کیا ہو گیا انکل! ایک ہی دن میں۔"

"تمہاری ماں کو پراٹھے بنانے آتے ہیں؟" اس کے سوال کو یوں نظر انداز کیا گویا سنا ہی نہ ہو۔

"بہت اچھے..." اس نے ایسے مزہ لے کے بتایا گویا امی کے پراٹھوں کا ذائقہ منہ میں آ گیا۔

"میں ہوٹل سے بھی کھا سکتا ہوں، لیکن سفید آٹے کا پراٹھا مجھ سے چبایا نہیں جاتا اس لیے کہہ رہا ہوں... چلو تمہاری امی کے ہاتھ کا پراٹھا کھاتے ہیں۔"

ایک دم سے وہ کھڑے ہو گئے۔ گویا خود کو خود ہی اس کے گھر میں دعوت دے ڈالی ہو۔

"مشکل ہے... امی تو یہاں نہیں رہتیں... وہ تو لاہور میں ہیں۔" وہ بھی ساتھ کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک دم رک گئے۔

"پھر ہم دونوں یہاں کیا کر رہے ہیں۔" وہ بھی لاہور کا تھا' جان کر اپنائیت محسوس ہوئی۔

"میری تو روزی روٹی یہاں لے آئی۔ آپ بتائیں۔" یہ تو کل دیکھتے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ اجنبی ہیں یہاں۔

"میری قسمت۔" اب وہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

"مطلب؟"

"بیوی مر گئی... اولاد دھوکے باز نکلی اور محبوبہ بے وفا۔" تین جملوں میں گویا عمر بھر کی کہانی سنا دی ہو۔

"اوہ... واقعی بہت ٹریجک اسٹوری ہے آپ کی... چلیں میرے ساتھ۔ امی کے ہاتھ کے نہ سہی 'موجو گجراتی کے ہاتھ کے پراٹھے کھلاتا ہوں آپ کو... بہت ذائقہ ہے اس کے ہاتھ میں..." وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اتنی اپنائیت کیوں محسوس ہوئی ان سے...

بہر حال وہ ان کو ساتھ لیے اپنے فلیٹ پر آ چکا تھا۔

ناشتا ختم ہونے سے پہلے اپنائیت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ ان کی درد بھری داستان کا خلاصہ سن کر وہ نہ صرف ان کے بیٹے اور بہو کی حرکت پر کف افسوس مل چکا تھا بلکہ بے وفا محبوبہ پر بھی چار حرف بھیج چکا تھا اور اب تازہ خبر یہ تھی کہ وہ انکل کا سامان لینے انکل کے ساتھ جا رہا تھا۔ "انکل" اب اس کے فلیٹ میں ہی رہنے والے تھے۔ بھلے آفس پندرہ منٹ لیٹ پہنچے' لیکن اسے یہ کام کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس پھٹی پرانی ڈائری کے آدھے نمبر تو بند تھے... کچھ نمبر تھے بھی پانچ ہندسی۔ جہاں کال مل جاتی' وہاں نمبر کے ساتھ لکھے نام والے حضرت وفات پا چکے ہوتے' جو حیات ملے ان کو یاد ہی نہیں تھا کہ کون فضل الٰہی... اور جن چند کو یاد تھا ان کو ابا سے ملے بھی سالوں بیت گئے تھے۔ وہ ڈائری بھی بے کار نکلی۔

شام پانچ بجے تک وہ ڈیڈی کو بتانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ غصے سے ڈائری اٹھا کر پھینکی کہ اندر سے ایک پرچی نما کاغذ نکلا۔ فون کرنے کا ارادہ ترک کر کے اس نے وہ کاغذ اٹھایا... اس کی حالت اتنی بوسیدہ نہیں تھی۔ اس نے کھول کر دیکھا اس پر بھی ایک نمبر لکھا تھا۔ کوڈ کے مطابق وہ کراچی کا نمبر تھا۔

"ابا کراچی کیسے جا سکتے ہیں۔" بے دل ہو کر کاغذ رکھتے رکھتے رک گئی۔ نمبر کے ساتھ حسن آرا لکھا ہوا تھا۔ اسے یاد آیا دادی اور ابا کے درمیان اکثر اس نام کا تذکرہ رہتا۔

"چلے جاؤ اپنی حسن آرا کے پاس... جان چھوڑو میری۔" یہ دادی کا پسندیدہ جملہ تھا۔ عزہ نے فوراً سے پہلے نمبر ملایا۔

"جی یہ حسن آرا آنٹی کا گھر ہے۔" ہیلو کے جواب میں وہ ذرا جھجک کر بولی۔

"جی' آپ کون؟" استفسار ہوا۔

"جی میں فضل الٰہی صاحب کی..." بات کاٹ دی گئی۔

"تم اس کی جو کوئی بھی ہو... آ کے لے جاؤ اس کو... دو دنوں سے جان عذاب میں ڈالی ہوئی ہے اس بندے نے۔" گو کہ وہ ابا کی بے عزتی کر رہی تھیں' لیکن عزہ کو یوں لگا گویا ٹھنڈے پانی کی پھوار اس کے جلتے بلتے دل پر پڑی ہو۔ مسکراہٹ سے پورا چہرہ کھل اٹھا۔

"جی جی... بہت شکریہ آنٹی... بس ان کو میرے فون کا نہیں بتایئے گا۔ میں آ رہی ہوں۔" خوشی روم روم سے عیاں تھی۔

"اف ابا... کراچی پہنچ گئے آپ..." فوراً حسن کو فون کیا۔ "دیکھو ذرا... ابا اپنا پرانا عشق تازہ کر رہے ہیں اور ہم یہاں مرنے والے تھے... ویسے یار! زبردست خبر ہے ایک ستر سال کا بوڑھا اپنی پرانی محبوبہ کے پاس چلا گیا اور اس کی اکلوتی پوتی شہر بھر میں خوار ہوتی رہی۔" حسن اب مذاق اڑا رہا تھا۔

"بکواس نہیں کرو... اب مجھے کراچی کی فلائٹ شیڈول دیکھنے دو۔" شیڈول چیک کرنے پر تھوڑی مایوسی ہوئی۔ ایک فلائٹ چھ بجے کی تھی۔ اس کے لیے تو ظاہر ہے لیٹ ہو چکی تھی۔ ایک رات دس بجے تھی' لیکن اس نے سوچا کہ ان کے گھر پہنچتے پہنچتے ایک بج جائے گا۔ مطلب ان کو تنگی ہو گی۔ لہٰذا طے ہوا کہ صبح آٹھ بجے والی فلائٹ پہ جائے گی۔ ابا مل چکے تھے۔ اطمینان کے لیے یہی بات کافی تھی۔

"ٹریٹ دو بھئی..." ربیعہ اپنا راگ الاپ رہی تھی۔

"گھر تو آ جانے دو ان کو..." وہ خوش تھی۔ بہت خوش... اسے اب ابا سے مل کر ان سے بہت سارا لڑنا تھا۔



لیکن اگلے دن اس کی خوشی کا بھرتا بن گیا جب وہاں پہنچ کر اسے پتا چلا کہ ابا تو اپنا بوریا بستر اٹھا کر وہاں سے جا چکے تھے۔

"بیٹا! کل جب تمہارا فون آیا' وہ اس سے پہلے ہی جا چکے تھے۔ میرا بیٹا اور بہو جب دفتر جانے لگے تھے تب ہی وہ اپنا سامان لے گئے تھے' لیکن میں سو رہی تھی اس وجہ سے پتا نہیں تھا... یہ تو جب شام کو واپس آئے تو انہوں نے بتایا۔" حسن آرا شرمندہ سی بتا رہی تھیں۔

"لیکن وہ کہاں گئے؟ آپ نے پوچھا نہیں؟" اب وہ سہیل اور اس کی بیوی سے مخاطب تھی۔

"معاف کیجئے گا... دو دن ہی میں جیسے ان کے ہمارے ساتھ تعلقات تھے۔ ہم نے پوچھنا ضروری نہیں سمجھا..." یہ ان کی بہو تھی۔

"ایکسکیوز می... میرے ابا آپ کے گھر سے

لاپتا ہوئے ہیں.... میں تو اپنے ابا آپ سے ہی لوں گی۔" وہ بھی فضل الٰہی کی پوتی تھی۔

"اگر اتنا ہی پیار تھا تو گھر سے کیوں نکالا تھا؟" بہو بیگم پھر بولیں۔

"باتیں کرنے کے بجائے دعا کریں کہ ابا مل جائیں.... ورنہ آپ کی خیر نہیں۔"

عزوہ حبیب اپنی کمپنی کی اسسٹنٹ منیجر تھی۔ باتوں سے تو کوئی اس کی تذلیل نہیں کر سکتا تھا۔ بڑے رعب سے اپنا بیگ کندھے پہ ڈالا اور گھر سے باہر نکل آئی۔ ذہن میں جگہیں ترتیب دینے لگی کہ پہلے کہاں سے ڈھونڈے اور بعد میں کہاں سے.... سو وہ اید ھی ہومز' اسپتال' پارک' سی ویو' ریلوے اسٹیشن ہر جگہ ابا کی تصویر دکھاتی پھری.... اپنے ایک کولیگ کے بھائی کے ذریعے ائیرپورٹ سے پسنجر لسٹ چیک کرنے کے لیے بھی رابطہ کر رکھا تھا' لیکن ابا کی کچھ خبر نہ تھی۔ امید کا دیا پھر بجھنے لگا.... رات کو تھکی ہاری وہ پھر حسن آرا کے گھر آگئی۔

"جب تک ابا نہیں ملتے' میں یہیں رہوں گی۔" یہ اطلاع حسن آرا کے گھر والوں کے لیے شاک سے کم نہیں تھی۔

"دادا کیا تھا جو بوتی ہے۔" بہو بیگم بڑبڑاتے ہوئے کمرے میں گھس گئیں۔



رات سونے سے پہلے وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اسے ابا کی تلاش کے لیے کہاں کہاں جانا تھا۔ سب سے پہلے تو اسے قریبی پارکس میں دیکھنا تھا کیونکہ ابا کو مارننگ واک کی عادت نشے کی حد تک تھی۔ وہ جہاں بھی ہوں 'مارننگ واک ضرور کریں گے بشرطیکہ بخیریت ہوں.... صبح فجر پڑھتے ہی اسے نکلنا تھا۔

ادھر موجو کی ساری موجیں ختم ہو چکی تھیں۔ شام کو جب مومن گھر آیا تو وہ لڑاکا بیویوں کی طرح دروازے میں داخل ہوتے ہی شکایتوں کا پٹارا کھول چکا تھا۔

"یہ کسے لے آئے ہیں بھائی جان؟ مجھے لگتا ہے میرے سارے گناہوں کی سزا مجھے زندگی میں ہی ملنے والی ہے۔"

"کیوں کیا ہوا؟" مومن نے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی۔

"سارا دن آرمی چیف بنے رہے ہیں میرے اوپر.... جوس لاؤ' حلوہ بنا کر دو' روٹی بناؤ.... صفائی ٹھیک کرو' بیڈ شیٹ بدلو.... پتا نہیں کیا کیا اور تو اور مجھے ایک بھی فلم نہیں دیکھنے دی.... سارا دن نیوز کاسٹروں کی شکل دیکھ دیکھ کر بے رنگ ہو گیا ہوں۔" اس کا واویلا سنتے سنتے جوتے موزے اتار کر رکھے اور ساتھ ساتھ دھیرے دھیرے مسکراتا رہا۔

"اب نماز پڑھنے گئے ہیں' کہتے میرے آنے تک ملک شیک بنا کر رکھو.... حد ہو گئی۔" دہائیاں دیتا اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ مومن واش روم گیا تو دروازے کے باہر کھڑا ہو کر اونچا بولنے لگا۔

"لوڈو کھیلتے رہے میرے ساتھ.... میں جیتنے لگتا تو بے ایمانی بے ایمانی کا شور مچا کر لڈو الٹ دیتے۔ میں تو کہہ رہا ہوں بھائی جان! بڑا خطرناک بڈھا ہے.... کہیں را کا ایجنٹ نہ ہو....." مومن واش روم سے نکل آیا۔

"بکواس مت کرو.... تمہیں اس لیے کھٹک رہے ہیں کیونکہ تم پر نظر جو رکھیں گے سارا دن.... اچھا ہے امی کے آنے سے پہلے تمہاری پریکٹس ہو جائے گی۔"

ڈھیلے ڈھالے ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس مومن اب اطمینان سے صوفے پر لیٹ کر ریموٹ اٹھا چکا تھا۔ کراچی آنے کے بعد ایک ماہ تک تو نہ ڈھنگ کا کھانے کو ملا.... نہ ڈھنگ کے کپڑے دھلے ملے.... لیکن اب پانچ مہینوں سے موجو اس کی زندگی میں تھا جس سے معاملات کافی آسان ہو گئے تھے' لیکن موجو کے معاملات کافی مشکل ہو گئے تھے۔



پچھلے دو گھنٹے سے قریبی پارک میں ابا کو ڈھونڈنے کی کوشش میں بری طرح ناکام ہو چکی تھی۔ ان دو گھنٹوں میں سفید داڑھی والے ان گنت لوگوں کو دیکھ کر اسے

اندازہ ہو چکا تھا کہ صرف اس کے ابا کو ہی مارننگ واک کا نشہ نہیں ہے۔ شہر بھر کے بابے اس لت میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ اس طرح پارکوں میں خوار ہو کر ابا کو ڈھونڈنا ناممکن لگ رہا تھا۔ سو طے ہوا کہ وہ ابا کا فوٹو پولیس اسٹیشن اور اخبار میں دے گی۔

دونوں سینڈل اتار کر بنچ کے اوپر چوکڑی مارے بیٹھ کر اپنے موبائل میں سے ابا کی تصویر سلیکٹ کرنے لگی۔ جس میں ابا کے نقوش بالکل واضح ہوں۔



آج اتوار کی وجہ سے وہ گھر سے تھوڑا لیٹ نکلے اور ان چھ ماہ میں پہلی بار تھا کہ وہ امی سے بات کرنے کے بجائے ''انکل'' کی اسٹوریاں سن رہا تھا اور وہ پتا نہیں کہاں کہاں کی کہانیاں سنا رہے تھے.... ابھی دوسرا ہی چکر تھا کہ باتیں کرتے کرتے اچانک ان کی نظر اس لڑکی کی پر پڑی جو بنچ پر چوکڑی مارے بیٹھی موبائل پر مصروف تھی۔ ان کو چہرہ کچھ جانا پہچانا لگا۔ لیکن جھکا ہونے کی وجہ سے واضح نہیں تھا۔ تھوڑا قریب جا کر اپنے خدشے کی تصدیق کی۔ تصدیق نہ ہو سکی تو تھوڑا اور قریب چلے گئے۔ اتنے میں لڑکی نے بھی سر اٹھا لیا۔ چند ثانیے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

''ابا!'' لڑکی کے ہونٹ ہلنے کی دیر تھی۔ ابا الٹے قدم بھاگنے لگے۔ لڑکی نے بھی جلدی سے جوتا پہنا اور پیچھے پیچھے بھاگنے لگی۔

''ابا.... بات سنیں.... بھاگ کیوں رہے ہیں ابا؟''

مومن جو ذرا آگے جا کر رک گیا تھا۔ حیران سا یہ منظر دیکھتا رہ گیا۔ پہلے اس کے پاس سے ابا گزرے' پھر ابا ابا پکارتی' کرتا جینز کے ساتھ اسٹالر لپیٹے وہ ماڈرن سی لڑکی گزری۔ اس کے ساکت وجود میں حرکت ہوئی تو ان دونوں کے پیچھے وہ بھی بھاگا۔ ابا گیٹ کی طرف ایسے بھاگ رہے تھے گویا جوانی میں ملکھا سنگھ کو ہرا چکے ہوں۔

''ابا! کتنا پریشان کیا ہے آپ نے.... اندازہ ہے آپ کو.... آپ ایسے نہیں بھاگ سکتے۔'' پھولے سانس کے ساتھ وہ پکار رہی تھی۔

یک دم گیٹ کے پاس پہنچ کر ابا رکے' پلٹے۔ اسی تیزی سے الٹے قدم چلتے عزوہ کے پاس پہنچے جو ابا'' کو پلٹتے دیکھ کر رک چکی تھی.... اس کو کندھوں سے تھام کر اپنے ساتھ لگایا.... الگ کر کے ماتھا چوما۔

''مل لیا میں نے۔ جاؤ اب واپس چلی جاؤ۔'' اتنا کہہ کر پھر سرپٹ دوڑ لگا دی۔ وہ جو چند لمحے ابا کے رویے کو حیرت سے دیکھتے رکی تھی۔ پھر پیچھے بھاگی۔

''ایکسکیوز می میڈم!'' مومن نے آواز دینی چاہی.... جو نہ چاہتے ہوئے بھی اس میراتھن میں شریک تھا۔ لیکن میڈم سن کہاں رہی تھیں۔ وہ بھی ابا کے پیچھے پیچھے سڑک کراس کر کے اب گلی میں گھس چکی تھیں۔ عزوہ' ابا کے پیچھے اور مومن' عزوہ کے پیچھے.... ''ٹوم اینڈ جیری'' کا سین تھا۔

''میڈم پلیز.... میری بات سنیے.... ایسے بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' مومن نے عزوہ کو جالیا جو ابا'' کو لفٹ میں بند ہوتے دیکھ کر سر پیٹ لینے کو تھی۔

''کیا مسئلہ ہے مسٹر؟'' جلی بھنی اس کی طرف پلٹی۔

''وہ میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ وہ میرے ساتھ رہتے ہیں.... میرے گھر چل کے بیٹھ کر آرام سے بات کر سکتی ہیں آپ۔'' اس کے جارحانہ انداز پہ تھوڑا سٹپٹایا لیکن بات مکمل کر کے لفٹ کا بٹن دبا دیا۔

''آپ کے ساتھ؟'' آپ کون ہیں؟'' مشکوک نظروں سے دیکھا۔

''میرے ساتھ چلیں' سب پتا چل جائے گا آپ کو۔'' وہ اوپر پہنچے تو کوریڈور میں کھڑے ابا زور زور سے فلیٹ کا دروازہ پیٹ رہے تھے جو بالکل نہیں کھلنے والا تھا کیونکہ موجودہ گجراتی صاحب اصطبل بیچ کر ابھی ابھی تو سوئے تھے۔

''اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' مومن نے دروازہ کھولتے ہوئے دونوں کو دیکھ کر گویا پرامن رہنے کی درخواست کرتے ہوئے کہا اندر داخل ہوتے ہی ابا واش روم میں گھس گئے گویا اسی آفت کے پیش نظر اتنی بھاگ دوڑ کی گئی ہو جبکہ عزوہ کو مومن نے لاؤنج

میں بٹھایا اور موجو کو جگانے چل دیا اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ پچھلے دو دنوں سے جس پوتی کا کئی بار ذکر ہو چکا تھا' ہو نہ ہو یہ وہی پوتی ہے۔

"یہ سب کیا ہے ابا.....؟" وہ لاؤنج میں آئے تو وہ فوراً" بولی' لیکن وہ اس کو مکمل نظر انداز کرتے لاؤنج کے داہنی حصے میں بنے امریکن کچن میں جا گھسے۔

"اپنے ماں باپ سے پوچھو۔" وہ بھی صوفے سے اٹھ کچن کاؤنٹر پر آ گئی تھی۔

"بچکانہ حرکتیں آپ کر رہے ہیں اور پوچھوں ان سے؟" کچن کیبنٹس کو کھولتے بند کرتے صاف اسے اگنور کرتے نظر آ رہے تھے۔

"ایسی ہی بچکانہ حرکتیں کر رہا ہوں تو کیوں آئی ہو میرے پیچھے؟" مومن بھی کچن میں ہی آ گیا تھا۔

"یہ پوچھیں کہ کیسے آئی ہو..... جبکہ آپ تو کوئی نشان نہیں چھوڑ کر آئے تھے۔"

"جیسے بھی آئی ہو..... واپس چلی جاؤ..... مجھے یہیں رہنا ہے اب" چمچوں کے اسٹینڈ میں سے چمچ اٹھا کر گویا فیصلہ سنایا

"یہاں کہاں ابا.....؟ کون ہیں یہ حضرت؟" مومن کو دیکھ کر ابا سے پوچھا جو فریج کا دروازہ کھولے کچھ کھوج رہے تھے۔ دروازہ کھولے کھولے مڑ کر دیکھا تو خیال آیا کہ تعارف تو کروایا نہیں۔

"عزوہ.....! مومن..... مومن.....! عزوہ۔" دونوں کو باری باری دیکھ کر گویا تعارف کی دشواری آسان کی۔

"کون مومن؟" ہاتھ میں پکڑا ڈونگا کاؤنٹر پر رکھا اور عزوہ کے سوال پر ایک نظر عزوہ پر ڈالی پھر مومن پر..... چند سیکنڈ سوچا۔

"میرا منہ بولا بیٹا۔" اپنی سوچ کو آواز دی اور ڈونگے میں سے چمچ بھر کر پیلے رنگ کا کسٹرڈ منہ میں ڈالا۔

"آپ کو شوگر ہے ابا۔" عزوہ منہ بولے بیٹے پر ردِ عمل دیتے دیتے کسٹرڈ دیکھ کر چیخ ہی تو پڑی۔

"آپ کو شوگر ہے ابا.....؟" وہی جملہ حیرت اور دکھ کے سے انداز میں کہتے مومن نے ڈونگا اٹھا لیا۔

"تھوڑی سی....." کھسیانے سے ہو کر اعتراف کیا۔

"یہ میرے ابا ہیں۔" مومن کا ابا کہنا عزوہ کو جیسے کانٹے کی طرح چبھا۔ "میرے۔" پر زور دے کر اسے جتایا۔

"اب میرے بھی ہیں..... آپ کے سامنے مجھے منہ بولا بیٹا بنایا ہے انہوں نے....." جتنی جلدی انہوں نے مومن کو بیٹا بنایا تھا اس سے بھی زیادہ جلدی مومن صاحب نے قبول بھی کر لیا تھا۔

"کیوں کر رہے ہیں ابا آپ ایسا؟" جھنجلا کر پھر ابا سے مخاطب ہوئی۔

"کبھی کبھی کی بد پرہیزی تو جائز ہے نا؟" ابا کی آنکھیں اور دل ابھی بھی کسٹرڈ کے ڈونگے میں اٹکا تھا۔

"میں میٹھا کھانے کی نہیں' روٹھ کر یہاں آ جانے کی بات کر رہی ہوں۔"

اب وہ مومن کو شاکی نظروں سے دیکھتے صوفے پر آ بیٹھے تھے۔ اور ساتھ ہی عزوہ بھی۔

"بس بہت ہو گیا..... تین بجے کی فلائٹ ہے اور آپ میرے ساتھ خود چلیں گے کہ اٹھوا کے لے جانے کا بندوبست کروں؟"

"میں صرف ایک صورت میں واپس اس گھر میں جا سکتا ہوں..... اپنے اماں ابا سے کہو یہاں آئیں' میری کچھ شرائط ہیں' وہ مانیں..... پھر میں سوچوں گا۔" ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر تکبر سے بولے۔

"پھر تو آپ کو کچھ عرصہ انتظار کرنا پڑے گا۔ پندرہ' بیس دن سے پہلے تو وہ آنے والے نہیں۔ سو آپ ابھی چلیں میرے ساتھ' میں گھر میں اکیلی ہوں..... جب وہ آئیں گے پھر منوا لیجئے گا ساری شرطیں....."

موجو آنکھیں ملتا فریش جوس نکال لایا تھا۔ عزوہ نے اپنی بات مکمل کر کے گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔

"کیا مطلب.....؟ وہ چلے گئے جرمنی۔ وہ چلی گئی اپنی ماں کے پاس؟ لو جی پھر تو گل ہی مک گئی..... جس بات کے لیے میں احتجاجاً" گھر سے نکلا تھا..... وہ تو ہو گئی..... وہ تو غیر تھی..... میرے خون کو' میرے بیٹے کو کوئی فرق نہیں پڑا..... اور میں سوچ رہا تھا وہ ڈھونڈ رہا ہو گا'

پریشان ہو گا۔" ٹانگ سے ٹانگ اُتر چکی تھی۔ تکبّر کی جگہ غصے نے لے لی تھی۔

"جی ہاں..... وہ غیر تھیں..... آپ کا خون نہیں تھیں..... اسی لیے آپ نے ان کو سترہ سال ایک ناکردہ جرم کی سزا دی..... لیکن میرا اور حسن کا وہ خونی رشتہ تھیں..... ہم نے بہت بار انہیں تکیے میں منہ چھپا کر روتے دیکھا..... میں نے اور حسن نے بھیجا ہے انہیں..... کیونکہ ہم انہیں مزید روتے نہیں دیکھ سکتے..... ہم نہیں چاہتے کہ جیسے انہیں باپ کا آخری دیدار نہیں کرنے دیا گیا..... ویسا درد انہیں اپنی ماں کے لیے ہو۔ نانی بیمار ہیں ابا..... آپ اتنے سنگ دل نہ بنیں۔" وہ بولی تو بولتی گئی۔ غصہ تھوڑا ٹھنڈا ہوا۔

"تم اور حسن بچے ہو۔ کچھ نہیں جانتے جو تمہارے نانا نے کیا تھا میرے ساتھ..... یہ تو بہت کم ہے۔"

"ہم سب جانتے ہیں۔ پہلے ہم بچے تھے۔ نہیں بولتے تھے لیکن اب نہیں ابا! اب ہم ممی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے۔" دوٹوک لہجہ۔

"کیا تکلیف ہے اسے ہمارے گھر میں..... ہر چیز کی مالک ہے وہ۔" ناراض ہونے کی وجہ مرتی ہوئی نظر آئی۔

"تو انہوں نے کیا تکلیف دی آپ کو..... اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود انہوں نے کبھی ماتھے پہ بل تک نہیں ڈالا۔ کب اپنے فرائض اور آپ کی خدمت میں کمی کی۔ کیا وہ اتنے انعام کی بھی حق دار نہیں.....؟"

اب ابا کے پاس کوئی جواب نہیں تھا..... اٹھ کر کمرے میں چلے گئے اور دروازہ بند کر لیا۔

"بس مجھے نہیں جانا۔" بند دروازے کے پیچھے سے آواز آئی۔

"تم، حسن، تمہارے ماں باپ..... ایک پرفیکٹ فیملی....." دو گھنٹے کی تگ و دو کے بعد ابا کمرے سے نکلے..... اور اب بول رہے تھے۔

"میری کوئی جگہ ہی نہیں بنتی وہاں..... ایک ایکسٹرا ہوں میں۔" خود ترسی کی کیفیت میں گھرے عزوہ کے سامنے بیٹھے تھے۔

"اگر آپ ایکسٹرا ہوتے تو میں اتنے دونوں سے اپنا کام دھندا چھوڑ کے شہر شہر آپ کو ڈھونڈتی پھر رہی ہوتی؟" اس نے ابا کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"صرف دنیا داری۔" بے دردی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"چلیں دنیا داری ہی سہی..... آپ نے تو دنیا داری بھی نہیں نبھائی..... اپنی چھوٹی انا اور جھوٹی قسم کے پیچھے قطع رحمی کے مرتکب ہوئے ہیں آپ ابا!"

مومن، موجو کو ساتھ لیے دوپہر کے کھانے کا انتظام کرنے گیا تھا، وہ دونوں گھر میں اکیلے تھے۔

"مجھے آپ کا وعظ نہیں چاہیے مولانا صاحب۔" ابا نے طنز سے بھری ٹون میں عزوہ کو مولانا صاحب کہا۔

اس نے بمشکل مسکراہٹ روکی..... دھمکی، پیار، منت سماجت اس نے ہر طرح سے منالیا، لیکن ابا کسی ضدی بچے کی طرح "نہیں نہیں، میں نہیں" کیے جا رہے تھے۔ عزوہ کا ضبط ختم ہونے لگا۔

"ابا میں آپ کو یوں اجنبی لوگوں کے پاس چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔" اب کھانا کھانے کے بعد مومن کو دیکھتے ہوئے وہ پھر بولی۔

"کوئی اجنبی نہیں..... تم سے زیادہ اچھا ہے....."

تین بجے کی فلائٹ نکل چکی تھی..... اب آٹھ بجے والی فلائٹ سے اسے جانا ہی تھا۔ بار بار باس کا فون آرہا تھا۔ نیپال سے واپس آکر ابھی تک اس نے میٹنگ کے متعلق رپورٹ نہیں کیا تھا۔

"دیکھیں مس عزوہ! آپ بے فکر ہو جائیں۔ یہاں ابا کا پورا خیال رکھا جائے گا۔" اس نے ایک نظر مومن کو دیکھا۔ ایک گہری سرد آہ بھری اور بیگ میں سے کچھ نکالنے لگی۔

"یہ لیں آپ کا فون..... اپنے پاس رکھیں اسے۔" ابا کا موبائل ابا کو تھمایا تو خود اس کا موبائل بجنے لگا۔ انٹرنیشنل نمبر دیکھ کر تھوڑا پریشان ہو گئی۔

"نانی کی ڈیتھ ہو گئی ہے ابا!" فون سن کر قدرے افسوس سے ابا کو بتایا جن کے چہرے کے عضلات یک

دم ڈھیلے پڑ گئے۔

"انا للہ۔۔۔۔ بھلی لوک تھی۔۔۔۔ اللہ بخشے" منمناتے ہوئے بولے۔ مومن اس عجیب سی سچویشن میں کشمکش میں تھا کہ کیا بولے؟

"آپ میرے ابا تو نہیں ہیں۔۔۔۔ پیار کرنے والے۔ محبت سے میرا ماتھا چومنے والے، مجھ پر آیت الکرسی پڑھ کر پھونکنے والے، میرے ساتھ باغ میں ریس لگانے والے۔ آپ تو کوئی سنگدل بوڑھے لگ رہے ہیں۔۔۔۔ میرے ابا نہیں۔" تاسف سے انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔

"اور تم بھی میری عزوہ نہیں لگ رہی ہو۔ ورنہ یہ جانتے ہوئے کہ مجھے اس لفظ سے کتنی چڑ ہے تم مجھے بوڑھا کبھی نہ کہتیں۔ اس سے تو اچھا ہے مر جاؤں۔۔۔۔ موجو! اکسٹرڈلاؤ۔۔۔۔" گہرے دکھ میں گھر کر بولے۔

"میٹھا کھا کے مریں گے۔۔۔۔ واہ!!" طنز سے کہتے بیگ اٹھایا اور فلیٹ سے نکل گئی۔

"جاؤ مومن! اس پاگل لڑکی کو ایئرپورٹ چھوڑ آؤ۔" اٹھ کر کچن کی طرف جاتے جاتے مومن کو حکم دیا۔ وہ بھی ان کے رویے پر حیران ہوتا فلیٹ سے نکل گیا۔

نیچے پہنچ کر دیکھا تو وہ گلی کے نکڑ پر پہنچ چکی تھی۔ اس نے پارکنگ کی طرف جانے کا ارادہ ترک کیا اور پیدل ہی اس کے پیچھے چلنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ وہ مین سڑک پر رک کر ٹیکسی کا انتظار کرنے کے بجائے سڑک پار کر کے اسی پارک کے گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ شام پانچ بجے کا وقت تھا۔ اور لوگ بہت کم تھے۔ وہ جا کر ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔۔۔۔ مومن بھی اس کے سر پر پہنچ گیا۔

"جی۔۔۔۔؟ کیوں کر رہے ہیں میرا پیچھا۔۔۔۔؟" بے زاری سے اس کو دیکھ کر اکتاہٹ بھرے لہجے میں پوچھا اور جوتا اتار کر بنچ کے اوپر چوکڑی مار کر صبح والی پوزیشن میں بیٹھ گئی۔

"ابا نے مجھ سے کہا ہے کہ آپ کو ایئرپورٹ چھوڑ آؤں۔۔۔۔" ذرا فاصلے پر بیٹھ کر اس نے اپنی وہاں موجودگی کی وجہ بتائی۔

"ہونہہ۔۔۔۔ ان کو جا کر تسلی دے دیں۔ میں واپس نہیں آنے والی۔" طنزیہ کہتے ہوئے اپنے بیگ میں سے کچھ ٹٹولنے لگی۔

"ارے نہیں۔۔۔۔ وہ آپ کی محبت میں کہہ رہے ہیں۔" دادا کی طرف سے پوتی کا دل صاف کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔

"جی۔۔۔۔ جی۔ صبح سے ان کی محبتیں دیکھ دیکھ کر ہی تو شاک میں ہوں۔۔۔۔ ادھر میرا باس میری جان کو رو رہا ہے۔۔۔۔ ادھر ابا بچوں کی سی ضد لگائے بیٹھے ہیں۔۔۔۔ اوپر سے نانی کا انتقال ہو گیا۔۔۔۔ وہ ڈیڈ باڈی پاکستان لا رہے ہیں۔ پنڈی بھی جانا پڑے گا۔۔۔۔ اف کھچڑی بن گئی ہے زندگی۔"

موبائل میں باس کی مسڈ کالز دیکھ کر اس کا سر گھوم گیا۔ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے اسے کسی دیرینہ دوست کی طرح سب بتا رہی تھی۔

"اگلے مہینے میری بہن کی شادی ہے، میں لاہور آؤں گا تو ابا کو اپنے ساتھ لے آؤں گا۔ آپ بالکل فکر نہ کریں، یہ ابھی غصے میں ہیں، غصہ اترے گا تو آجائیں گے۔ آپ میرا کارڈ رکھ لیں۔ اس پہ کراچی اور لاہور دونوں کے ایڈریس اور فون نمبرز ہیں۔"

مومن کے ہاتھ سے کارڈ پکڑتے پکڑتے کچھ خیال آنے پر مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

"اگر ابا نے آپ کو کوئی جھوٹی سچی کہانی سنائی ہے تو یقین نہ کیجئے گا۔ ابا کا کوئی بینک بیلنس ہے نہ کوئی زمین جائیداد۔ آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہونے والا۔۔۔۔" اس کی نیت کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے اسے آگ ہی تو لگا دی۔

"ایکسکیوزمی۔۔۔۔ آپ کو کیا لگتا ہے کہ مجھے آپ کے ابا سے کچھ لالچ ہے؟ معاف کیجیے گا میڈم! ایک ایسا شخص جو مجھے مسکین شکل بنائے پارک کے بنچ سے ملا ہو، جس کے بیٹے اور بہو نے اسے گھر سے نکال دیا ہو، مجھے اس سے کیا لالچ ہو گا۔ اور جس عمر میں آپ کے ابا ہیں، ان کے گردے بھی اتنے کار آمد نہیں کہ بیچ

کے چار پیسے ہتھیا سکوں۔۔۔ مجھ پر الزام تراشی کے بجائے اپنے اعمال پر نظرثانی کریں۔ اگر اتنا ہی احساس تھا ابا کا تو کیوں ان کے دشمنوں کے گھر چلے گئے۔۔۔ کیوں ان کا دل دکھایا۔" اس کو حقیقتاً بہت غصہ آیا۔۔۔ شرمندہ تو وہ بھی بہت ہوئی۔ سو بغیر وقفے کے دھیمے لہجے میں بولے گئی۔

"میری نانی اور دادی بہنیں تھیں۔ اپنے بچوں کا آپس میں رشتہ جوڑ کر گویا رشتے کو مضبوط کیا۔ سب ٹھیک تھا کہ نانا نے پنڈی میں کاروبار شروع کیا اور ابا کو پارٹنرشپ کی دعوت دی۔ ابا' دادی اور ممی کے منع کرنے کے باوجود سلیپنگ پارٹنر بن گئے۔۔۔ شروع کے چند سال تو ٹھیک رہا۔ لیکن پھر نانا ہر مہینے نقصان کا رونا رونے لگے' کاروبار بند کر دیا۔ لیکن چند ماہ بعد ابا کو کسی تیسرے فرد کے ذریعے پتا چلا کہ درحقیقت کاروبار بند نہیں کیا گیا بلکہ کسی اور جگہ یہ نئے نام سے شروع کیا گیا ہے۔ اور محض ابا کا حصہ نکالنے کے لیے نقصان کا ڈھونگ رچایا گیا ہے۔

بس پھر کیا تھا' ابا تو طیش میں آ گئے۔ خوب جھگڑا کرنے کے بعد طے ہوا کہ دادی اور ممی ان سے کبھی نہیں ملیں گی۔۔۔ دادی بہن سے ملے بغیر چلی گئیں اور نانا اپنی بیٹی سے۔۔۔ اس پابندی کے باوجود بھی ابا کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا۔۔۔ اکثر ہی ممی کو ان کے باپ کے حوالے سے طعنے دیتے رہتے۔ اور اب اگر ماں بیٹی کی ملاقات ہو گئی ہے تو کیا غلط ہوا۔"

وہ ساری کہانی بتا کر چپ ہوئی تو اس نے بھی گہرا سانس لیا۔ ایئرپورٹ جانے کا ٹائم ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

رات سونے سے پہلے بیڈ پر لیٹتے ہی دھیان نہ چاہتے ہوئے بھی ان عجیب سے دادا پوتی کی طرف چلا گیا۔ ابھی وہ دادا کی منفرد شخصیت پوری طرح ہضم نہیں کر پایا تھا کہ پوتی صاحبہ منظرعام پر آ گئیں۔ اب اس نے دھیان کی طنابیں کھینچ کر سوچ کا گھوڑا عزہ کی طرف دوڑایا۔ ایک عام سی لڑکی۔۔۔ صاف رنگت جیسی آج کل تمام ہی لڑکیوں کی ہوتی ہے کھلی کھلی' بڑی آنکھیں' ہر دوسرے بندے کی آنکھیں ایسی ہوتی ہیں۔

عام سا قد' بالوں کا کٹ اور سنہری لٹیں ہر دوسری لڑکی جیسی۔۔۔

پھر کیا تھا جو اس کو عام سے خاص بنا رہا تھا۔

میک اپ سے پاک چہرہ۔۔۔ شاید لپ اسٹک بھی نہیں تھی' سادگی بھی اپ ٹو ڈیٹ تھی۔۔۔ شاید نفاست اس کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ اب اس کا دھیان بات کرتے ہوئے اس کے ہاتھوں کی موومنٹ کی طرف گیا۔ بات کی شدت اور نرمی کے لحاظ سے اس کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ ہاتھوں کی حرکت بھی نمایاں تھی۔۔۔

شاید اس کا بات کرنے کا انداز اتنا پر اثر تھا کہ وہ خود کو متاثر پا رہا تھا۔ یا شاید اس کی آنکھوں میں جھلکنے والا وہ غرور' یا اس کی شخصیت سے عیاں اعتماد۔ کچھ تو تھا جو مومن کو بے چین کر رہا تھا۔

امی آج کل زمر کی شادی کی تیاریوں کے ساتھ ساتھ لڑکی بھی ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس نے اپنا تجزیہ کیا کہ اس کو کیسی لڑکی اپنی شریک حیات کے طور پر پسند آ سکتی ہے۔ پراعتماد' تعلیم یافتہ' اچھی صورت' خود مختار۔۔۔ جو خوبیاں اس نے ذہن میں دہرائیں' عزہ میں وہ ساری کی ساری بدرجہ اتم نظر آئیں۔۔۔ اسے ہمیشہ سے پراعتماد لڑکیاں پسند تھیں۔ زمر اور کشف بالکل ایسی نہیں تھیں۔ اس نے زمر کو ڈرائیونگ جس مشکل سے سکھائی تھی' یہ وہی جانتا تھا۔ ان کو اپنے ہر کام کے لیے اپنا بھائی چاہیے تھا۔ لیکن اس کی انتھک محنت اور کوشش کے بعد زمر میں تھوڑا اعتماد آیا تھا۔ کشف میں تو ابھی بھی نہیں تھا۔

اس نے سوچا اگر عزہ کی جگہ زمر کا دادا گم ہوتا۔۔۔ تو سب سے پہلے تو وہ خوب روتی دھوتی' پھر اکیلی دوسرے شہر میں جانے کا تو سوچ بھی نہ سکتی۔ لیکن اگر خود پر جبر کر کے اسے آنا بھی پڑتا تو وہ دادا کے ملتے ہی وہ رونا دھونا

مچاتی کہ الاماں..... اور دادا کی ضد کرنے پر خود بھی بوریا بستر یہیں ڈال دیتی کہ دادا کو لے کر ہی جائے گی..... لیکن عزوہ نے ایسا کچھ نہیں کیا۔
شکر ہے ہمارے دادا جا چکے ہیں۔" عالم تصور میں زمر کی پریشانی دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے شکر ادا کیا۔

☆ ☆ ☆

فریش ہو کر آیا تو موجو اور ابا کھانے پہ اس کا انتظار کر رہے تھے۔
"کیا سوچا پھر ابا آپ نے؟"
عزوہ کو گئے آج چوتھا دن تھا۔ مومن نے جب امی کو ابا کے بارے میں بتایا تو وہ بہت خفا ہوئیں..... اور جلد از جلد ان کو چلتا کرنے کی تاکید کی۔
"کس بارے میں.....؟" چہرے پر معصومیت طاری کر کے پوچھا گیا۔
"اپنے بارے میں اور کس بارے میں....." ڈونگے سے سالن نکالتے ہوئے ان کی مشکل آسان کی۔
اپنے بارے میں کیا سوچنا.....؟ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں یہیں رہوں گا۔" دھونس سے اس کی بات کا جواب دیتے نوالہ منہ میں رکھا اور موجو کی شامت آ گئی۔
"اوئے موجو خبیث.....! اتنا نمک..... دوبار ڈال دیا کیا.....؟ فوراً" پانی کا گلاس منہ کو لگالیا۔
"ویسے بھائی جان! ایک بات بتائیں۔ کیا ان کو آپ نے میری ساس بھرتی کیا ہے۔ ہر وقت مجھ پہ پھوں پھوں کرتے رہتے ہیں۔" ابا سے تنگ موجو نے مومن سے ایک بار پھر شکایت کی۔
"موجو.....! نمک واقعی زیادہ ہے۔" مومن نے بھی ابا کو مزید شہہ دی۔
"کبھی نمک زیادہ تو مرچ کم، کبھی مرچ زیادہ تو نمک کم، چائے بنائے تو پتی زیادہ..... مومن! تمہیں کوئی ڈھنگ کا لڑکا نہیں ملا رکھنے کو..... کیوں اپنی حلال کمائی اس پر حرام کر رہے ہو؟"
"ہاں ہاں..... مجھے بھی نہیں رہنا یہاں..... میرا حساب کریں مومن بھائی۔" موجو تو جیسے سامان سر پر رکھے بیٹھا تھا۔
"ہاں بڑے تم فنانس منسٹر تمہارے حساب کے دو جوتے نکلتے ہیں..... کھاؤ اور نکلتے بنو۔"
"ارے ارے۔ بس، بس ابا! موجو بہت اچھا کھانا بناتا ہے۔ بس آج نمک زیادہ ہو گیا تھوڑا..... یہ دہی بھی ساتھ لگائیں نا....." مومن نے بروقت سیز فائر کروایا۔ جو بات شروع ہوئی تھی وہ تو وہیں رہ گئی۔ ابا تو ایسٹ انڈیا کمپنی ہی بنتے جا رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

اپنی ماں کی ناراضی سے بچنے کے لیے اس نے ابا سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ مارننگ واک کے دوران کوئی بات نہیں ہوگی۔ سو طے پایا کہ وہ دونوں مخالف سمت میں دوڑیں گے۔ ہاں جہاں ٹکراؤ ہوتا وہاں مسکراہٹ کا تبادلہ کیا جاتا۔
"لڑکی تو بس ٹھیک ہی تھی۔ ایٹی ٹیوڈ بہت تھا۔"
کل پھر امی لڑکی دیکھنے کہیں گئی تھیں اور اب مومن کو تفصیل بتا رہی تھیں۔
"بس میں چاہتی ہوں کہ ایسی لڑکی ہو کہ دیکھتے ہی میرے دل میں کھب جائے، جیسے زمر کے لیے جب حماد کو دیکھا تھا تو پہلی نظر میں ہی اپنا اپنا لگا تھا۔"
"تو پھر ایک لڑکی میری نظر میں بھی ہے، وہ بھی دیکھ لیں....." لڑکی کا ذکر شروع ہوتے ہی مومن کی آنکھوں کے سامنے عزوہ کا سراپا ابھر آیا۔
"لے..... اس سے اچھی کیا بات ہوگی کہ لڑکی خود تمہاری پسند کی ہو..... مجھے بھی گھر گھر جا کر لڑکیاں دیکھنا اچھا نہیں لگتا..... میں بھی بیٹیوں والی ہوں۔" امی نے تو جیسے کلمۂ شکر ادا کیا۔
"ہاں تو ٹھیک ہے..... دیکھ لیں آپ، اگر پسند آ گئی تو اوکے کر دیجیے گا....."
"صحیح ہے..... کشف کے پیپرز بھی ختم ہو گئے..... ہم تینوں دو چار دنوں کے لیے تمہارے پاس آ جاتی

ہیں... لڑکی بھی دیکھ لوں گی اور سمندر بھی۔" انہوں نے تو جھٹ سے پروگرام بھی بنالیا۔ وہ ہلکے سے ہنسا۔

"سمندر دیکھنے شوق سے آئیں... لیکن لڑکی دیکھنے کے لیے کہیں جانے کی ضرورت نہیں' وہ لاہور میں ہی دیکھنے کو مل جائے گی۔"

"لاہور کسی کام سے آئی ہے کیا؟" امی نے بھی قیافہ لگایا...

"ارے نہیں امی! وہ رہتی ہی وہیں ہے۔ لاہور کی ہی ہے۔"

"کیا... یعنی تم نے لاہور ہی میں لڑکی پسند کرلی تھی۔ لیکن ماں کو شوقیہ خوار کروا رہے تھے۔"

زمر نے وظائف پڑھتے ہوئے سر اٹھا کر ماں کے بدلتے تیور دیکھے... جب سے تاریخ طے ہوئی تھی امی نے خوشگوار ازدواجی زندگی گزارنے کے لیے کئی وظائف بتائے تھے اور پڑھنے کی سختی سے تاکید بھی کی تھی۔ سو وہ پڑھتے پڑھتے ماں کو فون پہ بات کرتے دیکھ رہی تھی۔

"ارے نہیں امی! وہ کراچی آئی تھی کسی کام سے... ایکچوئلی وہ ان صاحب کی پوتی ہے۔ جو میرے ساتھ رہتے ہیں۔" اس نے ذرا رک کر اس کا تعارف کروا ہی دیا۔

"نہ بابا نہ... مجھے ایسے گھر سے بہو نہیں لانی جہاں بزرگوں کے ساتھ یہ سلوک ہو۔ جنہیں اپنے باپ کی پرواہی نہ ہو..." امی نے تو جیسے کانوں کو ہاتھ لگالیے۔

"امی! میں آپ کو ساری کہانی بتا توچکا ہوں... وہ بہت پڑھی لکھی فیملی ہے۔ آپ ملیں گی تو آپ کو اچھے لگے گا... کل حسیب صاحب کی کال آئی تھی میرے پاس... ابا کی وجہ سے بہت شرمندہ ہورہے تھے اور ممنون بھی بہت تھے۔ اب ابا خود ہی منع کررہے ہیں تو میں نے بھی انہیں تسلی دی کہ ابا کو میرے پاس ہی رہنے دیں... چند دنوں میں موڈ بہتر ہوگا تو خود ہی چلے جائیں گے..." اس نے تفصیلاً حسیب صاحب کی کال کا بتایا۔

"اچھا..." امی جیسے کسی نتیجے پر پہنچ چکی ہوں۔ خوب کھینچ کر "اچھا" کہا۔

"تو بابا اپنی پوتی کے لیے تم سے چپکا بیٹھا ہے... بھئی ایسا خوبرو' برسرروزگار' اکلوتا لڑکا کہاں ملتا ہے آسانی سے... وہ تمہیں الو بنارہے ہیں بیٹا جی اور تم مجھے۔"

زمر نے تسبیح چھوڑ کر پھر امی کو دیکھا۔

"ارے نہیں امی... ان کو تو پتا بھی نہیں کہ میں ایسا سوچ رہا ہوں... اور آپ نے بھی وہاں اس کی نانی کی تعزیت کے لیے جانا ہے۔ رشتے کی بات نہیں کرنی' اگر آپ کو پسند آئے تو پھر بات آگے بڑھائیں گے..." اس نے ماں کی اچانک اڈنے والی غلط فہمی کو دور کرنا چاہا۔

"ارے ماں صدقے جائے... کتنا فرماں بردار بیٹا ہے میرا..." زمر نے پل میں تولہ پل میں ماشہ ہوتی ماں کو دیکھا۔ اور مسکراتے ہوئے تسبیح جاری رکھی۔

"لڑکی اونچی لمبی گوری چٹی تو ہے نا مومن؟" یک دم کچھ یاد آنے پر پوچھا۔

"مجھے لگا تھا کہیں میری ماں بھی عام ماؤں جیسا نہ سوچتی ہو... لیکن شکر ہے آپ نے ایسا کچھ نہیں پوچھا' میری ماں واقعی عام نہیں۔" سامنے سے آتے ابا کو دیکھ کر اس نے امی کی بات کا جواب دیا... اور مسکرایا بھی۔

"اب شرمندہ تو نہ کرو... بس سیرت اچھی ہو۔ صورت کا کیا کرنا۔" زمر نے بمشکل اپنی ہنسی روکی... مومن نے اجازت لے کر فون بند کردیا۔

"اب صفیہ کی بہو جیسی لڑکی نہ پسند کرلے..." محلے کی خالہ صفیہ کی بہو کا سراپا یاد کرکے خود کلامی کی... اس کا قد چھوٹا اور جسم فربہی مائل تھا۔

"لیکن امی! صفیہ خالہ کی بہو کا اخلاق کتنا اچھا ہے۔ گھر آئے کی کتنی اچھی خاطر مدارت کرتی ہے اور خالہ بھی خوش ہیں۔" زمر نے لقمہ دیا۔

"ہاں یہ تو ہے... ارے بھولنا نہیں تھا وظیفے کے

"دوران.... اب شروع سے پڑھو۔"

پیاری زمر نے بیاہ کر پردیس چلے جانا تھا.... یہ سوچ سوچ کر دن میں دو، تین مرتبہ تو امی روتی تھیں۔ لیکن چھپ چھپ کر.... ہائے یہ رسم دنیا....

☆ ☆ ☆

"تمہاری ماں کو لڑکی ملی کہ نہیں؟" پتا نہیں بیٹھے بیٹھے ابا کے دماغ میں کیا آئی کہ اچانک یہ سوال داغ دیا اور وہ جو عزوہ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا، چونک گیا.... اسے لگا ابا اس کی سوچ پڑھ رہے ہیں.... اس نے اپنے تاثرات چھپانے کے لیے فوراً" چائے کا گھونٹ بھرا۔

"ابھی تو نہیں ابا...." ٹھاٹھیں مارتے سمندر کو دیکھ کر اپنی حیرت چھپائی۔

"ہوں.... ماں سے کہنا کوئی خاندانی لڑکی لائے.... اکلوتے بیٹے ہو تم اس کے۔ حسن آرا کی بہو جیسی نہ لے آئے.... جو جہیز تو بہت لے آئی پر تمیز رتی برابر نہیں...."

"اچھا تو حسنہ جی کے بارے میں سوچا جا رہا تھا۔ مومن نے لوہا گرم دیکھ کر ہتھوڑا اٹھایا۔

"جی.... جیسے آپ کی بہو.... آپ کا بیٹا بھی تو اکلوتا ہے نا۔"

"ارے نہیں نہیں.... میری بہو تو بہت اچھی ہے۔ چراغ لے کے بھی ڈھونڈنے سے نہ ملتی مجھے۔ بس دونوں بہشتی بہنوں کی مہربانی تھی۔" ابا تو جیسے کسی اور ہی رو میں بہہ رہے تھے۔

"لیکن جیسا آپ نے تعارف کرایا تھا اپنی بہو کا....

مجھے تو وہ بہت خرانٹ اور چالاک لگی تھیں۔" مومن نے ایک اور ضرب لگائی۔

"میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ تو بہت سلجھی ہوئی، دھیمے مزاج کی بچی ہے۔ بس ایک غلطی کی اس نے جو میرے منع کرنے کے باوجود اپنی ماں سے ملنے چل دی۔ ورنہ اس کے علاوہ تو تمام عمر اس نے بیٹی سے بڑھ کر خدمت کی۔" ابا واقعی کچھ بدلے بدلے لگ رہے تھے اور اداس بھی۔

"پھر بھی یہ فاش غلطی تو کر دی نا.... اب بھگتیں خمیازہ۔" مومن جیسے ان کے اندر کے محبت کرنے والے ابا کو جگانے لگا تھا۔

"بچے تو غلطی کرتے ہیں اور بڑے معاف کرتے ہیں.... بس بچے مجھے اب لاہور کی فلائٹ پر بٹھا آؤ۔ بہت رہ لیا گھر سے دور.... اور تم بہت نیک بچے ہو، کسی نیک عورت کی اولاد ہو۔ اللہ تمہیں اس نیکی کی جزا دے۔" ابا کچھ زیادہ ہی بجھے بجھے تھے۔ موجو سے بھی دو تین دن سے خوش اخلاقی سے پیش آرہے تھے۔

"ایسا کیا ہو گیا ابا! جو اچانک ہی جانے کی ٹھان لی۔ آپ کو تو ہمیشہ میرے پاس رہنا تھا۔ اتنی جلدی راستہ بدل لیا۔"

"اپنا گھر اپنا ہوتا ہے بچے، کہیں اور مروں گا تو میرا بیٹا کس کس کو صفائیاں دیتا رہے گا۔ اب ایسا بڑا بھی گناہ نہیں کر دیا انہوں نے کہ اتنی بڑی سزا ان کو ملے۔" سمندر دیکھ کر ابا کو موت یاد آنے لگی۔ حیرت تھی۔

ابھی تو آپ جوان ہیں.... مرنے کی باتیں کس لیے.... "مومن بھی تھوڑا ٹھٹکا۔

"مرنے کا تعلق عمر سے تھوڑی ہوتا ہے۔" گہری اداسی۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ موجو نے تو کچھ نہیں کہا۔" مومن واقعی پریشان ہوا.... وہ طنطنہ جو ابا" کی شخصیت کا خاصا تھا۔ اب کہیں نہیں تھا۔

"سب ٹھیک ہے بیٹا! تم بہت اچھے ہو۔ مجھے یہاں کوئی تنگی نہیں، پر اب جانا ہے۔" ڈوبتے سورج کو بڑی

گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"اچھا ابھی رک جائیں۔ اگلے ہفتے دونوں ساتھ جائیں گے۔" آج اتوار تھا۔ وہ ابا کو سی سائیڈ گھمانے لایا تھا۔ مگر وہ بجائے خوش ہونے کے اداس ہو گئے تھے۔ شاید گھر والوں کے لیے اداس ہو گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

زمر نے مومن کے بتائے ہوئے ایڈریس پہ جا کر گاڑی روکی۔

"دعا کرو لڑکی سیدھی میرے دل میں اُتر جائے۔" دورانِ سفر امی چوتھی بار یہی جملہ دہرا چکی تھیں۔ زمر اور کشف نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"امی یاد رہے! ہم وہاں تعزیت کے لیے جا رہے ہیں۔ رشتے کی کوئی بات نہیں کرنی۔ بھائی نے سختی سے تاکید کی ہے۔" زمر نے گاڑی سے نکلنے سے پہلے ماں کو یاد دہانی کرائی۔ جس پہ وہ تھوڑا ناراض بھی ہو گئیں۔

"ہاں ہاں پتا ہے مجھے، چھچھو۔" زمر نے پھر کشف کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے اطلاعی گھنٹی بجادی۔

"جی میں مومن کی والدہ ہوں۔ حسیب صاحب کی بیگم سے ملنا ہے۔" شاید ان کی کام والی نے دروازہ کھولا تھا ان کو وہیں چھوڑ کر وہ اندر بتانے گئی پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد بھاگی بھاگی آئی۔

"آیئے جی۔ اندر آیئے۔" ابھی وہ لان میں ہی تھیں کہ عزوہ بھی پہنچ گئی۔

"السلام علیکم۔" جینز موڑ کر گھٹنوں تک چڑھائے، وائٹ ٹی شرٹ پہنے۔ سیدھی سلکی بال کیچر میں قید کیے ہوئے، لیکن پھر بھی دونوں طرف سے نکلتی لٹیں چہرے کو ڈھانپے ہوئے۔ امی کو پہلی نظر میں ہی عزوہ کا حلیہ تھوڑا سا عجیب لگا۔ ذرا غور کرنے پر پتا چلا کہ کپڑے کہیں کہیں سے گیلے ہیں۔ اور ہاتھ پاؤں بھی، ہاں لیکن اس کے ملنے کا انداز اچھا لگا۔ بجائے ہاتھ ملانے کے وہ گلے ملی۔

"آپ پلیز یہاں بیٹھیے، میں ممی کو جگاتی ہوں۔ نماز پڑھ کر سو گئی ہیں۔" ان کو سٹنگ روم میں بٹھا کر وہ جانے لگی۔

"ارے بیٹا۔ اگر سو رہی ہیں تو نہ جگاؤ۔" فوراً اسے روکنا چاہا۔

"نہیں آنٹی! عصر کے لیے اٹھنا تو ہے ہی۔ پلیز آرام سے بیٹھیے۔" اتنا کہہ کر وہ چلی گئی۔

اب یہ تینوں سٹنگ روم کا جائزہ لینے لگیں۔ ہر چیز نفاست سے سجائی گئی تھی۔ نہ ہی ڈیکوریشن پیسز سے بھرا ہوا تھا۔ اور نہ ہی بالکل خالی تھا۔ سرمئی اور سبز رنگ کا امتزاج ہر چیز میں نمایاں تھا۔ اور سب سے نمایاں سامنے والی دیوار پر لگی وہ تصویر تھی جس میں عزوہ کو گولڈ میڈل مل رہا تھا۔ وہ تینوں ہی متاثر لگ رہی تھیں۔

"شاید یہی لڑکی ہے۔" کشف نے سرگوشی کی۔

"مجھے تو اچھی لگ رہی ہے۔ گولڈ میڈلسٹ ہے۔" زمر نے تو گویا گولڈ میڈل کی بنیاد پر اسے پاس کر دیا۔ امی البتہ خاموش تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ امی سے کچھ پوچھتیں، وہ دونوں ماں بیٹی آ گئیں۔

"السلام علیکم۔ کیسی ہیں آپ۔" وہ آتے ہی گرم جوشی سے تینوں سے گلے ملیں۔

"مومن بہت اچھا بچہ ہے۔ ہم تو اس کے بہت ممنون ہیں ورنہ ایسے لوگ کہاں ہوتے ہیں آج کل۔" مومن کی تعریف سن کر ہر ماں کی طرح اس کی امی بھی فخر محسوس کرنے لگیں۔

"جی ماشاء اللہ۔ اللہ کا انعام ہے میرا بیٹا۔ اس کی ہر عادت ہی بے مثال ہے۔" آنکھوں میں پیار بھر کر وہ مومن کا ذکر کر رہی تھیں۔

"ماشاء اللہ۔ ارے عزوہ بیٹا۔ اپنا حلیہ تو چینج کرو بچے۔" یک دم عزوہ کی طرف دھیان دیا۔ عزوہ جو اخلاق نبھاتے زمر اور کشف سے حال چال پوچھ رہی تھی، اپنا حلیہ یاد آتے ہی کھڑی ہو گئی۔

"جی ممی۔"

"اصل میں اس کو کام والی کے ہاتھ کے دُھلے کپڑے نہیں پسند۔ تو چھٹی والے دن اپنے کپڑے خود دھوتی ہے۔ ابھی بھی کپڑے ہی دھو رہی تھی۔" عزوہ کی ممی نے اس کے اس گیلے حلیے کی وضاحت کی۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے ورنہ آج کل کی بچیاں تو

ہل کے پانی بھی نہیں پیتیں" بات کرتے اپنی بیٹیوں کو افسوس بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ دونوں جزبز ہوئیں۔

"آپ کی والدہ کا سنا..... بہت افسوس ہوا۔" اب وہ رسمی بات چیت میں تعزیت کرنے لگیں۔

تھوڑی دیر کے بعد کام والی لڑکی ٹرالی گھسیٹتی اندر لے آئی اور پیچھے پیچھے عزوہ بھی..... اب اس نے پیچ کلر کا کرتا ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ گیلے بالوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ نہا کر آئی ہے۔ اس کو دیکھتے ہی امی کو ایسا لگا جیسے یہی تو تھی، جس کے لیے ماری ماری پھر رہی تھیں۔ لڑکی دل میں اتر چکی تھی۔ سو موڈ بھی کافی خوش گوار ہو گیا تھا۔ تقریباً" دو گھنٹے کی نشست میں ٹھیک ٹھاک جان پہچان ہو چکی تھی۔

"زمر کی شادی ہے دو ہفتے بعد..... آپ سب کو آنا ہے۔" نکلتے نکلتے شادی کی دعوت بھی دے ڈالی۔ زمر اور کشف بھی بہت خوش تھیں۔

☼ ☼ ☼

"مومن! لڑکی تو بہت پیاری ہے..... بڑی پسند آئی مجھے اور لوگ بھی بہت اچھے ہیں۔ اس کی ماں بہت ہی خوش اخلاق اور سلجھی ہوئی خاتون ہیں۔" امی عزوہ اور اس کی ماں کی تعریف میں رطب اللسان تھیں۔

"اور پتا ہے، کپڑے خود دھوتی ہے۔ گولڈ میڈلسٹ ہے۔" مزید گویا ہوئیں۔

"تو..... کپڑے دھونے کے لیے کون سے گولڈ میڈل کی ضرورت ہوتی ہے' ہماری کبریٰ بھی تو اتنے اچھے کپڑے دھوتی ہے حالانکہ اس کے پاس کوئی گولڈ میڈل بھی نہیں۔" زمر نے تسبیح چھوڑ کر لقمہ دیا۔

"باتیں سن لو اپنی بہنوں کی..... ان میں ان سے کوئی نہیں جیت سکتا۔"

"چھوڑیں امی.....! مہمان ہے اب بس دو ہفتوں کی۔" ہمیشہ والی محبت سے اپنی بہن کو خوش گوار زندگی کی دعا دی۔

"اب کارڈ دے آیئے گا شادی کا....." امی کو تاکید کی۔

"منہ زبانی تو میں دعوت دے آئی ہوں۔ تم آؤ گے تو کارڈ بھی دے آئیں گے۔" مومن بھی بے حد خوش تھا۔ ممنون اور مشکوک انداز والی لڑکی آنکھوں میں اتری اور دل میں سما گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اور پھر وہ وعدے کے عین مطابق چند دنوں بعد ہی ابا کو لے آیا۔ پہلے وہ انہیں اپنے گھر لے گیا جہاں ان کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ پارک والے سنکی بابا کی حیثیت سے نہیں بلکہ عزوہ کے دادا کی حیثیت سے اور ابا اپنی اس آؤ بھگت کے پیچھے موجود وجہ سے بالکل بے خبر تھے۔ انہیں تو بس گھر جانے کی جلدی تھی لہٰذا کھانے سے فارغ ہو کر وہ سب ہی ابا کو گھر چھوڑنے گئے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی ابا کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں سب سے پہلے بیٹے نے گلے سے لگایا۔

"تھینک یو ابا!" ناراضی ختم کر کے ابا کے واپس آجانے پر بہت ممنون تھے۔

"مجھے معاف کر دیں ابا! میں نے آپ کا بہت دل دکھایا' آپ کی نافرمانی کی۔" ابا نے سمیعہ کے سر پر ہاتھ رکھا تو بھل بھل روتے وہ اپنے گناہ کی معافی مانگنے لگیں۔

"نہیں میری بچی! معافی تو مجھے مانگنی چاہیے۔ میں نے تمہیں اتنے سال ایسے جرم کی سزا دی جو تم نے کیا ہی نہیں تھا۔"

ابا اور سمیعہ کے آنسوؤں میں سارے گلے شکوے بہہ گئے۔ عزوہ بہرحال ابا سے خفا تھی۔

"آنا تو تھا ہی ابا۔ کیا تھا جو میرے ساتھ آجاتے۔"

"تو تم مجھے اٹھوا کے لے آتیں۔ بس دعوے ہی تھے تمہارے۔" ادھر حسن بھی آن لائن آگیا۔

"ابا! آپ کے غم میں میرا ایچ بی (HB) کم ہو گیا ہے۔ اب پتا نہیں کتنا عرصہ لگے پورا ہونے میں۔" سب ہنس رہے تھے۔

"بہت شکریہ مومن بیٹا۔۔۔ ہم تمہارا احسان نہیں اتار سکتے۔" حسیب صاحب نے ایک بار پھر مومن کا شکریہ ادا کیا۔

"آپ مجھے شرمندہ کررہے ہیں سر۔"

"مجھے خوشی ہوگی اگر تم مجھے سر کے بجائے انکل کہو گے تو۔" انہوں نے خود ہی اس کی مشکل آسان کردی۔

"اپنے ابا کے کل ہی سارے ٹیسٹ کرواکر تسلی کرلیں کہ سارے پرزے پورے ہیں نا۔" عزوہ اسے چائے کی پیالی پکڑا رہی تھی جب مومن نے سرگوشی کی۔ وہ اس کی بات کی تہہ تک پہنچ کر مسکرانے لگی۔

"خوب یاد دلایا۔ تھینک یو۔ کل ہی ڈاکٹر سے اپائنمنٹ لیتی ہوں۔ بھئی کیا بھروسا آپ کا۔" وہ بھی بے تکلفانہ انداز میں جواب دیتی اس کو مسکرانے پہ مجبور کرگئی۔ اس کی حسن سے بھی ہیلو ہائے ہوئی۔ کافی خوش اخلاق لڑکا تھا وہ۔ حسیب صاحب سے بات کرتے ہوئے اس نے بلا ارادہ گردن موڑ کر عزوہ کو دیکھا جو کشف اور زمر سے بات کرتے ہوئے کسی بات پر مسکرا رہی تھی۔

"تم جو مسکراتے ہو۔۔۔ اچھا لگتا ہے۔۔۔"

کسی زمانے میں پڑھی ایک نظم کا پہلا مصرعہ یوں ہی ذہن میں آگیا۔ کشف کے دیکھنے پر اس نے فوراً نظر ہٹائی۔ امی نے شادی کا کارڈ دیا اور سب کو شادی میں شرکت کی تاکید کی۔۔۔ ابا اپنے گھر واپس پہنچ گئے تھے اور ایسا تب ہی ممکن ہوا جب انا کی دیوار کو نیست و نابود کیا۔ یہ منظر دیکھ کر ہیپی اینڈنگ والا تاثر آرہا تھا' لیکن درحقیقت کہانی تو اب شروع ہوئی تھی۔



ابا اور سمیعہ نے تو ان کی دعوت بسروچشم قبول کی تھی' لیکن عزوہ کا خیال تھا کہ اگر انہوں نے مروتاً سب کو دعوت دے دی ہے تو یہ کہاں لکھا ہے کہ سب ہی جائیں اور حسیب صاحب' ہمیشہ کی طرح اس کے ہم خیال تھے' مگر جب وہاں پہنچنے پر ابا اور سمیعہ کو توقع سے زیادہ ناراضی کا سامنا کرنا پڑا تو اس سے پہلے کہ سمیعہ کچھ بہانہ گھڑتیں' ابا نے عزوہ کے خیالات من و عن میزبانوں کے گوش گزار کردیے جس سے وہ اور خفا ہوگئے۔ سو معذرت اور کل کے فنکشن میں ان کی موجودگی کے وعدے کے بعد بات ٹلی اور یہی وجہ تھی کہ بارات کے فنکشن میں عزوہ نہ چاہتے ہوئے بھی موجود تھی۔ ممی نے بہت زور دیا تھا کہ وہ اپنا نیٹ کا فراک پہنے جو ذرا فینسی تھا' لیکن وہ تو عزوہ تھی' بقول اس کے اسے بیگانی شادی میں عبداللہ بننے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ سو وہ اپنا بے حد سمپل بلیک شیفون کا ڈریس پہن کر آئی تھی۔ جس کے گلے اور آستین پر کٹ ورک تھا۔ وہ اتنی سادگی میں بھی مومن کو محفل پر چھائی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ کتنی ہی بار چور نظروں سے اسے بے زار سی شکل بنائے دیکھ چکا تھا۔ موقع ملتے ہی اس کے پاس جا پہنچا۔

"آپ بور ہورہی ہیں غالباً؟"

"بالکل بھی نہیں۔ ایکچوئلی میں فنکشنز کو ایسے ہی اٹینڈ کرتی ہوں۔"

وہ اس کے ساتھ والی کرسی پہ بیٹھ گیا۔ "پھر تو مجھے آنٹی کو داد دینی پڑے گی۔۔۔ وہ آپ سے زیادہ سوشل ہیں۔" اس نے وہاں اشارہ کیا جہاں سمیعہ اس کی رشتہ دار خواتین کے ساتھ گپ شپ میں مصروف تھیں۔

"سچ کہوں تو مجھے بھی آج ہی پتا چلا ہے کہ ممی اتنی سوشل ہیں۔"

وہ جب سے یہاں آئی تھی' حیران ہورہی تھی۔ پہلے تو اس کی آمد پہ اتنی خوشی کا اظہار کیا گیا جیسے وہ تقریب کی چیف گیسٹ ہو۔ بس تالیاں بجانا رہ گئیں تھیں۔ پھر ممی اور ابا تو ایسے گھوم پھر رہے تھے جیسے ان کے گھر کی تقریب ہو اور اب تو ڈیڈی بھی کسی صاحب کے ساتھ گہرے مراسم جوڑے بیٹھے تھے۔

"آپ لوگ یہاں بیٹھے ہیں۔ اسٹیج پہ آئیں' فوٹو شوٹ شروع ہوچکا ہے۔" کشف بھاگی بھاگی آئی اور

عزوہ کے لاکھ نہ نہ کرنے پر گھسیٹ کے لے گئی۔ عزوہ اس عجیب سی بے تکلفی سے بوکھلا سی گئی۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑا کر ممی کو ڈھونڈا جو کسی اور خاتون سے باتوں میں اتنی محو تھیں کہ وہ بھول چکی تھیں کہ وہ ایک بے زار بیٹی کو بھی ساتھ لائی تھیں۔ مومن اس صورت حال کو سمجھ کر پہلے تو مسکراتا رہا پھر اس کے قریب آکے اس کی مشکل آسان کی۔

"جائیے اپنے کمفرٹ زون میں جاکر بیٹھ جائیے۔"

"تھینک یو۔" وہ کشف کے ہاتھ میں دبا اپنا ہاتھ بمشکل چھڑا کر اسٹیج سے اتر آئی۔ مومن کی نظروں نے تب تک اس کا تعاقب کیا جب تک وہ بیٹھ نہیں گئی۔

"سیاہ بادلوں میں چمکتا چاند..." اس کے سراپے کے لیے اس سے بہتر جملہ اس کے ذہن میں نہیں آیا... رات سونے سے پہلے اس کے ذہن میں آخری خیال یہی آیا تھا۔



اور پھر چند دنوں کے بعد ہی ان کی محبتوں اور نوازشوں کا عقدہ کھل گیا۔ جس کو سنتے ہی عزوہ تو پھٹ ہی پڑی۔

"بہت بے لوث بچہ ہے' کتنی پرخلوص فیملی ہے' ایسے لوگوں کی وجہ سے ہی تو دنیا قائم ہے... وغیرہ وغیرہ... دیکھ لیا خلوص...؟" وقتاً "فوقتاً" دیے گئے گھر والوں کے ریمارکس دہرا رہی تھی۔

"میں ہمیشہ سے کہتی تھی۔ کون ہے جو آج کل جو بنا مفاد کے نیکی کرے' لیکن نہیں' میری بات سنتا کون تھا ۔فوراً" انکار کریں انہیں۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ جب اس کی والدہ ہم سے ملی ہوں تو انہیں ہمارا رکھ رکھاؤ اچھا لگا ہو۔ بہو تو ڈھونڈ ہی رہی تھیں۔ تم پسند آئی ہو اور رشتہ ڈال دیا ہو۔ مومن کا ابا کو گھر رکھنے میں کیا مفاد تھا بھلا...؟ یوں ہی شکی ہو تم۔" ممی نے تو فوراً" اس کے خیالات کو رد کیا۔

"اور ویسے بھی جب وہ مجھے گھر لے کر گیا تھا تب تک تو تم سے ملا بھی نہیں تھا۔" ابا بھی بولے۔

"تو اور کیا۔" ممی نے پھر لقمہ دیا۔

"اور جو لوگ آپ کو جانتے ہیں انہیں یہ بھی پتا ہے کہ آپ اتنے باکمال ہیں کہ کوئی آپ سے نہ بھی پوچھے تو آپ اپنا تعارف تفصیل سے کرواتے ہیں اور آپ اپنی پوتی کے گولڈ میڈل ہونے اور سینہ چوڑا کر کے کمپنی اور سیلری کا تو ضرور ہی بتاتے ہیں... کیا آپ نے مومن کو نہیں بتایا تھا اس کے گھر جانے سے پہلے۔" ممی اور ڈیڈی کو دیکھ کر پھر ابا سے بولی تو وہ ذرا سوچ میں پڑ گئے۔

"بتایا تو تھا۔ اب یہ یاد نہیں کہ گھر جانے سے پہلے بتایا تھا یا گھر جانے کے بعد۔" دھیمی آواز میں کچھ یاد کرتے ہوئے بولے۔

"محترم ابا حضور... وہ آپ کو گھر ہی تب ہی لے کر گیا تھا جب آپ نے بتایا تھا۔ بس منع کر دیں آپ لوگ ڈیڈی۔" اس نے ڈیڈی کو دیکھ کر کہا۔

"بیٹا! آپ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو گا۔ مجھے تو فیملی اور لڑکا بہت اچھے لگے' لیکن آپ اب نئی بات بتا رہی ہیں۔" حسیب صاحب بھی ذرا فکر میں پڑ گئے تھے۔

"میں تو سوچ رہی ہوں' منع کیسے کروں گی؟" ممی پر سوچ انداز میں گویا ہوئیں۔

"سوچنے کی کیا بات ہے۔ کہہ دیں' کہیں اور بھی بات چل رہی تھی... وہ فائنل ہو گیا۔" عزوہ جلدی سے بولی۔

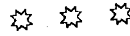
"کیسے کہہ دوں' انہوں نے رشتہ مانگنے سے پہلے پوچھ لیا تھا کہ کہیں بات تو نہیں چل رہی۔"

"تو کہہ دیں ہمیں آپ کا لڑکا پسند نہیں۔" اب وہ ذرا اکتا کر بولی۔

"اب ایسی بھی بات نہیں۔ لڑکا تو پسند ہے۔" ابا منمنائے۔

"میری شادی کی بات چل رہی ہے نا۔ تو پسند بھی میری ہونی چاہیے۔ ہے نا۔" سب کو وہیں چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ممی! آج بریانی کھانے کا دل کررہا ہے۔ پلیز بنادیں۔" اتنا کہہ کر سیڑھیاں چڑھ گئی۔ وہ سب ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔



پتھر جیسی نظر آنے والی عزوہ حسیب ہمیشہ سے پتھر نہیں تھی۔ زیادہ پرانی بات نہیں جب وہ نازک گلابوں کی طرح مہکا کرتی تھی۔ گولڈ میڈل کیا ملا' دنیا قدموں میں محسوس ہونے لگی۔ اب اسے آگے ہی آگے جانا تھا۔ بڑی بڑی کمپنیوں کی طرف سے جاب آفر ہونے لگی۔

خوش نصیب تھی۔ اسے جاب کے سلسلے میں کوئی کوشش نہیں کرنا پڑی تھی۔ اور پھر تیمور انصر زندگی میں آیا۔ تو گویا زندگی جیسے بدل ہی گئی۔ دل کو بھانے والا پہلا مرد تیمور انصر اس کی کمپنی کا ایم ڈی تھا۔ اس کو دیکھنا' بات کرنا تو پہلے دن سے ہی دل کو اچھا لگا تھا۔ لیکن جب اس نے اظہار محبت کیا تو عزوہ نے حقیقی معنوں میں جانا کہ ہواؤں میں اڑنا کسے کہتے ہیں۔ تیمور کے ساتھ گزارا ہوا وقت دن کا بہترین وقت لگنے لگا۔ چاہا جانا کسے اچھا نہیں لگتا۔ لیکن تیمور کی چاہت میں وہ وارفتگی تھی کہ عزوہ کو محبت سے ہی محبت ہونے لگی۔

اس سے پہلے کہ وہ اپنی ماں پر اپنے دل کا حال کھولتی' خوابوں کا محل زمین بوس ہوگیا۔ ہواؤں میں اڑتا وجود پٹخنیاں کھاتا پاتال میں جاگرا۔ محبت کے سارے رنگ ایک لمحے نے نوچ لیے۔

وہ بھی بہت سارے دنوں جیسا ایک دن تھا۔ ہمیشہ کی طرح اپنے آفس وہ کسی آدمی سے خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ عزوہ کا تعارف اسی گرم جوشی اور محبت سے کروایا جس پر عزوہ اترایا کرتی تھی۔

وہ تیمور کا بچپن کا دوست تھا سو بے تکلف بھی تھا' اسے زیادہ دیر وہاں بیٹھنا مناسب نہ لگا سو وہ معذرت کرکے کمرے سے نکل آئی۔ لیکن اپنے آفس میں داخل ہونے سے پہلے ہی خیال آیا کہ موبائل تو تیمور کی میز پر ہی چھوڑ آئی تھی فوراً" پلٹی۔

"یہ کیا یار! تمہیں تو ہمیشہ سے گھریلو اور سادہ لڑکیاں پسند تھیں۔ لیکن یہ لڑکی جس سے تم شادی کا ارادہ کررہے ہو یہ تو تمہارے آئیڈیل کے بالکل الٹ ہے۔"

دروازہ کھولنے کے لیے بڑھا عزوہ کا ہاتھ رک گیا۔ وہ تیمور کا جواب سننا چاہتی تھی۔

"ٹھیک کہا تم نے ایسی لڑکی کبھی بھی میرا آئیڈیل نہیں رہی۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ یہ میرے آئیڈیل سے بہتر ہے۔" عزوہ اپنی جگہ پر مغرور سی ہوئی۔

"وہ کیسے؟" دوست متجسس ہوا اور دروازے کے باہر کھڑی وہ بھی۔

"گولڈ میڈلسٹ ہے یار۔ سوچو' اگلے چند سالوں میں کہاں پہنچے گی۔" عزوہ لڑکھڑائی۔ "تم تو جانتے ہو' بچپن میں ایک ایک نوالے کو ترسا ہوں۔ دن رات ایک کرکے یہ مقام پایا ہے۔ لیکن اب کامیابی کی سیڑھی پر ایک جست میں اوپر پہنچنا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے یہ لڑکی بیسٹ ہے۔"

عزوہ کو لگا کہ آفس کی کئی منزلہ عمارت اس کے سر پر دھڑام سے گر پڑی ہے۔ اور اس کے ملبے تلے وہ خود ملبہ ہوگئی ہے۔

"تو تمہیں اس لڑکی سے محبت نہیں؟" اس سوال کا جواب سننے کی چاہ نہیں تھی لیکن ہزار جتن کرکے بھی وہ اپنے قدم اٹھا نہ پائی۔

"محبت؟ وہ کیا ہوتی ہے؟" تیمور کا جملہ اور پھر دونوں کا قہقہہ اسے سنگسار کرنے لگا۔

"کمینہ تو تو بچپن سے ہے۔" قہقہوں کے ہتھوڑے اس کی سماعت کو ریزہ ریزہ کرنے لگے۔ اسے موبائل لینے کی بھی چاہ نہ رہی۔ وہ پاؤں کے پتھر گھسیٹتی پلٹ گئی۔ آج بھی جب ان قہقہوں کی گونج یاد آتی تو آنکھوں میں مرچیں سی لگنے لگتی

تھیں۔
اسے اپنے ملبے کو اکٹھا کرنے اور پھر سے کھڑا کرنے میں تین سال لگے تھے۔ اور اب مومن ایاز اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ایک دوسرا سیلف میڈ انسان عزوہ نے طے کرلیا تھا کہ اب اسے نہیں ٹوٹنا۔ کسی مرد کے ہاتھوں تو ہرگز نہیں۔ اسے مومن کو انکار کرنا ہی تھا۔ اسے ہر سیلف میڈ مرد کو انکار کرنا تھا۔

✡ ✡ ✡

"انہوں نے کہا ہے کہ عزوہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔۔۔ وہ اپنے کیریئر پر فوکس کرنا چاہتی ہے۔" سمیعہ کے فون کے بارے میں وہ مومن کو بتاتے ہوئے تھوڑی دکھی تھیں۔
"یہ کیا بات ہوئی امی! شادی کا کیریئر سے کیا تعلق؟" یہ بے تکا جواب مومن کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔
"اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے بہت مہذب طریقے سے انکار کردیا ہے۔" اب صاف صاف بات کی۔
"یعنی انکار ہی کردیا۔" صدمے سے چور آواز نے ماں کے دل کو دبوچ لیا۔
"تو کیا ہوا۔۔۔ رشتے تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔ اگر تم نے عزوہ کا نام نہ لیا ہوتا تو زمر کی سسرال میں بھی ایک دو لڑکیاں تھیں میری نظر میں۔ میں ابھی بات چلاتی ہوں۔ فکر کاہے کی۔"
ماں تھیں بیٹے کو تسلی دے رہی تھیں، لیکن بیٹے نے بنا کوئی تسلی وصول کیے فون بند کردیا۔ اب وہ ابا کا نمبر ڈائل کررہا تھا اور وہ بھی ابا تھے۔ اپنے منہ بولے بیٹے کا دکھ بھرا استفسار سن کر پانی کی طرح بہنے لگے اور عزوہ کے خدشات و خیالات بنا سینسر کیے مومن کو سنا دیے۔ صدمے سے چور مومن کی تو آواز بھی ڈوب گئی۔
"کیا آپ بھی ایسا سمجھتے ہیں ابا؟" بڑی مشکل سے پاتال سے اپنی آواز کھینچ کر بولنے کے قابل ہوا۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کی نیت پہ شک کیا جارہا ہے۔
"عزوہ ایسا سوچتی ہے' میں نہیں۔" ابا ذرا سا لڑکھڑائے۔
"وہ ایسا کیسے سوچ سکتی ہے۔۔۔ میں اس کی چند ہزار کی سیلری کے لالچ میں اس سے شادی کرنا چاہوں گا' حد ہے۔" وہ صدمے سے نکل ہی نہیں پارہا تھا۔
"چند ہزار تو نہیں۔۔۔ سوا لاکھ ہے۔" ابا منمنائے۔
"تو؟ میری سیلری اس سے دگنی ہے۔۔۔ اس کے علاوہ ہماری زمینیں ہیں۔۔۔ جائیداد ہے۔ آپ جانتے ہیں' روپے پیسے کی کمی نہیں ہے مجھے۔ اور اگر لڑکی سے زیادہ مجھے سیلری میں دلچسپی ہوتی تو میری کئی کولیگز ہیں جو مجھ سے بھی زیادہ سیلری لیتی ہیں۔۔۔ میں ان کو نہ پرپوز کردیتا۔" وہ طیش میں آکر بولتا چلا گیا۔ ابا بالکل خاموش تھے۔
"اگر آپ کوئی اور وجہ بتاتے تو میں پیچھے ہٹ جاتا' لیکن اب نہیں ابا!" پرعزم انداز میں بولتا صدمے کے اثر سے نکلتا محسوس ہورہا تھا۔
"کیا کرو گے تم؟" ابا ٹھٹکے۔
"میں اسے قائل کروں گا۔ اپنی آنسٹی اس پر ثابت کروں گا۔ اس کے خدشات دور کروں گا۔"
"مشکل ہے اسے اپنی دادی کی گھٹی ملی ہے۔۔۔ ناں کا مطلب ناں۔۔۔ ہاں میں بدلنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا ڈونلڈ ٹرمپ کا مسلمانوں کو افطار ڈنر دینا۔" ابا اس کی ہمت توڑ رہے تھے۔
"اس کی ناں بھی ہاں میں بدلے گی اور ٹرمپ بھی مسلمانوں کی عزت کرے گا اگر آپ' انکل اور آنٹی مجھے اجازت دیں تو۔۔۔ اگر آپ لوگوں کو مجھ پر کوئی اعتراض نہ ہو تو۔"
وہ ٹھہر ٹھہر کر مضبوط لہجے میں بولا تھا اور ابا کو تو وہ پہلے ہی پسند تھا۔ ابا نے سمیعہ اور حسیب سے بات کرکے مومن کا مدعا سنا دیا۔ مومن تو سب کو پسند تھا۔ اس سے بات کرکے عزوہ کے شکوک سے جو کانٹا دل میں گڑا تھا' وہ نکل گیا۔ انہوں نے بخوشی مومن کو عزوہ کو قائل کرنے کی اجازت دے دی اور ساتھ ہی یہ بھی

بتادیا کہ وہ عزوہ پر کوئی دباؤ نہیں ڈالیں گے' آخری فیصلہ بہرحال عزوہ کا ہی ہو گا۔

موجو چھٹیاں گزارنے اپنے گاؤں گیا تھا اور ابھی تک لوٹا نہیں تھا۔ مومن کو اس کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اپنے لیے چائے بنا کر مگ اٹھا تا وہ ٹیرس پر ہی لے آیا۔ ہلکے ہلکے بادلوں کی وجہ سے سمندر سے آتی ہوائیں کچھ ٹھنڈی محسوس ہو رہی تھیں۔ امی سے بات کرنے کے بعد اتنی پریشانی ہوئی کہ وہ چاہتے ہوئے بھی آفس نہ جاسکا' اسے اب عزوہ سے بات کرنا تھی لیکن اس سے پہلے اپنی خود کی ماں کو اعتماد میں لینا ضروری تھا۔

"کیوں... اب کیا کرو گے تم... منتیں... کرو گے؟" امی کو مزید کوئی لڑکی دیکھنے سے منع کیا تو وہ بھڑک اٹھیں۔

"نہیں... انتظار کروں گا۔" جواب دینے کے بعد اسے احساس ہوا کہ جواب کچھ عاشقانہ ہو گیا ہے۔ خود ہی مسکرا بھی دیا۔

لیکن امی بالکل نہیں مسکرائیں۔ "کتنا؟"

"پتا نہیں... لیکن امی عزوہ سے دل نہیں ہٹتا۔ اس سے زیادہ خوب صورت لڑکیاں دیکھی ہیں میں نے... زیادہ قابل' پراعتماد' لیکن امی جیسا آپ کہتی ہیں ناکہ دل میں کھب جائے کوئی جیسے... وہ ایسے ہی میرے دل میں کھب گئی ہے۔" وہ خاموش ہوا تو امی بھی کچھ نہیں بولیں۔ اپنے ہیرے جیسے بیٹے کے لیے لڑکیاں دیکھتے ہوئے ناک پہ مکھی نہ بیٹھنے دینے والی ہستی اب یہ کیسے برداشت کرے کہ اس کا بیٹا کسی اور کے انتظار کا روگ لگائے کنوارا بیٹھا رہے۔

"لیکن اگر آپ کا دل نہیں مانتا تو کوئی بات نہیں... جہاں دل کرتا ہے' میری شادی طے کر دیں۔" ماں کی خاموشی کو محسوس کر کے ہمیشہ کی طرح فرماں بردار بیٹا بن گیا اور ماں کو یوں لگا جیسے ان کے کلیجے پر کسی نے گھونسا دے مارا ہو۔

"نہیں میرے شہزادے... تمہاری خوشی پہ میں قربان... لیکن میرے بچے اگر وہ نہ ملے تو روگ نہ لگا لینا جان کو۔"

"ارے نہیں امی' اتنا پاگل نہیں ہوں۔ بس جب تک میں نہ کہوں آپ کوئی لڑکی وڑکی نہ دیکھیں اور ابا کے گھر ویسے ہی جائیں جیسے پہلے آنا جانا تھا۔ اس رشتے کے ہونے یا نہ ہونے سے تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑنا چاہیے۔" ماں سے بات کرنے کے بعد مطمئن ہو کر اب وہ عزوہ کا نمبر ملا رہا تھا۔ آرام دہ کرسی پر نیم دراز ہو کر پاؤں ٹیبل پر رکھ لیے۔ فون اٹھائے جانے کا انتظار کرتے ہوئے درختوں کو دیکھ رہا تھا جن کے پتے نہ جانے کس خوشی میں ناچ رہے تھے۔

"ہیلو... السلام علیکم..." عزوہ کی مدھر آواز کانوں سے ٹکرائی۔ رسمی دعا سلام کے بعد مدعا بیان کیا۔

"تو اب آپ نے تصدیق کے لیے فون کیا ہے یا وجہ جاننے کے لیے؟" عزوہ کا لہجہ ہمیشہ جیسا تھا... وہی ٹھہراؤ' وہی مضبوطی۔

"تصدیق بھی ہو چکی اور وجہ بھی جان چکا... اب تو فیصلے پر نظرثانی کی اپیل کے لیے رابطہ کیا ہے۔ مجھ پر لگے الزام بے بنیاد ہیں جج صاحب۔" حسیب انکل سے بات کے بعد وہ کافی مطمئن ہو چکا تھا۔ لہٰذا بڑے خوش گوار موڈ میں بات کر رہا تھا۔ اس کا انداز سن کر وہ بھی مسکرائی۔

"آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ میں آفس میں ہوں اور یہ میرے کام کا وقت ہے۔"

"غالباً" لنچ بریک ہوا کرتی ہے اس وقت..." "فوراً" اپنی کلائی جھٹک کر ٹائم دیکھا۔

"تو لنچ بریک کا مطلب لنچ کرنا ہوتا ہے... فون اٹینڈ کرنا نہیں..." سامنے رکھی ہری بھری پلیٹ میں سے کھیرے کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے بولی۔

"آپ جیسے جینیس لوگ تو ایک وقت میں چار چار کام کر سکتے ہیں۔ آپ کو کیسی دقت؟" اپنی تعریف سن کر ہلکا سا مسکرائی۔ آج موڈ بہت اچھا تھا شاید۔

"تمہاری چھوٹ دیے... مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ آپ نے میرے انکار کو انا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آپ جو خود کو بہت اعلا و ارفع سمجھتے ہیں۔۔۔ ایک لڑکی نے آپ کا پرپوزل ایکسیپٹ نہیں کیا تو آپ کی انا کو ٹھیس پہنچی ہے۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"ارے محترمہ! جس مقام پہ میں خود کو محسوس کر رہا ہوں' وہاں انا کا کوئی کام نہیں ہوتا۔"

"کیا مطلب؟" مومن کا فلسفہ اس کے سر کے اوپر سے گزر گیا۔

"مطلب یہ کہ میں اس بات کو ایسے دیکھتا ہوں کہ ایک لڑکی جس سے قدرت نے مجھے اتفاق سے ملوا دیا جو خود کو بہت اعلا و ارفع سمجھتی ہے اور جو کہ وہ ہے۔ میں اس لڑکی بلکہ مہان لڑکی کو کھونا نہیں چاہتا۔"

"ہوں۔۔۔ تو اس کے لیے آپ اب اس لڑکی کے گھر والوں کے ذریعے اس پہ دباؤ ڈال کر اس کا انکار اقرار میں بدلوانے کا سوچ رہے ہیں؟"

"ہرگز نہیں۔۔۔ میں اس لڑکی کو اپنے حق میں کنوینس کرنے کا سوچ رہا ہوں۔" اب قہقہہ لگا کر ہنسنے کی باری عزوہ کی تھی۔

"جیسے آپ کوئی پروڈکٹ ہوں اور خود کی خوبیاں مجھ پر ایسے بیان کریں گے کہ میں آپ کو خریدنے کے لیے تیار ہو جاؤں گی۔۔۔ ایسا آپ اس لیے کہہ رہے ہیں کیونکہ آپ مجھے جانتے نہیں۔۔۔ میں نے نو کہہ دیا تو کہہ دیا۔۔۔" قطعی لہجے میں بولتی وہ لنچ بھی انجوائے کر رہی تھی۔

"اور ایک اطلاع آپ کے لیے بھی ہے کہ اس معاملے میں میرا ریکارڈ بھی شاندار ہے۔ میں جہاں سے ریجیکٹ کیا جاتا ہوں وہاں بعد میں سر آنکھوں پہ بٹھایا جاتا ہوں۔۔۔ جیسے اپنے کالج کی فٹ بال ٹیم کے آڈیشنز کے لیے میں دوبار ریجیکٹ کیا گیا اور جب میں کالج سے پاس آؤٹ ہوا تو میں اسی ٹیم کا وائس کیپٹن تھا اور تو اور میری کمپنی نے مجھے پہلے ریجیکٹ کیا تھا اور اب میں یہاں بھی سینٹرل باڈی کا ممبر ہوں۔۔۔ سو ریجیکٹ کرنے کا شکریہ۔" مطمئن سے انداز میں اسے کھلا چیلنج کر رہا تھا۔

"لیکن مسٹر! میرے معاملے میں کسی بھول میں مت رہیے گا۔۔۔ میں اپنی زندگی کو بے حد سیریسلی ٹریٹ کرتی ہوں۔ ابا نے آپ کو منہ بولا بیٹا بنایا ہے آپ ان سے رشتہ ضرور نبھائیں لیکن میری درخواست ہے کہ میرے حوالے سے چھیڑے جانے والے ٹاپک کو کلوز ہی سمجھیں۔ لنچ بریک ختم ہو چکی ہے' مجھے جانا ہے بائے۔" اس کا جواب سنے بغیر فون رکھ دیا۔

"گڈ لک تو کہتی جاؤ۔" بڑبڑاتے ہوئے فون کان سے ہٹا لیا اور پتوں کو دیکھنے لگا جو ناچ چھوڑ کر اب دھمالیں ڈال رہے تھے۔



مومن نے آج تک محبت پر جتنی کتابیں پڑھی تھیں' سب میں محبت کی علامات وہی تھیں۔۔۔ لیکن وہ خود کو لاحق مرض کو محبت کا نام دینے سے کترا رہا تھا۔ سب جانتے بوجھتے بھی وہ محبت کی راہ پر چل کر عزوہ تک نہیں پہنچنا چاہتا تھا۔ اسے ایسے راستے کا انتخاب کرنا تھا جہاں سے واپسی بھی ممکن ہو سکے۔ کیونکہ وہ خود سے جڑے رشتوں حتیٰ کہ خود کو بھی کسی مشکل میں ڈالنے کا روادار نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ محبتوں کے راستے پر کوئی یوٹرن نہیں ہوا کرتا۔۔۔ لیکن وہ ابھی یہ نہیں جانتا تھا کہ راستوں کا انتخاب انسان کے اختیار میں کہاں ہوتا ہے۔

وہ ہمیشہ سے مہینے کے آخری ویک اینڈ پر گھر جایا کرتا تھا لیکن اب اسے ہر ویک اینڈ پر گھر جانا تھا۔ اور یہ اس کا نہیں بلکہ اس کے دل کا فیصلہ تھا۔ خوب نک سک سے تیار ہو کر آئینے کے سامنے اپنا آخری جائزہ لیتے ہوئے خوب سارا پرفیوم چھڑکا۔۔۔ اور کن اکھیوں سے موجو کو دیکھا جو کسی فرماں بردار بیوی کی طرح رگڑ رگڑ کر اس کے جوتے پالش کر رہا تھا اور کسی نک چڑھی نخریلی بیوی کی طرح منہ بنائے ساتھ ساتھ بڑبڑا بھی رہا تھا۔

"یہ کیا بھائی جان۔۔۔ کل تو میں آیا اور آج آپ نے جانے کی ٹھان لی۔ اس ہفتے نہ جائیں۔ اگلے ہفتے چلے

جائے گا۔" جوتا اس کے سامنے رکھ کر آخری کوشش کی کہ وہ نہ جائے۔

"دو دن کی ہی تو بات ہے۔ پیر کو صبح صبح تمہارے پاس ہوں گا۔۔۔ یار! زمر کے جانے سے امی اکیلی اور اداس ہیں اس لیے جا رہا ہوں۔" بہانہ گھڑتے ہوئے مومن کو خود پہ ترس بھی آیا۔ ابھی نہ جانے اس کم بخت محبت میں کتنے جھوٹ بولنے تھے، کتنے بہانے گھڑنے تھے اور محبت بھی وہ جسے مومن محبت کہتا ہی نہیں تھا۔ موجو نے بھی صبر شکر کر لیا۔ ابھی وہ نکلنے ہی والا تھا کہ ابا کی کال آ گئی۔ ریسیو کرنے کا بالکل موڈ نہیں تھا لیکن ریسیو کرنا ہی تھا کہ وہ عزہ کے دادا تھے۔

"کیا ہو رہا ہے برخوردار۔۔۔! بھول ہی گئے۔" ہیلو کے بعد ہی شکوہ۔

"کیسے بھول سکتا ہوں ابا۔۔۔ کہیے کیسی گزر رہی ہے؟" والٹ جیب میں رکھتا دروازے کی طرف بڑھا۔

"بور ہو رہا ہوں یار۔۔۔ عزہ اپنی کسی دوست کی شادی میں شرکت کے لیے اسلام آباد گئی ہے اور سمیعہ اور حسیب کسی کی عیادت کے لیے ہسپتال گئے ہیں۔ سوچا تم دفتر سے آ گئے ہو گے، تمہیں فون کر لوں۔" ابا کی بات سن کر سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ دروازہ کھولنے کے لیے بڑھنے والا ہاتھ سست ہوا۔

"اچھا۔ کب تک آئے گی واپس؟" کسی امید کے تحت پوچھا۔

"وہ تو سنڈے کو ہی آئے گی اب۔۔۔ الا بلا رسمیں تو تین چار دن چلتی ہیں۔"

اسی ست سے انداز میں چلتے ہوئے واپس صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ کچن میں کھڑے موجو نے حیرت سے دیکھا۔ ابا سے دو چار ادھر ادھر کی باتیں کر کے فون رکھ دیا۔ اب وہ گہری سوچ میں گم تھا۔ موجو مسلسل اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔۔۔ لیکن خاموشی سے۔

مومن یہی سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔۔۔ جی میں آئی کہ کیوں نہ اسلام آباد جایا جائے۔۔۔ تقریباً طے ہو چکا تو ایئر پورٹ فون کر کے اسلام آباد کی فلائیٹ کا ٹائم پوچھنے کے لیے موبائل پکڑا۔۔۔ لیکن نمبر ڈائل کرنے سے پہلے ہی ایک اور خیال نے دستک دی۔

"اسے متاثر کرنا ہے بیزار نہیں۔" سو موبائل رکھ دیا اور جوتے اتار کر موزے اتارنے لگا۔

"یہ لو موجو۔۔۔ کیا یاد کرو گے، نہیں جاتا۔" نہ جانے کا احسان موجو پہ کرتے ہوئے اونچی آواز سے بولا۔

"رہنے دیجیے بھائی جان۔۔۔ ہماری کیا اوقات۔۔۔ یہ تو اس کال نے کوئی منتر پھونکا ہے جس نے آپ کو روک لیا۔" بالکل ناراض بیویوں جیسا لہجہ۔ مومن قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"شکل سے بھولے لگتے ہو پر ہو نہیں۔۔۔ چلو کھانا لگاؤ میں کپڑے بدل کے آتا ہوں۔" اور موجو ایک دم خوش ہو گیا۔

"میں اڈی اڈی جاواں ہوا دے نال۔" کمرے میں جاتے موجو کی گنگناہٹ نے اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ دوڑا دی۔

اور پھر اگلا ویک اینڈ آتے آتے تو امی بھی بے حد اداس ہو چکی تھیں۔ کتنی ہی بار آنے کی تاکید کی تھی۔ ابھی تو زمر کو اپنے سسرالیوں کے ساتھ ڈنمارک گئے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے لیکن امی کو یوں لگ رہا تھا جیسے صدیوں سے زمر کی شکل نہیں دیکھی۔ اس کے علاوہ کشف کو بھی ڈرائیونگ سکول میں ایڈمیشن کے لیے فائل کرنا تھا دو اکیلی عورتوں کے لیے ڈرائیور رکھنے کا رسک وہ نہیں لے سکتا تھا۔۔۔ لہٰذا وہ اپنی ماں کی گود میں سر رکھے جیسے دو ہفتوں کی تھکن اتار رہا تھا اور آنے والے دنوں کے لیے زاد راہ اکٹھا کر رہا تھا۔ ماں کے لمس میں ولیوں جتنی طاقت ہوتی ہے۔ مشکلوں کو آسانی میں بدلنے کا آسان نسخہ ہے ماں کا کلیجہ ٹھنڈا رکھو۔۔۔ مومن کو بھی یقین تھا کہ اس کی ہر مشکل آسانی میں بدلے گی۔ کیونکہ اس کی ماں اس سے خوش تھی۔

اور وہ اگلے ہی دن اپنی مشکل کے در پر حاضری دینے نکل کھڑا ہوا۔۔۔ امی اور کشف بھی ساتھ چل دیں۔۔۔ سمیعہ کے انداز میں گرم جوشی اور شرمندگی ملی جلی

محسوس کی جاسکتی تھی۔۔۔ مومن کی امی کے ایک جملے نے انہیں اس مشکل سے نکال دیا۔ "بہن 'رشتے تو نصیبوں سے ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم ملنا جلنا چھوڑ دیں۔ اللہ ہمارے بچوں کے نصیب اچھے کرے۔ کیا خبر دونوں کے لیے ایک دوسرے سے بہتر جوڑ اللہ نے جوڑ رکھے ہوں۔" شرمندگی زائل ہوئی تو شکر گزاری ہر جذبے پر حاوی ہو گئی۔۔۔ مومن نے ادھر ادھر کچھ ڈھونڈنے میں ناکام ہو کر بالآخر پوچھ ہی لیا۔

"ابا نظر نہیں آرہے؟"

"دونوں دادا پوتی پہلے کھسر پھسر کرتے رہے۔ پھر نکل گئے ہیں کہیں۔۔۔ بنا بتائے۔ انہیں چھوڑو یہ جوس پیو۔" کیسے چھوڑ سکتا تھا' جوس کا گلاس اٹھا کر دوسرے ہاتھ سے ابا کا نمبر ملایا۔

"جی کہاں ہیں آپ؟" جوس کا گھونٹ بھرتے ہوئے استفسار کیا۔

"میں تو آپ سے ملنے آپ کے گھر آیا ہوں۔۔۔ لیکن آپ خود سیر سپاٹوں پہ نکلے ہوئے ہیں۔"

"چلیں ٹھیک ہے۔۔۔ میں دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔" جلدی سے جوس ختم کرنے لگا۔

"میں صرف آپ کو شاپنگ کروانے والی ہوں۔۔۔ آپ کے دوستوں کو نہیں۔۔۔ کس کو بلا لیا ہے؟" ابا نے فون بند کیا تو ڈرائیو کرتی عزہ نے ناک سکیڑ کر پوچھا۔

"اپنا مومن آیا ہوا ہے۔ اسی کو بلایا ہے۔" اس کے تاثرات دیکھے بغیر خوشی سے بتایا۔ ایک جھٹکے سے گاڑی رکی۔

"آپ نے مومن کو مال پہ بلایا ہے؟"

اسے جیسے اپنے کانوں پہ یقین نہیں آرہا تھا۔ بہت افسوس بھری نظروں سے ابا کو دیکھا جو اتنی معصوم شکل بنائے ہوئے تھے کہ جیسے انہوں نے کیا کیا ہے؟ ایمپوریم مال کی پارکنگ کے باہر ہی گاڑی روک دی۔

"جگہ ہے اندر۔۔۔ یہاں کیوں روک دی گاڑی؟" ابا نے اس کو دیکھا جو کسی شوفر کی طرح ناک کی سیدھ میں دیکھتی ابا کے اترنے کا انتظار کر رہی تھی۔

"کیونکہ آپ مومن کے ساتھ شاپنگ کر رہے ہیں۔۔۔ مجھے واپس جانا ہے۔"

"تم کیا مومن سے ڈرتی ہو؟"

"میں کیوں ڈرنے لگی؟"

"پھر بھاگ کیوں رہی ہو؟ انکار کر دیا تو کر دیا۔۔۔ تمہاری مرضی۔۔۔ اب کیا اس کا سامنا بھی نہیں کرو گی۔" ابا نے جیسے بالکل صحیح جگہ پہ ضرب لگائی تھی۔ وہ تھوڑی دیر خاموش رہی۔

"چلو واپس۔۔۔ مجھے بھی نہیں کرنی کوئی شاپنگ۔"

ابا نروٹھے پن سے بولتے بیٹھے رہے۔ تھوڑی دیر ابا کو دیکھتی کچھ سوچتی رہی پھر گاڑی اسٹارٹ کر کے پارکنگ ایریا کے اندر لے گئی۔ گاڑی پارک کر کے ابا کو دیکھا جو ہنوز منہ سجائے بیٹھے تھے۔

"آپ نے بھی کچھ لینا ہے یا میں اپنے لیے ہی شاپنگ کر لوں۔" گاڑی کا لاک کھول کر ابا کو دیکھے بغیر دھمکی آمیز انداز میں بولی۔

"بھول ہے تمہاری کہ تمہارے پیسے بچ جائیں گے۔" اس کی دھمکی کا جواب دیتے گاڑی سے اتر آئے۔

ابھی ونڈو شاپنگ ہی جاری تھی کہ مومن بھی پہنچ گیا۔ ہلکے آسمانی رنگ کے شلوار قمیص میں ملبوس فریش سی عزہ سیدھی دل میں اتر رہی تھی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی نظریں ہٹا نہیں پا رہا تھا۔ کپڑوں کے ہینگرز الٹاتی پلٹاتی 'ابا کے ساتھ کرتے لگا کر چیک کرتی بہت اپنی سی لگ رہی تھی۔

"مان جاؤ یار۔۔۔" دل ہی دل میں اس بے پرواہ لڑکی سے مخاطب ہوا جو ابا سے بحث میں مشغول تھی۔

"سفید داڑھی کے ساتھ میرون کرتا کتنا فضول لگے گا۔ آپ ہی سمجھائیں ابا کو۔" ابا سے لڑتے لڑتے مومن کو مخاطب کیا۔

"دیکھو مومن! سارے بابوں والے رنگ چن رہی ہے۔" ابا نے بھی شکوہ کیا۔

"مان کیوں نہیں جاتے آپ کہ آپ بابے ہی ہیں اب۔" اب ایک رائل بلیو کلر کا کرتا ابا کے ہاتھ سے

لے کر واپس رکھ رہی تھی۔
"اب اتنے بھی بابے نہیں ہیں۔۔۔ یہ کلر تو چل ہی جائے گا۔" ایک فان کلر کا کرتا نکال کر مومن نے عزوہ کے سامنے کیا۔
"کچھ بہتر ہے۔" اس نے مومن سے اتفاق کیا تھا ۔۔۔ ابھی تک کے لیے یہی بہت تھا۔۔۔ دادا پوتی کے بحث و مباحثے کو انجوائے کرتے وہ کاؤنٹر پر پہنچا تو بل ادا کرنے کی ضد کرنے لگا۔
"اسی کو دینے دو بل۔۔۔ یہ مجھ سے شرط ہاری ہے اسی لیے شاپنگ کروا رہی ہے۔۔۔ ورنہ ہے یہ اتنی حاتم طائی۔" ابا نے مومن کو بل دینے سے باز رکھنے کے لیے حقیقت بتائی۔ جس پر عزوہ نے ابا کو گھورا۔
"شرط؟ کیسی شرط۔" مومن نے دلچسپی سے پوچھا۔
"بھئی، یہ کہتی تھی راحیل شریف ایکس ٹینشن لے گا۔۔۔ میں کہتا تھا نہیں لے گا۔۔۔ بس میں جیت گیا۔" مومن نے کھل کر مسکراتے ہوئے اسے دیکھا جو بظاہر ان دونوں سے بے نیاز رسید بنوا رہی تھی۔
"یہ تو تھوڑی پرانی بات ہو گئی ہے۔ نہیں؟"
"بات تو پرانی ہو گئی ہے پر سیل اب لگی ہے نا۔" ابا کی بات پر مومن قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ وہ پے منٹ کر کے پلٹی۔
"ہر بات ہر کسی کو بتانا ضروری نہیں ہوتا۔" ابا کو شاپر پکڑاتے ہوئے دانت کچکچاتے ہوئے بولی۔
"ہر کسی کو بتانا ضروری نہیں۔۔۔ لیکن مومن کو بتانا ضروری ہے۔ بیٹا ہے میرا۔" ابا نے مومن کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے جیسے اس کو جتانے کے لیے بولا۔ وہ جلتی بھنتی ان سے پہلے مال سے باہر آ گئی۔



سردی جاتے جاتے پھر کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح پلٹ کر آئی تھی۔ اسی کا اثر تھا کہ بہت سارے لوگوں کی طرح عزوہ بھی فلو، نزلہ، زکام میں گھری سوں سوں کرتی پھر رہی تھی۔ لیکن بھلا ہو حسن کا جو دو ہفتے کی چھٹی پر آیا تھا اور اس کی بیماری کو خاطر میں لائے بغیر مری جانے کا پلان بنا رہا تھا۔ وہ اپنے پیارے بھائی کی خاطر کچھ بھی کر سکتی تھی لیکن موڈ تو تب خراب ہوا جب ممی نے کشف اور اس کی امی کے بھی ساتھ جانے کا بتایا۔ ویسے تو اسے ان سے کوئی خار نہ تھی لیکن ان کے پیار کے آگے شرمندہ سی ہو جاتی تھی۔
ابا اور حسن سب سے زیادہ پُرجوش تھے' ڈیڈی نے اپنے کاروباری معاملات کی وجہ سے جانے سے منع کر دیا تھا اور ممی کو تو بیٹی سے زیادہ ابا کی فکر تھی۔ الائچی اور سونف کا قہوہ فلاسک بھر کے بنایا کہ کہیں ابا کو ٹھنڈ نہ لگ جائے۔ ڈیڈی نے اپنے آفس کے استعمال کی بارہ نشستوں والی گاڑی کا بمعہ ڈرائیور انتظام کر دیا تھا۔
عزوہ دوا لینے کے بعد تھوڑا بہتر محسوس کر رہی تھی۔ شاید دوائی کا ہی اثر تھا کہ تھوڑی دیر بعد ہی وہ سو گئی۔ تمام راستہ بے خبر سوئی رہی۔ آنکھ کھلی تو گاڑی رکی ہوئی تھی اور گاڑی میں ممی اور ڈرائیور کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ سو کر اٹھنے کے بعد سر کا بھاری پن جیسے دور ہو گیا تھا۔
"کہاں پہنچے ہیں ہم۔۔۔ سب کہاں گئے؟" ممی نے پلٹ کر پچھلی سیٹ پر دیکھا۔ عزوہ اٹھ کر بیٹھی ہوئی تھی۔
"اٹھ گیا میرا بچہ۔۔۔ بخار تو نہیں ہو گیا۔" ماتھے پہ ہاتھ لگا کر اطمینان کیا کہ بخار نہیں تھا۔
"ہم اسلام آباد ایئرپورٹ پر ہیں۔"
"ہم اسلام آباد پہنچ گئے۔ میں اتنا سوئی ہوں۔۔۔ ایئرپورٹ کیوں؟" جمائی روکتے ہوئے حیرت کے ساتھ استفسار کیا۔
"لو آ گئے۔۔۔ مومن آ رہا تھا نا۔" کھڑکی میں سے دیکھا تو مومن سب کے جلو میں راجہ اندر بنا ہنستا مسکراتا چلا آ رہا تھا۔
"لو جی۔۔۔ ان محترم کی کمی تھی۔۔۔ ہم انجوائے کرنے جا رہے تھے غالباً۔" عزوہ نے برا سا منہ بنایا۔
"ایسا نہیں کہتے بیٹا۔۔۔ حسن اس سے ملنا چاہ رہا تھا اور وہ حسن سے۔۔۔ سو ابا نے انوائیٹ کر لیا۔" وہ کوفت

سے پھر چادر منہ پر لے کر سوتی بن گئی۔ مومن دشمن جاں کو گٹھڑی بنے دیکھ کر آہ بھر کے رہ گیا۔

وہاں تو جیسے ہر منظر ان ہی کا منتظر تھا۔ مری نے برف کے ننھے گالے ان پر نچھاور کرتے ہوئے ان کا استقبال کیا۔ مارچ کے مہینے میں ہونے والی اس برف باری نے عزوہ کی ساری کوفت گرم جوشی میں بدل دی۔ وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔

"لو کہاں گیا فلو۔۔۔؟" سمیعہ، مومن کی امی کے پہلو میں بیٹھی اسے دیکھتی کہنے لگیں۔

"یہی تو دن ہیں ہنسنے کھیلنے کے۔۔۔ یہ چھوٹی موٹی بیماریاں کیا ہیں بھلا؟"

کشمیر پوائنٹ پہ پہنچتے پہنچتے برفباری میں شدت آ گئی۔ حسن کی کشف اور مومن سے بہت دوستی ہو گئی تھی۔ مومن اب مستقل کیمرہ مین کے عہدے پر فائز ہو چکا تھا۔ کیمرے کی آنکھ سے نظر آنے والی برفیلی پری سارے منظر پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کا انہماک دیکھ کر کشف اس کے پاس آئی۔ کیمرے کی اسکرین سے نظر آتی ہنستی مسکراتی عزوہ کو دیکھ کر مومن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے چونکایا۔

"غلط بندے کو کیمرہ پکڑا دیا ہے، ہم ایسے ہی پوز بنائے جا رہے ہیں۔" مصنوعی افسردگی طاری کر کے ابا کو سناتے ہوئے بولی۔ جہاں ابا قہقہہ لگا کر ہنسے وہاں مومن نے گڑبڑا کر کیمرہ حسن پر مرکوز کر لیا۔

"کچھ کھا لو بھئی۔ کم از کم میں بھوک سے نہیں مرنا چاہتا۔" ابا بھوک کی دہائیاں دے کر انہیں ریسٹ ہاؤس لانے میں کامیاب ہو ہی گئے۔

ان لوگوں نے دو کمرے بک کروائے تھے۔ ایک میں مرد حضرات اور دوسرے میں خواتین تھیں۔ مومن کی آنکھوں کے ہر گوشے میں نیند کے بجائے عزوہ آن بسی تھی۔ گو کہ یہ منظر بے حد سہانا تھا لیکن ابھی وہ سونا چاہ رہا تھا۔ اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ ابا اور حسن گہری نیند میں تھے۔ دل ہی دل میں ان پر رشک کرتے بستر سے اٹھا۔۔۔ لیدر جیکٹ پہن کر اپنے بلیک اینڈ وائٹ چیک کے مفلر کو مخصوص انداز میں لپیٹ کر کمرے سے نکل گیا۔

مال روڈ سے کافی پی کر وقت گزاری کا سوچا تھا۔۔۔ لفٹ سے نکلتے ہی بیرونی دروازے سے نکلتی عزوہ نظر آئی تو دل خود بخود ہی سریلی دھن کی لے میں دھڑکنے لگا۔ کافی رات بیت جانے کی وجہ سے لوگ بہت کم تھے۔ برف باری رک چکی تھی اور ہر منظر دھند کی مہین چادر میں لپٹا تھا۔ اس نے دیکھا کہ عزوہ ایک کافی شاپ کے سامنے کھڑی اپنے دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑ کر شاید کافی کا آرڈر دے رہی تھی۔ وہ بھی تیز قدموں سے ڈھلان اترتا اس کے برابر میں جا کھڑا ہوا۔

"ایک بلیک کافی پلیز۔" عزوہ ایک عام سی نظر اس پہ ڈال کر اپنا کپ پکڑ کر چل پڑی۔۔۔ چند ثانیے بعد وہ بھی اپنا دھواں اڑاتا کپ پکڑ اس کے قدم سے قدم ملانے لگا۔ مال روڈ کی روشنیاں دھند میں مدھم ہوئی جا رہی تھیں۔

"مجھے تو نیند نہ آنے کی ایک باقاعدہ وجہ ہے۔۔۔ آپ کو نیند کیوں نہیں آ رہی؟" عزوہ کے چہرے پر ابھرنے والی بیزاری کو نظر انداز کرتے اس نے بات کا آغاز کیا۔

"اور آپ کو لگتا ہے کہ میں آپ کو بتا دوں گی؟"

"مجھے یقین ہے کہ آپ نہیں بتائیں گی۔ بات تو کرنا تھی کوئی۔۔۔ سو۔" کافی کا گھونٹ لیتے وہ سچائی سے بولا۔

وہ خاموش رہی۔

"آپ کو میرا یہاں آنا اچھا نہیں لگا ناں؟" سامنے دھند میں کچھ ڈھونڈتے پوچھا۔

"میرے لیے آپ کا اس بے ثمر کوشش میں خود کو ہلکان کرنا مجھے اچھا نہیں لگا۔" وہ افسردگی سے بولی۔

"میرے حساب سے کوئی کوشش بے ثمر نہیں ہوتی۔" ماحول کا فسوں ان دونوں کو دھیرے دھیرے گھیرے میں لے رہا تھا۔

"ہر کوشش بامراد بھی نہیں ہوتی۔۔۔ جیسے میں ڈھند میں لپٹی اس سرد خاموشی کو سننے کی کوشش میں ہوں۔"

"تو سن لیجئے۔۔۔ میں اب کچھ نہیں بولوں گا۔۔۔"

گھمبیر آواز میں بولا۔۔۔ جیسے وہ خود بھی اس کی سانسوں کو سننا چاہتا ہوں۔

"آپ کے قدموں کی چاپ اس خاموشی کو منتشر کر رہی ہے۔" وہ خاموش ہوا تو جیسے اس کی خاموشی عزوہ کے دل پر نقب لگانے لگی۔ اس نے گھبرا کر اسے ساتھ چلنے سے بھی روکنا چاہا۔

"آپ کے لیے تو کچھ بھی۔۔۔" وہ رک گیا۔ وہ بڑھتی رہی۔

"دس قدم دور ہوں اب۔" دس قدم کا فاصلہ رکھ کر وہ پھر چل پڑا۔۔۔ اس فاصلے میں بھی سرور تھا۔

"ایسے موقعوں کے لیے فلموں میں ان گنت گانے گائے گئے۔ لیکن افسوس میری یادداشت اس معاملے میں مجھے دھوکا دے جاتی ہے۔ مس یو موجو۔" یہ آواز بلند بولا۔۔۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی حد نگاہ میں تھے ۔۔۔ اس کے پار دھند تھی۔ عزوہ نے مڑ کر تیکھے چتونوں سے دیکھا۔

"میں آپ سے بات نہیں کر رہا۔" مصنوعی خوف طاری کر کے بولا۔

"تو خود سے آہستہ آواز میں بات کیجئے۔" وہ پھر چلنے لگی۔

"میں اونچا سنتا ہوں۔" شوخی سے مزید بلند آواز میں کہا۔ اب وہ مڑی نہیں۔۔۔ ہاں لبوں پہ آنے والی مسکراہٹ کو بھی نہیں روکا۔

"میرے رشک قمر۔۔۔ تو نے پہلی نظر۔۔۔
جو نظر سے ملائی مزہ آگیا۔"

سامنے دھند میں سے ایک انتہائی سریلی مردانہ آواز ابھری۔۔۔ کوئی بہت جذب سے گا رہا تھا۔ عزوہ اپنی جگہ شرمندہ سی ہوئی۔۔۔ مومن البتہ بہت محظوظ ہوا۔۔۔ جیسے اس سارے سین میں اسی کی تو کمی تھی۔

"برق سی گر گئی کام ہی کر گئی۔
آگ ایسی لگائی مزہ آگیا۔"

آواز دھیرے دھیرے قریب آ رہی تھی۔ گانے والا انہی کی طرف آ رہا تھا۔ چند ہی ثانیے بعد دھند میں سے ایک منظر بھی نکل کر سامنے آیا۔ وہ تین نوجوان لڑکے تھے۔ جیسے ہی ان کی نظر عزوہ پر پڑی۔ گانے والے کی آواز میں چہکار بڑھ گئی۔ اور ساتھ کے دونوں لڑکے بھی شوخ نظروں سے اسے گھورنے لگے۔

"آنکھ ان کی لڑی یوں میری آنکھ سے
دیکھ کر یہ لڑائی مزہ آگیا۔"

عزوہ ان کے انداز بھانپ کر جزبز ہوئی لیکن پیچھے پلٹ کر مومن پر اپنی کمزوری ظاہر کرنا بالکل گوارا نہ تھا۔

مومن کو بھی ان لڑکوں کے انداز کھٹکے۔ وہ دو ہی جست میں دس قدم سمیٹتا' بالکل غیر محسوس انداز میں اس کے برابر چلنے لگا۔ لڑکوں نے اس کو ساتھ دیکھ کر اپنی نظروں کے زاویے بدل لیے۔ وہ دل ہی دل میں ممنون ہوئی۔ لیکن زبان سے کہتی تو شان نہ گھٹ جاتی۔ گانے کی آواز اب کہیں دور عقب میں جا چکی تھی۔ وہ دونوں بالکل خاموش تھے۔ عزوہ کو دھند میں لپٹی سرد خاموشی چبھنے لگی' دل اس کے قدموں کی چاپ کے ساتھ ہمکنے لگا کہ خود کی آواز نے دل چیر دیا۔

"تو کہہ دیا تو کہہ دیا۔" اور پھر خود کا قہقہہ۔۔۔ وہ رک گئی۔

"بہت آگے نکل آئے۔۔۔ واپس چلنا چاہیے۔"

تیز تیز قدم اٹھاتی واپسی کا راستہ طے کرنے لگی۔۔۔ مبادا کہ اس کا چہرہ پڑھ کے اس کے دل تک نہ پہنچ جائے۔



حسن دو ہفتے خوب ادھم مچانے کے بعد جا چکا تھا۔ اور گھر میں ایسی خاموشی تھی کہ خود کا بولا بھی عجیب لگ رہا تھا۔ اس کو گئے بھی ہفتہ ہو گیا تھا لیکن گھر کی ہر چیز جیسے اداسی کے ہالے میں تھی۔ ابھی بھی ابا لان میں سامنے رکھے ٹیبل پر بساط بچھائے عزوہ کو قائل کرنے میں لگے تھے کہ وہ ان کے ساتھ شطرنج کی بازی لگائے ۔۔۔ لیکن عزوہ اپنے لیپ ٹاپ میں گھسی نہ جانے کس کس سافٹ ویئر میں الجھی ہوئی تھی۔

"ارے بھئی' آج تو اتوار ہے۔" گیٹ سے مومن کی گاڑی داخل ہوتے دیکھ کر جہاں ابا چہکے وہاں عزوہ نے پہلو بدلا۔

"خوش قسمت ہیں بھئی جو ٹھنڈی ہوا میں انجوائے کر رہے ہیں۔ کراچی میں تو ابھی ایسی گرمی ہے جیسے جون چل رہا ہو۔" عزوہ کے اڑتے بالوں کو نظروں کے حصار میں لیتے ہوئے بولا۔ کل ہونے والی بارش سے منظر نکھر انکھر اتھا۔

"کیا خاک انجوائے کرنا... کب سے اس کو کہہ رہا ہوں کہ ایک بازی لگالو لیکن یہ دنیا جہاں سے مختلف پوتی ہے۔"

"بالکل ٹھیک کہا... ورنہ ہیرے جیسے لڑکے کو ریجیکٹ کرنے کی کوئی تک تھی بھلا... میری ماں مجھے ہیرا کہتی ہے۔" چال چلتے ہوئے جیسے اس نے گیم کا آغاز کر کے ابا کو خوش کر دیا... اور پھر عزوہ کو دیکھا۔

"ماؤں کے تو کیا ہی کہنے... کرس گیل بھی اپنی ماں کا چاند ہو گا۔" اس نے فوراً "حساب برابر کیا۔ ابا ان کو اس طرح بات کرتے ہوئے دیکھ کر انجوائے کر رہے تھے۔

"اچھا ویسے ایک بات تو بتائیں... میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو ریجیکٹ کر دیتیں... یا یہ اعزاز خاص الخاص میرے لیے ہے..." ابا کی موجودگی میں مومن کی ایسی بات سن کر تھوڑی حیران ہوئی لیپ ٹاپ سے نظر ہٹا کر ابا کو دیکھا جو بظاہر چال چلنے میں مصروف تھے لیکن دھیان سارا ان کی طرف ہی تھا۔ اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا۔

"دیکھیں جی... اب میں کوئی شبو ٹائپ لڑکی تو ہوں نہیں... کہ ادھر مجھے کسی نے پرپوز کیا ادھر میں شہادت کی انگلی دانتوں میں دابے' پلکیں جھپکاتی' تیز تیز سانس لیتے کمرے میں بھاگوں اور پھر گھونگھٹ میں سے زور زور سے سر ہلا کر اقرار کر لوں۔" میں عزوہ حسیب ہوں... آج کی پڑھی لکھی' برسرروزگار' اپنے ہر فیصلے میں خود مختار لڑکی۔ بات دل کو لگنے کی ہے... جو دل کو لگا وہاں ریجیکشن نہیں ہو گی۔"

اس نے اپنے ازلی اعتماد کے ساتھ بات مکمل کی اور مومن کی آنکھوں میں دیکھنے لگی جو گیم چھوڑ کر توجہ سے اسے دیکھ اور سن رہا تھا۔

"ابا! آپ کچھ نہیں بولیں گے؟" جواب نہ بن پڑا تو اس سے نظریں ہٹا کر بساط پر جمالیں اور ابا سے مدد مانگ لی۔

"میرا چپ رہنا ہی تمہارے مفاد میں ہے کیونکہ بات میری پوتی نے سولہ آنے درست کی ہے۔" اس کے مہرے کو پیٹتے اسے صاف جواب دیا گویا... وہ بدمزہ سا ہوا۔ عزوہ کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"کیا خاک سولہ آنے کی ہے۔ میں نے اپنی اٹھائیس سالہ زندگی میں خود سے زیادہ خوبرو آدمی نہیں دیکھا... اور محترمہ کے دل میں لگا ہی نہیں۔" چال چلی

"یہ تو ہے عزوہ... میری پچاس سالہ زندگی..."

"پچاس سالہ ابا؟" عزوہ نے بات پوری کرنے سے پہلے ہی روک دیا۔

"اچھا بھئی پچپن سالہ... میری پچپن سالہ زندگی میں مومن دوسرا شخص ہے جو وجاہت کے معیار پر پورا اترتا دیکھا ہے۔" اپنی زندگی کے پندرہ سال کھوہ میں ڈالتے وہ گویا ہوئے۔

"پہلا کون؟" مومن جواب جانتا تھا پھر بھی زبان کے ذائقے کے لیے پوچھا۔

"میں اور کون...؟" جیسے یہ عالمگیر سچائی ہو۔ عزوہ اور مومن دونوں ہی مسکرا اٹھے۔

"پچپن سالہ وجیہہ نوجوان! اگر خود ستائی سے فرصت ملے تو گیم پہ توجہ دیں دشمن کا گھوڑا آپ کے وزیر پہ گھات لگائے بیٹھا ہے۔" ان دونوں سے زیادہ عزوہ کی توجہ بساط پر تھی۔

"اوئے ہوئے... بچاؤ بچاؤ۔" ابا اپنے وزیر کو کو بچانے بھاگے۔ اور مومن "چیٹنگ چیٹنگ" چلاتا رہا۔ لیکن اس کی سن کون رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

تھا۔ ہر صبح مومن کا گڈ مارننگ میسج پڑھ کر صبح کا آغاز اچھا لگنے لگا تھا۔ ہر رات گڈ نائٹ کا میسج پرسکون نیند کا باعث بننے لگا تھا۔ اس نے کبھی جوابی میسج نہیں کیا تھا۔ کیونکہ وہ خود سے بھی چھپا رہی تھی کہ اسے ہر ہفتے اس کی آمد کا انتظار ــ رہنے لگا تھا۔ لیکن "کہہ دیا تو کہہ دیا۔" اس کی راہ میں حائل ایک بھاری پتھر تھا۔ جسے ہٹانا اس کے بس سے باہر تھا۔

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔" آج میسج کے بجائے اس کی کال آئی۔ آج عزہ کا برتھ ڈے تھا۔

"تھینک یو... ابا نے بتایا؟" ابھی وہ جائے نماز پر ہی بیٹھی تھی۔

"نہیں آپ کی سہیلی نے۔" وہ ایک دم چونک گئی۔ یہ کس سہیلی سے رابطے میں ہے؟

"مطلب...؟" چونکنا ظاہر کیے بغیر نارمل انداز میں بولی۔

"جناب آپ کی فیس بک کی ٹائم لائن پہ آپ کی درجنوں سہیلیوں نے آپ کو وش کیا ہے۔ رات بارہ بجے۔" اس نے سکون کا سانس لیا۔

"تو آپ میری فیس بک چیک کرتے رہتے ہیں؟" جائے نماز لپیٹتے ہوئے بولی۔

"ہر صبح... بھئی آپ جب میری فرینڈ ریکویسٹ اگنور کریں گی تو مجھے خود تو چیک کرنا پڑے گا ناں۔" اس نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

عزہ دل سے مسکرائی... کوئی آپ کو چاہتا ہے یہ احساس ہی خوش کن ہے لیکن "نو۔" عزہ کا "نو" اس کے قدم روک رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کے دل کی بستی میں مومن نام کی جھوکیں بسنے کو ہیں... لیکن اس نے یہ نہیں ہونے دینا تھا... یہ طے تھا اور پھر شام کو کشف اور آنٹی گفٹس اور کیک لے کر آ گئیں۔ وہ دل ہی دل میں مومن سے خفا ہوئی۔ ان کی محبتوں کو ٹھکرانے پہ خود کو مجرم محسوس کر رہی تھی۔ رات کا کھانا سب نے عزہ کے فیورٹ ریسٹورنٹ میں کھایا۔ پارٹی ابا کی طرف سے تھی۔

"مومن بھی آجاتا۔" ابا نے دو چار بار بہ آواز بلند مومن کو یاد کیا۔ وہ اندر ہی اندر ابا سے خفا ہوئی۔

"بس بھی کر دیں ابا۔" کیونکہ ابا اس کے دل کی بات کو آواز دے رہے تھے۔ پھر اس ویک اینڈ پر وہ نہیں آیا۔ اس نے دل کو ڈپٹ کر کلمہ شکر ادا کیا۔ دل کی ضد تھی کہ برتھ ڈے گزرا ہے۔ اس کو آنا چاہیے تھا۔ لیکن عزہ کی سخت گیر آپا کی طرح دل کو ڈانٹ ڈپٹ کر چپ کروا چکی تھی اور پھر نیکسٹ ویک اینڈ وہ چلا آیا۔

ہر بار کی طرح اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس کے پاس ایک خوب صورت گفٹ ریپر میں پیک باکس بھی تھا۔ قوی امکان تھا کہ یہ عزہ کے لیے تھا لیکن بشمول عزہ سب کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب مومن نے بتایا کہ وہ یہ گفٹ سمیعہ کے لیے لایا ہے۔

"بھئی پہلی اولاد کی پیدائش پر تحائف کی حق دار تو ماں ہونی چاہیے۔ کیونکہ وہ ماں بنتی ہے۔" ایسا تو کبھی کسی نے سوچا نہ تھا۔ وہ بہت خوب صورت برانڈڈ سوٹ تھا۔ اس کی ماں جو پہلے سے ہی مومن پہ صدقے واری جاتے نہیں تھکتی تھی اب اور دیوانی ہو گئی۔

"دل ڈن کلیور لوا ئے..." عزہ نے دل ہی دل میں مومن کی اس کی اس چال کو سراہا۔ مومن بھی نظروں ہی نظروں میں کورنش بجا لایا۔



"میری سمجھ میں نہیں آرہا اتنی اچھی پریزنٹیشن تھی۔ ان لوگوں نے کس بنیاد پہ ریجیکٹ کیا۔"

ایک بہت بڑی کمپنی نے ان کی آفر ریجیکٹ کر دی تھی۔ عزہ اس کو ڈیل کر رہی تھی۔ یوسف ہمدانی صاحب انتہائی غصے میں سب کی کلاس لگائے بیٹھے تھے۔ جب عزہ نے ازلی اعتماد سے یہ جملہ کہا تو یوسف صاحب کو جیسے آگ ہی لگ گئی۔

"آپ کے پاس سمجھ ہوتی تو جی ایم آپ نہ ہوتیں؟" اتنی بے عزتی پر وہ سر سے پیر تک سلگ اٹھی اور ابھی بھی ٹیرس پر لیپ ٹاپ کھولے سلگ رہی تھی۔

"سمجھتا کیا ہے خود کو؟" یہ آواز بلند بڑبڑائی۔
"اب کس کی شامت آگئی... میں نے تو ابھی کچھ کہا بھی نہیں۔" عقب سے آتی آواز پہ مڑ کر دیکھا تو ریڈ ٹی شرٹ اور بلیک جینز میں نکھرا نکھرا مومن سامنے کھڑا تھا۔
"کیا مسئلہ ہے آپ کے ساتھ؟ جہاں مرضی دندناتے پھرتے ہیں۔" دوبارہ نظریں اسکرین پر گاڑ کر اس کے ٹیرس پہ آنے کو تنقید کا نشانہ بنایا۔
"بھئی میں جہاں چاہوں جا سکتا ہوں۔ ابا کا منہ بولا بیٹا ہوں۔" اس کے عین سامنے کی کرسی پر بیٹھ کر اسے نظروں میں بھرتے ہوئے بولا۔
"کہیے... کیسے آنا ہوا؟" صبر کے گھونٹ پیتے پوچھا گیا۔
"میں آپ کو وارن کرنے آیا ہوں... میری آفر سے فائدہ اٹھالیں کیونکہ اگر میری ماں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو پھر آپ پچھتائیں گی۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ میری شادی کا کارڈ ہاتھ میں لیے رانجھا رانجھا پکارتی صحراؤں میں بھٹکتی رہیں۔" بڑے مزے سے بات مکمل کر کے اسے دیکھا۔
"اتنی خوش فہمی صحت کے لیے اچھی نہیں ہوتی۔" اسی مزے سے بول کر دوبارہ لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گئی۔
"کیا آپ کے لیپ ٹاپ میں مجھ سے بھی زیادہ کچھ انٹرسٹنگ ہے؟" اسے پھر چھیڑا۔
"میرے لیپ ٹاپ میں میرا مقصد ہے۔ اپنے باس کو اب جی ایم بن کے نہ دکھایا تو میرا نام بھی عزوہ نہیں۔" عزم سے بولی۔
"اس کو کہتے ہیں کم فہمی... میں آپ کو اپنی ذاتی کمپنی کی سی ای او بنانے کے چکروں میں ہوں اور آپ ایک جی ایم کی پوسٹ کے لیے خوار ہو رہی ہیں۔" اس کی عقل پر ماتم کرتا ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اکڑ کر بیٹھ گیا۔
"بس کر دیجیے مومن ایاز یہ شادی نامہ..." اس کی بات کاٹ کر تیز لہجے میں بولی۔ "میری اچھی بھلی زندگی آپ نے اجیرن کر دی ہے۔ آپ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔ مجھے نہیں کرنی آپ سے شادی' یہ بات آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آرہی... ابا کا لحاظ کرتے ہوئے میں آپ کو اگنور کر رہی ہوں تو آپ حد ہی پار کرتے جا رہے ہیں۔ میں آپ سے اس طرح بات نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ لیکن آپ نے مجبور کر دیا مجھے... امید کرتی ہوں آئندہ آپ مجھ سے کوئی بات کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔"
"پچھتائیں گی آپ... لکھ لیں میری بات۔" سیڑھیاں اترنے سے پہلے وہ پھر بولا... اور نیچے اتر گیا۔
"نو..." عزوہ کے دل کو پھر آواز آئی تو دھڑکن معمول پہ آگئی۔

☆ ☆ ☆

رمضان میں ان کا عمرے کا پروگرام تو پچھلے دو سالوں سے بن رہا تھا لیکن اب اللہ کا حکم ہو گیا تو امی' مومن اور کشف رمضان میں عمرے کے لیے جا رہے تھے۔ زمر بھی ان لوگوں کے بغیر بہت اداس ہو گئی تھی اور پچھلے ایک مہینے سے سپانسر شپ کا پروسس بھی چل رہا تھا۔ سو سب مل ملا کر طے یہ ہوا کہ پہلے زمر کے پاس ڈنمارک جائیں گے۔ کچھ دن وہاں رہ کر عمرے کی ادائیگی کے لیے حجاز مقدس جائیں گے اور پھر چاند رات کو واپسی ہو گی۔ معاملات طے پا گئے تو مومن اپنی ساری خفگی بھول کر عزوہ کا نمبر ملانے لگا۔ مگر وائے ری قسمت... اس کا نمبر بند تھا۔ تین چار بار ٹرائی کرنے کے بعد ابا کا نمبر ملا لیا۔ انہیں تمام پروگرام سے آگاہ کیا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔
"ایک بات مانو گے؟" مبارک سلامت کے بعد ابا بولے۔
"جی... حکم کریں۔" خوشی سے مخمور بولا۔
"عزوہ کو نہ بتانا۔"
"کیا مطلب؟ بتائے بغیر چلا جاؤں۔" وہ حیران ہوا۔
"ہاں... بلکہ وہاں جا کے بھی کوئی رابطہ نہ کرنا۔

میں اور گھر والے بھی اسے کچھ نہیں بتائیں گے۔"
"وہ کیوں بھلا؟" جھنجھلاتے ہوئے پوچھا۔
"شادی کرنا چاہتے ہو کہ نہیں۔"
"کرنا چاہتا ہوں۔" ترکی بہ ترکی بولا۔
"پھر جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو... وقت آگیا ہے کہ تم اسے اگنور کرو۔" ابا کی نرالی منطق پہ اس نے پہلو بدلا۔
"وہ یہی تو چاہتی ہے۔ تھوڑے بہت جو چانسز ہیں وہ بھی جائیں گے۔"
"اس کو اپنی دادی کی گھٹی ہے۔ اپنے تجربے کی بنیاد پہ تمہیں ترکیب بتا رہا ہوں۔ آگے تمہاری منشا۔" ابا کی بات پہ وہ سوچ میں پڑ گیا۔
"دیکھ لیجئے گا ابا۔ آپ کے بھروسے کر رہا ہوں ایسا ... یہ نہ ہو کہ بنی بات بگڑ جائے۔" مومن نیم رضامند سا بولا۔
"تمہارا ہی حوصلہ ہے میاں! جو اس عزت افزائی کے بعد بھی تمہیں بات بنی ہوئی نظر آرہی ہے۔" ابا نے آخری کال کا حوالہ دیا تو وہ مکمل رضامند ہو گیا۔ اپنی خواہش کے برخلاف محض ایک ہفتے بعد ہی وہ عزوہ کو بتائے بغیر اڑان بھر رہا تھا۔



"وہ چلا گیا تو پھر نہیں آئے گا۔ کہا تھا تمہیں اور وہ چلا گیا ہے۔" ہر صبح اس مخصوص گڈ مارننگ کو نہ پا کر دل ایسے ہی لتاڑتا... شروع میں تو انا کے روشن مندر کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہی... جان ہی نہ پائی کہ اندر کچھ ٹوٹ رہا ہے۔ ہر ویک اینڈ پر کان اس کی آواز سننے کے منتظر ہوتے، آنکھیں اس کا دیدار کرنے کی چاہ کرتیں۔ لیکن وہ نہیں آیا... انکار کی ساری توجیہات اپنی موت آپ مر رہی تھیں۔
"ہیرے جیسا لڑکا ہوں۔"
"پچھتاؤ گی۔"
"میرا یہاں آنا اچھا نہیں لگتا نا۔"
"کوئی کوشش بے ثمر نہیں ہوتی۔" اس کی آوازیں نوکیلے شیشوں کی طرح چبھتی تھیں۔ اس کی کوشش بے ثمر نہیں تھی۔ یہ تو عزوہ کی ضد کی آگ تھی جس نے ان ثمرات کو راکھ کر دیا تھا۔ اور خود اسی راکھ میں سلگ رہی تھی۔ کہیں سے اس کی خبر نہیں مل رہی تھی۔ ابا سے بہانے بہانے سے پوچھا۔
"آپ کا منہ بولا بیٹا کہاں ہے۔" ان کا جواب بھی ان کی طرح نرالا تھا۔
"چھوڑو پرے، مفاد پرست آدمی۔" شطرنج بچھائے دونوں طرف کی باریاں خود ہی چلتے انتہائی مطمئن تھے۔
"اب ابا بور ہو جاتے ہیں، مومن بھی تو نہیں آتا۔" ممی کے سامنے بھی یوں ہی سرسری سا تذکرہ کر لیا کہ شاید کچھ خبر ملے۔
"مصروف ہوگا۔" مختصر سا جواب اور بس۔
عزوہ اب جھنجھلائی جھنجھلائی پھر رہی تھی۔ انا کے شکستہ مندر کو لات مار کر مومن کا نمبر ملایا۔ اسے سوری کرنا تھا اور کہنا تھا کہ شادی نامہ وہیں سے شروع کرو جہاں سے چھوڑا تھا۔ مگر غصے سے لال پیلی ہو گئی جب اس کا نمبر ہی بند ملا۔
"جہنم میں جاؤ... آخری آدمی نہیں ہو تم... میں بھی کوئی مر نہیں رہی تمہارے لیے۔" شاید اس نے نمبر بدل لیا ہے، یہ سوچ کر ہی غصے کا شدید دورہ پڑا۔
رمضان المبارک کی مبارک ساعتوں میں اسے اب صرف عبادت کرنا تھی۔ کسی ایرے غیرے کے بارے میں نہیں سوچنا تھا۔ لیکن جب بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی ایرا غیرا مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ ہتھیلی کے فریم میں آ ٹکتا... وہ بے بس سی ہاتھ گرا دیتی۔
"تم جیت گئے مومن ایاز... میں تمہیں سر آنکھوں پہ بٹھانے کے لیے بے چین ہوں۔ تم آجاؤ واپس..." لیکن وہ کہیں نہیں تھا۔ اس نے بے دلی سے ہی عید کی شاپنگ کی... ممی کے اصرار پر ریڈی میڈ لباس لے آئی تھی۔
توقع تھی کہ آج آخری روزہ ہوگا۔ آفس سے آکر عصر کی نماز ادا کی تو کمرے سے باہر نکلنے پر احساس ہوا کہ آج معمول سے تھوڑی زیادہ گہما گہمی ہے، بشریٰ آج

اپنے ساتھ کسی اور کو بھی لائی تھی۔ وہ دونوں نئے برتن نکال کر انہیں خشک کپڑے سے صاف کر کے رکھ رہی تھیں۔

"چلو اچھا ہوا تم آگئیں ۔۔۔ یہ سیلڈ بنا دو ذرا۔" کھیرے اور ٹماٹر اس کے سامنے رکھ کر ممی پھر دیگچی میں چمچہ ہلانے لگیں۔

"آج کوئی آرہا ہے کیا ممی؟" چھری پکڑتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں نہیں پتا ۔۔۔ آج مومن لوگوں کی واپسی ہے۔ تو میں نے افطاری رکھ لی ۔۔۔ سیدھے یہیں آئیں گے۔" ممی بے حد مصروف تھیں۔

"واپسی؟ کہاں سے؟" الجھ کر پوچھا۔

"عمرے سے ۔۔۔ اور کہاں سے ۔۔۔ ارے بشریٰ ۔۔۔ گلاس بھی لے لو۔" بشریٰ کو آوازیں دیتی ممی کچن سے نکل گئیں اور عزوہ پر تو جیسے بہت ساری کیفیات نے ایک ساتھ حملہ کر دیا۔

"اسی لیے فون بند تھا۔ اور میں کیا سمجھی۔" خود کی سمجھ پر ہنستے ہوئے وہ خوش دلی سے سلاد بنانے لگی۔ اسے ابھی کپڑے بھی بدلنے تھے۔ دل کا موسم ایک دم سہانا ہو گیا۔ آج جب وہ شادی کی بات کرے گا تو وہ شبو کی ہی طرح انگلی دانتوں میں داب کر کمرے میں بھاگ جائے گی۔ یہ اس نے ٹھان لیا تھا۔

اور پھر روزہ کھلنے سے تھوڑی دیر پہلے وہ آگئے۔ عزوہ ہمیشہ سے بڑھ کر خوشی سے ان کے استقبال کے لیے آگے بڑھی۔ ملنے ملانے اور مبارکبادوں کے بعد افطاری کی گئی۔ عزوہ نے بہت بار دیکھا لیکن ایک بار بھی مومن کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے نہ پا کے بجھ سی گئی۔ مرد حضرات نماز پڑھنے مسجد کو چل دیے ۔۔۔ جبکہ کشف نماز کے بعد چاند دیکھنے کے لیے اسے بھی چھت پہ لے آئی۔ ممی اور آنٹی بھی اوپر ہی آگئے۔ لیکن مہربانی ہو ہماری سائنسی ترقی کی۔ آلودگی کی دبیز تہہ میں چاند چھپ گیا تھا۔ وہ لوگ نماز پڑھ کر آئے تو مومن بھی اوپر آگیا۔

"اس سے تو اچھا ہے ٹی وی پہ ہی خبر سن لیں۔" چاند ڈھونڈنے کی کوشش میں ناکام ہو کر کشف اعلان کرتے ہوئے نیچے بھاگی۔ ممی اور آنٹی بھی اس کی تقلید میں اترنے لگیں۔ "اتنے کچھ۔۔۔" ممی کی آواز آئی۔

"مومن ۔۔۔!" مومن بھی ان کے پیچھے جانے لگا تو عزوہ نے پکار لیا۔ پہلی بار اس کے منہ سے اس انداز میں اپنا نام سنا تھا۔ مومن بے اختیار پلٹ کر اس کے برابر آن کھڑا ہوا۔

"عمرہ مبارک ہو۔"

"تھینک یو۔" سفید شلوار قمیص میں دراز قد اور بھی نمایاں تھا۔

"آئی ایم سوری۔" ہمت جمع کر کے دھیرے سے بولی۔

"کس بات کے لیے؟" انجان بن کر اس کو دیکھا۔

"اپنی بدتمیزی کے لیے۔" سر جھکا کے اعتراف کر رہی تھی۔

"اوہ ۔۔۔ وہ میں تو بھول بھی چکا۔" کچھ یاد کر کے بولا۔

"بولنا بھی بھول گئے ہیں کیا؟" اس کی خاموشی پر چوٹ کی۔

"ایسا تو نہیں ۔۔۔ شاید یہ اس مبارک سفر کا اثر ہے جو تھوڑا بدلاؤ محسوس ہو رہا ہے آپ کو۔" اس نے جواب دیا۔

"ہوں۔" اور پھر خاموشی۔ کافی طویل خاموشی۔ دونوں ہی آسمان میں کچھ ڈھونڈ رہے تھے۔ شاید ایک دوسرے کو۔ تھوڑی دیر کھڑا رہنے کے بعد مومن مڑا اور سیڑھیوں کی طرف چل پڑا۔

"اگر اب آپ مجھ سے شادی کی بات کرتے تو میں نے "ہاں" کرنے کا سوچ رکھا تھا۔" بہت دقت سے اس نے یہ جملہ بولا۔

اس کے بڑھتے قدم رک گئے۔ دل سے اٹھنے والی خوشی لبوں پر مسکراہٹ بن کر دوڑ گئی۔ لیکن ابھی عزوہ پر کچھ ظاہر نہیں کرنا تھا۔ وہ اسی انداز میں چلتا اس کے برابر آگیا۔

"کیوں؟" وہ اظہار چاہ رہا تھا۔

"کیونکہ ۔۔۔ مجھے آپ پہ ترس آگیا ہے۔" اور اسے اظہار کرنا نہیں تھا۔

"اس ترس کا شکریہ.... لیکن اب کوئی فائدہ نہیں.... امی میرے لیے لڑکی پسند کر چکی ہیں۔" عزوہ کو تو جیسے کسی نے پہاڑی سے دھکا دے دیا ہو۔ اس کے حواس گم ہو گئے، لیکن وہ ابھی بھی اپنے پیروں پر کھڑی تھی۔

"چاند نظر آ گیا ہے۔ عید مبارک۔" مومن اس کی حالت سے بے خبر آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر چاند دکھاتا اور مبارک باد دیتا سیڑھیاں اتر گیا۔ اور وہ وہیں کھڑی رہ گئی۔

وہ اپنے بکھرے وجود کو کیسے سمیٹ کر اپنے کمرے تک لائی تھی، وہی جانتی تھی۔ اس کو بیڈ پر بے سدھ لیٹے کتنا ہی ٹائم گزر گیا۔ بشریٰ کھانے کے لیے بلانے آئی تو اس نے منع کر دیا حتیٰ کہ گاڑی کے اسٹارٹ ہونے اور گیٹ بند ہونے کی آواز آئی۔ جانے والا جا چکا تھا۔ محبت کا دیپک بجھنے کو تھا کہ ممی آ گئیں۔ ممی کا اس وقت آنا بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ اپنی ماں کو اپنا راکھ راکھ وجود کیسے دکھاتی؟

"میری شہزادی، میری بچی۔" ممی تو اس کا ماتھا چوم رہی تھیں۔

"تم نے مومن کو شادی کے لیے ہاں کر دی.... میرا دل خوش کر دیا۔" امی کیا بول رہی تھیں.... مومن، شادی، ہاں.... سب بکھرا بکھرا لگا۔ جب سب مرتب ہوا تو شادی مرگ کی سی کیفیت چھا گئی۔

"وہ کل شام کو منگنی کی باقاعدہ رسم کرنے آئیں گے۔" ممی مژدہ جاں سنا رہی تھیں.... محبت کے دیپک کی جوت بڑھ گئی تھی۔

"گھنا...." دل ہی دل میں مومن کو اچھے اچھے القاب سے نوازا.... دل بھنگڑے ڈالنے لگا۔

مومن کی امی تو نہ جانے کب سے اس دن کی تیاری کیے بیٹھی تھیں.... کپڑے، جیولری، جوتا سب تیار تھا۔

سج دھج کے مومن کے پہلو میں آ بیٹھی.... نہ نہ کہنے والی اب ہاں ہاں پکار رہی تھی۔

"آپ تو بہت تجربہ کار نکلے ابا!" دائیں پہلو سے بیٹھے ابا کے کان میں مومن نے سرگوشی کی۔

"دو محبوبائیں، تین معشوقائیں اور ایک بیوی بھگتا چکا ہوں میاں۔" ابا بھی شوخ ہو رہے تھے۔

"اچھا!! حسن آرا کے علاوہ بھی...." مومن حیران ہوا۔

"شش.... پھر کبھی تفصیل سے بتاؤں گا۔" ابا نے اسے باز رکھنا چاہا۔ مسکراتے ہوئے بائیں پہلو میں دیکھا۔ اس کا جہاں آباد تھا۔

"ابا سے کیا باتیں ہو رہی ہیں؟" آواز دبا کر عزوہ نے پوچھا۔

"ابا میری ثابت قدمی کو سراہ رہے ہیں۔" مومن نے بات بدلی۔

"ہونہہ ثابت قدمی.... اگر میں سرینڈر نہ کرتی تو پھر دیکھتے ثابت قدمی۔" عزوہ اسے کوئی کریڈٹ دینے کے موڈ میں نہیں تھی۔

"بہت شکریہ میڈم.... ہم آپ کا احسان نہیں اتار سکتے۔ ویسے میری کمپنی میں سی ای او کی پوسٹ مبارک ہو۔" چھیڑتے ہوئے بولا۔

"مبارک باد کیسی.... کمپنی ڈوبنے کے قریب ہے۔ بہت کام کرنا پڑے گا۔" وہ بھی ناک سے مکھی اڑاتی بولی۔

"آپ مالک ہیں.... جو چاہے کریں۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا جھکتے ہوئے بولا۔

"ویسے وہ لڑکی کیا ہوئی.... جو امی نے پسند کر لی تھی۔"

کچھ یاد آنے پر پوچھا۔

"وہ لڑکی میرے پہلو میں بیٹھی ہے۔" وہ ذرا قریب ہوا.... وہ جھینپ گئی۔

"اور اس لڑکی کے لیے تو میں قیامت تک انتظار کر سکتا تھا۔" مزید جھک کر بولا تو اس کے گال دہکنے لگے۔

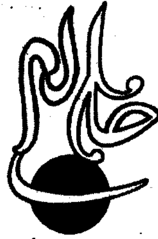
"کیونکہ اس کا انتظار امرت ہے۔"

"یہ کھسر پھسر تو ساری عمر کر سکتے ہیں آپ.... ابھی رسم نہ کر لیں۔"

کشف پیچھے سے ان دونوں کے سروں کے درمیان سر دے کر بولی تو دونوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے نام کی انگوٹھی پہنائی۔ فوٹوگرافر کی ایک کلک نے سٹیج پر موجود تمام مسکراتے چہروں کی کھلکھلاہٹ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لی.... محبت کی ایک اور کہانی اپنے انجام کو پہنچی اور عید کے دن عید ہو گئی۔

☆

نمرہ احمد



تالیہ مراد ایک کرمنل، جھوٹی، چور اور دغاباز ہے جو اپنا ماضی بھول چکی ہے۔ اسے صرف یہ یاد ہے کہ اسے ایک کشمیری خاندان نے اسے یتیم خانے سے لے کر اپنی لے پالک اولاد بنا لیا تھا مگر اس کی حیثیت ملازمہ کی سی تھی۔ انہوں نے اس کی شادی اسکائپ پر ایک ملائشین آدمی سے کردی۔ مگر وہ آدمی فراڈ نکلتا ہے۔ اور تالیہ کو منی لانڈرنگ کے لیے استعمال کرتا ہے۔

تالیہ صاحب کشف ہے اور اسے سچے خواب نظر آتے ہیں اسے اس فراڈ کا پتا چل جاتا ہے، ایئرپورٹ پر لیانہ جو خود بے سہارا ہے اس کی مدد کرتی ہے۔ دونوں اس فراڈی آدمی سے پیچھا چھڑا لیتی ہیں اور ایک دوسرے کا سہارا بن جاتی ہیں۔ تالیہ چیزیں چرا کر پہلے لوگوں کے لیے مسئلہ پیدا کرتی ہے پھر ان کرپٹنڈ فون پر، مردانہ آواز میں حالم بن کر ان مسائل کو حل کرتی ہے۔ یہی اس کا روزگار ہے۔ سب حالم کو ایک اسکام انویسٹی گیٹر کے طور پر جانتے ہیں، مگر پہچانتے نہیں۔ تالیہ عارضی طور پر تنکو کامل کی ملازمہ ہے وہ بھولی بن کر اس کا اعتماد حاصل کر لیتی ہے۔ مولیا، حالم کا کلائنٹ اور تنکو کامل کے حریف کا ملازم ہے۔

تالیہ کو بار بار خواب میں ایک سکہ نظر آتا ہے جو مظفر شاہ کے زمانے کا ہے۔ تالیہ کو کئی بار اسے چرانے کا موقع ملتا ہے مگر وہ اسے نہیں چراتی۔ داتن (لیانہ) چیزوں کی نقل بنانے کی ماہر ہے۔ سکے کی تاریخ یہ ہے کہ وہ کبھی کسی ایک شخص کے



پاس نہیں ٹھہرتا کسی نہ کسی وجہ سے گردش میں رہتا ہے اور جس کے پاس بھی ہوتا ہے وہ کسی موذی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ تالیہ ایک جھوٹی کہانی سنا کر یتیم خانے کی آیا سے اگلوا لیتی ہے کہ وہ پراسرار چمک دار سکہ جو چابی کا ایک حصہ ہے تالیہ کا ہی تھا۔ تالیہ کے قبضے سے نکلتے ہی وہ بجھ جاتا ہے اور ٹوٹ جاتا ہے اور تالیہ کی یادداشت چلی جاتی ہے۔ اب وہ سکہ تنکو کامل کے پاس ہے۔

تالیہ اب اکثر پریشان کن خواب دیکھتی ہے۔ ایڈم' عبداللہ کی جگہ گیارہ دن کے لیے فاتح رامزل کا باڈی مین بنتا ہے۔ اشعر' عصرہ رامزل کا بھائی خود وزیراعظم بننا چاہتا ہے اور اس لیے فاتح اور عصرہ کے خلاف سازشیں بھی کرتا ہے اور ان کا دم بھی بھرتا ہے۔ فاتح اس کی ہر سازش سے باخبر ہے۔ ایڈم اپنے خدشات کا اظہار کرتا ہے تو فاتح کی ذہانت اسے اس کا گرویدہ کر دیتی ہے۔ ایڈم فاتح کا بے لوث اور وفادار ملازم ہے۔

بریسلیٹ چرانے کا تالیہ اور داتن کا ہر منصوبہ ناکام ہو جاتا ہے۔ تالیہ سکہ چرانے کے لیے ایک امیر لڑکی کا روپ دھار کر عصرہ کی آرٹ گیلری میں پہنچتی ہے۔ جہاں اشعر کو وہ پسند آجاتی ہے۔

تالیہ کا لمس پاتے ہی عصرہ کے ہاتھ میں موجود بریسلیٹ چمکنے اور دہکنے لگتا ہے اور وہ اسے چرانے میں ناکام ہو جاتی ہے۔ تالیہ کی فاتح سے بھی ملاقات ہوتی ہے جو اسے تاشہ کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ ایڈم' تالیہ کو تنکو کامل کی ملازمہ کی حیثیت سے پہچان جاتا ہے۔ جس پر تالیہ ایک ہنگامہ کھڑا کر دیتی ہے۔ بالآخر ایڈم کو اس سے معذرت کرنا پڑ جاتی ہے۔ تالیہ کو بار بار القا ہوتا ہے اور وہ خود کو ایڈم کے ساتھ کسی خزانے کو تلاش کرتا دیکھتی ہے' جس کا کسی تاشہ کی لکھی ہوئی نظم میں ذکر ہے۔

تالیہ ایک لمبا ہاتھ مار کر پرسکون زندگی گزارنا چاہتی ہے' مگر داتن کی باتیں اسے حقیقت کی دنیا میں واپس لے آتی ہیں۔ عصرہ فاتح کے رویے سے شاکی ہے۔ پارلیمنٹ میں فاتح کی تعلیمی بل کو پذیرائی نہیں ملتی' مگر وہ ناامید نہیں ہوتا۔ فاتح' ایڈم کو حضرت عبدالمطلب کے ایفائے عہد کے بارے میں بتاتا ہے۔ عصرہ کے پاس جو پینٹنگ ہے' وہ نقلی ہے۔ تالیہ اسے باخبر کرنا چاہتی ہے' کیونکہ فاتح کی نظر میں تالیہ میں ذاتی کوئی خوبی نہیں' تو وہ اسے اپنی صلاحیت سے متاثر کرنا چاہتی ہے۔ عصرہ ایک یتیم خانے میں جاتی ہے۔ جہاں ایک مخبوط الحواس بچہ اسے مستقبل کے خطرے سے آگاہ کرتا ہے' مگر وہ ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔

ایڈم کو تالیہ مشکوک نظر آتی ہے۔ وہ تنکو کامل کے گھر اس کی حقیقت معلوم کرنے جاتا ہے۔ مولیا کے بلیک میل کرنے پر تنکو کامل اور اس کی بیوی تالیہ کو سرے سے پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

بدیعٰ' فاتح رامزل کا انٹرویو کرتی ہے' جہاں وہ ایک مگ کو دیکھ کر چونک جاتی ہے جو اشعر نے فاتح کو گفٹ کیا ہے۔ اس پر علامتی نشان ہیں۔

## چوتھی قسط

دان فاتح کے گھر کا لان لائیٹس سے جگمگا رہا تھا۔ اندھیرا چھانے لگا تھا اور ملازموں کی چہل پہل میں بھی اضافہ ہو چکا تھا۔ عصرہ لابی میں کھڑی تالیہ سے مل رہی تھی۔ یتیم خانے والے واقعہ کا اس کے چہرے پہ شائبہ تک نہ تھا۔ بھورے بال نفیس جوڑے میں باندھے' گہری نیلی اسکرٹ اور بلاؤز پہنے' گردن سے موتیوں کی لڑی چپکائے' وہ خوب صورت اور باوقار لگ رہی تھی۔

"مسز عصرہ... امید ہے آپ کے مصروف شیڈ ول میں مخل نہیں ہوئی ہوں گی۔" تالیہ نے اپنا سفید ہیٹ اتار کے اسٹینڈ پہ لگی کھونٹی پہ اٹکایا۔ سنہری بالوں کی فرانسیسی چوٹی بنا کے اسے بائیں کندھے پہ ڈالے' وہ پیروں تک آتا گلابی لباس پہنے ہوئے تھی اور کندھوں پہ نارنجی رنگ کا منی کوٹ تھا۔ ایسے لباس وہاں عموماً چینی عورتیں پہنتی تھیں۔

"مجھے مہمان اچھے لگتے ہیں تالیہ! بے فکر رہو۔"

عصرہ کہنے کے ساتھ اسے آگے لے آئی۔ بٹلر نے ادب سے دروازے کھولے اور وہ دونوں ڈرائننگ روم میں داخل ہوئیں۔ تالیہ نے میز پہ لاکٹ باکس کا بیگ رکھا تو عصرہ نے بیٹھتے ہوئے افسوس سے اسے دیکھا۔

"اس کی کیا ضرورت تھی تالیہ۔"

"مجھے آپ کے شایان شان لگا تو میں نے لے لیا۔" وہ مسکرا کے بولی تو عصرہ آگے کو بڑھی' باکس بیگ سے نکالا اور واپس ٹیک لگا کر اس کا ڈھکن ہٹایا۔ لاکٹ دیکھ کر اس کے ابرو پسندیدگی سے اٹھے۔

"بے عیب!" اور مسکرا کے باکس بند کر کے ایک طرف دھرا۔ جیسے وہ قیمتی تحفوں کی عادی ہو۔

ابھی دس منٹ ہی گزرے تھے کہ ملازم کھنکھار کے اندر داخل ہوا اور عصرہ کی طرف فون بڑھایا۔

"آپ کے بینک سے ہے۔"

"اس وقت؟" اس نے حیران ہو کر اسے کان سے لگایا۔ دوسری جانب واتن مہذب انداز میں پوچھ رہی تھی۔ "مسز عصرہ! آپ کے اکاؤنٹ سے ایک بھاری رقم آج نکالی گئی ہے' آپ مجھے اپنا اکاؤنٹ نمبر کنفرم کر سکتی ہیں؟"

"ایک منٹ۔ تالیہ!" معذرت کرتی وہ فون کان پہ لگائے باہر نکل آئی۔

چند منٹ بعد عصرہ فون پہ خفگی سے بولتی واپس ڈرائنگ روم کی طرف جاتی دکھائی دی۔ "آپ نے میرا اتنا وقت ضائع کروایا اور اب کہہ رہی ہیں کہ عصرہ محمد کا معاملہ تھا؟ میں عصرہ محمود ہوں' فار گاڈ سیک۔" اور اندر داخل ہوئی۔ "سوری تالیہ! میں...." چوکھٹ پہ وہ ٹھٹک کے رکی۔ چہرے پہ خوشگوار مسکراہٹ در آئی۔

اس کے دونوں بچے تالیہ کے برابر صوفے پہ بیٹھے تھے۔ ایک گیارہ سال کا لڑکا اور ایک آٹھ سال کی بے حد لمبے بالوں والی بچی۔

"ارے تم لوگ ادھر کب آئے؟"

"میں نے بلوایا تھا' مجھے ان سے ملنا تھا۔ اچھی کمپنی دیتے ہیں یہ۔" مسکرا کے وہ کہہ رہی تھی۔ عصرہ فون پہ بینک آفیسر کو جھڑکتے ہوئے سلسلہ کلام منقطع کرنے لگی اور اسی اثناء میں تالیہ آہستہ سے اپنا ہاتھ بچی کے پیچھے لے گئی۔ بچی تالیہ اور اپنے بھائی سکندر کے درمیان بیٹھی تھی۔ تالیہ نے بچی کے پرلی طرف کر کے زور سے چٹکی کاٹی اور پھرتی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ کن انکھیوں سے سی سی ٹی وی کیمرے کا رخ بھی دیکھ چکی تھی۔ وہ گھوم رہا تھا۔ اس طرف متوجہ نہیں تھا۔

جولیانہ چیخی اور فوراً" بائیں طرف بیٹھے بھائی کی ران پہ تھپڑ دے مارا۔ اس نے جواباً" طیش اور شاک سے جولیانہ کا کان مروڑا۔

"ماما اس نے مجھے مارا ہے۔"

"ماما! اس نے مجھے پہلے مارا تھا۔" وہ ایک دم رونے لگی تو عصرہ خفگی سے کھڑی ہوئی۔

"بیٹا! آپ گیسٹ کے سامنے کیا کر رہے ہو؟ چلو اٹھو' میں آپ کو آپ کے کمرے میں لے جاؤں۔"

"اٹس او کے مسز عصرہ۔ بچے ہیں یہ اور ان کو یہ بچپن دوبارہ نہیں ملے گا۔" اور پھر مسکرا کے اپنے

پرس میں ہاتھ ڈال کے بند مٹھی میں کچھ نکالا اور گھوم کے جولیانہ کی طرف متوجہ ہوئی۔
"او ہو بے بی! رو کیوں رہی ہو۔ چلو میں تمہیں ایک میجک دکھاتی ہوں۔" آواز کو پراسرار بنایا تو سکندر گردن نکال کے چونک کے دیکھنے لگا مگر جولیانہ ہنوز روئے جا رہی تھی۔ اسے کچھ نہیں سننا تھا۔
"یہ دیکھو۔ یہ چاکلیٹ میری مٹھی میں ہے نا۔" اس نے چاکلیٹ دکھا کے مٹھی بند کی اور پھر کھولی۔ مٹھی خالی تھی۔ جولیانہ ہتھیلی سے آنسو رگڑتی رک گئی۔ سکندر کا منہ کھل گیا۔
"چاکلیٹ کہاں گئی؟" ننھی پیاری بچی حیرت سے تالیہ کو دیکھ کے بولی۔
"سکندر کی جیب میں۔" سکندر چونکا' جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈال کے باہر نکالا تو اس میں ایک چاکلیٹ تھی۔
"واؤ!" وہ حیرت زدہ سا مسکرایا۔ تالیہ نے آنکھیں گھما کے عصرہ کو دیکھا تو وہ اسی طرح کھڑی محظوظ نظر آ رہی تھی۔ "یہ تم نے کیسے کیا؟"
"میجک۔" اس نے ملکے سے آنکھ دبائی۔
"میرے ساتھ بھی کریں نا۔" جولیانہ نے بے چینی سے جلدی جلدی آنکھیں رگڑیں۔ پھر حسرت سے سکندر کو دیکھا جو اپنی جادوئی چاکلیٹ کو تحیر اور خوشی سے کھول رہا تھا۔ تالیہ اس کی فرمائش پہ ذرا کنفیوز نظر آئی' پھر پرس کھنگالا اور کچھ مٹھی میں نکالا۔
"جولی۔۔۔ ان کو تنگ نہ کرو۔" عصرہ سامنے بیٹھتے ہوئے بولی مگر تالیہ نے روک دیا۔
"نہیں۔۔۔ ایک اور میجک ٹرک تو میں دکھا ہی سکتی ہوں۔ مجھے کوئی باریک چیز دیں۔" ادھر ادھر متلاشی نظروں سے دیکھا' پھر عصرہ کے ہاتھ کو دیکھ کے ٹھہری۔
"جولیانہ' ماما سے ان کا بریسلیٹ لے کر آؤ۔" (دل زور سے دھڑکا بھی تھا۔)
جولیانہ جھٹ آگے آئی اور ہاتھ بڑھایا تو عصرہ نے مسکرا کے بنا کسی تامل کے بریسلیٹ اتار کے اس کو تھما دیا۔ وہ اسے واپس تالیہ کے پاس لے کر آئی اور تالیہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ اسے پکڑا۔ وہ گرم نہیں ہوا۔ وہ جلا نہیں۔ وہ ٹھنڈا' شانت رہا۔ وہ عصرہ کی رضامندی سے اس کے ہاتھ میں آیا تھا۔
اس کے جادو کو انسانی ذہانت نے مات دے دی تھی۔
"یہ دیکھو۔" اس نے رومال پہ بریسلیٹ رکھا' پھر رومال کو تہہ بہ تہہ بند کرتی گئی۔ عصرہ بھی آگے کو ہو کے دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ جولیانہ اور سکندر اس کے گرد دم سادھے کھڑے تھے۔ آنکھیں رومال کی کھلتی تہوں پہ تھیں۔ یہ کھلی آخری تہہ' اور۔۔۔ اندر ایک ننھا پھول رکھا تھا۔ بریسلیٹ غائب تھا۔ بچوں کے منہ کھل گئے۔ عصرہ کے ابرو اکٹھے ہوئے۔
"جولیانہ۔۔۔ یہ پھول آپ اپنی پاکٹ میں ڈال لو۔" جولیانہ نے خوشی خوشی اسے اٹھایا اور پاکٹ میں ڈال دیا۔
"اور ماما کا بریسلیٹ؟" سکندر بے چین ہوا۔
"وہ تو تالیہ نے چرا لیا۔" وہ مسکرا کے بولی تو عصرہ مسکرا دی۔ بچے حیران ہوئے تو وہ ہنس دی۔
"ذرا وہ پھول نکالو جولیانہ۔"
جولیانہ نے جیب میں ہاتھ ڈال کے باہر نکالا تو اس میں کوئی پھول نہ تھا۔ بلکہ اس میں چمکتا دمکتا بریسلیٹ تھا۔
"واؤ۔" سکندر نے تالی بجائی اور جولیانہ مسکرانے لگی۔ اس نے بریسلیٹ خود پہن لیا اور عصرہ نے منع نہیں کیا۔ اسے اپنے بچوں سے زیادہ کوئی عزیز نہ تھا۔
"اوکے۔ بہت ہو گیا بچوں۔ اب آپ جاؤ۔ اور مجھے اپنی گیسٹ کے ساتھ باتیں کرنے دو۔" عصرہ خود بھی کافی محظوظ ہوئی تھی' لیکن اب بہت ہو چکا تھا۔ بچے تالیہ کو خوش اخلاقی سے خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔
"ٹرکس کا راز پوچھنا بداخلاقی نہ ہوتا تو میں ضرور پوچھتی۔"
"مجھے آپ خوش اخلاقی ہی پسند ہیں۔" اس نے مسکرا کے کہتے ہوئے پرس کو بند کیا اور آستین کے اندر

چھپایا ہوا اصلی بریسلیٹ پرس میں گرادیا۔) اس کی توقع کے عین مطابق بچی نے بریسلیٹ ماں کو فوراً واپس نہیں کیا تھا' اس لیے وہ کم از کم ابھی فرق نہیں پہچان سکے گی۔ گو کہ واتن کے نقال پہچاننا مشکل تھا مگر عصو ایک آرٹ کلیکٹر تھی۔ پھر بھی فی الحال کوئی خطرہ نہ تھا۔



کھانے کی لمبی میز ڈائننگ ہال میں سجی دکھائی دیتی تھی اور اس پہ تالیہ سربراہی کرسی کی سیدھ میں بیٹھی نیپکن گود میں پھیلا رہی تھی۔ ملازم اشیاء لالا کے رکھ رہے تھے۔ عصو گاڑیوں کی آواز سن کے باہر چلی گئی تھی۔

"اچھا لگا آپ کو دیکھ کے چے تالیہ۔" اشعر کی آواز پہ اس نے سر اٹھایا۔ وہ سامنے سے چلا آرہا تھا۔ تالیہ کی بے چین نظروں نے اس کے تعاقب میں دیکھا۔ وان فاتح نہیں تھا۔ پھر وہ جبراً" مسکرا کے اشعر کی طرف متوجہ ہوئی۔

"اتنی پر تکلف دعوت کا شکریہ' اشعر صاحب۔ امید کرتی ہوں آپ آگے بھی میرا ساتھ دیں گے۔"

"اور میں یہ جاننے میں انٹرسٹڈ ہوں کہ آپ کس کی سفارش لائی ہیں۔" وہ کرسی پہ بیٹھتے ہوئے بولا اور نیپکن اٹھالیا۔ گرے سلک ڈریس شرٹ پہنے' بغیر کوٹ یا ٹائی کے وہ بالوں کو سامنے سے اٹھائے کافی تیار لگ رہا تھا۔ گاہے بگاہے ایک گہری نظر اس پہ ڈالتا گویا اسے پڑھنے کی کوشش کررہا ہو۔ وہ بس ہلکا سا مسکرادی اور سر جھکا کے نیپکن درست کرنے لگی۔

فاتح بھی ساتھ ہی گھر میں داخل ہوا تھا مگر عصو نے اس کو باہر روک لیا تھا۔

"میں اس کو لاکھوں کی مالیت کی دو پینٹنگز بیچنا چاہتی ہوں' فاتح پلیز! یہ بات یاد رکھنا۔" وہ منت اور تنبیہہ دونوں کررہی تھی۔

"اچھا وہی لڑکی' ٹھیک ہے۔ تم بتاؤ میں کیا کروں۔" وہ صلح جو انداز میں بولا۔

"بس اس کو خفا نہ کرنا۔ پلیز۔"

"اوکے' بے فکر رہو۔" اس نے نرمی سے عصو کا سر تھپکا تو وہ نم آنکھوں سے مسکرادی۔

"آئی لو یو۔" ذہن میں ایک لمحے کے لیے بچے کی نیلی آنکھیں تازہ ہوئی تھیں مگر جب فاتح نے مسکرا کے جواب میں "لو یو ٹو" کہا اور آگے بڑھ گیا تو اس نے ساری سوچیں جھٹک دیں۔

کمرے میں آکے اس نے کوٹ اور ٹائی اتار کے پرے رکھی' پھر باتھ روم میں آیا۔ واش بیسن پہ جھک کے پانی کے چھینٹے منہ پہ مارے اور گیلا چہرہ اٹھا کے آئینے میں خود کو دیکھا۔

"یعنی اب مجھے اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لیے ایک obnoxious اور شو آف کی بورنگ لڑکی کو کمپنی دینی پڑے گی۔ چلو' عصو کے لیے یہ بھی کرکے دیکھ لیتے ہیں۔" تولیہ کھینچتے ہوئے وہ گہری سانس لے کر بڑبڑایا تھا۔

"تو آپ ساری عمر باہر رہی ہیں؟ یہاں اور وہاں میں کیا فرق۔۔۔" اشعر گردن موڑ کے تالیہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کررہا تھا کہ وان فاتح ڈائننگ ہال میں داخل ہوا۔ اس نے دیکھا کہ وہ جو اس کی بات سن رہی تھی' بے اختیار کھڑی ہوگئی۔

"ہاں تاشہ کیا حال ہے۔ بیٹھو بیٹھو۔" ہاتھ کے اشارے سے اسے مطمئن رہنے کا اشارہ کرتا وہ سربراہی کرسی تک آیا اور اسے کھینچ کے بیٹھا۔ کوٹ اتار چکا تھا۔ سفید شرٹ کے کف موڑ رکھے تھے۔ بال جو صبح گیلے کرکے جمائے تھے اب سوکھ کے ماتھے پہ بکھرے ہوئے تھے' اور وہ اس عام سے حلیے میں بھی سحر انگیز لگ رہا تھا۔

ایڈم کسی کونے سے نمودار ہوکر پیچھے آکھڑا ہوا تھا۔ تالیہ کو وہ دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ اور تالیہ بس فاتح پہ نظریں جمائے واپس بیٹھ رہی تھی۔ اشعر بالکل خاموش ہوگیا تھا۔ عصو میزبانی کے فرائض سرانجام دیتی ملازموں کو ہدایات دے رہی تھی۔

"تو کب آئیں تم؟ میں زیادہ لیٹ تو نہیں ہو گیا؟" دوستانہ انداز میں کہتے ہوئے فاتح نے نیپکن گلاس سے نکال کے جھٹک کے گود میں بچھایا اور ڈش میں سے چاول' پلیٹ میں نکالنے لگا۔ جانتا تھا' سب کھانا شروع کرنے کے لیے اس کے منتظر تھے۔

"آپ مجھے بار بار تاشہ بلاتے ہیں' میرا نام تالیہ ہے۔"

"اچھا' مجھے لگا میں تالیہ ہی کہہ رہا ہوں۔ خیر' کھانا شروع کرو۔ اشعر۔ لو۔" وہ سب کو عام سے انداز میں ہدایات دیتا خود شروع کر چکا تھا۔ تالیہ بھی آہستہ سے کھانا نکالنے لگی۔ ہاتھوں میں ذرا سی لرزش تھی۔ حلق بار بار سوکھ رہا تھا۔ یہ شخص۔ اف یہ شخص۔

"تو کیا بنا عصرہ تمہاری نیلامی کا! کل تک میں سن رہا تھا کہ تمہاری دوست ناراض ہو گئی ہے۔ وہ معاملہ حل ہوا؟" وہ بیک وقت عصرہ اور تالیہ' دونوں کو دیکھ کے بولا تھا۔ ساتھ ہی چاولوں کا چمچہ منہ میں رکھا۔

"ہاں' وہ غلط فہمی تھی' ایڈم نے کلیئر کر دی تھی۔" عصرہ خوش گوار انداز میں بولی۔ فاتح کا اچھا موڈ دیکھ کے وہ بہتر محسوس کر رہی تھی۔

"اسے بھول جائیے۔" اس نے مسکرا کے ایک نظر کونے میں کھڑے ایڈم کو دیکھا جس نے نظریں مزید جھکا لیں۔

"ہم تو اب نیلامی کا سوچ رہے ہیں۔ مسز عصرہ۔" وہ اپنائیت بھرے انداز میں کہتی عصرہ کی طرف متوجہ ہوئی۔ "میں مدعے پہ آتی ہوں۔ مجھے ہر صورت گھائل غزال خریدنا ہے۔" پھر ایک نظر اشعر کو دیکھا۔

اس نے مسکرا کے کندھے اچکائے۔ "میں سفارش ہی کر سکتا ہوں' آگے کاکا کی مرضی۔"

"تالیہ۔ مجھے بہت خوشی ہوگی اگر آپ اس پینٹنگ کو خریدیں گی مگر میں اس کو نیلامی واؤچر میں ڈال چکی ہوں۔ لوگ دور دور سے آئیں گے۔ اگر اب میں اس کو نکال دوں تو میری کریڈیبلٹی پہ برا اثر پڑے گا۔"

"میں سمجھ سکتی ہوں۔" پھر وہ رکی۔ ذرا افسردہ نظر آئی تھی۔

"کیا میں کچھ اور کر سکتی ہوں تالیہ؟" عصرہ نے دل جوئی والے انداز میں لقمہ لیتے ہوئے پوچھا تو وہ جھینپ کے مسکرا دی۔

"میں ایک دفعہ اس پینٹنگ کو چھونا چاہتی ہوں۔"

"اتنی سی بات؟ میں ابھی لاتی ہوں۔ وہ میرے پاس ہی ہے۔" عصرہ نے پلیٹ پرے کھسکائی' ٹشو سے لب تھپتھپائے اور کرسی دھکیلتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں ابھی تک سمجھ نہیں سکا کہ اس پینٹنگ میں اتنا خاص کیا ہے۔" فاتح پلیٹ پہ جھکے' کندھے اچکا کے بولا تھا۔ وہ ہاتھ روک کے اسے دیکھنے لگی۔

"اس میں ایک بے بس خوب صورت ہرن اکیلا زخمی حالت میں پڑا ہے' اور وہ زندہ ہے۔ وہ مرا نہیں ہے۔ تنہائی' بے بسی' محرومی۔ ان احساسات کا مکسچر ہے وہ پینٹنگ۔" وہ سنجیدگی سے بولی تھی۔

"اچھا' مجھے پتا ہے کیسا لگتا ہے؟" اس نے لقمہ لیا' پھر خاموشی سے چبانے لگا۔ حلق سے اتار لینے کے بعد آنکھیں اٹھا کے تالیہ کو دیکھا اور نرم مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگا۔ "مجھے لگتا ہے کہ آرٹ اچھا شوق ہے' میں اس کی قدر کرتا ہوں' مگر جن آرٹسٹوں کی زندگی میں ان کو کوئی پوچھتا نہیں تھا' ان کے مرنے کے بعد ان کی بنائی اچھی اور بے کار' دونوں طرح کی اشیاء کو اتنے کریزی ہو کر خریدنا۔ یہ مجھے نمود و نمائش لگتا ہے۔ جیسے لوگ دیکھا دیکھی میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہے ہوں۔"

"میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتی فاتح صاحب۔ قدیم ادوار ست ادوار تھے۔ لوگ جلدی مشہور نہیں ہو پاتے تھے۔ لیکن ہزاروں مصور تب بھی موجود تھے' مشہور صرف بہترین ہوئے ہیں۔"

وہ دونوں میز کے دونوں سروں پہ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ یوں کہ طویل میز درمیان میں حائل تھی۔ وسط میں اونچا سا شمع دان رکھا تھا جس پہ اوپر نیچے تین موم بتیاں جل رہی تھیں' وہ فاتح کا چہرہ ان کے شعلوں کے پار دیکھ رہی تھی۔

اشعر فاتح کے بائیں جانب بیٹھا' ٹینس میچ میں گیند کا تعاقب کرنے والی نظروں سے خاموشی سے دائیں بائیں۔ دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔
"مشہور؟" وہ تھوڑا سا مسکرایا اور باربی کیو کا ٹکڑا چھری کانٹے سے توڑتے ہوئے بولا۔ "صدیوں پہلے ایک اطالوی مصور نے ایک پینٹنگ بنائی تھی' جس نام مونالیزا تھا۔ چار سو سال تک وہ غیر مقبول رہی۔ مصورا سے سراہتے تھے' مگر عوام اس کو جانتے تک نہ تھے۔ وہ پیرس کے Louvre میوزیم میں ٹنگی ایک عام پینٹنگ تھی' مگر پھر اس کو کس نے مشہور کیا؟"
"چوروں نے" وہ سکون سے بولی۔ "انہوں نے مونالیزا چوری کرلی۔"
"رائٹ۔ مونالیزا جب غائب ہوئی تو وہ ایک خبر بن گئی۔ ایک خواب بن گئی۔ اخباروں کی زینت' ہر گفتگو کا محور۔ سب اس میں دلچسپی لینے لگے۔ میں مانتا ہوں وہ ایک بہترین پینٹنگ ہوگی گو کہ مجھے وہ کبھی سمجھ میں نہیں آئی' لیکن ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی اور چوروں نے اسے مشہور کیا تھا۔ مگر وہ اسے بیچ نہیں سکے اور دو سال بعد برآمد کرلی گئی۔"
"انہوں نے اسے بیچنے کے لیے نہیں چرایا تھا وان فاتح۔ انہوں نے اس کو پھر سے تخلیق کرنے کے لیے چرایا تھا۔" وہ اب کہنیاں میز پہ ٹکائے دونوں ہاتھ ایک دوسرے پہ رکھ کے ان پہ تھوڑی جمائے کہہ رہی تھی۔ اس کی توجہ کھانے پر سے ہٹ گئی تھی۔
چاولوں کا چمچہ بھرتا ذرا چونکا۔
"انہوں نے مونالیزا کی چھ نقول تیار کیں اور بے وقوف امریکی بزنس مینوں کو بیچ دیں۔ کئی ملین ڈالرز کے عوض۔"
"اور میں اس بات پہ حیران ہوں کہ انسان اتنی قیمتی چیزیں خرید تا ہی کیوں ہے جو کبھی بھی کوئی بھی چرا کے لے جائے۔" وہ شانے جھٹک کے بولا۔
"لگتا ہے آپ کو چور بہت برے لگتے ہیں۔" آواز میں اداسی سی تھی۔
"چوری کبیرہ گناہوں میں سے ہے' تاشہ۔"
"مگر آپ ہماری وزیراعظم صاحبہ کو ہر وقت چور کہتے رہتے ہیں' مگر وہ اپنے کاروبار کو تقویت دینے کے لیے ایسے لوگوں کے پیسے چراتی ہیں جو اپنی بے پناہ دولت کا خود بھی شمار نہیں جانتے۔ یہ تو بالکل ایسے ہے جیسے ہیروں کی دکان سے کوئی ایک ہیرا چرالے۔ اتنے بڑے جوہری کو ایک ہیرے کے جانے سے کیا فرق پڑتا ہے وان فاتح؟" وہ اس کی آنکھوں سے نظر ہٹائے بغیر کہہ رہی تھی۔
فاتح نے چمچہ پلیٹ میں رکھ دیا اور سنجیدگی سے تالیہ کی طرف متوجہ ہوا۔ "جوہری کو فرق پڑے یا نہ پڑے' مگر وہ تمام نوکری پیشہ لوگ جو اس ہیروں کی دکان کی حفاظت پہ مامور ہیں' سیکیورٹی گارڈ' کیشئیر' سیلز مین۔۔۔ کیا ان کی نوکریاں نہیں چلی جائیں گی؟" تالیہ کے حلق میں کچھ پھنسنے لگا۔ وہ پلک تک نہ جھپک سکی۔
"ٹھیک ہے۔ وزیراعظم چور ہے۔ بہت بری ہے وہ۔" حلق میں شاید آنسو تھے۔ "لیکن اگر وہ کہے کہ وہ اچھی ہونا چاہتی ہے۔ چوری چھوڑ کے نیک ہونا چاہتی ہے۔ تو کیا اسے معاف نہیں کیا جاسکتا؟"
"میں کون ہوتا ہوں معاف کرنے والا؟ اس نے میرا نہیں عوام کا پیسہ چرایا ہے۔ اگر وہ سارا پیسہ واپس کردے اور۔۔۔"
"ہاں۔۔۔ اگر۔۔۔ اگر وہ سارا پیسہ واپس کردے تو کیا وہ تب بھی بری ہوگی؟"
"تاشہ!" وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "وہ صرف چور نہیں ہے' وہ جھوٹی اور خائن بھی ہے اور جھوٹے لوگوں کے لیے جھوٹ چھوڑنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ناممکن نہیں مگر بہت مشکل۔ اور جانتی ہو ان کی سب سے بڑی سزا کیا ہوتی ہے؟ جب وہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا سچ بولنا چاہیں تو ساری دنیا ماننے سے انکار کردے۔ میرے معاف کرنے کے باوجود اس کو اپنے اعمال کے نتائج بھگتنا ہوں گے۔"
تالیہ کی آنکھیں خشک تھیں مگر دل پہ کسی نے پیر رکھ دیا تھا۔ "آپ کو چور اتنے برے کیوں لگتے ہیں؟"

"کیونکہ وہ صرف آپ کے پیسے نہیں چُراتے۔ وہ ان پیسوں سے جُڑے آپ کے خواب چرا لیتے ہیں۔"

"اور خواب چُرانے والوں کی کیا سزا ہونی چاہیے۔" وہ بنا پلک جھپکے اس کو دیکھ کے پوچھ رہی تھی۔

"ان کا... (فاتح نے کن انکھیوں سے اشعر کو دیکھا) دایاں ہاتھ کاٹ دینا چاہیے۔"

الفاظ کی ٹھنڈک پہ اشعر نے ذرا چونک کے اسے دیکھا مگر اب وہ کھانے کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ اسی اثناء میں کھٹکا ہوا تو تالیہ جبراً چہرے پہ مسکراہٹ لے آئی۔ عصرہ سامنے سے چلتی آرہی تھی۔ ساتھ بٹلر تھا جس نے لکڑی کا ڈبہ اٹھا رکھا تھا۔ ملازم نے فوراً تالیہ کے سامنے جگہ خالی کی اور بٹلر نے ڈبہ ادھر رکھا۔

"مجھے امید ہے تم بور نہیں ہوئی ہو گی تالیہ۔" وہ اپنی کرسی پہ واپس بیٹھتے ہوئے بولی تو تالیہ نے "ہرگز نہیں۔ فاتح صاحب سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔" کہتے ہوئے ڈبے کا ڈھکن ہٹایا۔ اندر شیشے پہ پینٹ کردہ زخمی ہرن اسی طرح تڑپتا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ وہ تھا جو اس نے پینٹ کیا تھا۔ وہ ایک ایک رنگ کو پہچانتی تھی۔

"بے عیب!" وہ پینٹنگ کی سطح پہ ہاتھ پھیر کے ستائش سے بولی۔ عصرہ مسکرا کے کھانا کھانے لگی۔ تالیہ نے ایک نظر چھری کو دیکھا جو ساتھ رکھی تھی اور پھر پینٹنگ کو۔ وہ ابھی چھری سے پینٹنگ کے فریم کو کاٹ کے اندر چھپا ہوا میٹریل ان کو دکھا سکتی تھی۔ جو ظاہر کر دیتا کہ وہ نقلی تھی۔ مگر اس سے پہلے اسے ایک اور کام کرنا تھا۔ فاتح کی ساری باتوں کو بھلا کے اس نے مسکراتا چہرہ اٹھایا۔

"اگر میں کوئی بڑی سفارش لاؤں تب بھی آپ اس کو مجھے نہیں دیں گی؟"

"مثلاً" کس کی سفارش؟" اشعر بڑی دیر بعد بولا تو تالیہ نے مسکرا کے فون اٹھایا اور نمبر ملا کے اسے چہرے کے سامنے کر لیا۔ اسپیکر آن تھا اور وہ تینوں رنگ ٹون سن سکتے تھے۔ وہ فیس ٹائم پہ کال ملا رہی تھی۔ فاتح اب سکون سے کھانا ختم کر رہا تھا۔

چند لمحے بعد اسکرین پہ ایک گندمی رنگت کے آدمی کا چہرہ نمودار ہوا۔ "مجھے تمہارا پیغام مل گیا تھا تالیہ۔ تم ضروری بات کرنا چاہتی تھیں؟" سلام کے بعد وہ بولا تھا۔

تالیہ نے مسکرا کے اسکرین عصرہ کے سامنے کی۔

"یہ شیخ جاسم ہیں' میرے اچھے جاننے والے۔ وہ گھائل غزال ان ہی کی ملکیت تھی۔ انہوں نے ہی دی ہو گی نا آپ کو؟" سادگی سے پوچھا۔

عصرہ کھاتے کھاتے رکی۔ بھنویں سکڑیں۔ چہرہ سامنے کیا۔ پھر آنکھوں میں تعجب اور بے یقینی در آئی۔

"السلام علیکم۔ آئی ایم سوری مگر... میں ان سے تو نہیں ملی۔ وہ تو کوئی اور تھے۔" وہ ایک دم چوکنی نظر آئی تھی۔ فاتح چونکا مگر اشعر اسی طرح بیٹھا رہا۔ پرسکون۔

"جی مسز عصرہ! آپ مجھ سے نہیں ملیں۔ آپ میرے کزن جاسم الثانی سے ملی تھیں اور وہ پینٹنگ اس نے آپ کو ہمارے پورے خاندان کی طرف سے عطیہ میں دی تھی۔" تالیہ جو مسکرا کے ساری کارروائی دیکھ رہی تھی' ان الفاظ پہ اس کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ فوراً سے اسکرین اپنی طرف موڑی۔

"اوہ۔ وہ آپ کے کزن تھے؟" دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔ الفاظ ختم ہو گئے تھے۔ (یہ سب ملے ہوئے تھے؟)

"جی بالکل۔ اب آپ کو مجھ سے کیا فیور چاہیے تالیہ۔"

وہ اس لمحے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا وہ شیخ کو اس کے ملازم کے اسکام سے آگاہ کرنے جا رہی ہے مگر یہاں تو...

"چونکہ آپ کے ہاتھ سے مسز عصرہ نے پینٹنگ وصول نہیں کی اس لیے میں کچھ کہنے کے قابل نہیں ہوں فی الوقت۔" الوداعی کلمات کہہ کر اس نے فون بند کیا' اس کا ذہن تیزی سے چل رہا تھا۔ بدقت مسکرا کے عصرہ کو دیکھا۔ "میں آپ کی خواہش کا احترام کرتی ہوں۔ میں کوئی سفارش کیلئے بغیر نیلامی میں دوسرے لوگوں کی طرح ہی حصہ لوں گی اور چاہے جتنی

قیمت ادا کرنی پڑے میں کروں گی۔"

"تالیہ..." عصرہ کچھ بے چین سی لگ رہی تھی۔ جیسے سوچ میں الجھی ہو۔ "تمہیں کوئی شک ہے پینٹنگ کے بارے میں کیا؟ مطلب تم آرٹ کی پہچان رکھتی ہو اگر کچھ کھٹک رہا ہے تو پینٹنگ تمہارے سامنے رکھی ہے۔ بتاؤ۔"

"جی تالیہ... بتایئے۔" اشعر بھی اتنی توجہ سے بولا تھا۔ اس نے باری باری دونوں کے چہروں کو دیکھا اور پھر... فاتح کو۔ وہ پھلوں کے رس کے گھونٹ بھرتا خاموش آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ تالیہ پینٹنگ پہ جھکی۔ اس کو باہر نکالا اور ذرا اوپر اٹھایا۔ عصرہ ہاتھ روک چکی تھی۔ سانس بھی تھم چکا تھا۔

وہ چند لمحے پینٹنگ اور اپنے ساتھ رکھی چھری کو دیکھتی رہی۔ دیکھتی رہی۔ پھر اس نے پینٹنگ واپس رکھی اور گہری سانس لے کر ان تینوں کو دیکھا۔

"یہ اصلی ہے۔ سو فیصد اصلی۔"

عصرہ کی سانس بحال ہوئی اور اشعر کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ (اس کو آرٹ کی پہچان نہیں ہے شاید صرف فیشن کی ہے۔ مگر اچھا ہے۔)

فاتح نیپکن سے ہونٹ تھپتھپاتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے اجازت!" پھر رک کے تالیہ کو دیکھا۔ "اچھا لگا تم سے مل کر۔ نیلامی میں ملاقات ہو گی اب۔" رسماً کہہ کر وہ باہر کی جانب بڑھ گیا۔ اس سے زیادہ پرفارمنس وہ نہیں دکھا سکتا تھا اور عصرہ مطمئن تھی۔

"مگر آپ مجھے ایک اور فیور تو دیں گی نا مسز عصرہ۔" وہ سوچتے ہوئے بولی تھی۔

☼ ☼ ☼

تالیہ مراد کے جانے کے بعد اشعر عصرہ سے مل کر دروازے تک پہنچا تھا کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔ شیخ جاسم کا میسج آیا تھا۔ اس نے مسکرا کے جواب لکھا۔ "میں جانتا تھا ہماری ڈونر آپ کی ہی سفارش لائے گی۔ مدد کا شکریہ۔ میری حکومت میں آپ کی اس مدد کا اچھا بدلہ ملے گا۔"

وہ اچھے موڈ میں لگ رہا تھا۔ پیغام بھیجا ہی تھا کہ ایک کال آنے لگی۔ موبائل کان سے لگا کے ہیلو کہا مگر دوسری جانب سے کہے گئے الفاظ سن کے رنگت بدلتی گئی۔

"کون سا مگ؟" چہرہ سفید پڑا پھر سرخ۔ "وہاٹ؟" وہ دھاڑا۔ پھر فون بند کیا اور تیزی سے واپس آیا۔ عصرہ کمرے میں جا چکی تھی اور ایڈم گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے ایڈم کو بازو سے تھام کے روکا۔

"آبنگ کہاں ہے؟"

اشعر کے تیور دیکھ کے وہ ٹھٹک گیا۔ "وہ اسٹڈی میں..."

اشعر نے اسے چھوڑا اور آگے دوڑا۔ دیوانہ وار زینے پھلانگے اور دھاڑ سے اسٹڈی کا دروازہ کھولا۔

وہ سامنے اپنی کرسی پہ بیٹھا لیپ ٹاپ پہ کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ ایک نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔ "اخبار میں موجود تمہارے ذرائع نے خبر دے دی تمہیں؟" ٹھنڈے انداز میں سوال کیا۔ وہ آندھی طوفان کی طرح اس کے سر پہ آپہنچا۔

"آپ نے... آپ نے ان کو میرا مگ دکھایا؟" میز پہ دونوں ہاتھ رکھ کے وہ جھکا اور غصے سے غرایا۔ فاتح نے عینک اتار کے پرے رکھی اور ٹیک لگا کے اسے فرصت سے دیکھا۔

"میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا کوئی الزام نہیں لگایا۔ تم اس اینٹی چائینز تنظیم کے ساتھ منسلک تھے ایش!"

"وہ برسوں پرانی بات ہے۔" اس نے زور سے میز پہ ہاتھ مارا۔ "وہ بچپن کا ایک کریز تھا۔ کسی کو بھی نہیں معلوم تھا۔ مگر آپ نے اسے کھول دیا۔ واؤ مجھے یقین نہیں آرہا۔ کل پورا ملک مجھے racist کہہ رہا ہو گا۔ سارے چینی اکٹھے ہو جائیں گے کہ میں چینی قوم سے نفرت کرتا ہوں۔ یا اللہ۔ یا اللہ۔"

وہ سیدھا ہوا اور پیشانی کو دونوں ہاتھوں سے تھاما۔ فاتح گال تلے تین انگلیاں رکھے اسے دیکھے گیا۔

"ایک لڑکا تھا۔۔۔ بہت ذہین بہت۔۔۔"

اشعر تیورا کے گھوما اور غصے سے اس کو دیکھا۔

"مجھے اس وقت آپ کی کوئی کہانی نہیں سننی۔"

"بہت عقل مند بہت پھرتیلا سا۔ اپنے ماں باپ کے بعد وہ سب سے زیادہ اپنی بہن سے قریب تھا۔ اکثر چھٹیاں گزارنے امریکہ آتا تھا۔"

اشعر تھم گیا۔ آنکھیں ابھی تک غصے سے لبریز تھیں مگر اب وہ سن رہا تھا۔ فاتح کے پیچھے کھڑکی کے شیشے پہ ٹپ ٹپ بارش برسنے لگی تھی۔

"جب میں رات دیر تک کام کرتا رہتا۔۔۔ تو میرے پاس آکر بیٹھ جاتا تھا۔ مجھ سے پوچھتا تھا' آبنگ! آپ اتنی محنت کس چیز کے لیے کر رہے ہیں؟ میں اس کو بتاتا کہ میں اسٹیٹ اٹارنی (شہر کے پراسیکیوٹر) کا الیکشن لڑ رہا ہوں۔ وہ پوچھتا' آبنگ! لوگ الیکشن کیوں لڑتے ہیں؟ تو میں کہتا مختلف وجوہات ہوتی ہیں مگر ایک وجہ سب میں مشترک ہوتی ہے۔" اس کی نظریں اشعر پہ جمی تھیں' جو اسے لب بھینچے دیکھ رہا تھا۔

"اور وہ ہے۔۔۔ طاقت حاصل کرنے کا جنون۔ خود مختاری اور طاقت۔۔۔ یہ سب کو اچھی لگتی ہے۔ تب وہ نوجوان لڑکا مجھ سے کہتا تھا' آپ میں اور آپ کے مقابل میں پھر کس شے کا فرق ہے اگر آپ دونوں کو طاقت ہی چاہیے؟"

پانی کے قطرے زور زور سے کھڑکی پہ برس رہے تھے گویا شیشے کو چکنا چور کر ڈالنا چاہتے ہوں۔ اشعر کا تنفس آہستہ ہو چکا تھا۔ رنگت بحال ہو رہی تھی۔ وہ بس خاموش نظروں میں چبھن لیے فاتح کو دیکھے جا رہا تھا۔

"تب میں نے اس کو بتایا کہ جو میرا مخالف ہے وہ ایک دفعہ اسٹیٹ اٹارنی رہ چکا ہے اور اس نے بڑے بڑے مجرموں کے کیس رشوت لے کر بند کیے ہیں۔ اس کو طاقت اپنی دولت بڑھانے کے لیے چاہیے۔ مجھے طاقت زمین پہ اللہ کا انصاف قائم کرنے کے لیے چاہیے۔ پھر اس نے پوچھا۔ انسان کو معلوم کیسے ہوتا ہے کہ کسی کو طاقت کیوں چاہیے؟ میں نے کہا' اس کے طور طریقے سے۔ تب جانتے ہو اشعر' اس لڑکے نے مجھ سے کیا کہا تھا؟" اس کی آواز میں دکھ در آیا اور اشعر۔۔۔ اس کی فاتح پہ جمی آنکھوں میں گلابی نمی اترنے لگی۔ پلکیں بھیگنے لگیں۔

"اس لڑکے نے کہا۔ آبنگ! اگر میں کبھی طاقت کی ہوس میں مبتلا ہو جاؤں تو مجھے روک لینا۔"

باہر بجلی زور سے کڑکی۔ پل بھر میں سارا شہر روشن ہو گیا' اشعر کی آنکھ کے کنارے پہ آنسو اٹکا ہوا تھا۔ اگلے ہی پل پھر سے اندھیرا چھا گیا۔ آنسو اس نے اندر اتار لیا۔

"آپ کو لگتا ہے مجھ میں اور آپ میں فرق نہیں؟" وہ سابقہ غراہٹ سے بولا تھا۔ "آپ وائٹ نائٹ ہیں اور میں سیاہ بھیڑ؟ مگر نہیں۔ ہم دونوں ایک جیسے ہیں کیونکہ ہم دونوں کو ایک ہی چیز چاہیے۔ آپ نے وزیراعظم بن کے وہی کرنا ہے جو موجودہ وزیراعظم کر رہی ہے۔ کرسی لینے کے بعد سب ایک سے ہو جاتے ہیں' آبنگ۔" پھر اس نے افسوس سے دائیں بائیں گردن ہلائی۔ "مگر مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ یوں مجھے تباہ کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"وہ لیکن میں تمہیں تباہ نہیں کر رہا۔" اس نے ہلکے سے شانے اچکائے۔ "میں یہ بات لائیو ٹی وی پہ بھی کہہ سکتا تھا مگر میں نے اس اخبار کا انتخاب کیا جہاں تمہیں وقت سے پہلے خبر مل جائے گی مگر اس رپورٹر کو چنا جو خبر لگائے گی ضرور۔ میں نے ایش' تمہیں ایک موقع دیا ہے۔" وہ ٹیک لگائے' نرمی سے کہہ رہا تھا۔ "کل جب تم ایک اسکینڈل کی زد میں ہو گے اور تمہیں racist کا خطاب مل جائے گا اور تم چائنیز اکثریت ووٹر کھو دو گے' تو میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم اس کو فکس کیسے کرو گے۔ ایک بزنس مین کی طرح یا ایک لیڈر کی طرح؟ اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے حق میں دستبردار ہو جاؤں تو پہلے مجھ پہ ثابت کرو کہ تم۔۔۔ مجھ سے۔۔۔ بہتر ہو۔ تب میں اس بارے میں سوچ سکتا ہوں ورنہ۔۔۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور سامنے کھڑے اشعر کے برابر آکر اس کا چہرہ افسوس سے

دیکھا۔ ”ورنہ پھر ہم دونوں کرسی کے لیے لڑیں گے۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ لڑنا تمہارا حق ہے مگر میں یہ ضرور دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم کیسے لڑو گے۔ میں نے اس لڑائی میں آریانہ کو کھویا ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم کچھ کھونے کی اہلیت رکھتے ہو یا نہیں۔“

وہ جواباً ”نفرت سے پھنکارا۔ ”مجھے معلوم تھا، ہم ایک دن اس مقام پہ ضرور آئیں گے۔ آپ کو معلوم نہیں تھا۔ میں تیار ہوں ”آپ نہیں۔“ ہاتھ اٹھا کے اشارے سے سلام کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اسٹڈی سے باہر نکل گیا۔ فاتح ہولے سے مسکرایا اور واپس کرسی پہ بیٹھا۔

(تیار تو دور کی بات ایش۔ میرے پاس کوئی کارڈ بچا ہی نہیں ہے کھیلنے کے لیے۔ میں نے ساری عمر تم پہ اعتبار کیا اور تم نے ہر طرف سے مجھے مفلوج کردیا۔) کھڑکی کے باہر بارش کو دیکھتا وہ زخمی سا مسکرا رہا تھا۔ خود پہ۔ زندگی پہ۔ ہر شے پہ۔

✲ ✲ ✲

وہ لاؤنج میں داخل ہوئی اور پرس اٹھا کے زور سے فرش پہ پھینکا، پھر غصے و بے بسی کے عالم میں صوفے سے کشن اٹھا کے دیوار پہ مارا۔ آوازیں سن کے داتن نیچے تہ خانے سے اوپر آئی تو دیکھا، وہ سر دونوں ہاتھوں میں گرائے صوفے پہ بیٹھی تھی۔

”بریسلیٹ نہیں ملا؟“

تالیہ نے چہرہ اٹھایا تو آنکھیں گلابی پڑ رہی تھیں۔ ”مل گیا ہے۔“

”یعنی گرائے بے بی اسکام کام کر گیا۔ گڈ! پھر منہ کیوں لٹکا ہوا ہے؟“ وہ دونوں ہاتھ کمر پہ رکھے حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”پینٹنگ کی اصلیت نہیں کھول سکی۔ وہ شیخ ملا ہوا تھا۔ اس نے نوفل کی اسٹوری کو پکا کر دیا۔“

داتن کا منہ کھل گیا۔ ”اوہ۔ مگر تم یہ بتا سکتی تھیں کہ پینٹنگ نقلی ہے۔“

”کیسے بتاتی؟“ وہ زہر خند ہوئی۔ ”میں سچ بولتی کب ہوں جو اتنا بڑا سچ بولتی؟ بڑی ہمت چاہیے ہوتی ہے سچ کے لیے داتن اور میرے پاس وہ نہیں تھی۔“ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

داتن نے افسوس سے گہری سانس لی۔ ”میری بچی۔ خود کو معاف کرنا سیکھو۔“

وہ جواباً ”تلخی سے کچھ سے کہنے لگی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ داتن اٹھنے لگی مگر وہ آنکھیں رگڑتی کھڑی ہو گئی۔ ”تم بیٹھو۔ ملازمہ تھوڑی ہو تم جو بٹلر نہیں ہوگا تو تم یہ کام کرو گی۔ میں خود دیکھتی ہوں۔ اور شاید تھوڑی دیر کے لیے واک پہ چلی جاؤں۔ مجھے تازہ ہوا کی ضرورت ہے۔“ خود کو سنبھالتی وہ دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

پورچ میں اندھیرا تھا۔ صرف ایک بتی روشن تھی۔ وہ قدم قدم اٹھاتی گیٹ تک آئی مگر پھر۔ ٹھہر گئی۔ رفتار سست پڑ گئی۔

گیٹ اور چار دیواری چھوٹی اور برائے نام تھی۔ سامنے کھڑے شخص کے سینے تک اونچی تھی۔ اور وہ شخص۔ تالیہ کا سانس منجمد ہو گیا۔

وہ درمیانی عمر کا مرد تھا۔ سانولا، چمکتی آنکھوں والا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا ڈھٹائی سے مسکرا رہا تھا۔

”میں نے جب سنا کہ اشعر محمود کسی تالیہ مراد کی تفتیش کروا رہا ہے تو میں کھٹک گیا تھا۔ سوچا، ہو نہ ہو یہ وہی تالیہ ہے۔ میری سابقہ بیوی۔“

وہ دم سادھے اسے دیکھ رہی تھی۔ ”سمیع!“ لب پھڑپھڑائے۔

”اور یہ بھی سنا ہے کہ وہ تم میں دلچسپی لے رہا ہے۔ یعنی شادی وغیرہ کرنا چاہتا ہے۔ تو میں نے تمہارا پتا اچکا اور یہاں آ گیا۔ اور اب سوچ رہا ہوں کہ پہلے کیوں نہیں آیا۔“ ستائش سے اس نے گردن اٹھا کے اونچے بنگلے کو دیکھا جو بت بنی تالیہ کی پشت پہ کھڑا تھا۔

”بڑا مال بنا لیا ہے تم نے۔ یقیناً امیر دوست بنائے ہوں گے۔ ان کو محبت کے جال میں پھنسایا ہوگا اور پھر لوٹ کے چھوڑ دیا ہوگا۔ تم جیسی خوب صورت مگر اکیلی لڑکیاں اس کے علاوہ کچھ کر بھی نہیں سکتیں۔ لیکن کیا

ہے تالیہ کمس۔" وہ گیٹ کے جنگلے پہ ہاتھ رکھے آگے بڑھا۔وہ اس سے دو میٹر کے فاصلے پہ تھی' پھر بھی یک لخت پیچھے ہٹی۔ آنکھوں میں خوف تھا۔

"اس دفعہ بندہ غلط چُنا ہے تم نے۔ سیاست دان؟ چچ چچ۔ جانتی ہو سیاست دانوں کو فرشتہ صفت بیویاں چاہیے ہوتی ہیں۔ کیا اسے معلوم ہے تم پہلے بھی شادی کر چکی ہو اور منی لانڈرنگ میں انوالو رہی ہو' یقیناً" نہیں۔ یو نو واٹ۔ میرے پاس نکاح کی ویڈیو تک پڑی ہے مگر طلاق کہیں رجسٹر نہیں ہوئی تھی۔ اگر چاہوں تو میں تمہیں ابھی بھی اپنی بیوی کلیم کر سکتا ہوں' اور ایک دفعہ یہ ذکر کھلا تو وہ سیاست دان تمہیں باہر اٹھا کے پھینک دے گا۔ لیکن۔۔۔" وہ رکا۔ دو انگلیوں سے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے مسکرایا۔ وہ برف کا مجسمہ بنی سن رہی تھی۔

"لیکن اگر۔۔۔ تم میرا کوئی ماہانہ وظیفہ مقرر کر دو یہی کوئی دو تین لاکھ ہر ماہ کے۔۔۔ تو میں تمہیں تنگ نہیں کروں گا۔ ابھی تم ذرا شاکڈ ہو گئی ہو' خیر ہے سنبھل لو' پھر آؤں گا میں۔

اب وہ ٹہلتا ٹہلتا سڑک پہ دور جاتا دکھائی دے رہا تھا اور تالیہ۔ وہ شل کھڑی تھی۔

جیسے کاٹو تو لہو نہیں۔

مارو تو جان نہیں۔

## میراث پدر من

اس نے دیکھا۔۔۔ ایک نیم تاریک کمرہ ہے جس کی چوکھٹ پہ وہ ننھی لڑکی کھڑی ہے۔۔۔ کھلے لمبے بال اور پیروں تک آتا لباس۔۔۔ اندر ایک آدمی پشت کیے بیٹھا ہے۔۔۔ اس کے آگے آگ جل رہی ہے اور وہ جھک کے سلاخ پہ کسی شے کو دہکا رہا ہے۔۔۔ چھوٹی لڑکی قدم قدم چلتی اس کے کندھے کے پیچھے آ رکتی ہے۔

"بابا!" اس کے پکارنے پہ وہ چونک کے گردن موڑتا ہے۔۔۔ جیسے برے خواب سے جاگا ہو پھر جبرا" مسکرا دیتا ہے۔

"تم سوئیں نہیں' تالیہ؟"

"وہ لوگ کون تھے جو ابھی یہاں سے گئے ہیں؟"

اس کی کم عمر' باریک آواز گونجتی ہے تو وہ دوبارہ چونکتا ہے' پھر اس کا ہاتھ تھام کے اسے ساتھ بٹھاتا ہے۔

"میرے دوست تھے۔۔۔ فوج کے ساتھی!" اور سلاخ کو انگاروں پہ پلٹتا ہے۔ اس کے سرے پہ سونے کے سکے جیسا کچھ ہے۔

بچی ہتھیلیوں پہ چہرہ گرا کے سوچ میں ڈوبی کہتی ہے۔ "مگر وہ سپاہی تو نہیں لگتے تھے۔ میں نے خود سنا تھا' وہ بار بار ہمبورو کہہ رہے تھے۔"

"یا اللہ تالیہ۔۔۔" مراد کے ہاتھ میں پکڑی سلاخ لرزتی ہے۔ گھبرا کے ادھر ادھر دیکھتا ہے۔

"یہ ہمبورو (شکار باز) کون ہوتے ہیں' بابا؟"

"شش۔۔۔" اس نے بوکھلا کے اسے چپ کرایا۔

"تم یہ لفظ اب نہیں بولو گی۔ اگر شہر میں کسی نے سن لیا تو ہم سب مار دیے جائیں گے۔"

"مگر بابا۔۔۔ وہ کسی خزانے کی بات کر رہے تھے؟"

اس کی آنکھیں پھر چمکیں۔ "مجھے بتاؤ بابا۔۔۔ کیا کوئی خزانہ ہے بابا؟"

آدمی گہری سانس لیتا ہے اور سلاخ آگ سے اوپر اٹھا کے دکھاتا ہے۔۔۔ اس کے سرے پہ گول سکہ اور ڈلی جڑی ہے۔ سنہری چابی۔

"جب یہ چابی تیار ہو جائے گی تو ہم اس کی مدد سے خزانہ ڈھونڈ لیں گے اور پھر ہمارے شہر کے لوگوں کو عافیت مل جائے گی۔"

بچی کی آنکھیں دہکتی چابی پہ جم سی جاتی ہیں۔ لب کھل جاتے ہیں۔ تحیر سے' ستائش سے۔۔۔ "یہ چابی کس کی ہے؟"

"انسانوں کے سب سے بڑے خزانے کی۔۔۔ میں اس کو اپنے لوگوں کی مدد کے لیے تیار کر رہا ہوں۔۔۔ چاند کی اکیسویں پہ یہ تیار ہو جائے گی۔۔۔ پھر یہ ہمیں خود خزانے تک لے جائے گی۔"

"وہ کیسے؟" وہ دلچسپی سے پوچھتی ہے۔

"جو اس چابی کو پہلی دفعہ پہنتا ہے' وہ اس کو راستہ

خود دکھاتی ہے' اس کو اس جگہ خود لے جاتی ہے جہاں خزانے کا قفل ہے۔ ہمارے گاؤں کے لوگوں کے مسئلے ختم ہو جائیں گے۔ سب امیر ہو جائیں گے۔" وہ دھیرے دھیرے سمجھا رہا ہے۔

"اسے سب سے پہلے کون پہنے گا؟" اس کی نظر دہکتی چابی پہ ٹکی ہے جس کو وہ دوبارہ آگ میں ڈال رہا ہے۔

"میں... صرف میں... تم اس کے قریب بھی نہیں آؤ گی... اب جا کر سو جاؤ..." وہ آخر میں درشتی سے کہتا ہے' مگر اس کی نظریں ابھی تک چابی پہ ٹکی ہیں جس پہ چند ہندسے بار بار ابھر کے مٹ رہے ہیں... جیسے وہ بہت سے الفاظ اپنے اندر رچتی جا رہی ہو۔

وہ عجیب سے ہندسے تھے...

* * *

تالیہ واپس لاؤنج میں داخل ہوئی تو اس کا چہرہ وہ نہ تھا جس کے ساتھ وہ گھنٹی بجنے پہ اٹھ کے باہر گئی تھی۔ وہ برف کی مانند سفید پڑ رہی تھی۔ ٹھنڈی۔ بے جان۔

داتن اسی اثنا میں دوریان (پھل) اٹھا لائی تھی اور میز پہ رکھ کے اب انہیں کاٹ رہی تھی۔ دروازہ کھلا تو منہ میں پھل بھرے' اس نے کچھ کہتے ہوئے سر اٹھایا تو تالیہ کو دیکھ کے ٹھٹکی۔ وہ سفید بے جان کپڑے کی گڑیا کی طرح گویا پانی پہ قدم رکھتی آ رہی تھی۔ گم صم۔ شل۔

"کون تھا؟" داتن نے پلیٹ پرے ہٹائی۔ ماتھا ٹھنکا۔

"سمیع۔"

"کون؟ وہ بجلی کے محکمے میں جو ہمیں..." وہ یاد کرنے ہی لگی تھی کہ تالیہ بات کاٹ کے بولی۔

"میرا شوہر... میرا ایکس!" داتن کا منہ کھل گیا۔ آنکھوں میں پہلے حیرت اور پھر صدمہ ابھرا۔

"وہ... وہ سمیع؟"

تالیہ بے دم سی صوفے پہ گر گئی۔ آنکھیں کہیں دور خلا میں ٹکی تھیں۔

"کیا کہا اس نے؟" داتن پریشانی سے اٹھ کے اس کے پاس آئی۔ "اس نے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش تو نہیں کی تمہیں؟ تم نے مجھے کیوں نہیں بلایا؟"

"وہ مجھے ڈرانے آیا تھا... شاید وہ اشعر کو جانتا ہے۔ دھمکا رہا تھا کہ اشعر کو بتا دے گا کہ میں فراڈ ہوں۔"

"اس کو کیسے معلوم کہ ہم اسکامرز ہیں؟" داتن چونکی۔

"مگر یہ تو معلوم ہے کہ میں کسی فوت شدہ امیر خاندانی آدمی کی وارث نہیں ہوں۔ اگر اس نے بتا دیا کہ میں لاہور سے شادی ہو کر آئی تھی تو سوال اٹھیں گے کہ میں نے یہ دولت کیسے بنائی۔ وہ میرا کور بلو کر دے گا۔ سب ختم ہو جائے گا۔" اس کی آنکھیں گلابی پڑنے لگیں۔ وہ شدید ذہنی دباؤ اور خوف کے زیر اثر تھی۔

"مگر اس کو اشعر وغیرہ کا کیسے علم ہوا؟"

"مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ اس کو میرے گھر کا معلوم ہو گیا ہے اور اب وہ پیسے مانگ رہا ہے۔ اوہ داتن... وہ سب کچھ ختم کر دے گا!" اس نے سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا تھا۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے تھے۔

"تم تو بہت بہادر ہو تالیہ۔ ایسے گھبراؤ تو نہیں۔ تم تو بڑے بڑوں کو انگلیوں پہ گھما دیتی ہو' میری بچی۔"

تالیہ نے بھیگی آنکھیں اٹھا کے اسے دیکھا۔ ”سمیع وہ پہلا آدمی تھا جس نے مجھے دھوکہ دیا تھا۔ میں کبھی بھی اس کے خوف سے باہر نہیں نکل پائی۔“

داتن نے دلاسا دینے والے انداز میں اس کے دونوں ہاتھ تھامے۔ وہ بے بسی سے روتے ہوئے کہتی جا رہی تھی۔

”میں تو سب کچھ چھوڑنے والی تھی۔۔۔ بس آخری واردات۔۔۔ بس آخری چوری کرنی تھی اور اب سمیع سب خراب کر دے گا۔۔۔ یا اللہ۔۔۔ اگر اس نے وان فاتح کو بتا دیا کہ میں فراڈ ہوں تو وہ مجھے بھی ایسے دیکھیں گے جیسے وزیراعظم کو دیکھتے ہیں۔ میں ان کی نظروں میں نہیں گرنا چاہتی۔“ اس کا سر پھٹنے کو تھا۔

”کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ تم تالیہ ہو۔ تمہارے پاس ہمیشہ پلان ہوتا ہے۔ میری بات سنو۔“ داتن نے اسے شانوں سے تھام کے جھنجھوڑا۔ ”تم وہی کرو گی جو میں کہوں گی۔ تم زخمی ہرن کی پینٹنگ کے معاملے اور اس سکے کو ڈھونڈنے پہ فوکس کرو۔ سمیع کو مجھ پہ چھوڑ دو۔ میں اس کا منہ بند کرنے کا طریقہ ڈھونڈ لوں گی۔“

تالیہ نے گہری سانس لی اور ہتھیلیوں کی پشت سے آنکھیں رگڑیں۔ اب وہ ابتدائی صدمے سے نکل آئی تھی اور اس کا ذہن کام کرنے لگا تھا۔ اب کے وہ بولی تو آواز بھیگی ہوئی، مگر سنبھلی ہوئی تھی۔

”کچھ کرو، داتن۔ ایک دفعہ وہ چابی مل جائے تو میں وان فاتح کی زندگی سے دور چلی جاؤں گی۔ بس تب تک سمیع کا منہ بند رکھنے کی کوشش کرو۔“

”ایسا ہی ہوگا اور ہاں۔۔۔ بریسلیٹ مل گیا نا؟“ داتن کو خیال آیا تو پوچھا۔ تالیہ پھیکا سا مسکرائی۔

”ہاں۔ جیسے ہم ویٹرس بن کے پارٹیز میں عورتوں کے بچوں کو رلا کر ان کا زیور چھپاتے تھے بالکل اسی طرح۔ کرائے بے بی اسکام۔ مجھے بس اب وہ سکہ ڈھونڈنا ہے۔“

”اور مجھے سمیع کا حل۔“ داتن اٹھی اور اپنی چیزیں اٹھا کے پرس میں ڈالنے لگی۔ کشن کے پیچھے سے ایک پرانی چھوٹی کتاب اٹھائی۔ (ہم شکار باز)۔ تالیہ اب بے چینی اور پریشانی سے بڑبڑا رہی تھی۔

”کہاں ہو سکتا ہے وہ سکہ؟ نہ اس کو نیلامی پہ رکھ رہی ہیں عصرہ، نہ وہ فاتح کے سیف میں تھا۔ یقیناً“ عصرہ کے لاکر میں ہوگا یا گھر میں کسی دوسری جگہ۔“

داتن نے کتاب بیگ میں ڈال کر دوسری چیزوں تلے چھپا دی اور اسے پکارا۔

”سمیع پہ مجھے ابھی سے کام شروع کرنا ہوگا۔ میں چلتی ہوں۔“

تالیہ پھیکا سا مسکرائی اور اس کی پھلوں والی پلیٹ کو دیکھا۔ ”تم دوریان کھا بھی نہیں سکیں میری وجہ سے۔“

”تالیہ!“ داتن نے مسکرا کے اسے دیکھا۔ ”میری پیاری بچی۔۔۔ میری ہرنی۔۔۔ میری بلی۔۔۔ تمہارے لیے میں ہر شے قربان کر سکتی ہوں۔۔۔ مگر۔۔۔“ چہرے پہ غصہ طاری کیا ”تم نے سوچا بھی کیسے کہ میں دوریان قربان کروں گی۔ ہونہہ۔“ موٹی عورت نے یہ کہہ کے دوریان کی پلیٹ اٹھائی، ایک قاش منہ میں رکھی اور دھپ دھپ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

تالیہ کے ابرو اکتاہٹ سے اکٹھے ہوئے۔ ”میری پلیٹ واپس نہ لائیں تم تو دیکھنا۔“ پیچھے سے پکارا، مگر داتن ناک سے مکھی اڑاتی باہر نکل چکی تھی۔

داتن کے جاتے ہی گھر ایک دم خاموش اور سنسان ہو گیا تھا۔ اونچا محل اور اندر مقید وہ تنہا شہزادی۔۔۔ خیال سا آیا تو چونکی اور پرس کھولا۔ اندر بریسلیٹ رکھا تھا۔ اس نے احتیاط سے اسے نکالا۔ دل دھڑکا، مگر وہ ٹھنڈا رہا۔ تالیہ نے اسے ہاتھ میں نہیں پہنا بلکہ گردن تک لے گئی۔ زنجیر لمبی تھی۔ عصرہ اس کے کنڈے کو پہلی کڑی میں ٹائٹ کر کے ڈالتی تھی تو وہ کلائی پہ فٹ بیٹھتا تھا۔ تالیہ نے اسے گردن سے لگایا اور آخری کڑی میں کنڈا ڈالا۔۔۔ وہ اس کی گردن پہ فٹ آ گیا۔۔۔ کسی پھندے کی طرح۔۔۔

ایک دم اردگرد روشنی ہوتی گئی۔۔۔ تیز روشنی۔۔۔ تب اس نے وہ منظر دیکھا۔۔۔ چابی کو دہکا تا اس کا

باپ اور اس سے سوال پوچھتی ننھی تالیہ... شکار باز... فوجی دوست... گاؤں کے لوگ... خزانہ... ساری باتیں گڈمڈ ہورہی تھیں۔

اس نے زنجیر نوچ کے گردن سے اتاری۔ روشنی غائب ہوگئی۔

حواسوں میں واپس آنے میں اسے چند لمحے لگے تھے۔ سنہری زنجیر صوفے سے نیچے جاگری تھی... اس نے جھک کے اسے اٹھایا۔ وہ بے نور رہی' مگر تالیہ کی آنکھوں میں تحیر' خوف اور جستجو مل جل کے ابھرنے لگی تھی۔

"شکار باز...؟ مگر کس چیز کے شکاری؟" وہ آنکھیں چھوٹی کرکے لاکٹ کو دیکھتی بڑبڑائی تھی۔

"تو یہ تھے میرے بابا... پہلی دفعہ دیکھا ان کو..." وہ خواب کو سمجھنے کی کوشش کررہی تھی۔ "بابا فوج میں تھے... اور ان کے دوست بھی... شکار باز۔ کوئی ایسی تنظیم جس پہ پابندی ہوگی... اور یہ لوگ خزانہ تلاش کررہے تھے... اپنے گاؤں کے غریبوں کی مدد کرنے کے لیے۔" وہ دور خلا میں دیکھتی کڑیاں ملارہی تھی۔

"اور وہ چابی... وہ شاید انہوں نے مجھے پہنادی ہو۔ میں اسے پہن کے دور کسی چرچ میں نکل گئی ہوں گی اور کھوگئی ہوں گی۔ چابی اترتے ہی میری یادداشت چلی گئی ہوگی اور میں کسی کو بتا نہیں سکی ہوں گی کہ میں کہاں سے آئی ہوں' مگر پھر مجھے میرے بابا نے ڈھونڈا کیوں نہیں؟" اس کا ذہن الجھ رہا تھا۔ "شاید پیچھے سے لوگوں کو معلوم ہوگیا ہو کہ وہ شکار باز ہیں اور وہ کسی مشکل میں پھنس گئے ہوں۔ شاید وہ جان سے چلے گئے ہوں۔" دل کانپا۔ "شاید میرے پیچھے کوئی اس لیے نہ آیا ہو کیونکہ کوئی زندہ ہی نہ رہا ہو۔ پورا گاؤں تباہ ہوگیا ہو۔ یہی وجہ ہوسکتی ہے۔ یہی کہانی ہے میری اور میری ساری یادداشتیں اسی سونے کی ڈلی میں محفوظ ہیں۔"

اب وہ احتیاط سے لاکٹ کو ٹشو میں لپیٹ رہی تھی۔ عصرو کے بریسلیٹ کو اس نے لاکٹ بنالیا تھا۔ اپنی داستان اب کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی تھی۔

مگر کیا اس کی داستان اتنی سادہ تھی؟

ایسا کیا تھا جو اس کے بابا میں بہت عجیب سا تھا... جو اس کمرے اور اس ننھی بچی میں بھی تھا... کچھ بہت انوکھا اور منفرد... جس کو سمجھنے کے لیے اس کی عقل چھوٹی پڑرہی تھی... کچھ غلط تھا...

☆ ☆ ☆

داتن کا اپارٹمنٹ چھوٹا' مگر آرام دہ لگتا تھا۔ دروازے کے باہر سرسبز گملے رکھے تھے۔ وہ لفٹ سے اتری اور چلتی اپنے دروازے تک آئی ہی تھی کہ پیچھے سے اس کے بیٹے کی آواز سنائی دی۔ "ماں۔"

چابی لاک میں گھساتی داتن رکی اور حیرت سے مڑ کے دیکھا۔ ٹوپیس پہنے ایک نوجوان چلا آرہا تھا۔ سیاہ رنگت اور نقوش داتن جیسے ہی تھے اور لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔ داتن کے سارے وجود میں خوشی پھیل گئی۔

"عدنان' تم آج کیسے؟ آج تو ویک اینڈ نہیں ہے۔" وہ دونوں جب اندر آگئے تو داتن اپنا سامان میز پہ رکھتے ہوئے خوش گوار حیرت سے پوچھنے لگی۔

عدنان اب صوفے کے کنارے پہ آگے کو ہوئے ٹک گیا تھا' اور ایک گھٹنا بے چینی سے ہلا بھی رہا تھا۔

سوال پہ ننھی داڑھی کھجاتے ہوئے کندھے اچکائے۔ "آپ آرام سے آکر بیٹھیں تو میں بتاتا ہوں۔"

"میں قہوہ لے آؤں۔" وہ رسان سے کہتی کچن کی طرف آئی۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئی اور ٹرے سامنے رکھی۔ اس میں قہوے کے ساتھ بسکٹ سے بھرا ایک جار بھی تھا۔

"میں نے یہ گندم والے بسکٹ بنائے تھے۔ تم دونوں کو پسند ہیں۔ واپسی پہ لیتے جانا۔" وہ مسکراتے ہوئے اسے قہوہ پیش کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"آپ کی جاب کیسی جارہی ہے؟؟"

داتن نے چونک کے اسے دیکھا۔ "جاب؟؟"

"لائبریری کے علاوہ کسی امیر عورت کے ہاں ہاؤس کیپنگ کرتی ہیں نا آپ۔"

"ہاں... ساشا میڈم کے ہاں۔" داتن نے گہری

سانس لی۔ "اچھی جارہی ہے ہم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"کیا وہ آپ کو قرضہ دے سکتی ہیں؟ اصل میں۔۔۔" اس نے کپ اٹھا کے گھونٹ بھرا۔ بسکٹ کو چھوا بھی نہیں۔ "مجھے نیا کاروبار شروع کرنا ہے بھاری رقم چاہیے۔ میں سود سمیت واپس کردوں گا۔ واپسی کی تو آپ فکر ہی نہ کریں۔"

داتن کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ پیالی میں چائے انڈیلتے ہاتھ رک گئے۔ نظریں کپ پہ جھکی رہیں۔

"کتنی رقم چاہیے؟" آہستہ سے تھرماس واپس رکھا اور نظریں جھکائے چائے میں چینی ڈالنے لگی۔

عدنان نے جھٹ رقم بتائی۔

"یہ تو کافی زیادہ ہے مگر میں میڈم سے مانگ لوں گی۔ کب تک چاہیے؟" پلکیں جھکائے وہ چمچ ہلا رہی تھی۔ ایک ہاتھ سے بسکٹوں کا جار اٹھا کے قدموں کے پاس رکھ دیا۔

"اگر دو تین دن میں مل جائے تو میں کچھ سامان خرید لوں گا۔ کام جلد شروع ہو سکے گا۔"

"میں تمہارے اکاؤنٹ میں بھیج دوں گی۔ تمہیں مجھے ریمائنڈ بھی نہیں کروانا پڑے گا۔"

"اوکے تھینک یو ماں۔" اس کا چہرہ فرط مسرت سے چمکنے لگا تھا۔ پھر کلائی کی گھڑی دیکھی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے کہیں ضروری پہنچنا ہے۔ چلتا ہوں۔" پھر رک کے داتن کے پیروں کے ساتھ رکھے بسکٹوں کے جار کو دیکھا۔ "کیا یہ میرے بچوں کے لیے بنائے ہیں آپ نے؟" جیسے یاد نہ آیا ہو کہ ابھی ماں نے بسکٹوں سے متعلق کیا کہا تھا۔

لیانہ صابری نے پیر سے جار کو صوفے کے نیچے ذرا سا دھکیلا۔ "نہیں۔ یہ شوگر فری ہیں۔ ساشا کے لیے بنائے تھے۔ وہ ہر وقت ڈائٹ اور ایکسرسائز کے چکر میں زیادہ کھاتی پیتی نہیں ہے نا۔ تم جاؤ میں پیسے بھیج دوں گی۔" نظریں اٹھا کے ویرانی سے اسے دیکھا تو وہ مسکرایا اور سلام جھاڑتا باہر نکل گیا۔

چھوٹا سا فلیٹ بالکل خاموش رہ گیا۔ سوگوار۔ تنہا۔ ویران۔ داتن کی چائے اسی طرح رکھی تھی اور وہ بے دلی سے اسے دیکھے جارہی تھی۔ ذہن کا پردے پر کچھ مناظر ابھر رہے تھے۔

سات سال قبل کی وہ گرم صبح جب سارا کوالالمپور پسینے سے پگھل رہا تھا۔ ایسے میں ایئرپورٹ کی عمارت کے اندر معمول کا رش اور شور تھا۔ آوازیں' اعلانات' الوداعی ملاقاتیں اور آنے والوں کو خوش آمدید کہنا۔ مگر لیانہ صابری کو اس وقت کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ سیاہ فام بھاری بھرکم عورت جس کے گھونگھریالے بال جوڑے میں بندھے تھے' سر جھکائے ہاتھ رومز کے آگے بنے فرش پہ وائپر سے موپ لگا رہی تھی۔

("سمجھا کریں ماں' ہم مزید ساتھ نہیں رہ سکتے۔ میری بیوی کو ڈاکٹرز نے ریسٹ کا کہا ہے' آپ کے ساتھ رہے گی تو روز جھگڑا ہوگا اور اس کی صحت پہ برا اثر پڑے گا۔ وہ یعقوب بھی تو ہے آپ کا بیٹا' آپ اس کے ساتھ بھی رہ سکتی ہیں۔)

سر جھکائے وائپر لگاتی لیانہ کی آنکھ سے آنسو ٹپکا اور فرش پہ جا گرا۔ اگلے ہی لمحے پوچے کے دھاگوں نے اسے وائپ کر کے فرش کو صاف کر دیا۔ پہلے عدنان اور اب یعقوب کی آواز سنائی دینے لگی۔

(میرے ساتھ؟ نہیں ماں۔ یہ ممکن نہیں۔ عدنان اور اس کی بیوی تو پاپا کے بنائے گھر میں رہ رہے ہیں' وہ وہاں سے آپ کو کیسے نکال سکتے ہیں۔ میرا فلیٹ تو پہلے ہی بہت چھوٹا ہے اور تنخواہ کم ہے۔ مگر میرے دوست کی والدہ اولڈ ہوم میں رہتی ہیں' تمام سہولیات میسر ہیں' خوراک' رہائش' آرام۔ اور پھر اپنی عمر کے لوگوں کا ساتھ بھی ہوگا۔ ان کے اتنے دوست بن چکے ہیں وہاں اور۔۔۔)

آنسو ٹپ ٹپ فرش پہ گر رہے تھے۔ پھر اس نے آنکھیں زور سے رگڑیں اور بے رحمانہ انداز میں پوچا دائیں سے بائیں لگایا۔ بکٹ اٹھائے وہ ٹوائلٹس کی طرف آئی اور آخری ٹوائلٹ کا دروازہ سختی سے دھڑ دھڑایا۔

"کون ہے اندر؟ نکل بھی آیئے۔ مجھے صفائی کرنی

ہے۔" (جیولری اسٹور کے مالک نے تمہیں نوکری سے نکال دیا ہے لیانہ۔ اس کو جوان اور خوب صورت لڑکی مل گئی ہے۔ تمہاری دوست کی حیثیت سے سمجھا رہی ہوں' اب کسی اسٹور میں تمہیں ملازمت نہیں ملے گی۔ کیونکہ.....)

اب کانوں میں ایک دوست کی آواز گونجنے لگی تھی۔

باتھ روم سے جو لڑکی باہر نکلی وہ' وہ تالیہ نہیں تھی جس کے ساتھ اب وائتن کام کرتی تھی۔ وہ ایک ڈری' سہمی' قدرے الجھی ہوئی لڑکی تھی' جس کی آنکھیں رونے کے باعث سرخ نظر آرہی تھیں۔ کڑھائی والی شلوار قمیص' کندھوں پہ دوپٹا اور ہاتھوں پہ مٹی مٹی سی مہندی۔ اس کے پاس ایک ایسا بیگ تھا جس سے وہ خود بھی ناواقف تھی۔ لیانہ کو وہ بیگ اور اس کے حالات دیکھ کے سارا معاملہ بھانپنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ ایئرپورٹ پہ اکثر ایسا ہوتا تھا۔ یا لڑکیاں مجبور ہوتیں' یا ناواقف۔ مگر یہ لڑکی بہرحال یہ ماننے کو تیار نہ تھی کہ اس کا شوہر یہ سب کر سکتا ہے۔

لیانہ نے اسے چھپ چھپاتے ایئرپورٹ سے نکلوایا اور اپنی دوست کے گھر لے آئی جہاں وہ خود بطور پے انگ گیسٹ کے رہ رہی تھی۔ تالیہ سمجھدار تھی' ذہین بھی۔ بات جلدی سمجھ جاتی اور تیزی سے وہ کام کر ڈالتی۔ دوست کے سامنے لیانہ کی رشتے دار کی اداکاری بھی اچھی کرلی لیکن وہ اب بھی پریشان اور سوگوار تھی۔ یہاں تک کہ اس نے اسکائپ پہ اپنے شوہر سمیع سے رابطہ کیا تو اس کا انداز اور باتیں... ہر شے..... اس کا رہا سہا شک رفع کرنے کے لیے کافی تھی۔

اب لیانہ کو لگا کہ تالیہ مان گئی ہے کہ اس کے شوہر نے اسے صرف استعمال کیا اور آگے بھی کرے گا کیونکہ نوجوان گھریلو لڑکیوں کے بیگز ایئرپورٹ پہ کم ہی کھولے جاتے ہیں۔ لیکن مان جانے کے بعد وہ بالکل چپ ہوگئی۔ سمیع کو معلوم نہ تھا وہ کدھر ہے۔ وہ لیانہ کی دوست کے اس کمرے میں بالکل مقید ہو کے رہ گئی۔ خاموش۔ صدمے میں۔

پھر چند دن بعد اس نے خود کو سنبھالنا شروع کیا۔

اس سے لیانہ کا کوئی رشتہ نہ تھا لیکن وہ لڑکی اسے اچھی لگی تھی۔ بے حد ذہین اور قابل لیکن بے بس اور دکھی۔ خود کو ٹکڑا ٹکڑا کر کے اس نے جوڑا اور سمیع سے رابطہ کیا۔ شرط یہی طے پائی کہ وہ اسے طلاق دے گا تو وہ بیگ واپس کرے گی۔ سمیع کاغذات کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا اور چونکہ اس کے اسکائپ کے نکاح کا بھی کوئی ثبوت نہ تھا۔ (وہ ملائیشیا اپنے ملے پس منظر کے باعث آئی تھی۔ سیاؤ زویزا پہ نہیں۔) اور تالیہ اس سے جان چھڑانا چاہتی تھی' اس کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ اس کو فون پہ طلاق دے ڈالے۔ وہ ایک نئے ملک میں تنہا لڑکی تھی جس کو پیچھے بھی سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا۔ سمیع سے کچھ بعید نہ تھا کہ معاملہ کتنا لٹکائے اور کاغذات کے لیے اس کو سمیع سے ملنا پڑتا اور لیانہ کو ہمیشہ لگا کہ وہ سمیع کا نام سن کے بھی خوف زدہ ہو جاتی ہے۔

اس نے تالیہ کو کسی ایسی چیز سے ڈرتے نہیں دیکھا جو عموماً" اس کی عمر کی لڑکیوں کو خوف زدہ کیے رکھتی ہیں۔ طوفان' سانپ' بچھو۔ کبھی واک کرتے ہوئے کوئی موذی کیڑا نظر آجاتا تو وہ اس کو جوتے تلے مسل کے آگے بڑھ جاتی۔ لیانہ کو اچھا نہ لگتا۔ ملے لوگ سانپوں کو بھی نہیں مارتے کہ ان کا دل دکھتا ہے۔ مگر وہ لڑکی مار ڈالتی تھی۔ ایک سمیع کے خوف سے وہ کبھی نہیں نکلی۔ طلاق لے لی' بیگ واپس ہوگیا' تعلق ختم مگر اس کے ذکر پہ وہ چونک چونک جاتی تھی۔ وہ واحد آدمی تھا جس نے تالیہ کو اسکام کیا تھا اور وہ بھی ایسا کہ اس کا ذہن مفلوج ہوگیا تھا۔

لیانہ نے اسے ایک ریستوران میں نوکری دلوا دی۔ ویٹرس کی نوکری۔ لیانہ خود لائبریری میں کام کرتی تھی۔ دونوں اس کی دوست کے کمرے میں ہی رہتی تھیں۔ وہ زندگی کی طرف واپس آنے لگی تھی۔ ویٹرس بن کے محنت مشقت کر کے پیسے جوڑنا... لیانہ کو یہ تالیہ کے مسائل کا بہترین حل لگتا تھا۔



ریستوران میں اس روز معمول کی گہما گہمی تھی۔ تالیہ ٹرے میں چپس' برگر اور کوک کے گلاس رکھے سامنے سے چلتی آرہی تھی۔ یونیفارم پہنے' پونی کے اوپر پی کیپ جمائے' وہ سادہ اور سپاٹ سی ویٹرس لگ رہی تھی۔ ایک میز پہ تین مرد بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ تالیہ ان کے پاس رکی اور باری باری ٹرے سے اشیاء نکال کے سرو کرنے لگی۔ ایک رک کے یوں ہی اسے دیکھنے لگا۔ جیسے ہی وہ مڑی اور آگے بڑھی' اسے لگا کسی نے اسے چھوا ہے۔

وہ بدک کے پیچھے ہٹی اور غصے سے اس کو دیکھا۔ وہ آدمی مسکرا کے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"تفریح چاہیے تو گلی کے پار جاؤ..... وہاں چند رنگٹ کے عوض تفریح مل جاتی ہے۔ یہاں آکر تمیز سے کھانا کھایا کرو۔" غصے سے غرا کے آگے بڑھ گئی مگر ان پہ کوئی اثر نہیں ہوا۔ تینوں مسکراتے رہے۔

چند قدم دور گئی تھی کہ ایک کی آواز سنائی دی۔ اس نے کوئی نازیبا بات کہی تھی۔ تالیہ کی رنگت سرخ ہوئی۔ اس کا ہاتھ قریبی میز کی طرف رینگا جہاں ایک چھری رکھی تھی۔ اس نے سرعت سے چھری اٹھائی اور گھما کر ایک دم ان کی طرف دے ماری۔ چھری گول چکر کی صورت گھومتی..... فضا میں اڑتی ہوئی..... سیدھی ان کی میز کے ساتھ دیوار کے وسط میں پیوست ہوگئی..... جیسے کسی ماہر نشانہ باز نے نشانہ باندھا ہو.....

دو گھنٹے بعد وہ لیانہ کے ساتھ اس کی لائبریری کے باہر ایک کیفے میں بیٹھی تھی اور فنگر چپس کھاتے ہوئے بولے جا رہی تھی۔

"اور پھر بہت شور واویلا ہوا۔ آخر میں میری یہ نوکری بھی چلی گئی۔ بہت سی گالیوں اور لعن طعن کے ساتھ ریستوران کی مالکن نے مجھے کسی شکاری کی اولاد کا طعنہ بھی دے دیا۔" وہ کہہ کے ہنس دی جیسے خود بھی انجوائے کر رہی ہو یا شاید وہ زیادہ مضبوط ہوگئی تھی۔

"مگر تم نے اتنا اچھا نشانہ باندھنا کس سے سیکھا۔" لیانہ حیران تھی۔

"پتا نہیں۔ میں بچپن سے اچھے نشانے لگالیتی ہوں۔ شاید مجھے یہ سارے کام آتے ہیں۔" اس نے بے پروائی سے شانے اچکا دیے اور کھاتی رہی۔

"مگر ایسی کیا بات ہوئی جو تم اتنی خوش ہو؟" لیانہ نے آنکھوں کی پتلیاں سکیڑ کے غور سے اسے دیکھا تو تالیہ نے چمکتی ہوئی آنکھیں اٹھائیں' ادھر ادھر دیکھا۔ احتیاط سے آگے ہوئی اور پرجوش سرگوشی میں بولی۔

"کیونکہ جس نے میرے ساتھ بدتمیزی کی تھی میں نے جاتے جاتے اس کا بٹوہ بھی نکال لیا۔ اور اس میں اتنے ڈھیر سارے پیسے ہیں۔" ہاتھ میز پہ رکھا تو اس میں ایک نوٹوں سے بھرا بٹوہ بھی تھا۔

"تم کسی شکاری کے ساتھ ساتھ کسی چور کی اولاد بھی لگتی ہو' تالیہ۔" وہ خفگی سے بولی تھی۔

"ہمیشہ شکار بننے سے شکاری بننا بہتر ہے موٹی عورت۔"

"مجھے موٹی عورت مت کہا کرو۔"

"تو کیا داتن پدوکا کہوں؟" (داتن پدوکا بوڑھی دادی قسم کی خواتین کے لیے دیا جانے والا سرکاری اعزاز ہوتا ہے۔)

"تو کیا میں کسی داتن پدوکا سے کم ہوں؟" وہ گردن اکڑا کے بولی تو تالیہ کے لب حیرت سے کھل گئے۔

"تمہارا خواب یہی ہے کیا؟ کہ ایک دن سرکار تمہیں داتن پدوکا کا ٹائٹل دے؟"

"اگر ہے بھی تو کیا۔ اتنے سال جیولری اسٹور اور اس لائبریری کی خدمت کی ہے میں نے۔ حق بنتا ہے میرا۔" وہ نتھنے پھلائے برا مان کے بولی تو تالیہ نے بے اختیار مسکراہٹ دبائی۔

"اوکے۔ جب میں بہت امیر ہو جاؤں گی' میرا جزیرے پہ وہ اونچا محل بن جائے گا تو میں تمہیں یہ اعزاز دلوا دوں گی۔"

"یہ اعزاز امیر لوگ نہیں دلوا سکتے تالیہ مراد۔ یہ صرف پردھان منتری (وزیراعظم) دلوا سکتا ہے۔"

"تو پھر میں....." وہ اٹھی اور میز پہ دونوں ہاتھ رکھ کے جھک کے شرارت سے بولی۔ "..... پردھان منتری سے شادی کرلوں گی اور اس سے پہلی درخواست یہ

کروں گی کہ وہ تمہیں سچ مچ کی داتن پدو کا بنادے۔ خوش؟"

اس وقت کا وزیر اعظم ایسا بوڑھا اور ٹھگنا تھا کہ داتن یہ سب سوچ کے ہی کھلکھلا کے ہنس دی تھی۔ چائے ختم ہو گئی تھی۔ داتن کے ذہن کا پردہ خالی ہو گیا تھا۔ اس نے چونک کے سر اٹھایا تو دیکھا.... وہ اپنے فلیٹ میں تنہا بیٹھی تھی۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے موبائل اٹھایا اور اپنے اکاؤنٹ کا بیلنس چیک کیا۔ اس میں بے پناہ رقم تھی۔ اس نے عدنان کو میسج لکھا۔

"ساشا بی بی ادھار دینے پہ راضی ہیں' میری تنخواہ سے کٹ لیں گی' تم واپسی کی فکر نہ کرو' بس کاروبار پہ دھیان دو' صبح پیسے بھجوادوں گی۔"

پیغام بھیج کر دل خالی سا ہو گیا تھا۔ پھر اٹھی اور جار اٹھالیا۔ اسے ان بسکٹس کو تالیہ کے لیے رکھنا تھا۔ یہ محبت سے بنائے گئے تھے۔ داتن کی کہانی میں ان کا تالیہ کے سوا کوئی حقدار نہ تھا۔

پھر اسے سمیع کو کھوجنے کا کام شروع کرنا تھا۔



وان فاتح کے اونچے محل پہ چاند پوری آب و تاب سے چمکتا دکھائی دے رہا تھا۔ ایڈم کچن سے اپنی چیزیں لے کر نکلا تو اشعر کو دھڑا دھڑ زینے اترتے دیکھا۔ وہ اس چہرے کے ساتھ نہیں پلٹا تھا جس کے ساتھ اندر گیا تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں' ماتھے پہ بل تھے اور ہاتھ میں پکڑے موبائل پہ تیز چلتی انگلیاں۔ زینے پھلانگتا وہ سیدھا باہر نکل گیا۔

"اشعر آیا تھا واپس؟" عصرہ نے اپنے بیڈروم کے دروازے سے گردن باہر نکال کے حیرت سے اسے پکارا۔

"جی میم.... شاید باس سے کوئی بات کرنا تھی۔ اب وہ چلے گئے ہیں۔" اس نے رسان سے مطلع کیا تو اس نے سر ہلادیا۔ پھر ایڈم کے چہرے کا ہیجان دیکھ کے رکی۔

"کچھ کہنا ہے تمہیں ایڈم؟" غور سے ملازم کو دیکھا جو متذبذب لگ رہا تھا۔ سوال پہ نظریں جھکا کے جھینپ گیا۔

"نہیں وہ.... میم.... مجھے کچھ چاہیے تھا۔" کہہ کے خود بھی پریشان ہو گیا۔

عصرہ نے ہاتھ دروازے سے ہٹالیے اور بازوؤں کو سینے پر لپیٹ لیا۔ "کس سلسلے میں۔"

"وہ... میری منگیتر.... میری شادی ہو رہی ہے کچھ ماہ بعد.... مگر اس سے پہلے...."

"پیسے چاہئیں؟" اس نے بات کاٹ کے سادگی سے پوچھا تو ایڈم نے چونک کے نظریں اٹھائیں۔

"نہیں میم۔ ہرگز نہیں۔" اس کا جیسے دل دکھ گیا تھا۔

"مجھے صرف ایک مشورہ چاہیے تھا۔"

"اچھا بتاؤ.... کیا پوچھنا ہے؟" وہ نرمی سے بولی تو لڑکے نے آنکھیں اٹھائیں۔ ماتھے پہ ابھی تک اداسی سے در آنے والی لکیریں تھیں۔ عصرہ کو اس پہ ترس آیا۔ تیئس چوبیس برس کا نوجوان جو اگر کسی بڑے گھر میں پیدا ہوا ہوتا تو آج یوں کسی کی ملازمت نہ کر رہا ہوتا۔ خیر۔

"میری منگیتر کی سالگرہ ہے' میں پوچھنا چاہتا تھا کہ اسے کیا تحفہ دوں۔"

"اتنی سی بات؟" وہ مسکرادی۔ ایڈم کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے۔ "کوئی اس کا پسندیدہ پرفیوم' یا کسی اچھے برانڈ کا جوڑا' یا کوئی اچھی کتاب۔ اگر ہو سکے تو جیولری دے دو۔" پھر رکی۔ "وہ سکہ جو میں نے تمہیں دیا تھا' جو تنکو کامل کے بیٹے نے فاتح کو گفٹ کیا تھا' وہ سنبھال رکھا ہے نا؟"

"جی میم۔" ایڈم نے جھٹ سر ہلایا۔

اس روز تنکو کامل کے گھر سے واپسی پہ جب ایڈم نے کوٹ کی جیب سے سکہ نکال کر عصرہ کو امانت واپس کرنی چاہی تو وہ جو کار سے نکل کے اندر جارہی تھی' کچھ سوچ کے مڑی اور اسے دیکھا۔ "یہ تم رکھ لو۔"

"میں؟ مگر یہ تو اینٹیک ہے اور...."

"اینٹینک نہیں ہے یہ مگر ہے سونے کا۔ زیور وغیرہ بنوالینا۔ میں تمہیں کپڑوں پہ کچھ زیادہ ہی ٹوک گئی آج۔" وہ سادہ مگر بلا جھجک انداز میں کہہ رہی تھی۔ یہ اس کا مداوے کا ایک طریقہ تھا۔

"مگر اس نے فاتح صاحب کو دیا تھا اور....."

"اور جب جب میں اسے دیکھوں گی مجھے یاد آتا رہے گا کہ فاتح نے ایک ننھے بچے کا کیسے دل دکھایا ہے۔" اس کا اشارہ فاتح کا سکے کو نقلی کہنے پہ علی کامل کا چہرہ بجھ جانے کی طرف تھا۔ "رکھ لو۔" وہ شان بے نیازی سے کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

"جی میم.... وہ سکہ ماں نے سنبھال رکھا ہے۔"

"اس کی انگوٹھی وغیرہ بنوالو اور اس کو دے دو۔ خوش ہو جائے گی۔"

ایڈم نے سمجھداری سے سرہلایا اور تشکر سے مسکرایا۔ "شکریہ میم!" عصرہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر کو جنبش دی اور پیچھے ہٹ کے دروازہ بند کر دیا۔

"تم نے وہ لاکٹ دیکھا جو مہمان خاتون تالیہ نے بیگم صاحبہ کو تحفے میں دیا ہے؟" وہ اپنا بیگ اٹھانے کچن میں آیا ہی تھا کہ دونوں ملازمائیں فریج کھولے کھڑی کھسر پھسر کرتی دکھائی دیں۔

"ہاں.... اف.... کیا خوب صورت لاکٹ تھا۔ مہنگا بھی بہت ہوگا۔ تم نے اس کے اندر لگے ہیرے دیکھے؟ پورے پانچ تھے۔"

"یا اللہ!" وہ حیران ہوا۔ "تم لوگ مالکوں کی چیزوں پہ اتنی گہری نظر رکھتی ہو کیا؟"

ملازمہ پلٹی اور تندی سے اسے گھورا۔ "ملازم کا کام نظر رکھنا ہی ہوتا ہے۔ چاہے آگے مالک ہوں یا دوسرے ملازم" پھنکار کے اطلاع دی اور واپس مڑ گئی۔

مگر ایڈم محمد ایک دم بالکل سن رہ گیا۔ ملازم کا کام نظر رکھنا ہی ہوتا ہے۔ چاہے آگے مالک ہوں یا دوسرے ملازم؟

ذہن میں بجلی کا کوندا سا لپکا اور اس کے چودہ طبق روشن کر گیا۔

بیگ اٹھا کے وہ بے اختیار باہر کو بھاگا۔

تنکو کامل کے گھر کے گیٹ کے باہر گیلی سڑک ویران پڑی تھی۔ رات کی تاریکی کو اسٹریٹ پولز نے روشن کر رکھا تھا۔ بارش کچھ دیر ہوئی رک چکی تھی۔ ایسے میں سامنے اگے درختوں کی اوٹ میں ایڈم کھڑا تھا۔ سادہ شرٹ پینٹ میں ملبوس وہ آنکھیں چھوٹی کر کے گیٹ پہ جمائے ہوئے تھا۔ بالآخر گیٹ کھلا اور ایک ملازمہ باہر نکلتی دکھائی دی۔ یہ ملازموں کی چھٹی کا وقت تھا۔ یقیناً" اسے بس اسٹاپ کی طرف جانا تھا۔ ایڈم محتاط قدموں سے درمیان میں فاصلہ رکھے اس کا پیچھا کرنے لگا۔ چند منٹ بعد وہ مین روڈ پہ آ گئی۔ گاڑیاں زن سے سامنے سے گزرتی جارہی تھیں۔ ملازمہ بس کے انتظار میں ایک جگہ کھڑی ہوگئی۔ تب وہ تیز تیز چلتا اس کے قریب آیا۔

"بات سنیں۔" مصروف الجھے ہوئے انداز میں اسے پکارا تو وہ چونک کے پلٹی۔

سر سے پیر تک اسے دیکھا۔ وہ اندھیرے میں کھڑا تھا، پھر بھی وہ اسے دیکھ سکتی تھی۔ شاید پہچانی نہیں تھی کیونکہ ایڈم کو نہیں یاد اگر اس ملازمہ سے اس کا پہلے آمنا سامنا ہوا ہو۔

"تنکو کامل بن محمد کے گھر کام کرتی ہیں آپ؟"

دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ جھوٹ نہیں بولتا تھا مگر سچائی کو کھوجنے کے لیے آج اسے جھوٹ بولنا تھا۔

"ہاں.... کیوں؟" وہ چونکی ہوئی۔

"مجھے تالیہ نے....." تھوک نگلی۔ زبان لڑکھڑائی۔ "بھیجا ہے۔ تالیہ نے کچھ تحائف بھیجے تھے آپ کے لیے اور اپنی ساری ساتھی ملازماؤں کے لیے۔" بولتے بولتے اس کا سانس چڑھنے لگا۔ جھوٹ بولنا کتنا دشوار تھا۔

ملازمہ کی آنکھوں میں چمک ابھری۔ خوشگوار سی حیرت۔ "اس نے تحائف پاکستان سے بھجوائے ہیں؟ وہ تو پاکستان چلی گئی تھی نا۔"

اور ایڈم اس لمحے بالکل پتھر کا بت بن گیا۔ یعنی تالیہ

واقعی ان کی ملازمہ تھی؟ وہ سرخروئی کا لمحہ تھا۔ اس کا سچ جیت گیا تھا۔ اس کے اعضاء نے اس سے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ ایڈم سچا تھا۔ تالیہ جھوٹی تھی۔

"جی۔" بدقت وہ بول پایا۔ "مگر...... میں ذرا کنفیوزڈ ہوں۔ میں نے آپ کو تنکو کامل کے گھر سے نکلتے دیکھا لیکن کیا آپ واقعی تالیہ کے ساتھ تنکو کامل کے گھر کام کرتی تھیں؟ یہ نہ ہو میں تحائف کسی اور کو دے بیٹھوں۔"

"ہاں ہاں۔ میں نور ہوں۔ تالیہ مجھے جانتی ہے۔"

"مگر۔" اس نے پیشانی پہ آیا پسینہ پونچھا جیسے کافی الجھ گیا ہو۔ "کتنا عرصے آپ دونوں نے ساتھ کام کیا؟ سوری مگر مجھے کنفرم کرنا ہے کیسے...."

"دو ماہ.... وہ دو ماہ پہلے آئی تھی' اس نے ریستوران میں تنکو کامل کے بیٹے کی جان بچائی تھی' یونو اس کو الرجی ہے مونگ پھلی سے اور اس نے غلطی سے سیلاد میں سے مونگ پھلی کھالی تو تالیہ جو وہاں ویٹرس تھی اس نے کوئی گھاس پھوس بچے کے منہ میں ڈالا جس سے اس کی حالت سنبھل گئی۔ ویسے کیا بھیجا ہے تالیہ نے۔"

"کچھ کپڑے اور پرفیومز ہیں۔ باقی ملازموں میں بھی آپ کو ہی بانٹنے ہوں گے۔ مگر اتنا سامان جو میں آپ کے حوالے کروں اور کل کو آپ کہیں کہ آپ تالیہ کو جانتیں تک نہیں۔" ذرا سی ہمت کر کے بولا تو لڑکی کی آنکھوں میں خفگی ابھری۔

"کتنی دفعہ بتاؤں کہ اس کو جانتی ہوں۔ آپ تالیہ سے بات کروادیں میری۔"

"تاکہ وہ مجھے ڈانٹے کہ میں نے اس کی دوست پہ شک کیوں کیا؟ مگر ایک منٹ۔" اس نے سیل فون نکال کے ایک تصویر سامنے کی۔ "کیا یہ تالیہ ہے؟"

وہ کسی چینی اداکارہ کی تصویر تھی۔ نور نے الجھ کے سر نفی میں ہلایا۔ ایڈم نے اسکرین آگے کی۔ ایک ملے اداکارہ۔ نور نے اچنبھے سے پھرتاں کی۔ تیسری تصویر وہ سامنے لایا تو وہ سنہری بالوں والی تالیہ تھی۔

نور نے گہری سانس لی۔ "امتحان لے رہے تھے آپ میرا؟ یہی ہے تالیہ۔ مگر۔" اس نے انگلیوں سے اسکرین پہ چٹکی لی اور تصویر زوم کی۔ "اچھی لگ رہی ہے۔ بال رنگ لیے ہیں اس نے۔"

"ہاں' پہلے اس کے بال سیاہ تھے۔" وہ بڑبڑایا۔

"لگتا ہے اچھی جگہ شادی ہوگئی اس کی۔ میک اپ وغیرہ کرنا آگیا۔"

"شادی؟" وہ چونکا۔ نور نے آنکھیں اٹھا کے اسے گھورا۔

"کیا ابھی تک نہیں ہوئی؟ شادی کے سلسلے میں تو اس کے نکھٹو باپ نے اسے واپس بلایا تھا۔ سارا خاندان غریب تھا' ایک یہی کماتی تھی' اور سب اس کے پیسے پہ عیش کرتے تھے۔ مجھے لگتا تھا کسی نکھٹے سے شادی کردیں گے اس کی مگر اس کے کپڑے اور جیولری تو دیکھو۔ لگتا ہے وہ امیر ہے۔" پھر سر جھٹکا۔ "خیر۔ سامان کدھر ہے۔"

"سامان۔" ایڈم گڑبڑایا اور جلدی سے فون اس کے ہاتھ سے لیا۔ "وہ میں کل لادوں گا۔ آپ کی بس آگئی۔"

نور نے مڑ کے دیکھا' بس خراماں خراماں چلتی قریب آرہی تھی۔ اس نے بیگ اٹھایا اور واپس پلٹی۔

"اچھا کل صبح میں...." مگر بات ادھوری رہ گئی۔ پیچھے کوئی نہ تھا۔ ایڈم جاچکا تھا۔

"چلو۔ کل آئے گا نا۔" اس نے خود کو تسلی دی اور بس کی طرف بڑھ گئی۔

وہاں سے جلدی سے کھسک کے ایڈم ایک دوسری بس پکڑ کے گھر آگیا تھا۔ وہ حیران تھا' شاکڈ تھا' خوش تھا۔ وہ سچا تھا۔ وہ لڑکی وہ نہیں تھی جو وہ خود کو کہہ رہی تھی۔ وہ شاید فراڈ تھی۔ فاتح کو قتل کرنا چاہتی تھی۔ ہاں یہ بات ہوسکتی تھی۔

یا اللہ.... توان کو (آقا).... مجھے اس جھوٹ کے لیے معاف کرنا.... میرے پاس سچ ثابت کرنے کا کوئی اور طریقہ نہ تھا.... وہ خطرناک لڑکی ہے اور مسز تنکو کامل اس کو اس دن صاف بچاگئی تھیں.... سب جھوٹ بول رہے تھے توان کو.... انہیں مات دینے کے

لیے مجھے انگلیاں ٹیڑھی کرنی پڑیں۔"

وہ کانوں کو ہاتھ لگاتا توبہ کرتا اپنے گھر کا چھوٹا دروازہ کھول رہا تھا۔ ڈربے میں بیٹھی مرغی نے زور کی کٹاک کی۔ اس کے پروں تلے چھپے ننھے چوزے چوں چوں کرنے لگے۔ ایڈم نے ہش کیا تو مرغی کے پر جو کھل گئے تھے، دھیرے دھیرے تھم کے سمٹتے گئے اور وہ پرسکون ہو گئی۔ ایڈم دبے قدموں گھر میں داخل ہوا۔ آہستہ سے چابی گھمائی۔ لبوں پر پرجوش مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں فتح کی چمک۔ جسم میں توانائی بھری تھی۔ دھیرے سے اندر آیا اور سیدھا اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ مگر پھر ٹھٹکا۔

آج ماں کیوں اس کی راہ تکتی نظر نہیں آئی؟ نگاہیں سامنے کو اٹھیں۔ ابیو (ماں کو ملے میں ابیو کہتے تھے) اور بابا کے کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ وہ بنا چاپ کے دھیرے دھیرے چلتا آگے آیا مگر پھر قدم خود بخود زنجیر ہو گئے۔

"اب کیا ہو گا؟ بھائی صاحب واقعی سنجیدہ ہیں؟" ابیو پریشانی سے کہہ رہی تھی۔

"سنجیدہ ہیں تو اتنی سفاکی سے شرط رکھی ہے ناکہ جب تک ہم ایک بنا بنایا اپارٹمنٹ یا گھر فاطمہ کے نام نہیں لگائیں گے، وہ ایڈم اور فاطمہ کی شادی نہیں کریں گے۔" باہر کھڑے ایڈم کی سانس تھم گئی۔

"مگر وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ جانتے تو ہیں کہ ایڈم محنتی ہے اور جلد اس کو نوکری مل جائے گی اور......"

"ان کی طرف سے دیکھو تو بات غلط بھی نہیں ہے۔ جب انہوں نے ایڈم سے فاطمہ کا رشتہ طے کیا تھا تو ایڈم فوج میں تھا، اس کا مستقبل ان کو روشن نظر آیا تھا لیکن اب ایڈم کے پاس جاب نہیں ہے اور وہ بغیر کسی سیکیورٹی کے فاطمہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں نہیں دے سکتے۔"

"لیکن تمہارا اسٹور بھی ہے اور ایڈم محنتی ہے، ایک دن وہ بہت اوپر جائے گا محمد! لوگ اس بات کا یقین کیوں نہیں کرتے؟ فوج کی نوکری دنیا کا آخری کنارہ تو نہیں ہوتی کہ اس کے بعد خلاء آجائے؟" ابیو دکھی دل سے کہہ رہی تھی اور ایڈم شکستگی سے پلٹ گیا۔

اپنے کمرے کا دروازہ اس نے بنا آواز کے بند کیا اور بیڈ پہ بیٹھ گیا۔ بالکل چپ۔ ساکت۔ جیسے دل ہی تھم گیا ہو۔ کتنی ہی دیر وہ یوں ہی بیٹھا رہا۔ پھر اٹھا اور الماری کھولی۔ چند کپڑے آگے پیچھے کیے اور پھر... فوجی یونیفارم نکالا..... اس پہ آج بھی نیم پلیٹ یوں ہی لگی تھی۔ ایڈم Adam ۔ اس نے نیم پلیٹ پہ انگلیاں پھیریں۔ بہت کم لوگ جانتے تھے کہ ایڈم کو دے کی وجہ سے فوج سے نہیں نکالا گیا تھا۔ نیم پلیٹ کو خالی نظروں سے تکتے ہوئے وہ ایک دم جیسے اس کی چمکتی دھات میں مناظر دیکھنے لگا تھا۔



"چیخ و پکار..... ننھی لڑکی کے چیخنے کی آواز نے پورے سفاری پارک کو سر پہ اٹھا رکھا تھا۔ مجمع ٹیلے پہ کھڑا ہکا بکا سا نشیب میں اگے میٹھے سیبوں کے اونچے درخت کو دیکھ رہا تھا جس کے اوپر..... بالکل اوپر ایک دس بارہ سال کی بچی چڑھی تھی، اور خوف سے چیخیں مار رہی تھی۔ سفاری پارک کا عملہ ڈنڈے لیے آگے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ کوئی کال ملا رہا تھا، کوئی مدد کے لیے دوسروں کو پکارنے بھاگ رہا تھا۔

کیپٹن ایڈم اور میجر بدر الدین درختوں کے درمیان بنی روش پہ چلتے آرہے تھے۔ کریو کٹ بال، سن گلاسز لگائے۔ میجر بدر صاف رنگت کا حامل ملے نوجوان تھا۔ ایڈم کی رنگت اس سے ذرا دبتی تھی۔ سادہ کپڑوں میں ملبوس، وہ چھٹی کا دن انجوائے کرنے یہاں آئے تھے اور ابھی بدر کوئی بات کہہ ہی رہا تھا کہ دور سے لڑکی کی چیخوں کی آواز آئی۔

ایڈم چونک کے گھوما۔ یہ سفاری پارک تھا اور جانوروں سے ہر وقت خطرہ بہر حال موجود رہتا تھا۔ خدا جانے کیا ہوا تھا؟ بنا سوچے سمجھے اس نے اس طرف دوڑ لگا دی۔

"کدھر جا رہے ہو؟ ہمیں فلم کے لیے جانا ہے..... ایڈم..... ایڈم!" بدر اکتا کے اس کے پیچھے دوڑا۔

وہ تیز تیز بھاگتا اونچے نیچے راستے پھلانگتا ٹیلے کی چوٹی تک آیا تو مجمع سامنے تھا اور بچی چند گز کے فاصلے پہ درخت پہ چڑھی چلا رہی تھی۔ ٹیلے اور درختوں کے درمیان گہری کھائی تھی۔ وہ چند لوگوں کو ہٹا کے آگے آیا تو لمحے بھر کو بالکل ساکت ہو گیا۔

درخت کے تنے کے ساتھ ایک کموڈو ڈریگن زمین پہ لیٹا سر اونچا کر کے بچی پہ غرا رہا تھا۔ (کموڈو ڈریگن دنیا کی سب سے بڑی چھپکلی ہے' بالکل مگرمچھ کی طرح' مگر کافی موٹی تازی اور زہریلی۔) سیاح چلا چلا کے گائیڈز کو مدد لانے کے لیے کہہ رہے تھے مگر کوئی شخص ڈریگن کے قریب جانے کو تیار نہ تھا۔

ایڈم نے لمحے بھر میں ہی صورت حال بھانپ لی تھی۔ درخت پر چڑھی بچی سیاح نہیں تھی۔ وہ دوسری طرف سے گاؤں سے آئی تھی' یقیناً" میٹھے سیب چرانے۔ اور ڈریگن یقیناً" بھوکا تھا ورنہ وہ زیادہ انسانوں پر حملہ نہیں کرتا تھا۔ موٹا تازہ بھی تھا۔ اگر ڈریگن کا بچہ ہوتا تو درخت پر چھپکلی کی طرح چڑھ جاتا مگر بڑا ڈریگن اپنے وزن اور دس بارہ فٹ کے سائز کے باعث اوپر نہیں چڑھ سکتا تھا' سو اب بچی کو ڈرا اور غرا کے اس کے گرنے کا انتظار کر رہا تھا۔

"بچاؤ..... کوئی مجھے بچاؤ۔" وہ روتے ہوئے چلائے جا رہی تھی۔

"اب تم اندر مت کود پڑنا ہیرو بن کے۔ سفاری پارک کو خود ہینڈل کرنے دو۔ ان کے پاس عملہ ہو گا اس صورتحال کے لیے....." بدر نے اسے تنبیہہ کی جو گردن اوپر نیچے کرتا پریشانی سے صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا۔

"وہ بچی گر جائے گی۔ ہمیں کچھ کرنا ہو گا۔" بدر کا جواب سنے بغیر وہ تیزی سے آگے بھاگا اور ایک ڈنڈے بردار رور کر کو روکا۔

"کیپٹن ایڈم۔" اپنا بیج لہرا کے جیب میں رکھا اور اس کو دونوں کندھوں سے پکڑا۔ "تم لوگ اس کو کتنی دیر میں پکڑ سکتے ہو؟"

"دس..... پندرہ منٹ لگیں گے۔ دوسرے لڑکے لنچ بریک کی وجہ سے دور گئے ہوئے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے اسی طرح ایک ڈریگن نے سپروائزر کا پاؤں کھا لیا تھا' کوئی ان کے قریب نہیں جانا چاہتا۔"

"وہ بھوکا ہے بے وقوف' ایک دفعہ وہ کھانے میں مصروف ہو جائے گا تو اس کا دھیان لڑکی سے ہٹ جائے گا۔ تم فوراً" جاؤ اور سفاری سے اپنا کوئی ہرن کا بچہ نکال کے لاؤ۔ ہرن ہی کھاتا ہے نا یہ؟" ورکر نے جھٹ سر ہلایا۔

"گڈ۔ اس کے آگے ہرن ڈالو تو یہ سب بھول جائے گا۔ میں بچی کو نیچے اتارتا ہوں۔" ورکر فوراً" دوسری طرف دوڑا تو عمر نے اسے حیرت سے روکا۔

"تمہیں ڈریگن کے بارے میں اتنا کیسے پتا؟"

"تم کتابیں نہیں پڑھتے کیا؟" وہ خفگی سے کہہ کے آستینیں چڑھاتا آگے کو دوڑا۔ ٹیلے کے سرے پہ آ کے وہ رکا۔ "بے بی... میری طرف دیکھو۔" بلند آواز میں پکارا تو مجمع میں سے چار پانچ افراد بھی دیکھنے لگے۔ بچی ہنوز چلائے جا رہی تھی۔

"میں تمہیں بچا لوں گا' یہ تمہیں کوئی نقصان نہیں دے گا۔ بے بی... مجھے بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟" وہ ہونٹوں کے گرد ہاتھوں کا دائرہ بنا کے چلا کے بولا تو بچی کی چیخیں رکیں۔ آنسوؤں کے ریلے میں اس نے اوپر دیکھا جہاں سامنے والے ٹیلے پہ لوگوں کے جھرمٹ میں ایک نوجوان کھڑا اس کو پکار رہا تھا۔

"نادیہ!" وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

"نادیہ میں فوجی ہوں۔ تمہیں فوجی اچھے لگتے ہیں نا۔"

بچی نے جواب نہیں دیا۔ آنسو بہاتی اس کو دیکھتی رہی۔

"نادیہ..... اس کو مت دیکھو' مجھے دیکھو۔ مجھے تمہیں کچھ بتانا ہے۔" وہ اونچی آواز میں اس کو پکار رہا تھا۔ بچی نے ڈریگن سے نظریں ہٹا دیں اور اس پہ جما دیں۔ اب وہ بات سننا چاہتی تھی۔

"ہمارے جنرل صاحب کہتے ہیں نادیہ کہ....." وہ بچی پر سے نظریں ہٹائے بغیر با آواز بلند بات جاری رکھے

ہوئے تھا۔ ''اگر کبھی زندگی میں کسی بری عادت' کسی نہ مل سکنے والی محبت یا کسی جنون اور شوق کا شکار ہو جاؤ تو یاد رکھنا۔۔۔ جتنا زبردستی چیخ چیخ کے اس کو خود سے نوچ پھینکنے کی کوشش کرو گے۔۔۔ وہ اتنا اور تمہارے اوپر سوار ہو گا۔۔۔ وہ اتنا تمہیں ڈرائے گا۔۔۔ تم سن رہی ہو نادیہ۔۔۔ کسی خوف ناک درندے کی طرح وہ چیز ہمیں ڈراتی رہے گی۔۔۔''

درخت کی شاخیں جکڑے بچی بھیگی آنکھیں اسی پہ جمائے ہوئے تھی۔

''وہ کہتے ہیں۔۔۔ ان چیزوں کا مقابلہ بھی ایسے ہی کیا جاتا ہے جیسے کسی بڑے خوف ناک درندے کا کیا جاتا ہے۔ پتا ہے کیسے؟ پرسکون ہو کر۔ خاموشی سے بیٹھ جاؤ۔ مزاحمت چھوڑ دو۔ ڈرنا چھوڑ دو۔ اپنی خواہش' جنون' پاگل پن سے جب ہم ڈرنا چھوڑ دیتے ہیں تو وہ فیز گزر جاتا ہے۔۔۔ تم پرسکون ہو کے اس کے گزر جانے کا انتظار کرو۔۔۔ ریلکیس کرو۔۔۔ یہ تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا جب تک تم پرسکون ہو۔۔۔ بہادری اس کو کمزور کرے گی۔ تمہارا خوف اس کو مضبوط کرے گا۔ سنا تم نے نادیہ؟''

بچی نے گہرے سانس لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ابھی تک شاخوں کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی۔

''اسے تمہاری شاعری سمجھ میں نہیں آئے گی ایڈم۔'' بدر نے اکتاہٹ سے اسے ٹوکا تھا۔

''شدید حالات میں کوششیں بھی شدید کرنی پڑتی ہیں۔''

وائلڈ لائف کے ورکرز تیزی سے دوڑتے آرہے تھے۔ کسی نے ڈریگن کے سامنے کٹا ہوا ہرن پھینکا۔ باقی ڈنڈے لیے فاصلے پہ احتیاط سے کھڑے ہو گئے۔ ڈریگن نے خوشبو سے ایک دم گردن موڑی اور تیزی سے اس طرف رینگا۔ درخت سے دور۔

ایڈم تیزی سے درخت کی طرف لپکا۔ بدر نے اسے پکارا مگر وہ جواباً'' چلایا۔ ''تم ڈنڈے کے ساتھ ڈریگن کو پکڑنے کی کوشش کرو۔۔۔ ورکرز کی مدد کرو۔''

اور خود آگے بھاگ گیا۔ ورکرز نے بدر کو ڈنڈا پکڑایا تو وہ برا منہ بناتا ڈریگن کی طرف بڑھا۔ ایڈم درخت کے نیچے آکر رکا۔ ڈریگن چند قدم کے فاصلے پہ تھا۔ اس کی طرف پیٹھ کیے ہوئے وہ ہرن کے کٹے جسم میں منہ ڈالے دیوانہ وار ماس کھا رہا تھا۔ ایڈم نے سر اونچا کر کے اوپر چڑھی خوف زدہ بچی کو دیکھا۔

''اور اب تم وہی کرو جو جنون' محبت اور درندوں کے مقابلے میں کیا جاتا ہے۔ پرسکون ہو جاؤ۔ گہرے سانس لو۔۔۔ خود کو ہلکا چھوڑ دو۔ آگے کیا ہو گا کے خوف سے نکل آؤ۔ مجھ پہ بھروسا کرتے ہوئے۔۔۔ چھلانگ لگا دو۔۔۔ خود کو ہوا کے حوالے کر دو۔ میں تمہیں پکڑ لوں گا۔ شاباش نادیہ۔'' وہ بازو پھیلائے کہہ رہا تھا۔

آواز اب کے کافی مدھم تھی۔ مجمع کی سانسیں تھم گئی تھیں۔ ورکرز ڈنڈے پکڑے ابھی بھی دور کھڑے تھے۔ عجیب خوف تھا جو سب پہ طاری تھا۔ بچی نے شاخ پکڑے ڈریگن کو دیکھا تو ایڈم نے پکارا۔

''یہ نہیں سوچتے کہ بُری چیزیں ہمارے ساتھ کتنا بُرا کر سکتی ہیں۔ یہ سوچتے ہیں کہ ہم دنیا میں کتنا اچھا کر سکتے ہیں۔'' بچی نے ڈریگن سے نظریں ہٹا کے اس پہ جمائیں۔ چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔۔۔ پھر کود گئی۔۔۔

اس کے پیر زمین چھونے سے قبل ہی ایڈم نے اسے پکڑ لیا تھا۔ اگلے ہی پل وہ بچی کو اٹھائے دیوانہ وار اوپر کی طرف بھاگا تھا۔ مجمع خوشی سے شور مچانے لگا اور بدر سمیت ورکرز ڈنڈے لیے ڈریگن کی طرف بھاگے۔ اس کو اب لگام ڈالی جا سکتی تھی۔

''کیا اب یہ اس کو ماردیں گے؟'' اس کی گردن کے گرد بازو پھیلائے' اس سے لگی بچی نے سراسیمگی سے پوچھا۔ وہ اسے اٹھائے ٹیلے تک آپہنچا تھا۔

''نہیں۔ چاہے درندہ کیسا بھی ہو' ہمیں اس کی جان لے لینا اچھا نہیں لگتا۔ لیکن۔'' اس نے ایک محفوظ جگہ پہنچ کے بچی کو زمین پہ اتارا اور اس کے ہاتھ تھامے اس کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھا' پھر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"میں جانتا ہوں تم میٹھے سیب چرانے آئی تھیں۔ تم نادیہ' آئندہ چوری نہیں کروگی۔ چوری کا پھل کبھی میٹھا نہیں نکلتا۔ ایک ذرا سی خواہش کے پیچھے زندگیاں چٹکی میں تباہ ہو جاتی ہیں۔" وہ اسے سمجھا رہا تھا اور بچی نے نظریں جھکالی تھیں۔ اس کے ہاتھ ابھی تک ایڈم کے ہاتھوں میں تھے۔



اپنے تاریک کمرے میں بیٹھا ایڈم ابھی تک نیم پلیٹ کو تک رہا تھا... چمکتے دھات میں سے ایک اور منظر ابھر ابھر سا رہا تھا جیسے کنویں کے پانی میں ہچکولے کھاتا چاند کا عکس ہو...

وہ ایک ملٹری اعزازات اور کتابوں سے سجا آفس تھا۔ وردی والا بارعب شخص مرکزی کرسی پہ بیٹھا تھا اور ابرو بھینچ کے ناگواری سے سامنے یونیفارم میں الرٹ کھڑے ایڈم کو دیکھ رہا تھا۔ ایڈم کے ہاتھ سیدھے تھے' سر پہ کیپ تھی' البتہ آنکھوں پہ سخت دکھ اور بے بسی بھرا غصہ پنہاں تھا۔

"اگر میجر بدر کو کوئی اعلا اعزاز مل رہا ہے تو تمہیں اس میں کیا مسئلہ ہے' کیپٹن ایڈم؟"

"سر میں یہ نہیں کہتا کہ میجر بدر کو اعزاز نہ ملے۔ اس نے ڈریگن کو اس جگہ سے ہٹایا تھا' میں مانتا ہوں' مگر سر... اس بچی کو بچانے میں میرا بھی رول تھا۔ مجھے کوئی اعزاز' کوئی انعام' کچھ بھی کیوں نہیں مل رہا؟"

"تم نے انعام کے لیے بچی کو بچایا تھا؟"

"نہیں سر۔ لیکن مجھے گھر میں اور فوج میں یہی سکھایا گیا ہے کہ جب کچھ غلط ہوتے دیکھوں تو ہاتھ یا زبان سے اسے روکوں۔ میں نے تب بھی یہی کیا۔ اب بھی اپنے ساتھ زیادتی ہوتے دیکھ کے یہی کر رہا ہوں۔" وہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے جذباتی ہو گیا تھا۔

"ایوارڈ ایک ہی شخص کو مل سکتا ہے' چونکہ بدر کا کردار زیادہ نمایاں تھا' اس لیے وہ اس کا حقدار ہے۔"

"مگر سیاحوں کی فوٹیجز... موبائل ویڈیوز جو یوٹیوب پہ موجود ہیں... ان کا کیا سر؟"

"میں مزید اس بارے میں کچھ نہیں سننا چاہتا ایڈم۔" وہ اب درشتی سے بولا تو ایڈم نے نظریں جھکالیں۔ چند گہرے سانس لیے اور آنکھیں اٹھائیں تو ان میں زمانے بھر کے شکوے تھے۔

"میرے ساتھ یہ سب صرف اس لیے ہو رہا ہے کیونکہ میں اورنگ اصلی ہوں۔ ہے نا سر!"

(اورنگ اصلی original people نچلی ذات ہے جو بظاہر ملے جیسے ہی لگتے ہیں مگر رنگت ذرا دبتی ہوئی ہوتی ہے۔ ان کو ملائیشیا میں وہی مقام دیا جاتا ہے جو امریکہ میں سفید فام کے مقابلے میں سیاہ فام کو یا انڈیا میں براہمن کے مقابلے میں شودر کو ملتا ہے۔)

"بہت ہو گیا۔ میں آئندہ یہ racist (نسلی) گفتگو نہ سنوں اس چھاؤنی میں۔" کمانڈر نے میز پہ غصے سے ہاتھ مارا تو ایڈم خاموش ہو گیا۔

بیڈ روم ابھی تک تاریک تھا۔ وہ کھڑکی کے سامنے بیٹھا تھا۔ ہاتھ میں یونیفارم اٹھا رکھا تھا جس پہ لگی نیم پلیٹ چاندنی سے مزید روشن ہو گئی تھی۔ ایڈم کی اداس آنکھیں اس پہ کندہ اپنے نام پہ جمی تھیں جس پہ وہ دن آج بھی تحریر تھا جب... وہ لاکر روم میں اپنے کھلے لاکر کے سامنے کھڑا تھا اور اندر سے کپڑے الٹ پلٹ کر رہا تھا جب پیچھے کوئی آ کے کھڑا ہوا۔ ایڈم نے ایک اچٹتی نظر اپنے عقب میں ڈالی مگر پھر ٹھہر گیا۔ وہ میجر بدر تھا اور ناگواری سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"سب کہہ رہے ہیں کہ تم نے جنرل نصیر کو ای میل کی ہے کہ تمہیں ایوارڈ اورنگ اصلی ہونے کی وجہ سے نہیں دیا جا رہا۔"

"میں نے وہ کہا ہے جو سچ ہے۔" وہ بے رخی سے کہہ کر واپس اپنے کپڑے کھنگالنے لگا۔

"جنرل نصیر آج چھاؤنی آ رہے ہیں' اگر تمہیں لگتا ہے کہ وہ اس نسلی امتیاز کی کہانی کو سن کر تمہیں ایوارڈ دلوا دیں گے تو تم غلط ہو۔"

ایڈم گھوما اور سنجیدگی سے اس کو دیکھا۔ "میں یہ ایوارڈ لینے کے لیے نہیں کر رہا۔ اگر صرف مجھے ایوارڈ دیا جاتا اور آپ کو چھوڑ دیا جاتا تو میں آپ کے لیے بھی

ایسے ہی لڑتا۔" پھر رکا اور گہری سانس لی۔ "میں شاید اس نسلی امتیاز پہ خاموش ہو جاتا لیکن اس روز میں نے ممبر پارلیمنٹ وان فاتح رامزل کا انٹرویو دیکھا تو جانتے ہیں اس نے کیا کہا؟ وہ کہہ رہا تھا' ذاتی زندگی ہو یا کیریئر' صرف سچ بولنا اور سچ کے لیے کھڑے ہونا آپ کو ترقی دلاتا ہے۔ صرف سچ آپ کو بلندی پہ لے کر جائے گا' کیونکہ وہ آپ کو ہلکا کر دیتا ہے اور آپ ہر بوجھ سے آزاد فضا میں پرواز کر سکتے ہیں۔"

وہ ایڈم کے قریب ہوا اور آواز دھیمی کی۔ "اگر تم کمانڈر کے خلاف جاؤ گے تو یہ مت بھولنا کہ کمانڈر میڈیکل بورڈ بٹھا کر تمہارے دمے کی تفتیش کروا سکتا ہے۔"

ایڈم لمحے بھر کو بالکل ہکا بکا رہ گیا۔ "مگر مجھے دمہ نہیں ہے' وہ تو صباح کے جنگل میں ٹریننگ کے باعث معمولی الرجی ہو گئی تھی لیکن میں..." وہ حیران پریشان سا بولا تھا۔ "میں یہ جڑی بوٹیوں سے علاج کی کتاب پڑھ رہا ہوں' اس میں ہر بیماری کا علاج ہے' میرا دمہ چند ماہ میں ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے لاکر سے کتاب نکال کے دکھائی۔ "اور دمے کی وجہ سے کسی کو فوج سے نہیں نکالا جا سکتا۔"

"میں تم سے ہمدردی کر رہا تھا ایڈم۔ عقل سے کام لو۔ صحت کے مسئلے کی وجہ سے فوج سے نکالے گئے تو کوئی تمہیں باڈی گارڈ بھی نہیں رکھے گا۔ منگیتر شادی سے انکار کر دے گی مگر تم شاید سمجھتے ہو کہ یہ کتابیں اور یہ وان فاتح والی آئیڈیالوجی تمہیں ترقی دلائے گی؟ بیوقوف لڑکے' کبھی سوچا کہ آج صوفیہ رحمٰن وزیر اعظم کیوں ہے اور وان فاتح خود کیوں وہ ترقی حاصل نہیں کر سکا؟"

اس کے کندھے کو ہلکا سا تھپکا اور ایک ترس کھاتی نظر اس پہ ڈال کے آگے بڑھ گیا۔ ایڈم بالکل چپ رہ گیا تھا۔ گم صم...

لاکر روم کا منظر وقت کی سیاہ اسکرین سے غائب ہو گیا اور اس میں سے ایک روشن دن طلوع ہوا... چھاؤنی کی انگریز کے زمانے کی بنائی عمارت کے برآمدے میں گردن سیدھی کیے کھڑا ایڈم۔ بالکل چاق و چوبند اور مستعد اور سامنے کمر پہ ہاتھ باندھے کھڑا سفید بالوں والا جنرل سنجیدگی سے اس سے مخاطب تھا۔

"اور تمہارے خیال میں اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ سوچ سمجھ کر کہنا جو بھی کہنا۔"

"میں سوچ چکا ہوں سر۔ ایڈم جھوٹ نہیں بولے گا۔" وہ سپاٹ نظروں سے سامنے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "ایڈم کے ساتھ یہ زیادتی اس لیے ہو رہی ہے کیونکہ ایڈم ایک اورنگ اصلی ہے اور ہماری فوج آج بھی ملے کو اورنگ اصلی پہ ترجیح دیتی ہے۔" وہ سامنے دیکھتے ہوئے سپاٹ نظروں سے کہہ رہا تھا۔ "اور ایڈم سچ اس لیے بول رہا ہے کیونکہ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا کے سب سے عظیم انسان ہیں اور ان کی تعلیمات سے میں نے یہی سیکھا ہے کہ چاہے زمانہ کوئی سا بھی ہو... انسان کو بلندی صرف سچ عطا کرتا ہے۔ سیاسی لیڈر غلط ہو سکتے ہیں' کمانڈر غلط ہو سکتا ہے' مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ سچ فرماتے تھے' اور انہوں نے ہمیں یہ بھی سکھایا ہے کہ کسی گورے کو کالے پہ فوقیت نہیں ہے' پھر ایڈم کے ساتھ کسی صاف رنگت والے کے لیے کیوں زیادتی کی جائے سر؟"

جنرل نصیر آنکھیں چھوٹی کر کے خاموشی سے اسے سن رہا تھا جو بے خوفی سے بولے جا رہا تھا۔

اور جو آخری منظر ایڈم بن محمد کو یاد تھا وہ چھاؤنی میں فوجیوں کے زیر استعمال کمروں کا تھا۔ وہ ایک کمرے کے اندر دروازہ بند کیے دیوار کے ساتھ نیچے زمین پہ اکڑوں بیٹھا تھا... اس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا جس پہ میڈیکل بورڈ نے اس کو فوج کے لیے ان فٹ قرار دے دیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں اسے بھینچے' سر جھکائے بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ مگر کوئی سن نہ لے' اس خوف سے سسکیاں دبائے ہوئے تھا۔ سرخ گلابی چہرے پہ آنسو لڑھکتے اس کی وردی کے سینے کو بھگوتے جا رہے تھے۔ اور وہ روئے جا رہا تھا...

"سچ تو کامیابی دیتا ہے۔ سچ تو انسان کو عظمت دیتا ہے... پھر میرے خواب کیوں چھن گئے مجھ سے اللہ تعالیٰ؟ ایڈم تو صرف اپنے ملک کی خدمت کرنا چاہتا تھا، فوج کی وردی پہن کر اپنے ملک کو دشمنوں سے نجات دلانا چاہتا تھا، مگر ایڈم کی رنگت ذرا گہری ہے اس لیے ایڈم سے یہ موقع چھین لیا گیا، اللہ تعالیٰ! ایڈم اس لیے ظلم کے خلاف کھڑا ہوا تھا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہی سکھایا ہے کہ ظلم کو خاموشی سے برداشت کر لینے والا بھی ظالم جیسا ہوتا ہے۔ پھر ایڈم کے خواب کیوں ٹوٹ گئے، تو ان کو؟"

وہ گھٹنوں پہ سر رکھے گھٹی آواز میں روئے جا رہا تھا۔ ہچکیوں سے، سسکیوں سے... مگر وقت کا پہیہ پیچھے نہیں مڑ سکتا تھا۔

اور اب اپنے تاریک بیڈ روم میں بیٹھے ایڈم کو تالیہ مراد کی "دریافت" یکسر بھول چکی تھی۔ یاد تھا تو صرف اتنا کہ جس منگیتر کے ساتھ اس کی جذباتی وابستگی کافی عرصے سے بن چکی تھی، وہ فوج سے نکالے جانے کے بعد پچھلے ایک برس سے اس کے ساتھ اس لیے کٹی کٹی رہنے لگی تھی کیونکہ وہ اب "بے کار" تھا۔ ملے قوم کے لیے، اپنے خاندان کے لیے، وہ سب کے لیے بے کار تھا۔

وہ اسی طرح اداسی سے بیٹھا رہا اور رات بھیگتی رہی بلی اس کی کھڑکی کے سامنے منڈیر پہ بیٹھی اسے دیکھتی رہی اور چاند خاموشی سے چمکتا رہا۔



رات کے اس پہر بھی کوالالمپور جاگ رہا تھا۔ تالیہ مراد اپنے گھر کا گیٹ بند کر کے باہر نکل رہی تھی۔ اس نے ٹراؤزر کے اوپر ہڈ والی لمبی شرٹ پہن لی تھی اور پاؤں میں جوگرز تھے۔ سینے پہ بازو لپیٹے وہ گیلی سڑک کے کنارے چلنے لگی۔ تیز تیز۔ نظریں دور سامنے جمی تھیں اور ذہن پیچھے تھا۔

سات سال پہلے... لائبریری کے لان میں ایک بینچ رکھا تھا... ہری گھاس پہ رکھا سرمئی بینچ جس پہ بھاری سی داتن ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ چہرے پہ حیرت اور تحیّر لیے وہ منہ کھولے تالیہ کو سن رہی تھی جو اس کے چاروں طرف چکر کی صورت ٹہلتی ہاتھ ہلا ہلا کے مزے سے اپنا کارنامہ بتا رہی تھی۔

سیاہ لمبے بالوں والی تالیہ کوالالمپور میں گزارے چند ماہ میں ہی خوش خوراکی کے باعث قدرے بھری بھری ہو گئی تھی۔ رف سی اسکرٹ اور اوپر لمبی قمیص پہنے، اس کا چہرہ گلابی اور بچوں کی طرح پھولا ہوا لگتا تھا۔ آنکھوں میں چمک تھی اور لبوں پہ شرارتی مسکراہٹ۔

"پرسوں میں سوچ رہی تھی کہ سمیع کے ساتھ میں کتنا برا کرنا چاہتی ہوں؟ یو نو... بدلہ وغیرہ... تو میرا دل چاہا میں اس کا ای میل ہیک کر لوں اور اس کے سارے راز پڑھ کے دنیا کے سامنے کھول دوں مگر پھر۔" اس نے شرارت سے چٹکی بجائی۔ "مجھے یہ خیال آیا کہ میری طرح کتنے لوگ اپنے ایکس کا ای میل ہیک کرنا چاہتے ہوں گے؟ بس پھر کیا تھا... میں نے ایک فیک فیس بک آئی ڈی سے اشتہار لکھا اور اسے پیجز پہ لگا دیا کہ اتنے پیسے دو اور اپنے ایکس کا اکاؤنٹ ہیک کروالو۔ داتن، دو دن میں پانچ افراد آ گئے جو اپنے ایکس کی ای میلز پڑھنا چاہتے ہیں۔"

"وہ تمہیں کبھی بھی پیسے نہیں دیں گے، کیونکہ تم ہیک کر ہی نہیں سکتیں۔"

وہ گھوم کے اس کے سامنے آئی اور مسکرا کے بولی۔

"ارجنٹینا، یوراگوئے اور امریکہ سے چار بندوں نے پیسے ایڈوانس بھیج دیے ہیں، صرف پچاس ڈالر تو ایڈوانس مانگے تھے میں نے۔ پانچواں عقلمند تھا، پہلے ایڈوانس کے جھانسے میں نہیں آیا۔"

"اور باقی کے پچاس ڈالر؟"

"یہی تو اسکام ہے اصل۔ ایڈوانس اچھا معاوضہ لے لو، اور پھر اس کی ای میلز کا جواب ہی نہ دو۔ پچاس ڈالر سے وہ غریب نہیں ہو جائے گا، مگر ہم ضرور ایک کرائے کا مکان بنا لیں گے۔"

داتن نے گہری سانس لی۔ "تالیہ... میں تمہارے

ساتھ ہوں' مگر یہ یاد رکھنا کہ ایک دفعہ ہم اس راستے پہ چل پڑے تو کبھی واپس نہیں آسکیں گے۔ ابھی بھی وقت ہے' سوچ لو۔"

"بس کچھ عرصے کے لیے میں یہ چھوٹے چھوٹے اسکام کرنا چاہتی ہوں' پھر چھوڑوں گی۔ ایک گھر گاڑی بنالوں' اچھا کاروبار سیٹ ہو جائے' پھر مجھے اس کی ضرورت نہیں رہے گی اور ہم کوئی ان سیاستدانوں کی طرح غریب عوام سے لوٹ مار تھوڑی کر رہے ہیں؟"

اس نے ہاتھ سے سڑک کی طرف اشارہ کیا جہاں مرکزی شاہراہ پہ بل بورڈ لگا تھا جس پہ وان فاتح کی تصویر آویزاں تھی۔ سوٹ میں ملبوس وہ ہاتھ بلند کیے ہوئے تھا۔ مسکراتا ہوا روشن چہرہ جس کے ساتھ چند حمایتی نعرے درج تھے۔

"میں صرف ان لوگوں سے چند ڈالر لوٹ رہی ہوں جو کسی دوسرے کے ساتھ برا کرنا چاہتے ہیں' یعنی ای میل ہیک کروانا۔ وہ میرے خلاف پولیس میں نہیں جا سکتے کیونکہ جرم کے ارادے میں خود پکڑے جائیں گے۔ اور اگر وہ اپنے پیسے کی حفاظت نہیں کر سکتے تو وہ اس پیسے کی ملکیت کے اہل ہی نہیں ہیں۔" وہ جذباتی انداز میں دلائل دے رہی تھی۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں تالیہ... لیکن یہ یاد رکھنا کہ ہم اس کام کو کبھی چھوڑ نہیں پائیں گے۔"

"وقت آنے پہ دیکھیں گے داتن۔ میں پیار لر جا رہی ہوں۔ میری شفٹ کا وقت ہونے والا ہے۔ تمہاری بریک بھی ختم ہونے والی ہے۔ آج ہم کھانا باہر کھائیں گے۔" وہ مسکرا کے اٹھی' بیگ کندھے پہ لیا تو داتن پیچھے سے بولی۔

"تمہارے ماں باپ... تمہارا خاندان... وہ تو ملے تھے نا... ملائیشیا کے رہائشی... کیا تم ان کو ڈھونڈنا نہیں چاہتیں؟؟"

تالیہ رک گئی۔ لمحے بھر کے لیے بالکل خاموش ہو گئی۔ پھر آہستہ سے مڑی تو داتن نے دیکھا' نہ وہ پریشان ہوئی تھی نہ جذباتی۔ اس کی آنکھوں میں اداسی تھی۔

"انہوں نے مجھے بچپن میں ہی چھوڑ دیا۔ کوئی مجھے لینے نہیں آیا۔ میں چڑیا کا چھوٹا سا بچہ تھی جو گھونسلے سے گرا تو اسے دوبارہ اٹھانے کا خیال تک نہ آیا۔ میں یتیم خانے میں رہی' میں ایک فوسٹر فیملی کے پاس ملازموں کی طرح بڑی ہوئی' جہاں مجھے روٹی اور پاکٹ منی کے لیے چوری کرنی پڑتی تھی' سزا سے بچنے کے لیے بروقت جھوٹی کہانی گھڑنی پڑتی تھی۔ میں نے خود ہی اڑنا سیکھ لیا' اب میں اس گھونسلے کو تلاش کر کے کیا کروں گی داتن' جو میرے خوابوں سے بہت چھوٹا' بہت پیچھے رہ گیا ہے؟" آخر میں مسکرائی تو آنکھوں میں نمی تھی۔ پھر وہ پلٹ گئی اور سر جھکائے آگے بڑھتی گئی۔

سڑک پہ آکے اس نے ایک نظر بھی اس بل بورڈ کو نہیں دیکھا بلکہ بس یونہی قدم اٹھاتی رہی۔ کنارے پہ اسٹالز لگے تھے۔ کتابوں' اخباروں اور پھولوں کے۔ ایک اسٹال کے سامنے وہ رکی۔ وہاں سفید پھولوں کے گول تاج بنے پڑے تھے جو قدیم زمانوں میں شاہزادیاں اپنے سروں پہ پہنا کرتی تھیں۔ تالیہ کے لبوں پہ مانوس سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

اس نے ایک تاج اٹھایا اور آگے آئی... اسٹال کے وسط میں بڑا سا آئینہ لگا تھا۔ تالیہ نے تاج سر پہ رکھ کے آئینے میں دیکھا۔ وہ کسی شاہزادی کی طرح لگنے لگی تھی۔ مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ نظر موڑی تو سامنے اخبار سجے دکھائی دیے۔ اس نے عادتاً" نوکری کے اشتہار کے لیے اخبار اٹھایا اور ورق کھولی۔ سامنے ہی وان فاتح کی تصویر تھی اور اس کے ساتھ انگریزی میں چھپا اس کا انٹرویو۔

سر پہ تاج پہنے کھڑی لڑکی رک کے ان الفاظ کو پڑھنے لگی۔

"دو برس قبل پہلی دفعہ ممبر پارلیمنٹ منتخب ہونے والے وان فاتح بن رامزل سے جب ہم نے پوچھا کہ وہ ملائیشیا میں کس قسم کی بہتری دکھانا چاہتے ہیں تو ان کا جواب روایتی سیاستدانوں سے ہٹ کے تھا۔ "میں جس ملائیشیا کا خواب دیکھتا ہوں..." اکتالیس سالہ

ممبر پارلیمنٹ اور سابق امریکی اسٹیٹ اٹارنی مسکرا کے ہمیں بتانے لگے۔ "وہاں لوگ حلال گوشت خریدنے سے زیادہ حلال کمائی کا دھیان رکھنے والے بنیں گے۔ کیونکہ بظاہر ہم نے بہت ترقی کی ہے۔ اعلا تعلیم اور نوکریاں.... خوب صورت سڑکیں' اونچی عمارتیں اور بے پناہ ٹورازم تو ہم نے اپنی قوم کو دے دیا ہے مگر ہم اپنی وہ اقدار بھولتے جارہے ہیں جن کے بغیر کوئی مسلمان مکمل نہیں ہوتا۔ دو چیزیں۔" انہوں نے ہمیں انگلیوں کی وی بنا کے دکھائی گویا یہ ان کے نزدیک فتح کی واحد وجوہات تھیں۔

"دو چیزیں ہوتی ہیں جو کسی بھی انسان کو دنیا اور آخرت میں کامیاب کرتی ہیں۔ سچائی اور ایمانداری۔ اور ملائیشیا کے لوگوں کو اور سیاستدانوں کو یہ بات وقت پہ سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ اگر وہ اپنے معاملات میں سچے نہیں ہوں گے' پیسے کمانے کے لیے حلال ذرائع استعمال نہیں کریں گے تو وہ فراموش کردیں اس بات کو کہ ان کے رزق میں اور زندگیوں میں اللہ کوئی برکت دے گا۔ ان کا لالچ بڑھتا جائے گا اور وہ کبھی مطمئن نہیں ہوں گے۔ وہ جتنے عقلمند اور شاطر ہو جائیں' اپنے جھوٹ کھلنے کا خوف ان کو کبھی بہادر نہیں بننے دے گا۔ اب آپ صوفیہ رحمٰن کی مثال لے لیں' محترمہ نے دو دفعہ...."

تالیہ نے اخبار نیچے کر دیا۔ سر اٹھا کے آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ تاج ویسے ہی کھلا کھلا سا لگ رہا تھا مگر آنکھوں میں اداس سا ہیجان تھا۔

"آپ کو کیا چاہیے؟" دکاندار اس سے پوچھ رہا تھا۔ "اخبار یا تاج.... یا دونوں؟"

"دونوں ایک ساتھ ایک دل میں نہیں رہ سکتے۔" وہ بڑبڑائی۔ پہلے اپنے عکس کو دیکھا' پھر اخبار کو۔ چند لمحے کے لیے اس نے سوچا۔ پھر اخبار دھیرے سے واپس اسٹال پہ ڈال دیا۔ "مجھے یہ تاج چاہیے۔ میں اسے چھوڑنا نہیں چاہتی۔" بٹوے سے چند نوٹ نکالے اور سنجیدگی سے دکاندار کی طرف بڑھائے۔ اس نے چناؤ کر لیا تھا....

مگر آج رات شہر کی بارونق گیلی سڑک کے کنارے چلتے ہوئے وہ عجیب اداسی کا شکار ہو رہی تھی۔

اس سارے راستے میں.... تخت و تاج کی تگ و دو میں.... وہ گھونسلہ تو بھول ہی گیا تھا جس سے وہ گری تھی۔ بچپن میں ان سے شکوہ ہوتا تھا.... نوعمری میں نفرت ہوتی گئی جو پھر بے زاری میں بدل کے آخر میں اپنی ہر حیثیت کھو بیٹھی۔ جیسے برف کو پکڑے پکڑے انگلیاں سن ہو جاتی ہیں۔ ان کی طرف سے تالیہ کا دل بھی سن ہو گیا تھا۔ بے حس۔

مگر آج اس نے اپنے پاپا کو دیکھا تھا.... وہ چابی تیار کر رہے تھے اور دل نے کہا تھا کہ اس رشتے میں تخت و تاج سے زیادہ کشش تھی۔ وہ مشکل میں تھے۔ کسی ایسی مشکل میں جس کے باعث وہ اسے بچانے نہیں آ سکے تھے۔ وہ بھی تو ان کو بچانے نہیں گئی۔ وہ سب کچھ بھول گئی۔ کوئی ایسے بھی بھولا کرتا ہے کیا؟

سڑک کے وسط میں پھولوں کی چوڑی سی باڑ بنی تھی جو دونوں اطراف کی سڑکوں کو کاٹ رہی تھی۔ وہ اس کے سرے پہ سخت جگہ پہ بیٹھ گئی اور چہرہ ہتھیلیوں میں گرا دیا۔

"میرا بھی کوئی گھر تھا۔" بے خودی کے عالم میں خالی نظروں سے سامنے دیکھتے ہوئے وہ بڑبڑائی۔ "میرا کوئی خاندان تھا.... یا شاید اب بھی ہو۔" وہ چونکی۔ "سترہ برس ہی تو گزرے تھے۔ خاندان والے زندہ ہوں گے' اگر اس مشکل سے نکل آئے ہوں تب۔" دل کو دھڑکا لگا تھا۔ "مگر گاؤں.... وہ گاؤں والے۔ جانے کتنے برس انہوں نے میرا انتظار کیا ہو' اور شاید اب تک کر رہے ہوں۔" ایک دم وہ بے چینی سے اٹھی اور ادھر ادھر دیکھا۔

وہ شاہراہ کے وسط میں پھولوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ارد گرد چاروں طرف سڑکیں جاتی دکھائی دیتی تھیں۔ وہ ایڑیوں پہ پوری گول گھومی۔ کون سا راستہ اس کا تھا' کچھ معلوم نہ تھا۔

"مجھے اپنے خوابوں کو سمجھنا ہے.... مجھے اس سکے کو ڈھونڈنا ہے.... مجھے چابی کو مکمل کرنا ہے۔" ٹریفک کے

رش اور شور میں وہ زور سے خود سے بولی تھی۔
"مجھے اس چابی کے ذریعے تاشہ کا خزانہ ڈھونڈنا ہے اور پھر اس خزانے سے اپنے گاؤں اور اپنے خاندان والوں کی مدد کرنی ہے۔ وان فاتح کہتا ہے کہ میری کامیابیاں کیا ہیں؟ میں اسے بتانا چاہتی ہوں کہ میں چور اور جھوٹی سہی' میں بہت بری سہی' مگر اچھے لوگوں کے ساتھ برا ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔ مجھے اپنے گاؤں کو ڈھونڈنا ہے۔ مجھے اپنے خوابوں کا تعاقب کرنا ہے۔"
بالآخر اسے منزل نظر آنے لگی تھی.... ایک مقصد .... ایک ٹارگٹ....
ایک عزم کے ساتھ اس نے ہڈ چہرے پہ گرایا' جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور اٹھ کے سڑک کے کنارے چلنے لگی۔ اب اس کا ذہن پرسکون اور رخ گھر کی جانب تھا.... آج اس نے پھولوں کو دیکھا تک نہیں تھا۔



وان فاتح کی رہائش گاہ پہ بھی بارش تھم چکی تھی۔ سارا گھر پانی سے نہایا ہوا تھا۔ ایسے میں وہ ابھی تک اسٹڈی میں بیٹھا تھا۔ پیچھے کو ٹیک لگائے' وہ بظاہر پرسکون لگ رہا تھا۔ مگر جیسے کھڑکی کے شیشے پہ گدلے پانی کی لڑیوں کے نشان جم گئے تھے' اس کی سوچیں بھی ایسی ہی دھندلی ہو رہی تھیں۔
(میرا اگلا کارڈ کیا ہوگا؟ کیا میرے پاس کوئی کارڈ بچا ہے؟) اس نے سر جھٹکا۔
خیر' کارڈ بہت سے ہوتے ہیں۔ میں ان لوگوں کے سامنے کبھی نہیں جھکا۔ کوئی وان فاتح کو کنٹرول نہیں کر سکتا۔ نہ پہلے کر سکا ہے۔ اشعر کے ساتھ بھلے ساری دنیا آ کھڑی ہو' مجھے گرا نہیں سکتا وہ۔ ہارتے وہ ہیں جو ہار مان لیتے ہیں۔ اشعر سمجھتا ہے' جدوجہد کے لیے.... سیاسی طاقت حاصل کرنے کے لیے.... بے پناہ پیسہ اور تعلقات ضروری ہیں.... سالوں کی محنت' لوگوں کو خوش کرنا اور اشتہار بازی کی مہم.... یہ سب انسان کو مقصد تک لے جاتی ہیں۔ ایش نہیں جانتا کہ عظیم مقاصد کے لیے عظیم قربانیاں بھی دینا پڑتی ہیں۔ میں نے اس سفر میں آریانہ کو کھویا ہے۔ اشعر نے کیا کھویا ہے؟؟"
اس نے میز کے کنارے رکھا فوٹو فریم اٹھایا۔ اس میں ننھی آریانہ ہیلمٹ پہنے گھوڑے پہ بیٹھی دکھائی دے رہی تھی۔ ہنستے ہوئے ٹھوڑی اٹھی ہوئی تھی اور سامنے سے دو دانتوں کا خلا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ اس دن کی تصویر تھی جب آریانہ کھوئی تھی۔
اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ آریانہ کے ساتھ اس روز کیا ہوا تھا.... عصرہ بھی نہیں....
سوائے وان فاتح کے.... کوئی نہیں جانتا تھا....
دل کے اس کونے میں جہاں پہلی اولاد کے نام کا خانہ ساری عمر کے لیے وقف ہو جاتا ہے' بہت ڈھیر سارا درد اٹھا تھا۔ اس خانے کو کوئی پر نہیں کر سکتا۔ اولاد چلی جائے تو بھی وہ خانہ ویران' سوگوار رہتا ہے۔ کسی بھی قسم کی خانہ پری کا انتظار کیے بغیر۔ صبر بھی آجاتا ہے' ڈپریشن کا فیز بھی نکل جاتا ہے.... آدمی مضبوط ہو کر آگے بھی بڑھ جاتا ہے.... مگر رات کو سونے سے پہلے.... نیند کی وادی میں ڈوبنے سے پہلے .... پلک جھپکنے سے پہلے.... وہ خانہ ہر رات پکارتا ہے .... وہ غم کبھی نہیں جاتا.... شکل بدل جاتی ہے' کیفیت ڈھل جاتی ہے.... مگر واللہ' وہ غم ساتھ نہیں چھوڑتا۔
"اگر میں اب ہار مان گیا تو سمجھو آریانہ کی قربانی رائیگاں گئی۔" پھر اس نے گہری سانس لی.... فریم واپس رکھا اور موبائل اٹھایا۔
چند لمحے بعد وہ فون کان سے لگائے جب یہ الفاظ ادا کر رہا تھا تو چہرے کی مسکراہٹ "سچی" اور اطمینان اصلی تھا۔ "عبداللطیف .... میں نے۔" (ذرا سے شانے اچکائے) اشعر کے تالاب میں کنکر پھینکے ہیں اور وہ کنکر کافی بڑے ہیں۔ نہیں' پریشانی کس بات کی؟"
وہ ہلکا سا ہنسا۔ "تمہیں معلوم ہے' سیاست تھل کے ساتھ اور بھی دلچسپ ہو جاتی ہے۔ تم اگلے کچھ دن کے واقعات بہت انجوائے کرو گے۔" پھر دوسری طرف کچھ سن کے رکا اور سوچتے ہوئے کان کی لو کو انگلی

سے رگڑا۔

"میں صرف اشعر کو مصروف کر رہا ہوں۔ فاتح دنیا کو مثبت سوچ سے دیکھتا ہے ..... مجھے تو اپنا اور ملائیشیا کا مستقبل بہت روشن نظر آرہا ہے۔ وہ جتنی چالیں چل لیں، میرے ہاتھ کوئی نیا کارڈ لگ ہی جائے گا۔ فی الحال میں صرف ایک جگہ مار کھا سکتا ہوں، اور وہ ہے فنڈز کی کمی۔ مجھے پیسے چاہئیں۔ نہیں، میں امیر دوستوں کے عطیات قبول نہیں کر سکتا۔ نہ قرض لینا چاہتا ہوں۔ نہیں مجھے اپنی بیوی کے پیسے بھی نہیں چاہئیں۔ میں ملاکہ والا گھر بیچنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ہاں، اس بارے میں کوشش کرو۔"

وہ عبدالطیف کا جواب سن کے ہنسا۔ "نادر اور قیمتی ہے تو کیا ہوا؟ میرے باپ کا گھر ہے، مجھے وہ بیچنا ہی پڑے گا..... سوائے اس صورت میں کہ کوئی خزانہ ہاتھ لگ جائے میرے جو پارٹی چیئرمین الیکشن کا مسئلہ حل کردے۔ ورنہ کل سے ہم اس گھر کو بیچنے کی تیاری کریں گے۔" مطمئن اور روشن آنکھوں کے ساتھ وہ ٹیک لگائے، خوشگوار انداز اور بے فکری سے مستقبل کا لائحہ عمل طے کر رہا تھا۔



اپنے تاریک کمرے میں بیٹھا ایڈم ابھی تک یونیفارم کو اداس نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"ایڈم فاطمہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔" اس نے تکلیف سے خود سے کہا تھا۔ "وہ واحد لڑکی ہے جس سے میری برسوں سے جذباتی وابستگی ہے۔ ایڈم اس کو نہیں چھوڑے گا۔" اس نے بند مٹھی سے آنکھیں رگڑیں۔ "ایڈم محنت کرے گا..... لیکن۔" ایک دفعہ پھر مایوسی اس کے اردگرد ڈیرا ڈالنے لگی۔ "ایک گھر اور کاروبار سیٹ کرنے کے لیے مجھے نوکری نہیں بلکہ ..... کوئی، کوئی ..... خزانہ چاہیے ..... اور خزانے ہم جیسوں کے ہاتھ نہیں لگا کرتے۔"



سڑک کنارے وہ ہڈ سر پہ گرائے، جیبوں میں ہاتھ ڈالے تیز تیز چلتی گھر واپس جا رہی تھی ..... لبوں پہ بالآخر پرجوش مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں پرانی چمک۔

"میرے سارے خواب پورے ہو جائیں گے۔ جزیرے کے اوپر پہاڑی کی چوٹی پہ محل ..... ڈھیروں دولت ..... اور ..... اپنے خاندان اور گاؤں والوں کی مدد کرنا ..... اور اس کے لیے مجھے کہیں دفن وہ خزانہ ڈھونڈنا ہے جو اس سنہری چابی سے کھلے گا ..... خزانہ صرف میرا ہے کیونکہ صرف میں جانتی ہوں کہ کوئی خزانہ ایگزسٹ کرتا ہے ..... تاشہ کا خزانہ صرف میرا ہے۔" وہ مسکرا کے سوچتی ہوئی قدم اٹھا رہی تھی۔

کوالالمپور پہ اتری روشنیوں سے منور رات اسی طرح بھیگتی جا رہی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

شازیہ الطاف ہاشمی



سسرال میں ہونے والے سارے جھگڑے ہی زوردار تھے مگر پانی پہ ہونے والا جھگڑا اس قدر تکلیف دہ تھا کہ وہ چیخ اٹھی۔ امروز کی تنخواہ جو برف کی ڈلی کی طرح گھل کر ہر مہینے پانی ہوتی تھی۔ اس میں اتنی گنجائش بھی نہ تھی کہ وہ فائزہ کو الگ سے رہنے کھانے کا انتظام کر کے دے سکتا۔ دوسرے اس کی ساس امروز کی ماں ایسی تیز طرار عورت تھی کہ بیٹے کے پیسوں کو پوری طرح قبضے میں کیے رکھتی تھی۔

وٹے سٹے میں آئی بڑی بہو اس کی جٹھانی کا مرتبہ سب سے بلند تھا اور جو وہ نہ بلند قامت تھی نہ بلند سوچ کی حامل مگر چالاک ساس نے اسے پورے گھر پر اختیار دے رکھا تھا۔ اس کا چھوٹا سا قد سب پر حاوی تھا تو فائزہ بے چاری جو نئی نئی سسرال پہنچی تھی۔ وہ کیسے جم سکتی تھی۔ بھلا جب ساس سسر اور خود اس کا شوہر بڑی بھابی کو کل کائنات سمجھتے ہوں تو بات ہی ختم تھی۔

سب برے ہوتے لیکن امروز کو اس کا خیال ہوتا تو بیوی کو لے کے علیحدہ ہو جاتا یا ماں کو بھابی کو ہی کبھی سمجھا بھی لیتا مگر اسے ان سب باتوں کی اور خود فائزہ کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ ٹھیک ٹھاک گھر چل رہا تھا بس فائزہ کے آنے سے آپا۔ ڈسٹرب ہو رہی تھیں۔ اسے ہر ممکن حد تک فائزہ کو ہی دبا کے رکھنا تھا مگر وہ بے وقوف تھی جو بول پڑی تھی۔

"گھر کی موٹر پر سب کا حق ہے۔"

حالانکہ موٹر تو کیا پورے گھر پر رشیدہ کے سوا کسی کا حق نہیں تھا اور یہ حق خود اس نے بھی پوری رضا مندی اور ہوش میں رشیدہ بھابی کی گود میں ڈالا تھا اور فائزہ جسے آئے ابھی چھ مہینے نہیں ہوئے۔ وہ حق جتاتے بٹوارہ کرنے بیٹھ گئی تھی تو اسے وہاں حصہ تو کیا جینے کا حق بھی نہیں مل سکتا تھا۔

وہ تو آتے ہی مکھی بن کے خود ہی دیوار سے چپک گئی تھی نہ ڈھنگ کا کھانا نہ کپڑے اور کام تھے کہ سارے کے سارے اسی کے ذمے اور کریڈٹ سارا اس چمگادڑ کو جاتا۔ وہ سارے گھر کے جوتے پالش کر کر ہانپ جاتی، روٹیاں پکاتے پکاتے ہاتھ دکھ جاتے اور ساس خوش پھر بھی نہ تھیں۔

زندگی خوب صورت ہوتی جو امروز اس کے ساتھ ہوتا مگر امروز اس کے ساتھ کبھی نہیں تھا۔ وہ تو اپنے ساتھ بھی نہیں تھا شاید۔ ہر وقت اپنی آپاؤں کے مسائل میں الجھا رہتا جن کے سارے مسائل کا حل وہی تھا جو بول پڑی تھی اور برا بولی تھی جب ہی تو گھر سے اگلے ہی لمحے بے دخل کر دی گئی تھی۔

گاڑی کی چھک چھک میں کتنا سے گزرا، کون سا اسٹیشن آیا۔ اسے خبر نہ ہو سکی تھی۔ وہ تو جھگڑے کی وجوہات پر ہی غور کرتی رہ گئی تھی اور اگلے ہی پل گھر سے بھی باہر تھی۔ امروز کو نہ اس کے سوالات کی پروا تھی نہ منتوں کی نہ اس کو پہنچنے والی ٹھیس کی۔ بس اتنا یاد تھا کہ گھر میں فساد پھیلانے کی ذمہ دار فائزہ ہی تھی اور سب سے بڑھ کر اس نے بڑی بھابی سے بدتمیزی کی تھی اور یہی بدتمیزی اسے گھر سے بے گھر کرنے چلی تھی۔ گھر میں پہلا قدم پڑا تھا اور ابو نے اسے ہی جھاڑ ڈالا تھا، وہ لڑ کر گھر سے باہر نکلی ہی کیوں تھی اور وہ حیران رہ گئی تھی۔

اسے تو خود امروز نے بازو سے پکڑ کر باہر پھینکا تھا، ہلکے پھلکے سامان سمیت وہ خود تو۔ راستوں سے بھی بے خبر تھی۔ رشیدہ نے اس کے آنے سے پہلے ہی وہاں بھی آگ بھڑکا دی تھی کہ وہ لڑ کر خود ہی گھر سے

نکل پڑی تھی۔ امروز کے منہ سے انگارے نکل نکل کر سارے گھر میں چنگاریاں بکھیر گئے تھے۔ وہ ابو کو اپنی بدتمیز بیٹی خود ہی سنبھالنے کا مشورہ دیتا بغیر چائے پانی کے ہی واپس چلا گیا تھا اور امی ابو کھڑے رہ گئے تھے۔

بعد میں جب امی' ابو' صفیہ آپی اور فیصل بھائی سب مل کر بیٹھے تو انہیں پتا چلا کہ رشیدہ کس کس طرح سے اسے ستا رہی تھی۔ وہ باتھ روم میں نہانے لگتی تو باہر سے پانی بند' فائزہ کپڑے لیتی تو امروز اسے بھی لے کر دیتا اور اس کی بے حیا بیٹیاں بھی فائزہ سے چالاک تھیں جنہوں نے چچا کو چچی سے بدظن کرنے شکایتیں' چغلیاں کر کر کے اسے تنگ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی اور ساس بھلا کیوں اسے اپنی بیٹی سے عزیز رکھنے لگیں بھلا۔ انہیں تو فائزہ کا خون دے کر بیٹی کو خوش رکھنا تھا ہر طرح سے انہیں صرف اپنی بیٹی کی خوشی عزیز تھی فائزہ کی پروا کسے تھی اور خود امروز کو بھی وہ بوجھ لگتی تھی۔

امی' ابو کی ہمدردیاں اس کے ساتھ تھیں۔ وہ محبت سے دل جوئی کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ تسلیاں دیتے تھے مگر فائزہ بے چین تھی۔ اسے کسی طرح قرار نہیں آتا تھا۔ وہ امروز کی بیوی تھی تو امروز کی بیوی ہونے کے ناتے کیا وہ رشیدہ کو ایک غلط بات پر ٹوک بھی نہیں سکتی تھی۔ کیوں درست بات پر بھی امروز اس کے ساتھ کھڑا نہ ہو سکا تھا۔ وہ شوہر تھا اور اسے شوہر بننا چاہیے تھا مگر اس نے تو اسے کچرے کی طرح میکے لا



پھینکا تھا۔ امی کو اس پر غصہ بھی تھا۔ ایسا کانوں کا کچا تھا امروز تو کیوں انہوں نے اپنی سترہ سالہ فائزہ اس منحوس کو دے دی جسے بیوی کی قدر ہی نہیں۔ جب فیملی افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ تنگ دست تھا تو شادی کیوں کی تھی اس نے۔

وہ ماں تھیں۔ ان کی اپنی سوچ اپنے جذبات تھے مگر ابو نے اور طریقے سے سوچا تھا۔ انہیں امروز کو سمجھانا تھا۔ ان کے سمجھانے سے شاید وہ سمجھ جاتا اور کچھ نہ سہی تو اپنی بیوی کو پورے عزت احترام سے اپنے گھر ہی لے جاتا مگر کافی دن گزرنے کے بعد بھی نہ اس نے فون کیا نہ خود آیا۔ وہ مکمل چپ اور لاتعلق تھا۔ جاتے وقت وٹے سٹے والی شاطر آپا سے ملنے کا اثر تھا کہ وہ مڑ کر بھی فائزہ کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ فائزہ کے نہ ہونے میں عافیت ہی عافیت تھی۔ یہ اس نے چند ہی دنوں میں جان لیا تھا سوا سے فائزہ سے لاتعلق رہنے میں ہی سکھ محسوس ہوا تھا۔

فائزہ کے دل کو کسی طرح چین نہیں تھا' وہ تو اس سے محبت بھی کرنے لگی تھی۔ اس نے تو امروز کے ساتھ ہی اپنے سارے خواب دیکھے تھے۔ وہ خواب رشیدہ توڑ کیسے سکتی تھی' کھانا کھانے کو اس کا دل نہیں چاہا۔ یونہی تازہ ہوا میں چہل قدمی کرنے باہر نکل آئی تھی۔ آج اس کا رخ پکھی واسوں کی جھگیوں کی طرف تھا۔ امی کو اس کا پکھی واس سے دوستی کرنا کبھی پسند نہیں آیا تھا مگر آج انہوں نے بھی فائزہ کی اداسی کی خاطر ہی سہی اعتراض نہیں کیا۔

وہ گھر سے نکلی تو انہیں خبر تھی کہ وہ حمیرا کی جھگیوں میں جا رہی تھی۔ وہ پکھی واس روایتی سے پکھی واس نہیں تھے ——— سالوں سے یہیں تھے۔ حمیرا اسے مل گئی تھی۔ حمیرا اس کی میٹرک کے بعد دوست بنی تھی پھر اس کی شادی یہیں گوٹھ میں فقیر علی سے ہو گئی تھی۔ ناک میں موٹا سا کوکا لیے وہ مسکرا کر فائزہ سے ملی تھی۔ نیچے بچھی صاف دری اور پلنگ بھی ستھری دھلی چادروں سے ڈھکے تھے۔ وہ علیحدہ رہتی تھی اور خوش بھی نظر آ رہی تھی۔ چھ سات مہینے کا بیٹا بھی تھا اس کا۔

"کیا کھاؤ گی فائزہ؟" اس کے لہجے میں بھی چوڑیوں جیسی کھنک تھی۔

گھڑے کا ایک گلاس ٹھنڈا پانی پی کر اس کے دل کو سکون سا ملا تھا پھر حمیرا اپنی داستان محبت سنانے بیٹھی تو فائزہ داستان غم۔

"تو بڑی بھولی ہے فائزہ بی بی۔" وہ اس کی باتیں سن کر مسکرا اٹھی' وہ بھولی بھلا کیسے ہو سکتی تھی' وہ تو پڑھی لکھی تھی' غالب' اقبال' احمد فراز کی مداح تھی' اس کے خیالات سچے تھے تو وہ کیسے بھلا حمیرا کے مقابلے میں بھولی ہو گئی۔ ایک پڑھے لکھے اور چٹے ان پڑھ کا فرق مٹ کیسے گیا آخر۔

"جگہ کوئی کسی کو نہیں دیتا۔ وہ تو بنانی پڑتی ہے سرنگ کی طرح۔ پہلے محبت سے پھر محبت میں ناکامی کے درد میں ڈوب کر تم کیسے اس جنگل میں راستہ بنا پاؤ گی فائزہ بی بی! محبت کر کے دیکھ لو محبت سے نہ ملے ناں تو ناکامی کو سینے میں دفن کر کے اپنی دنیا آپ بسا لینا۔"

وہ نجانے کیا کیا کہہ رہی تھی اور اس کی نظر تو ان گھگھو گھوڑوں میں اٹکی تھی جو جھگی کے باہر پختہ حالت میں بہت دور تک بکھرے پڑے تھے' واپسی پر وہ ساتھ بہت سے گھگھو گھوڑے' چھوٹے کٹورے لیتی آئی۔ رشیدہ کی بیٹیوں کے لیے اس کا دل محبت سے بھرا تھا۔

✲ ✲ ✲

بڑی منت سماجت کر کے ابو نے امروز کو واپس بلایا اور بڑی دقتوں سے وہ وہاں پہنچا تھا' بےزاری اس کے چہرے سے واضح تھی۔

ابو نے اس سے فائزہ کو الگ موٹر لگوا کر دینے والی بات منوانے کے ساتھ ساتھ اسے تنگ دستی میں ہی سہی' علیحدہ پکانے کا بھی وعدہ لے لیا تھا۔ امی نے دیسی گھی میں تر حلوے کی بڑی بالٹی اس کے ساتھ بھیجی تھی جو اس کا ارادہ سب کو دینے کا تھا۔ اتنا سارا حلوہ وہ اکیلی کھا کیسے سکتی تھی۔ ساتھ زم زم کی بوتل جو خالہ

خضری نے بھجوائی تھی۔ وہ بھی اس نے سامان میں ہی ساتھ رکھ لی اور امروز کے ساتھ رخصت کرتے وقت امی کی سو نصیحتوں کے ساتھ ابو کی اکیلی نصیحت بھی تھی۔

"فائزہ! آئندہ کبھی لڑ کر نہ آنا ورنہ وہ تم پر حاوی ہو جائے گی۔"

اس کے دل میں بھی ہزار خدشے تھے مگر اللہ کا نام لے کر گاڑی میں سوار ہو گئی تھی' وہ امروز کو ابھی بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

ایک دن جب اس نے خود امروز کو فون کر کے بات کرنے کی کوشش کی تھی تب بھی اس نے اس سے صاف جان چھڑالی تھی۔ "میں گھر سے باہر ہوں۔" حالانکہ پیچھے کی آوازیں اس نے بخوبی سنی تھیں۔ وہ اپنی ماں اور بھائی بھتیجیوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔

اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ دل دھوئیں کے بادلوں میں گھرا تھا۔ اندیشے' واہموں کا طوفان اسے اپنی زد میں لیے ہوئے تھا۔ زندگی کا عجیب موڑ تھا جہاں وہ کھڑی تھی۔ وہ تو خلوص دل سے امروز کی زندگی میں شامل ہوئی تھی۔ امروز اس کی پہلی اور آخری محبت تھا مگر محبت ایسی بھی ہوتی ہے۔ یہ اس نے سوچا نہ تھا۔

گاڑی اپنی منزل کو پانے کے لیے رواں دواں تھی۔ اس کی منزل کہاں تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا۔ دوپہر کے وقت ہلکی بھوک محسوس ہوئی تھی اور اس نے ٹفن سے ایک پراٹھا انڈے کے ساتھ کھالیا تھا۔ امروز کو نہ کھانے کی پروا تھی نہ اس سے مطلب۔ اس کے چہرے پر غصہ جما تھا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ لودھراں پہ گاڑی رک گئی تھی۔ وہ خود ہی چھوٹا سا بیگ لیے اتر آئی تھی۔ امروز آگے آگے تھا۔ وہ ویگن میں سوار ہو گئے تھے۔ اسے پیاس لگی تھی۔

"امروز! مجھے پیاس لگی ہے۔ پانی تو لا دیں۔"

وہ اس سے کہہ بیٹھی تھی اور اس نے سنا تک نہیں۔ چلچلاتی دھوپ میں اسے پیاسا ہی بیٹھنا پڑا تھا۔ ویگن چلنے والی تھی۔

کوئی مرے دل دا حال نہ جانے اور ربا

جھوڑے ٹر جاندے پچھاں مڑ کے نئیں تکدے

ھویا کی قصور سانھوں ایہہ وی تے نئیں دسدے

کوئی مرے دل دا حال نہ جانے او ربا

راحت فتح علی خان کی پرسوز آواز پر اس کی آنکھیں بھر گئی تھیں۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کا قصور کیا ہے۔ آگے والے پیچھے دھکیلتے تھے اور پیچھے والے آگے۔ وہ جاتی تو کہاں جاتی آخر۔ حبس بھری فضا میں اس کی آہیں بکھر گئی تھیں۔



گھر پہنچنے پر اس کا استقبال اس کی سوچ سے بھی برا ہوا تھا' ساس نے جھوٹے منہ بھی پوچھا' سسر صاحب کے بھی شکوے بھی بڑھ گئے تھے اور رشیدہ کو تو اس سے ایسی نفرت تھی کہ خود فائزہ کو بھی ڈر لگنے لگا تھا۔

اس کے کمرے کی حالت نہایت ابتر تھی۔ بیڈ شیٹ سالن اور مٹی کے داغوں سے اٹی ناقابل شناخت ہو چکی تھی۔ اس کے رسالے گم ہو گئے تھے اور کپڑوں کی الماری میں مڑے تڑے اس کے چند ایک پرانے کپڑے موجود تھے۔ ان میں سے بھی سب آدھے ادھورے تھے۔ کسی کا دوپٹہ نہیں تو کسی کی قمیص غائب' یہ حرکت یقیناً" رشیدہ کی بیٹیوں کی تھی اور انہوں نے جی بھر کر تلاشی لی تھی اور جو توڑ سکی تھیں توڑ دیا تھا اور جو اٹھا کر لے جا سکتی تھیں' لے گئی تھیں۔

ٹی وی آن کرنے کی کوشش کی مگر وہ بھی ابدی نیند سو چکا تھا۔ وہ کس سے اور کیا کہہ سکتی تھی۔ انہوں نے یہ سب کیا ہی اسی لیے تھا کہ وہ بولے اور بول کر پھر نکال دی جائے گھر سے۔

ساتھ لائے ہوئے کپڑوں میں ایک شلوار قمیص اٹھا کر وہ نہانے چلی گئی تھی اور پانی باہر سے پھر بند ہو چکا تھا یعنی اس کے جانے کا بھی کسی نے کوئی نوٹس نہیں لیا تھا بلکہ دشمنی اور بڑھ گئی تھی' ناچار بالٹی میں پڑے تھوڑے سے پانی سے نہا کر وہ باہر نکل آئی۔ باہر پانی بند

کرنے والی اس کی ساس تھیں جو چہرے پر معصومیت لیے کچھ کہے جانے کی منتظر تھیں جو اس نے نہیں کہا۔

امروز کو فائزہ کی امی پر بے حد غصہ تھا۔ آخر انہوں نے اسے سمجھانے کی جرأت کیسے کی تھی اور اس غصے کو ہوا دیتی اس کی ساس جو ہر وقت یہی کہتی رہتیں کہ فائزہ کی امی نے تو انہیں نہ جانے کتنی ہی سنا ڈالی تھیں "بیٹا بھی میرا اور باتیں غیروں کی۔" ان کی فتنہ پروری عروج پر تھی۔

پھر فائزہ نے رشیدہ کی بیٹیوں کو مٹی کے کھلونے دیے تھے اور باقی سب کو حلوہ دیا تھا۔ شاید اس طرح کچھ بدل جائے۔ زم زم کی بوتل اس نے سنبھال کے رکھ لی تھی جو اس نے بعد میں سب کو دینے کا کہا تھا۔ شاید ہلکا سا فرق پڑ بھی جاتا لیکن رشیدہ نے خود جو ٹونے جادو کرتی پھرتی تھی۔ اس نے یہ حلوہ پانی بھی جادو سمجھ لیا تھا اور ایک دم سے ہی سارا گھر اس سے بچ کر رہنے لگا تھا۔ پانی کے برتن، حلوہ سب غائب ہو گیا تھا اور اس سب میں سارا گھر پیش پیش تھا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا کیونکہ کوئی نہیں تھا جو اس کے حق میں بولا ہو۔

وہ ایک دم سے جادوگرنی بن چکی تھی سب کی نفرت میں اضافہ ہو چکا تھا۔ اس کے حوصلے ٹوٹنے لگے تھے۔ امروز کی خاموشی اس کے اقرار کی گواہی دیتی تھی۔ وہ محافظ تھا۔ وہ اس کی امان میں تھی اور امان دینے والا کہاں تھا؟

ابو کہتے تھے "عورت کا اصل گھر شوہر کا گھر ہے۔"

یہ شوہر کا گھر تھا' یہ امان ملی تھی اسے۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے امروز تک پہنچی تھی۔

"امروز! کیا میں تعویذ دھاگے پر یقین رکھتی ہوں۔ میں یہ حلوہ تمہارے لیے لائی تھی۔ تمہیں دیسی گھی میں بنا حلوہ پسند ہے ناں تم بتادو۔ تم بتا سکتے ہو۔ تم مجھے جانتے ہو۔ آپا نے جھوٹ بولا ہے آگ بھڑکائی ہے۔ تم ہی اس آگ سے مجھے نکال سکتے ہو۔" وہ التجا کر رہی تھی۔

"تم بولو' کچھ کہتے کیوں نہیں۔" وہ اس کے قدموں میں بیٹھ چکی تھی شاید ایک کے قدموں میں بیٹھنے سے وہ باقی بھاری پیروں تلے کچلے جانے سے بچ جاتی۔

"تم لائی بھی ہو تو مجھ پر ان تعویزوں کا اثر نہیں ہوگا' بھول ہے تمہاری یہ۔"

وہ بولا بھی تو کیا بولا تھا۔ وہ اس کے قدموں سے اٹھ کر رب سے فریاد کرنے اٹھ گئی تھی' ہاں اللہ امتحان لیتا ضرور ہے اور وہ بھی جن سے پیار کرتا ہے۔ ان دنوں فائزہ کو لگتا تھا کہ وہ ہی اللہ کو سب سے بڑھ کر عزیز تھی ورنہ پل پل یوں نہ سلگ رہی ہوتی۔ ساس نے اب امروز کے پاس بیٹھے رہنے اور اسے بھڑکانے کے سوا اور کوئی بھی کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وٹے والی نند کا بھی یہی خیال تھا کہ فائزہ کو ان کی زندگی سے نکل جانا چاہیے۔

وہ نکل کر جاتی کہاں؟ یہ وہ سوال تھا جس کا کسی کے پاس جواب نہیں تھا۔ اسے نکالنے کے کارِ خیر میں بہت سارے لوگ حصہ ڈال رہے تھے۔ جادو ٹونے والی بات امروز کے چھوٹے چاچو اور بڑی نند نے مل کر اڑائی تھی۔

بڑی پھوپھو جو خود کو امروز کی سب سے بڑی حق دار سمجھتی تھیں۔ وہ بھی اس انتقام میں اپنا حصہ ڈال رہی تھیں۔ جیٹھ دیور تو ویسے ہی اسے دیکھنے کے بھی روادار نہیں تھے۔



پہلے تراشا کانچ سے اس نے مرا وجود
پھر شہر بھر کے ہاتھ میں پتھر تھما دیے

محبت اور حقوق کا رستہ ازل سے کٹھن رہا ہے۔ فائزہ کے بھی دشمنوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ ساس امروز کی ماں ہونے کا فائدہ اٹھا رہی تھی۔ ان ہی دنوں اسے اندازہ ہوا تھا کہ کوئی عورت مکرو فریب کا کتنا مضبوط جال بن سکتی تھی۔ رشیدہ کے پاس اسے تنگ کرنے کے ہزار طریقے تھے' اس کی بیٹیوں کو فائزہ کو تنگ کر کے سکون ملتا تھا۔

وہ بوڑھی نہیں تھی مگر اس سفر نے اسے بوڑھا کر دیا تھا۔ اتنے سارے دشمنوں کا مقابلہ تن تنہا وہ کیسے کر سکتی تھی۔ امی ابو کے لہجے سے بھی اسے یہی محسوس ہوا تھا کہ اسے اپنے گھر پہ رہنا چاہیے وہ فرض ادا کر چکے تھے تو کون تھا جو اسے بتاتا کہ اس کا گھر کون سا تھا۔ آخر امی کا گھر یا رشیدہ کا گھر' اس کا کوئی گھر نہیں تھا۔

وہ دن بھر رات ہونے کا انتظار کرتی تھی کیونکہ رات کے وقت رشیدہ اور اس کی ساس بھی سو جاتی تھیں اور وہ بھی ان کے آزاروں سے وقتی طور پر ہی سہی محفوظ ہو جاتی تھی۔ سسر کی عاشق مزاجی' دیوانہ پن آج بھی ویسا ہی تھا اور ایک وہ تھی کہ صرف غم سے بھرا دل لیے جلتے پیر کی بلی کی مانند جیتی تھی۔ سسر' ساس کی دل داریوں میں مصروف رہتے تھے۔ وہ نیا نویلا جوڑا زیادہ لگتے تھے اور اس کی آزمائش تھی کہ بڑھتی ہی جاتی تھی۔

رہیں نہ رند یہ زاہد کے بس کی بات نہیں
تمام شہر ہے دو چار دس کی بات نہیں

رشیدہ' امروز کی تنخواہ سے بجٹ بناتی تھی' اس کے جیٹھ کی کمائی اتنی نہیں تھی کہ ایک اچھا بجٹ بنایا جا سکے۔ اسی تنخواہ پہ قابض رہنے کی خاطر ہی وہ امروز اور فائزہ کو قریب نہ آنے دینا چاہتی تھی اگر امروز بیوی کے قریب ہو جاتا تو پھر تنخواہ سے جدائی برداشت کرنا پڑتی جو رشیدہ جیسی گھاگ عورت کو کسی طرح منظور نہیں تھا۔ چینی' روح افزا' اچار' سرف وغیرہ وغیرہ اس سے میں کوئی بھی چیز اسے نہیں ملتی تھی۔ رشیدہ بد فطرت تو تھی ہی مگر کنجوسی میں بھی اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ چینی' سرف' صابن' اچار اسی کے قبضے میں رہتا تھا اور وہ بچے کھچے سرف سے کپڑے دھو لیتی تھی۔

امروز کی آنکھیں مکمل بند تھیں مگر اس نے یہ دکھ اب کسی سے بھی نہ کہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ دکھ اس کے تھے تو سہنے بھی اسے ہی تھے۔ اس کا گھر یہی تھا اور اپنا گھر اس نے حاصل کر کے رہنا تھا۔ چاہے کتنی ہی رشیدائیں اور امروز کی کم ظرف مائیں یا پھر حاسد رشتے داروں کی لائن لگ جاتی۔ اسے ان سب سے لڑنا تھا اور جی کر دکھانا تھا۔

بڑی نند روز فون کر کے رشیدہ کو پٹیاں پڑھاتی تھی۔ وہ وٹے سٹے کی مضبوطی کو فائزہ کی بے دخلی سے مشروط کیے بیٹھی تھی۔ اب اس میں رشیدہ نے اپنے میکے والوں کو بھی شامل کر لیا تھا۔ اس کا بدشکل بھائی بھی اس میدان میں کود پڑا تھا۔ وہ امروز کے بہنوئی کی حیثیت سے اس پر رعب جھاڑتا تھا۔ فائزہ جانتی تھی کہ وہ یہاں کس لیے چاہا جاتا ہے' وہ ہر وقت پلاننگ میں مصروف رہتا تھا۔ بڑی نند نے اس کی صورت نند کو فوجیں روانہ کی تھیں۔

"مشہود کے لیے چائے بنا دو۔"

ساس اس سے چائے بنواتیں اور یہ خیال رکھتیں کہ کہیں وہ تعویذ نہ گھول دے' رشیدہ کے باپ کی ہدایات بھی وہ روز فون پر سنتی۔

"اس سے کام کروایا کر رشیدہ۔ مصروف رکھا کر۔"

رشیدہ کا باپ تو رشیدہ سے بھی دو ہاتھ آگے تھا۔ اور امروز کی لاتعلقی۔

وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

زمانے کے اس چلن اس ناانصافی سے گھبرا تو وہ بھی گئی تھی اب اسے پتا چلا تھا کہ لوگ راستے سے کیسے دوسروں کو ہٹاتے ہیں' بے پروا کیے بغیر اخلاقی حدود' دل آزاری جیسے الفاظ تو صرف کتابوں میں ہی بند لکھے پڑے ہیں۔ عملی زندگی میں ان کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔

اس نے محسوس کیا تھا کہ مشہود' رشیدہ اور اس کی ساس اسے کچھ بولنے پر اکساتے تھے۔ مجبور کرتے تھے کہ وہ کچھ بولے۔ حالات کا بغور جائزہ لینے پر اس نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا اور سوچ لیا تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ امروز لڑائی جھگڑا پسند نہیں کرتا تھا تو اس کو اپنانے کے لیے اسے صبر سے کام لینا تھا۔

رشیدہ نے اس کے کمرے سے اس کی الماری سے بے شمار چیزیں اڑا ڈالی تھیں' ان میں اس کے چھوٹے

چھوٹے ایئر رنگز بھی تھے جو اسے امروز نے گفٹ کیے تھے۔ رشیدہ نئے کپڑوں کے ساتھ چوری کیے ہوئے ایئر رنگز پہن کر آئی ہی اسی لیے تھی کہ وہ شور مچادے کہ یہ تو میرے اٹھائے ہیں اور اسے معلوم تھا کہ امروز کو یاد ہوگا بھی تو وہ چپ رہے گا اور رشیدہ ساس کی شہہ پر ہروہ کام کر سکتی تھی جو اس کا جی چاہے مگر اس نے چپ رہنا شروع کردیا تھا۔

اس کی ساس امروز کو یہ یاد دلانا کبھی نہیں بھولتیں کہ فائزہ کی امی نے امروز کو ماں کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی تھی۔

اس نے مان لیا تھا کہ امی کو ان کے معاملات میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے تھی۔ امروز کے چہرے پر اسے ہلکا سا سکون محسوس ہوا تھا۔

"اس کی ماں نے جو باتیں کی ہیں ناں میں معاف نہیں کروں گی اسے۔"

اس کی ساس کی مکار نگاہوں میں آنسو مگرمچھ کے آنسو لگتے تھے۔ اسے لگتا تھا کہ فائزہ بھڑک اٹھے گی اور ضرور کوئی نہ کوئی جوابی بیان جاری کرے گی اور نہیں تو ان کا بیٹا تو ضرور ہی ان کے حق میں بول کر ان کا کلیجہ ٹھنڈا کرے گا۔ وہ غور سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کا ارادہ اور بھی سنانے کا تھا۔

"امروز! آپ کی چائے۔"

کپ بے شک آدھا ہی تھا جو اس نے کچن سے بڑی مشکلوں سے نکالا تھا مگر تھا تو سہی۔ امروز کو صبح کے وقت ہلکے ناشتے کے بعد چائے پسند تھی جو کبھی کبھار ہی میسر آسکتی تھی۔ اس نے چائے اور پراٹھا تھوڑے سے سالن کے ساتھ رشیدہ کے چنگل سے آزاد کروانا شروع کیا تھا۔ چائے رشیدہ صرف اپنے اور ساس کے لیے بناتی تھی نہ اسے ملتی تھی اور نہ امروز کو۔ مگر اب فائزہ نے چائے اچکنا سیکھ لیا تھا۔

"سبزی کے پیسے تو دیتا جا۔" ساس نے اسے اٹھتا دیکھ کر دو سو روپے کا مطالبہ کردیا تھا جو روز کے روز دونوں ساس بہو قابو میں کرلیتی تھیں۔

"اللہ حافظ۔" وہ جا رہا تھا اور مڑ کر اسے بھی دیکھ رہا تھا مگر جواب ساس کی طرف سے آیا تھا۔

"ماں صدقے اللہ کے حوالے۔" اماں کی نظروں نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

صبح ہی صبح اس نے اپنا بلو کلر کا سوٹ خوب جما کے استری کیا تھا اور شام ہونے کے قریب وہ اچانک ہی باتھ روم میں گھس گئی تھی۔ سب کاموں میں مصروف تھے کسی کو خبر بھی نہ ہو سکی تھی کہ وہ نہانے جا چکی ہے۔ ورنہ کوئی نہ کوئی باہر سے پانی ضرور بند کردیتا مگر انہیں پتا ہی اس وقت چلا جب وہ بال سلجھا رہی تھی۔

امروز کے آنے کا وقت تھا۔ وہ ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پہ سجائے ۔ کمرا صاف ستھرا کر کے بیڈ پر بیٹھی تھی اور ایل ای ڈی پہ

اگر تم مل جاؤ زمانہ چھوڑ دیں گے ہم

چل رہا تھا۔ تھکے ہارے امروز نے منہ ہاتھ دھو کر کمرے کے خوشگوار ماحول میں قدم رکھا تو موڈ بھی اچھا ہوگیا تھا۔

"گانا اچھا ہے۔ تمہیں پسند ہے۔" وہ سرسری سا ذرا آگے بڑھ کے پوچھ رہا تھا۔

ہاں اگر آپ کو پسند ہو تو۔" اس کی مسکراہٹ بھرپور تھی۔

"مجھے اچھا لگتا ہے یہ۔" وہ بھی کہہ گیا تھا۔ وہ جلدی سے رشیدہ سے اس کے لیے کھانا نکلوا لائی تھی پھر فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل۔ ٹنڈے اسے پسند نہیں تھے وہ بے دلی سے کھا رہا تھا وہ دیکھ رہی تھی۔

"فریج میں چکن کے پیکٹ پڑے ہیں۔ رشیدہ بھابی نے ٹنڈے بنا لیے۔" وہ بتا رہی تھی۔

"ہاں انہیں سبزی پسند ہے۔"

پھر اس نے برتن اٹھا لیے تھے' وہ نیم دراز ہوچکا تھا۔

"کل سیف کے ہاں چلنا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ بیگم کے ہمراہ آنا۔ تیار رہنا' شام کو چلیں گے۔"

اس نے پنکھا فل چلا دیا تھا اور خود بھی تھوڑی دیر لیٹ گئی تھی۔ کمرے کے ٹھنڈے دھلے فرش اور چلتے پنکھے کی ہوا نے جلد ہی اسے غافل سا کردیا تھا۔

"دوپہر سے گھسا ہے بیوی کے ساتھ کمرے میں۔

بے شرم اولاد آج کل تو بڑے بوڑھوں کا لحاظ رہا ہی نہیں۔"

ساس موبائل پر باتیں تو بڑی نند سے کر رہی تھیں مگر ان کے بڑبڑانے کی آواز کمرے تک آرہی تھی۔ رشیدہ نے پٹخ پٹخ جھاڑو دینا شروع کردی تھی اور اس کی بیٹیاں الگ اُدھم مچانے میں مصروف تھیں۔ باہر نکل کر دیکھا تو سسر کے چہرے پر بھی مردنی سی چھائی ہوئی تھی اور ساس کے تیور بھی بہت بگڑے ہوئے تھے۔

"یہ لچھن ہیں لڑکی کے نہ شرم نہ لحاظ۔" وہ اسے طعنہ دے رہی تھیں۔ "نہ رشیدہ کو دیکھا ہے کبھی ایسے۔ چھی چھی۔"

وہ خود ہی شرما بھی رہی تھیں۔ ہاں رشیدہ ایسے کیوں کرے گی بھلا وہ تو صرف شیطان کا کام کرتی ہے۔ جو اپنے شوہر کے پاس ایسے بیٹھی ہوتی تو وہ کمانے نہ لگ جاتا نکھٹو۔ وہ دل ہی دل میں کہہ کر باتھ روم میں گھس گئی۔

"اٹھ گئے برخوردار!" سسر چبا چبا کر بولے تھے اور امروز سب کے ناراض چہرے دیکھ رہا تھا۔

"جی ابا! کوئی کام ہے تو بتائیں۔ ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔"

اور ساس اس کی ذرا سی آنکھ لگنے والی بات ہضم نہیں کرپائی تھیں۔ وہ ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھیں۔

"کیا کر رہی ہو؟" رشیدہ کی پاٹ دار غصے بھری آواز گونجی۔

"چکن بنا رہی ہوں۔" اس کا اطمینان دیکھنے والا تھا۔

"کس کی اجازت سے؟" رشیدہ کی چیخ نکل گئی۔

"وہ امروز دال نہیں کھاتے تو...." وہ معصومیت کی آخری حدیں چھو آئی۔

"کیوں دال نہیں کھاتا' جب سب کھا رہے ہیں تو۔" رشیدہ کی بکواس جاری تھی۔

"بھابی! کیوں شور مچا رہی ہیں۔ میں نے کہا ہے۔ آج طبیعت ٹھیک نہیں تو۔"

امروز دروازے میں کھڑا تھا۔ اسے چپ ہونا ہی پڑا تھا۔ رشیدہ نے اپنے بھائی مشہود کو بھی فون کیا تھا۔ نت نئے گر حاصل کرنے کے لیے مگر اب کوئی گر کارگر نہیں تھا۔ سب فضول تھا۔

بڑی نند نے بھائی کے گھر پر توجہ دے دے کر شوہر کو کہیں اور متوجہ ہونے کا موقع دے دیا تھا۔ اس کے واویلے الگ جاری تھے اور فائزہ بھی اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھی۔

"پاؤں دبا دوں آپ کے؟" وہ پوچھ رہی تھی اور پھر خود ہی نرم ہاتھوں سے پیر دبانے لگی تھی۔

"آپ روز پیدل چل چل کے بسوں کے دھکے کھا کھا کے تھک جاتے ہیں۔ ایک موٹر سائیکل کیوں نہیں لے لیتے۔"

اگلے دن سیف نے بھی یہی مشورہ دیا تھا۔

"ایڈوانس کے لیے کم از کم بیس ہزار چاہیے۔ وہ کہاں سے آئے گا۔ اماں کا ہاتھ تو پہلے ہی تنگ ہے۔" وہ جانتی تھی۔ اماں کا ہاتھ کبھی کھلا نہیں ہوتا تھا۔ اب امروز اسے بھی ہزار پانچ سو اماں سے چھپ کر تھما دیا کرتا تھا۔ اس مسئلے کا حل اس کے پرس میں موجود تھا۔ "یہ لیں اٹھارہ ہزار اور دو ہزار سیف بھائی سے لے لیں۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

اور جب موٹر سائیکل آئی' سارے بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے تھے۔ ساس یہ جسارت برداشت نہ کرپائیں۔

"نہ پوچھا نہ بتایا اور اتنا بڑا قدم۔" وہ آگ بگولا ہو گئیں اور امروز حیران۔ قرضے میں جکڑے یعنی قسطوں میں پھنسے بیٹے کو سبق سکھانے کا یہی موقع تھا "لے جا موٹر سائیکل اور یہ چنڈال بھی۔ الگ ہو جا' اب ہم نے نہیں رکھنا اسے اپنے ساتھ۔"

سسر کو اس کی باہر آمد و رفت سے بھی بڑا درد اٹھتا تھا۔ امروز کا دل برا ہو چکا تھا۔ اب اسے الگ ہونا ہی تھا۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ اپنا کچن' اپنی موٹر' کمرا اس نے وہ سب کر دکھایا تھا۔

"بڑی سمجھ دار ہو گئی ہو۔" رشیدہ نے بھی ہار مان لی تھی اب۔

"ہاں وہ تو میں ہوں۔" وہ مسکرا اٹھی۔ کیونکہ کڑا وقت گزر گیا تھا۔

☆

سائرہ رضا

# حسن المآب اور....



صحرا کا آگ اگلتا سورج' شدید پیاس' پھوڑے' پھنسیوں سے بھرا جسم وہ سب کچھ بھول چکا تھا۔ نام' عہدہ' شخصیت' رشتے' محبت' نفرت.... اس لمحے اسے اپنے گناہ یاد آرہے تھے وہ اللہ کو پکار رہا تھا۔

ماہ رو' اریبہ' حلیمہ اور حسن المآب کالج میں دوست تھیں۔ ماہ رو کا آزاد خیال اور ماڈرن گھرانے سے تعلق ہے۔ اریبہ ایک مڈل کلاس فیملی سے ہے اور بڑی بہنوں کے رشتے نہ ہونے سے پریشان رہتی ہے۔ حلیمہ کا تعلق ایک بہت مذہبی گھرانے سے ہے۔ حسن المآب غیر معمولی حسین ہے۔ اس نے سن شعور سے اپنے گھر میں شریعت کے احکام نے اور مذہب کی سختی سے پابندی دیکھی ہے۔ مفتی عبیدالرحمٰن اس کے نانا تھے۔

حسنل کا خاندان تبلیغ دین کے لیے مشہور تھا۔ جبکہ حلیمہ کے گھر والوں کی حیثیت ان کے مریدین جیسی تھی۔ حلیمہ کے والد کی انتہاپسندی کی وجہ سے حلیمہ کی بڑی بہن اور دو بھائیوں کے رشتے نہ ہو سکے تھے۔

# مکمل ناول

حلیمہ اپنے والد کا پرتو تھی 'جبکہ حسنل اپنے مذہبی ماحول سے شدید بے زار تھی۔
میری اپنی خالہ زاد کی شادی میں شرکت کرنے چرچ جاتی ہے۔ وہاں دولہا یوحنا اسے شکوہ بھری نظروں سے دیکھتا ہے۔
یوحنا نے پہلے اس کے لیے رشتہ دیا تھا۔ ماما کو بھی شدید رنج ہے کہ میری نے یوحنا کے رشتے سے انکار کیوں کیا۔
حسنل کے لیے عبدالمبین اور عبدالمتین کا نام لیا جاتا ہے۔ جن سے حسنل شدید نفرت کرتی ہے۔
حسنل' ماہ رو اور اریبہ کے شدید اصرار پر ایک میوزک کنسرٹ میں جاتی ہے۔ وہاں موسیٰ لی کو دیکھتی ہے۔ اسے لگتا ہے کہ جس شخص کو وہ اپنے تصورات میں دیکھتی رہی ہے۔ وہ موسیٰ لی ہے۔ اس کا خیالی پیکر مجسم ہو کر سامنے آگیا تھا۔



عقیلہ بیگم اس کے آنے سے بہت خوش تھیں۔ ان کا پوتا ساری زندگی ان سے دور رہا تھا۔ ان کا پوتا ماورائی حسن کا مالک تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ بے حد نازک مزاج بھی تھا۔ خصوصاً" کھانے کے معاملے میں اس کے ہزار نخرے تھے۔ انہوں نے اس کے لیے خاص طور پر شیف رکھا تھا۔

حسنل کی تصورات کی دنیا موسیٰ لی سے آباد تھی۔ موسیٰ انڈین میوزک ڈائریکٹر کی چال بازیوں سے دل برداشتہ ہو کر پاکستان اپنا کیریئر بنانے آگیا۔ جہاں چالاک اور نسبتاً" بڑی عمر کی اداکارہ شہزاد عیسائی نے اسے گھیر لیا اور دونوں ہی اپنے مفادات کی خاطر دوستی کے رشتے میں بندھ گئے۔

سعد حسن نے دوراندیشی سے کام لے کر محی الدین سہگل کو اپنا داماد بنالیا۔ جو کہ مفتی عبید الرحمٰن کا کلاس فیلو تھا۔ محی الدین سہگل نے ذہانت کے بل بوتے پر خوب ترقی کی اور اسی دوران وہ ایک بیٹے بدر الدین کا باپ بن گیا۔ بدر الدین کی آمد

منل اور عقیلہ کے لیے ڈراؤنا خواب تھی۔ وہ صرف کیریئر بنانا چاہتے تھے۔
وہ اپنے دوستوں ایڈورڈ اور کیلاش کے ساتھ تفریح کی غرض سے نکلا تھا۔ مگر ایڈونچر کے شوق میں راستہ بھٹک گیا۔ اس کے دوستوں نے اسے بہت ڈھونڈا مگر وہ صحرا میں کہیں کھو گیا تھا۔
خدیجہ بانو نوعمری میں بیوہ ہوگئی تھیں۔ انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنے بل بوتے پر پالا۔ خدیجہ بانو کے اپنے بھائی اور اس کی فیملی سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ خدیجہ بانو کا بیٹا ماریہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ماریہ عیسائی ہے۔ دونوں کے خاندان اس رشتے کے لیے تیار نہیں۔ مگر ماریہ اور منا دونوں ہی کسی معجزے کے منتظر ہیں۔
اپنے اپنے تحفظات کے ساتھ ماریہ اور منے کی فیملی مان جاتی ہے اور دونوں کی شادی ہوجاتی ہے۔ ماریہ کے والدین اس سے قطع تعلق کرلیتے ہیں۔ خدیجہ اور ماریہ کے درمیان روایتی ساس بہو والی چپقلش نہیں۔ ماریہ عملی مسلمان بننے کی کوشش کرتی ہے مگر خدیجہ بانو اس کے عقائد کے بارے میں شک میں پڑجاتی ہیں۔
حسنل کو اس کی سہلیاں سمجھاتی ہیں کہ موسیٰ کا حصول ایک خواب ہے مگر حسنل اسے اپنی دعاؤں کا حصہ بنالیتی ہے اور اسے پانے کے لیے نیک بن جاتی ہے۔ اس کی یہ کوشش اس کے نانا سے مخفی نہیں مگر وہ اصل بات نہیں جانتے۔
موسیٰ نئی نئی ماڈلز کے ساتھ کام کرتا ہے جس پر شہرزاد چراغ پا ہوجاتی ہے مگر حقیقت کا ادراک کرکے موسیٰ سے دوبارہ دوستی کرلیتی ہے۔
محی الدین سہگل نے بدر کی تربیت کے لیے فلپ اینڈرسن کو رکھا تھا۔ وہ ایک ہوس ناک مرد تھا جس نے بدر کو لوٹ لیا۔ بدر لندن تعلیم حاصل کرنے جاتا ہے فلپ اس کے ساتھ ہے مگر ایک حادثے میں فلپ ہلاک ہوجاتا ہے۔ فلپ کی موت بدرالدین کو توڑ دیتی ہے۔ وہ اپنے ماں باپ سے برگشتہ ہوکر اسکارلٹ کی دوستی میں پناہ تلاش کرتا ہے جو بلا کی مے نوش ہے۔
کیلاش اسے تلاش کرنے میں اور وہ صحرا میں راستہ تلاش کرنے میں ناکام ہوگیا ہے۔ اب اس کی تلاش ملکی سطح پر ہورہی ہے کیوں کہ وہ برطانوی شہریت رکھتا ہے۔
جیک کی دوست اس کی محبت میں گرفتار ہے اور خود بھی اس کی تلاش کا عزم رکھتی ہے۔ محی الدین سہگل اپنے پوتے سمیع الدین کے ساتھ کچھ بے باک لڑکیوں کو دیکھ کر خدشات کا اظہار کرتے ہیں مگر سمیع ان کی تسلی کرا کے اپنی شادی کے سارے اختیارات انہیں سونپ دیتا ہے۔
ماریہ اور خدیجہ بانو کے درمیان تناؤ آجاتا ہے۔ ماریہ چار بچوں کی ماں بن جاتی ہے۔ منے کا ایک روز ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے تو ماریہ کا بھائی ڈیوڈ اسے خون دیتا ہے۔ اسی اسپتال میں ماریہ کے والد بھی داخل ہوتے ہیں۔ ماریہ محبت سے مجبور ہوکر دوبارہ اپنے گھر والوں سے تعلقات قائم کرلیتی ہے۔ خدیجہ بانو سخت برا مانتی ہیں۔ ان کی پوتی میری اپنی دادی اور ماں کی چپقلش سے متاثر ہوتی ہے۔ شہرزاد ہر موقع پر موسیٰ بی کی پسند ناپسند کا خیال رکھ کے اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ صحرا میں بے بسی سے کسی مدد کا منتظر ہے۔ اس بات سے بے خبر کہ عالمی میڈیا اس کی جانب متوجہ ہوچکا ہے اور اس کی تلاش کے لیے ہیلی کاپٹر سے مدد لی جارہی ہے۔
خاندانی شرافت پر یقین رکھنے والی لڑکی کی تلاش میں محی الدین سہگل اپنے حلقے میں ناکام ہوجاتے ہیں۔ مفتی عبید الرحمٰن ان کی توجہ ان کوتاہیوں کی طرف دلاتے ہیں جو بدرالدین کی پرورش کے سلسلے میں ان سے ہوئی تھیں۔
حسنل چھپ چھپ کے ریڈیو پر موسیٰ بی کے گانے سنتی ہے۔ صبغہ اسے ٹوکتی ہے اور اس کے پاس موسیٰ کی جیکٹ بھی نکلتی ہے مگر حسنل اپنی زبان درازی کے آگے اس کی ایک نہیں چلنے دیتی۔
موسیٰ بی اور شہرزاد کو پرستار گھیر لیتے ہیں۔ وہیں قریب ماہ رو بھی ہوتی ہے وہ بھی موسیٰ کی شخصیت سے متاثر ہوجاتی ہے۔ موسیٰ کی رفاقت نے شہرزاد کو خوش فہمی میں مبتلا کردیا ہے۔ خدیجہ بانو نے میگی کا نکاح اس کی پسند کو دیکھتے ہوئے ذیشان سے کروادیا۔ میری کے لیے سمیع الدین کا رشتہ آتا ہے۔ دونوں خاندان ایک دوسرے کو پسند کرلیتے ہیں مگر میری کسی ایسے شخص سے شادی کے لیے تیار نہیں، جس کی ماں کا مذہب دوسرا ہو۔ اور اس حوالے سے وہ اپنی دادی کو موردِ الزام

ٹھہراتی ہے۔

اسے صحرا میں بھٹکے تین دن و رات گزر جاتے ہیں' اس کی تلاش کی کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں۔ اس کی حالت خراب ہونے لگتی ہے جیک کی دوست اس کے حوالے سے بے حد پریشان ہوتی ہے۔

مفتی عبیدالرحمٰن' حسنل کی بغاوت دیکھ کر زبردستی اس کی شادی سمیع الدین سے کر دیتے ہیں۔ جس کا رشتہ پہلے وہ کئی دفعہ رد کر چکے تھے۔ اپنی دانست میں انہوں نے حسنل سے چھٹکارا پایا تھا۔ مگر سمیع الدین ہی موسیٰ بی ہے۔ حسنل' موسیٰ کو اپنی محبت کی دیوانگی اور دعاؤں کا بتاتی ہے۔

شہرزاد' موسیٰ کی شادی سے ٹوٹ کر رہ جاتی ہے۔ اور منفی باتیں سوچتی ہے۔

میری جو اصل میں حسنل کی دوست ماہ رو ہے۔ حسنل اور موسیٰ بی کو ساتھ دیکھ کر غم زدہ ہوتی ہے اور حسنل کے پروردگار پر ایمان لے آتی ہے۔

حسنل کی ساری دوستوں کو حسنل اور موسیٰ کی شادی سے اس کی دعاؤں کی قبولیت پر یقین آجاتا ہے۔ مگر ماہ رو جب اپنے انکار اور کرسچن ننھیال کا بتاتی ہے تو حلیمہ سخت ردِعمل کا اظہار کرتی ہے۔

جیک اپنی دوست کو خوش خبری سناتا ہے کہ وہ صحرا سے زندہ سلامت مل گیا ہے۔

اسے ایک ساربان دیکھ لیتا ہے اور گاؤں والے اسے تھانے لے آتے ہیں۔ تھانے کا انسپکٹر رام ناتھ ایک اوباش شخص ہے۔ سی ایم پرشاد باجپائی کی ایک عورت کے معاملے میں اس سے ٹھن جاتی ہے اور اس نے اس کا تبادلہ پاک' انڈیا بارڈر پر کرا دیا ہے' جہاں وہ ہر طرح کی عیاشی سے محروم ہے۔

## آٹھویں قسط

واقعی یہ پانی ہی تھا۔ اس نے یکدم اچھل کر تیزی سے اپنا پیٹ جکڑ لیا۔ آ۔۔۔ اوک۔۔۔ اوک۔۔۔ آ۔۔۔ آ۔

اسے زور کی ابکائی آئی۔ وہ چارپائی پر اوندھا گر گیا۔ چارپائی کے بان سے سارا پانی نیچے بہہ گیا۔

اس میں سیدھا ہونے کی سکت نہیں تھی۔ وید جی اپنے پنڈورے میں سر گھسائے کچھ تلاشنے لگے۔

"چار راتیں اور تین دن سے ادھر غائب تھا۔ اب زندہ ہے۔ وشواس نہیں ہو تا وید جی! دونا کوئی چمتکاری پڑیا' مارے سے حالت دیکھی نہ جاوے۔"

"ارے کچھ ہو نہ جائے۔ شودے کو۔" پورا مجمع اس کے لیے فکرمندی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"بے چارہ ہے کون۔۔۔ پڑھا لکھا لگتا ہے۔ پر پہلے ادھر نہ دیکھا اور نارو والے علاقے تک کیسے آ گیا باڈر ایریا۔"

لوگوں کا تجسس عروج پر تھا۔ کانسٹیبل ہری اوم کو صبح ہی اس کے بارے میں تمام اطلاعات مل گئی تھیں۔

"نارو والے علاقے تک تو بھٹک بھٹک کے پہنچ گیا۔ اونٹوں والے مہاراج کے بیٹے مہاراج کیلاش کا متر (دوست) ہے۔ باہر لندن سے آیا تھا۔ ہے ویسے پاکستانی۔"

"پاکستانی؟" سارا مجمع یک زبان ہو کر حیرانی سے لفظ پاکستانی کو دہرانے لگا۔

"پاکستانی ہے۔۔۔ پاکستانی۔" ایک دوسرے کو بتانے لگے۔

"میں اسے جانوں ہوں۔ جناب۔۔۔" پڑھا لکھا لگتا لڑکا مجمع میں جگہ بناتا سامنے آ گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ جیسے اینتھیسزیا کے زیر اثر تھا اور دھیرے دھیرے ہوش واپس آ رہا تھا۔ اس کی یادداشت میں چہرے گڈمڈ ہو رہے تھے۔ مگر وہ انہیں پہچاننے سے قاصر تھا۔ وہ تو خود کو نہیں پہچان پا رہا تھا کہ وہ کون ہے۔ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ ہاں ایمانے کا چہرہ یاد تھا اور پھر اپنی

ماں کا....

لیکن اس وقت وہ ان سے اپنے رشتے کو بھولا ہوا تھا۔ ہاں بس یہ دو چہرے.... باقی اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ تو کاش کوئی آئے اور اسے بتائے کہ وہ کون ہے۔ اور یہ دو چہرے کس کے ہیں۔

تو جب اس لڑکے نے آگے بڑھ کر بہت جوش و فخر سے کہا "میں اسے جانوں ہوں.... جناب!" تو اس کے پورے وجود میں کرنٹ دوڑ گیا۔

"شکر کوئی ہے جو اسے اس کے بارے میں بتائے گا۔"

اس کا پورا وجود کان بن گیا۔ لڑکے نے اس کا نام بتا دیا تھا۔ مجمع کا چہرہ جگمگانے لگا۔ سب کو دلی خوشی ہوئی۔

اسے خوشی نہیں ہوئی بلکہ اس کی کھوئی یادداشت سے ایک پل سماعت سے ٹکرانے لگا۔

"تم صرف مجھے دکھانے کے لیے شو کرتے ہو کہ تمہیں ان کی پرواہ نہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ تم کو صرف اور صرف ان کی پرواہ ہے۔" اس کی ماں چلا رہی تھی۔

"ایسا نہیں ہے۔" اس کے باپ نے پُرزور انکار کیا۔

"جھوٹ مت بولو۔" ماں پورے جسم کی طاقت سے چلائی۔ "اگر ایسا نہیں ہے تو تم اسے سامی دین کیوں کہتے ہو۔ موسی کیوں نہیں کہتے۔"

اس کا نام سامی دین نہیں ہے۔ موسیٰ ہے 'موسیٰ بی.... موسیٰ بدر الدین۔

اسکارلٹ نے ایک ہاتھ مار کے سینٹرل ٹیبل پر پڑے گلاس دور پھینک دیے۔ پھر خود وہ صوفے پر اوندھی ہو گئی۔

"موسیٰ.... موسیٰ بی نام ہے اس کا۔ کلاکار ہے۔ میں تو پہچان گیا اس کو.... ارے راموہ گانا نہیں ہے۔ بھیگی راتیں.... تیری باتیں.... اسی نے تو گایا۔ بہت مشہور آدمی ہے یہ۔"

"اچھا.... تو وہ موسیٰ ہے۔ اور ایمانے.... ایمانے اس کی بیٹی.... وہی بیٹی جس کے حق میں وہ اپنے تئیں آخری سانسوں میں دعا مانگ رہا تھا۔

"اے اللہ! ایمانے موسیٰ کی حفاظت کرنا۔" ہاں ایمانے موسیٰ اس کی لاڈلی بیٹی "اس کا سرمایہ۔

اور وہ دوسرا چہرہ اس کی ماں کا تھا۔ اس کی ماں....

وہ ذہن پر زور دینے لگا۔ اسے بہت مشکل سے بھی ماں کا نام یاد نہ آیا۔ تو اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ماں تین حرفوں ہی میں مکمل اظہار یہ ہے۔ مزید کی ضرورت رہتی تو نہیں.... تو وہ موسی تھا۔ لیکن پھر سمیع الدین کون تھا؟ وہ ایک بار پھر الجھا۔

ایسی ہی الجھن میں پڑ کر ہری اوم نے پاسپورٹ کو دیکھا۔

اس میں نام سمیع الدین درج تھا اور ایک بہت خوب صورت نوجوان کی تصویر تھی۔ وہ کبھی تصویر کو دیکھتا کبھی چارپائی پر پڑے پنجر کو۔

"اتنے دناں (دن) کا بھوکا پیاسا.... چچ چچ...."

"اسے وہ بڑے اسپتال لے کر جانا ہووے گا۔ وید جی! وہاں ڈرپ لگے گی۔" وہ لڑکا واقعی پڑھا لکھا تھا۔

وید جی نے ناگواری سے اسے گھورا اور مٹی کے برتن میں انگلی گھما گھما کر دوا تیار کی۔ ہری اوم اور دو ہٹے کٹے لڑکوں نے اسے سیدھا کیا اور وید جی کسی نہ کسی طرح دوا اس کے منہ میں ٹپکانے لگے۔

پہلے تو کوئی تاثر نہ آیا پھر زبان باہر نکلی اور ہونٹوں کو چاٹنے لگی۔ وید جی کے اشارے پر اسے دو بندوں کے سہارے بٹھا دیا گیا۔

"رک رک کر ہولے سے گھونٹ اتاریو۔ سارے کا سارا ایک ساتھ نہ چڑھالیو۔ ابھی یہ دوا اندر ٹھہرے تو دو گھنٹے تک روٹی کھانے کے قابل ہو جائے گا۔"

وید جی نے تمام حاضرین کو فخریہ بتایا اور پڑھے لکھے کو گھورا۔

ان کا مریض اب منہ کھول کر سانس لے رہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن یکدم.... اسے جھٹکے سے لگنے لگے۔ ماتھے پر پسینہ نمودار ہوا۔ زور کی کھانسی آ گئی۔

وید جی اس کا سینہ مسلنے لگے۔

کچھ ہی دیر میں اس کے سینے کا زیرو بم رواں تھا۔



"تو تم اس کے بعد (عہد) سے پھر گئے۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی نہ ہوتی تو تم خسارے میں پڑ گئے ہوتے۔ (البقرہ۔63)

سن 2015ء.....

"یہ دیکھیے مومی جان میرے ڈریسز....." وہ ڈھیر سا اٹھائے لے آئی تھی۔

"ارے..... نہیں..... یہ اتنے بہت سے کیوں.....؟"

"تو ابھی آپ نے خود ہی تو کہا میرا یہ ڈریس اچھا نہیں ہے۔" اس نے گردن نیچے کر کے خود کو پیروں تک دیکھا۔

لائٹ بلو جینز کا رانوں تک کا اسکرٹ اور باریک فیتوں والا بیٹ سے چڑھا ہوا پنک بلاوز' پیروں میں پنک بیلی شوز.....

"اونو! ان سب کو لانے کی کیا ضرورت تھی اور دوسرے یہ سب بھی تو ان ہی کے جیسے ہیں۔"

"آپ کو..... تو۔" وہ ڈھیر کو الٹتے پلٹتے کر بڑائی۔

"ایسا سوٹ لائیں جیسا میں نے پہن رکھا ہے..... ایسا شلوار سوٹ۔"

"او آئی سی..... ہے ناں میرے پاس۔" وہ فوراً پلٹ گئی۔

وہ لیمن اور کیمل کلر کا چھوٹے پرنٹ کا لان سوٹ پہن آئی۔ دوپٹہ ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔

"ماشاء اللہ..... ادھر آؤ میرے پاس!" مومی جان نے ہاتھ بڑھا کر اسے قریب کیا اور بازوؤں میں بھینچ کر اس کے پھولے پھولے گال چٹا چٹ چوم ڈالے۔

"نو..... نو..... آپ مجھے دوپٹا اوڑھایئے۔" وہ کسمسائی۔

مومی جان نے بہت سلیقے سے دوپٹا نماز کے انداز میں اس کے گرد لپیٹ دیا۔

"میں نماز کا کپڑا بچھاتی ہوں۔" وہ تیزی سے اچھلی اور جائے نماز بچھالی۔

"اٹھنا بیٹھنا تو آپ کو آتا ہے ناں تو میں پڑھتی جاؤں گی اور آپ کرتی جانا۔"

"اوکے۔" اس نے تابعداری کا مظاہرہ کیا۔

"ابھی آپ صرف دو رکعت پڑھ رہی ہیں۔" مومی جان نے بتایا اور تکبیر کہہ کر دھیرے دھیرے نماز پڑھنی شروع کردی۔

وہ بہت دل جمعی اور خشوع و خضوع سے نماز کے افعال انجام دے رہی تھی۔

"اب دعا مانگیں۔ اور دعا میں بولوں یا آپ خود مانگو گی؟"

"نو۔۔۔ میں خود۔"

"اللہ جی! آپ نے میرے پاپا کو کیوں گم کردیا۔ آپ انہیں ڈھونڈ دیں۔ مجھے میرے پاپا لادیں۔ وہ کسی کو نہیں مل رہے ہیں۔ شیفت کہتے ہیں ان کے پاس کھانے پینے کو کچھ نہیں ہے۔ (ہچکی)۔۔۔ میرے اللہ' آپ ان کو ایک چکن پیزا اور ایک پائن ایپل جوس دے دیں۔۔۔

مجھے ڈول ہاؤس نہیں لینا اور اسٹوری بکس بھی نہیں۔۔۔ آپ بس میرے پاپا کو لادیں۔۔۔ اوں' اوں۔۔۔" اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہوچکا تھا۔

"مجھے ان کے پاس لے جائیں۔ ایمانے موسیٰ' پاپا کے ساتھ رہے گی۔۔۔ اوں۔۔۔!"

مومی جان تیر کی طرح اٹھی تھیں۔ وہ اپنی شدید پریشانی اور بہتے آنسوؤں کو اس کے سامنے کب سے روکے بیٹھی تھیں۔ ضبط ختم ہوگیا۔

ایمانے کو تشہد کی حالت میں بیٹھے بیٹھے گود میں اٹھا لیا اور صوفے پر آبیٹھی تھیں۔ مگر وہ زاروقطار روتے ہوئے گود سے نکلنے کو مچل رہی تھی۔

"چھوڑ دیں۔۔۔ چھوڑ دیں۔ مجھے اللہ سے بات کرنے دیں۔ ابھی میری دعا پوری نہیں ہوئی۔"

"باس۔۔۔ بس۔" اس کے آنسو صاف کیے "سن لیا۔۔۔ سب سن لیا اللہ نے۔"

"میری گود میں بیٹھ کر دعا پوری کرو' ایسے کہو۔۔۔" ان کے ہونٹ اس کے گال سے جڑے تھے اور وہ بغیر آواز کے اس کے بوسے لے رہی تھیں۔

"جب میرے پاپا آئیں گے تو میں دوبارہ تھینکس کہنے کے لیے ایسے ہی نماز پڑھوں گی اور آگے بولو کہ بہت سارے پوئر بچوں کو چاکلیٹ اور کینڈیز دے کر آؤں گی۔"

"اور مومی جان میں اپنا ڈول ہاؤس بھی دے دوں گی جو مجھے برتھ ڈے پر ملا تھا۔"

ان کے الفاظ دہراتے دہراتے اس نے اپنا آئیڈیا بھی شامل کیا۔

"یہ تو بہت بڑا وعدہ ہے۔ اگر بعد میں بھول گئیں یا پھر دل نہ چاہا تو۔"

"ابھی دے دوں؟" وہ فوراً" اپنا چہرہ ان کی سمت گھما کر بولی۔

"ارے میری بچی!" وہ نہال ہوگئیں۔ اسے سینے سے لگالیا۔ سر پر پے درپے بوسے دینے لگیں۔ اس کے کسے ہوئے دوپٹے کو اتار کر سنہری بالوں کو انگلیوں سے سنوارا۔

"اب میری ایمانے نے دعا مانگ لی۔ بس اب دیکھنا پاپا جلد آئیں گے۔ اللہ بچوں کی دعا جلدی قبول کرتا ہے۔"

"مومی جان! آپ نے یہ کیوں کہا کہ اللہ بچوں کی دعا جلدی قبول کرتا ہے۔"

"بچے فرشتوں کی طرح معصوم ہوتے ہیں اور انہوں نے کبھی کوئی گناہ نہیں کیا ہوتا اور نہ کوئی غلطی۔"

"مومی جان! گناہ کیسے کرتے ہیں۔ گھر میں کرتے ہیں کہ اسکول میں' آؤٹ سائیڈ جاکر۔۔۔؟" وہ پانچ سال کی بے حد ذہین بچی تھی۔ اس کے ذخیرہ الفاظ میں یہ نیا لفظ تھا "گناہ"۔

مومی جان لڑکھڑا گئیں۔ بہت بھاری الفاظ اور پُراثر تشبیہات کے ساتھ وہ گناہ کی تعریف کو باقاعدہ خطاب کرتے ہوئے بیان کرسکتی تھیں مگر اس ننھی سی بچی کے لیے؟ وہ مشکل میں پڑ گئیں۔

"بتائیں ناں؟"

"دیکھو' ابھی جیسے آپ نے عہد کیا ہے کہ آپ کے پاپا آئیں گے تو آپ یہ اور وہ کریں گی۔ اللہ سے آپ نے پرامس کیا ہے۔ اب آپ کے پاپا آجائیں اور پھر آپ اپنا پرامس پورا نہ کریں' بھول جائیں تو اسے بد عہدی کہتے ہیں۔ میرا مطلب یہ گناہ ہو گا۔"

"بس کرو حلیمہ! اس کی عمر دیکھو اور اپنا خطبہ.... خاک پلے پڑا ہو گا۔ پریشان ہو جائے گی بچی۔ ہر چیز وقت پر اچھی لگتی ہے۔ یہ کوئی موقع ہے۔"

مسز حسن المآب موسیٰ (سمیع الدین المعروف موسیٰ بی' موسیٰ بدر الدین) بولتی آئی اور صوفے میں دھنس گئی۔

مسز حلیمہ عبدالمبین' ایمانے موسیٰ کی ممانی جان (مومی جان) نے کسی بھی سخت لفظ کو کہنے سے خود کو بمشکل باز رکھا۔

"جب بولنا سیکھ لیا تو بہتر ہے کہ اچھی بات بولی جائے۔ جب سننا سیکھ لیا تو حق ہے کہ اچھی بات کہی اور سنی جائے' تمہیں خبر نہیں.... سماعت کا برتن بہت کم گنجائش رکھتا ہے۔ اس لیے اس میں جلدی جلدی اچھی باتیں انڈیل دینی چاہئیں۔ برائی سے بھر دیا گیا تو لبریز ہونے کے بعد لاکھ جتن کرنے پر بھی ایک اچھائی کی بوند بھی نہیں ڈالی جاسکے گی۔"

"پلیز حلیمہ! میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ مہربانی کرو.... مجھے کسی مثال یا مشکل الفاظ کی مار مت دینا۔"

وہ جھنجلائی' اکتائی سی فون کو سائیڈ پر پھینک کر بولی۔

"ڈورا! ڈورا! ادھر آئیں اور پلیز یہ سب لے جائیں۔ سب کپڑے اٹھالائی ہے اور اسے سلائیں۔ تین بج رہے ہیں۔" اس کی تحکم بھری بلند آواز وسیع و عریض لاؤنج میں گونجی۔

"میں نے دعا مانگی ہے ممی! اب پاپا جلد آجائیں گے۔" ایمانے بہت یقین سے کہتی اس تک آئی۔

"یس آف کورس!" اس نے بچی کی تھوڑی چھوئی۔

"ان شاء اللہ کہتے ہیں بیٹا!" حلیمہ نے تصحیح کی تھی ماں کی اور بیٹی کو سکھایا تھا۔

"اور میں نے پرامس کیا ہے اللہ سے کہ پاپا...." وہ جلدی جلدی بتانے لگی۔

"ٹھیک ہے بیٹا' ٹھیک ہے۔" حسنل خود پر جبر کر رہی تھی۔ "ایمانے کو لے جائیں ڈورا۔" وہ میڈ سے مخاطب ہوئی۔

"تم نے بھی تو کئی سال پہلے بہت سے عہد کیے تھے۔ کئی سو یا شاید ہزاروں نفل اور روزے...." حلیمہ کا اشارہ کس جانب تھا' وہ پل میں سمجھ گئی۔

"پورا تو کیا ہو گا۔"

حسنل نے چونک کر حلیمہ عبدالمبین کی صورت دیکھی۔

وہ گلابی اور سرمئی لان کے خوب صورت پرنٹ کے لباس میں ملبوس تھی۔ دوپٹا لپیٹنے کا وہی ہمیشہ کا انداز تھا۔ وہ اس کے کزن کی بیوی تھی۔ اسی کزن کی جس کے متعلق ہرزہ سرائی وہ ایک عالم میں کرتی تھی اور جو آج ملک کا ایک جانا مانا عالم' مفکر اور استاد تھا۔ حلیمہ کا جسم کسی حد تک بھاری تھا۔

اس کے چہرے کی نرمی اور عاجزی اسے ایک بے حد خوب صورت تاثر سے نوازتی تھی۔ بے اولادی کے غم نے اس کے نقوش میں ایک حزن بھر دیا تھا۔

دوسری طرف حسن المآب تھی۔

وہ سفید اور میرون پھولوں والے چنٹوں سے بھرے چغے میں ملبوس تھی۔ اس کے لمبے شہد رنگ بال کیچو میں جکڑے کمر پر گرے تھے۔ سولہ میٹر کے اس لبادے میں وہ پری لگتی تھی۔ اسے خوب صورت بنا کر ہی دنیا میں اتارا گیا تھا۔

موسیٰ بی کے پندرہ سالہ ساتھ نے اسے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔

دوپٹا جو اس کے شانے پر بمشکل ٹکا تھا اب پھسلتا ہوا زمین پر ڈھیر تھا۔ جسے اس نے حسب عادت فوراً" اٹھا کر کندھے پر رکھا۔

"پلیز حلیمہ! میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ نو لیکچر۔" وہ حلیمہ سے خوب واقف تھی۔

"ہاں ایک تم پریشان اور ایک وہ دوسری.... پریشان

آرہی ہیں۔" حلیمہ نے بھاشن کی خواہش کا گلا گھونٹتے ہوئے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ اس کی نظریں بیرونی دروازے پر تھیں۔ حسنل نے گردن گھمائی۔

سیاہ و سفید چیک اور پھولدار پرنٹ کی ساڑھی میں وہ شہزاد عیسائی تھی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا' بال پریشان اور آنکھیں بے خوابی کا شکار تھیں۔

اس نے صوفے میں دھنسی حسنل سے جھک کر کندھے ٹکرائے اور گال پر ہوائی بوسے لیے۔

"کوئی خبر؟ کوئی ریکوری....؟" اس نے عجلت سے سوال پوچھا اور ساتھ ہی حلیمہ کو دیکھ کر دل گیری سے مسکرائی۔ حلیمہ نے قطعاً" مروت نہ دکھائی۔ وہ گہری کاٹ دار نگاہوں سے دونوں کو گھور رہی تھی۔

"ہاں! ہیلی کاپٹر کا استعمال ہو گا۔ آج پرمیشن ملی ہے۔ ایڈاے پاکستانی تو وہ خاک اہمیت دینے کو تیار نہ تھے۔ مگر میں نے برٹش ایمبیسی کو ڈالا ہے بیچ میں' ہوپ سو... شام تک کوئی خبر ملے گی۔"

حلیمہ اور اپنے درمیان ہونے والی ناگواری کو بھلا کر اب حسنل پریشانی کے عالم میں شہزاد سے محو گفتگو تھی۔

"اوپر سے مجھے ان چینلز والوں نے تنگ کر رکھا ہے۔ صبح' دوپہر' شام بلکہ رات میں بھی ان کی وینز یہاں کھڑی رہتی ہیں۔ دوست' رشتے دار بھی آتے ہوئے گھبرا رہے ہیں۔ مائیک کیمرہ لے کر جہاں چاہیں کسی سے بھی سوال پوچھنا شروع کر دیتے ہیں۔"

"اور اگر غلطی سے ٹی وی چلا لوں۔" حسنل نے ریموٹ پلازمہ کی طرف گھمایا۔ "پہلی خبر یہی ہے بلکہ دیکھ لو' یہی چل رہی ہے۔"

حلیمہ اور شہزاد ایک ساتھ متوجہ ہوئیں۔ ایک مستقل ٹکر (نیوز پٹی) چل رہا تھا۔

"مشہور گلوکار موسیٰ بی تین راتوں اور دو دن سے لق و دق صحرائی علاقے میں لاپتا۔ ان کی تلاش کے لیے زمینی راستوں کے بعد اب فضائی مدد لیے جانے کا فیصلہ۔ وہ اپنی والدہ کی عیادت کے بعد انگلینڈ سے واپسی پر نئے ویڈیو البم کی تیاری کے لیے ممبئی گئے تھے۔ پرانے دوستوں کے ساتھ راجستھان اور گرد و نواح کی سیر کرتے ہوئے رات کے اندھیرے میں بھٹک گئے۔ وہ پاک و ہند کی نوجوان نسل کے پسندیدہ گلوکار ہیں۔"

حسنل نے آواز بلند کی۔ ہانپتا ہوا تیز تیز بولتا نیوز رپورٹر سنسنی خیز لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"معصوم ایمانے موسیٰ اپنے پاپا کے انتظار میں دہلیز پر آنکھیں ٹکائے ہوئے ہے۔ کیا کوئی بتائے گا' ایمانے کے پاپا کب آئیں گے' وہ کہاں ہیں۔

موسیٰ کے بوڑھے معذور دادا کی برستی آنکھیں اس بات کی گواہ ہیں کہ وہ ہار رہے ہیں۔ کیا کوئی ہے جو انہیں لاڈلے پوتے کی خبر دے۔

موسیٰ کی اہلیہ عزم و ہمت کی تصویر ہیں۔ مگر اس ہمت کے ٹوٹنے سے پہلے موسیٰ کا مل جانا بہت ضروری ہے۔ تمام قوم دعاگو ہے' فکر مند ہے۔

موسیٰ کے دوست بے حد پریشان ہیں۔ آئیے بات کریں' جانے مانے گلوکار شہزاد رائے سے اور عاطف اسلم سے وہ اس بارے میں کیا کہتے ہیں اور انڈیا ہی سے ہمارے ساتھ ہیں علی ظفر' بتائیے آپ کیا کہیں گے؟"

یہ اس کی پہلی پریس کانفرنس کی فوٹیج تھی۔ جو میڈیا کے ہر چینل سے ہر گھنٹے چلتی تھی۔

پاکستانی میڈیا کا کردار کسی حد تک بہتر تھا۔ وہ جو ہے جیسا ہے کی بنیاد پر رپوٹنگ کرنے کی کوشش کر رہے تھے جبکہ انڈین نیوز چینلز کے خوفناک لہجے' سنسنی پھیلاتے جملے' امید توڑتے انداز ے۔

"موسیٰ کہاں ہیں؟"

"کیا موسیٰ زندہ ہیں؟ موسیٰ کے ساتھ کیا ہوا؟"

"اس خطرناک علاقے کے بارے میں آپ کو بتائیں گے ہمارے رپوٹر بجن سنگھ' جی بجن! بتائیے۔ موسیٰ کے ساتھ کیا کیا ہو سکتا ہے؟"

"موسم' بھوک' پیاس' سانپ' زہریلے جاندار اور .... اور .... گھر والوں کی تسلی کے لیے بہت ضروری ہے۔ موسیٰ کا مل جانا... زندہ... یا مردہ۔"

حسنل نے ہلکی سی چیخ کے ساتھ کانوں پر ہاتھ جما دیے۔ شہزاد کے آنسو ایک تواتر سے بہہ رہے تھے۔
حلیمہ نے خود میں ہمت پیدا کی اور میوٹ کا بٹن دبا کر پاکستانی نیوز چینل لگا دیا۔
وہ اٹھ کر حسنل کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اور اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔
"میں ٹوٹ گئی ہوں.... حلیمہ....!"
اس نے اپنے دونوں بازو حلیمہ کی کمر کے گرد لپیٹ لیے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☼ ☼ ☼

"وہ ہزاروں نفل تھے حسنل.... ہزاروں.... تم نے کتنے ادا کیے؟"
حلیمہ نے دبی بھینچی چیخ نما آواز میں زور دے کر جتایا۔ "اور بہت سے روزے۔" "تم کو گنتی یاد ہے یا بھول گئیں؟" اریبہ عاقل و بالغ کی یادداشت بھی کمال تھی۔
"ان سب کا یہاں کیا ذکر؟" اسے اپنی بے پناہ پریشانی میں یہ نیا موضوع قطعاً نہ بھایا۔
"اسی سب کا ذکر ہے۔ اللہ سزا دے گا یا اگنور کر دے گا۔
مگر جو خود آگے بڑھ کر، سینہ تان کر وعدہ کرے، قسمیں کھائے، روئے، گڑگڑائے اور بعد میں مڑ کر نہ دیکھے، بھول جائے تو اللہ وعدہ خلافی پسند نہیں کرتا۔ تمہاری ایک ٹکر کی یا ان ہزاروں ٹکروں کی اللہ کو کیا ضرورت.... مگر حسنل، تم نئی قسم کھانے سے پہلے پچھلا حساب تو بے باق کرتیں۔"
"کیا کروں پھر میں؟" اس کے پاس جواب نہیں تھا، ناگواری سے پوچھا۔
"اسے پانے کے لیے سجدہ ریز ہوئی تھیں۔ پا لینے کے بعد کتنی بار سر جھکایا؟" حلیمہ کو اس کے اندر جھانک لینے کا فن آتا تھا۔
"پڑھے تھے میں نے نفل۔" وہ توڑ توڑ کر بولی۔
"کتنے....؟" اریبہ نے لفظ کھینچا۔
"مجھے کہاں.... وقت ملا.... پہلے انگلینڈ چلے گئے پھر ہنی مون کے لیے اور موسیٰ کے البم اور کیریئر کا ٹف ٹائم۔"

"موسیٰ نے وضو کرانا تھا.... یا جائے نماز بچھا کر دینی تھی؟" اریبہ اپنے چھوٹے بیٹے کو تھپتھپا کر سلا رہی تھی۔ جوش میں بہت زور سے ہاتھ مار گئی۔ بچہ بلبلا گیا تو بات ادھوری چھوڑ اسے دودھ دینے لگی۔
"اللہ نے پانچ برس تک اپنا وعدہ یاد کروانے کے لیے تمہاری گود سونی رکھی۔ مگر تمہیں دھیان نہ آیا۔" حلیمہ نے دھیرے سے کہا تو حسنل کو پتنگے لگ گئے۔
"تو تم جو دس سال سے خالی گود لیے بیٹھی ہو، تمہاری کون سی وعدہ خلافی ہے۔ ذرا پتا تو لگے۔"
"بہت بری بات حسنل....!" اریبہ کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔
حلیمہ نے دھیرے سے اریبہ کا شانہ چھو کر شانت رہنے کی تلقین کی۔ "وعدہ خلافی تو یاد نہیں یقیناً" فرائض کی کوتاہی ہو گی۔ ہم اپنے کردہ ناکردہ گناہوں کی معافی ہر لحہ طلب کرتے ہیں اور اللہ کی تقسیم بے عیب ہے، وہ جسے چاہتا ہے، دیتا ہے۔ لیکن میں دعا مانگنا تو نہیں چھوڑ سکتی۔
تمہیں اس لیے کہا کہ تمہیں وہ چیز ملی جس کے ملنے کا گمان بھی میں نے کبھی نہیں کیا تھا۔ تمہیں بل بورڈ پر سمیع بھائی کی تصویر دیکھتے، روتے.... اور تمہارے بیانات سن کر میں قائل ہوئی تھی۔ مجھے اللہ پر تمہارا یقین دیکھ کر حیرت اور جلن ہوئی تھی اور جب تم نے موسیٰ کو پا لیا تو رشک آیا تھا۔ لیکن اسی وقت خیال آیا تھا کہ آیا تم اپنے عہد نبھا سکو گی اور میں نے نوٹ کیا، تمہیں ہمیشہ اشاروں کنایوں میں کہا لیکن....
اب تم دونوں کو دیکھیں تو لگتا ہے کہ ایک دوسرے ہی کے لیے اتارے گئے تھے۔ مگر اس وقت موسیٰ ہی تمہارے قابل نہیں تھا اور ہم نے یہ کہا تھا کہ کہاں مفتی عبدالرحمٰن کی نواسی اور کہاں.... وہ۔" اریبہ نے زبان دبائی۔
"اور تم نے ہمیں لاجواب کر دیا کہ تم اللہ سے

مانگ رہی ہو کہ اس کی تمام کمیاں دور کر کے وہ اسے تمہارا کر دے' وہ ویسے کا ویسا ہی رہا... اور تم اس کے رنگ میں رنگ گئیں۔ میں اس موضوع پر بحث نہیں چاہتی لیکن ایک نظر فقط ایک نظر خود پر ڈالو۔ کیا تم وہی حسن المآب ہو؟ تم اسے اپنے راستے پر لا سکتی تھیں مگر اپنی غرض پوری ہو گئی تو پلٹ کر نہ دیکھا۔ تمہیں تو سیدھے راستے کا علم تھا۔ اسے اپنے ساتھ چلاتیں۔ اس کے سر گناہ نہیں اور تمہارے بائیں بازو کا رجسٹر فل ہو گیا۔"

"خطبہ دینے کا کوئی موقع جانے نہ دینا... میں ہی پاگل ہوں جو آجاتی ہوں مشورہ کرنے۔" وہ بھنا گئی...
آئینے میں نظر آتی کریہہ صورت...

"صرف اتنا کہا تھا کہ غریبوں کو کھانا دوں گی اور ایک مسجد بنواؤں گی اور..."

"کھانا دینا اللہ کا وعدہ ہے اور سجدہ کرنے والے مسجد کے محتاج نہیں۔ ساری زمین سجدہ گاہ ہے۔ تم دوسروں کے کندھوں پر کیوں سواری کرتی ہو۔ تم جاؤ ابھی وضو کرو' ان ہزاروں میں سے چند... چند سو ہی پڑھ ڈالو بلکہ چند سو بھی کیوں' اللہ کی ناراضی کا خیال کر کے معافی طلب کرتے ہوئے دو سجدے بھی کر لو... تو تمہاری مشکل آسان ہو۔ موسیٰ کی مشکل آسان ہو۔ نیا ادھار مانگنے سے پہلے پچھلا حساب چکانا پڑتا ہے۔ حسن المآب موسیٰ!"

حسنل کھڑی ہو گئی۔ وہ انگلیاں مروڑتی ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

"نہیں... نہیں۔" سالوں پہلے کا جنون عود کر آیا۔

"نہیں' وہ موسیٰ تو نہیں کھوئے گی۔ اتنی مشکل سے ملنے والی چیز اتنی آسانی سے کیسے کھو سکتی ہے۔ نہیں۔"

وہ غرض کی پتلی تھی۔ اسے اللہ کو منانے کا طریقہ یاد تھا۔ لیکن اگلے ہی پل کچھ متزلزل ہو گئی۔

"لیکن اتنے بہت سارے نوافل!" اسے تو اب ان کی صحیح تعداد بھی یاد نہیں تھی۔ اس نے خدشہ بیان کیا پھر جواب سے پہلے ہی بولی۔

"میں کفارہ دے دوں گی... قیمتاً" کسی سے پڑھوا لوں گی... روزے البتہ خود رکھ لوں گی۔"

"بہت آئیڈیاز سوجھتے ہیں تمہیں حسنل..." حلیمہ نے گھن کھائے انداز میں کہنا شروع کیا لیکن درمیان ہی میں اریبہ نے ٹوک دیا۔ وہ چمک کر بولی تھی۔

"کیوں' کیوں... تم کرتی کیا ہو۔ بوڑھی ہو۔ لاغر' کمزور' بے بس' ٹانگیں ٹوٹی ہیں یا پاگل ہو گئی ہو۔ نہ پڑھو نفل نہ کرو وعدے پورے۔ پر دل کی گہرائیوں سے توبہ تو کر سکتی ہو' کردہ' ناکردہ گناہوں کی۔"

حلیمہ بغور اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ متزلزل تھی اور متوحش بھی۔ اس کے ہونٹ مرتعش تھے۔ اس کا سارا وزن بائیں ٹانگ پر تھا۔ دائیں کو ہلکا سا ہلا رہی تھی یہ حرکت غیر شعوری تھی۔

حلیمہ کے چہرے پر نرمی کا تاثر آرکا۔ سالوں کی گرد نے اس کا بال بھی بیکا نہ کیا تھا۔ وہ آج بھی پری رو تھی۔

وہ جنت کی حور نہیں تھی مگر حور اگر دنیا میں اتر آئے تو اس کا نام حسنل ہی ہو سکتا ہے۔ ساری بے نیازی کی ادائیں' حیثیت اور مرتبے' موسیٰ کی بیوی ہونے کا غرور اس کی گردن میں سریئے کی طرح فٹ ہو چکا تھا۔ لیکن اپنی انگلیاں مروڑتی وہ آج بھی وہی حسنل تھی جو کلاس روم میں بیٹھی من پسند چیز کے لیے مچل رہی تھی۔



"پھر اس نے تمہارا قصور معاف کر دیا۔ وہ بے شک معاف کرنے والا اور صاحب رحم ہے۔" (البقرہ-54)

حلیمہ اور اریبہ کی باتیں اسے پندرہ برس پیچھے لے گئیں۔ شہاب الدین بلاک... کینٹین' سرخ باداموں کے سائے میں بیٹھی وہ چاروں' لان اور عظمت اللہ بلاک کا وہ آخری کمرہ جس کی کھڑکی سے موسیٰ بی کا بل بورڈ نظر آتا تھا۔

"وہ ہزاروں نفل تھے حسنل.... تم نے کتنے ادا کیے۔"
"نیا ادھار مانگنے سے پہلے پچھلا حساب چکانا پڑتا ہے۔"
اس نے ان دونوں کی دلیلوں کا پورا مقابلہ کیا تھا۔ موضوع کو سرسری بنانے کا یا موضوع بدلنے کی کوشش مگر رات کے اس سناٹے میں جب وہ اپنے بیڈ روم میں تنہا تھی۔ اسے ان دونوں کی باتوں پر یقین آنے لگا۔ تو کیا واقعی اللہ دے کر چھین بھی لیا کرتا ہے تو کیا موسیٰ اس سے چھین لیا گیا۔
وہ وحشت زدہ ہو کر کھڑی ہو گئی۔ کمرہ کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ اگر وہ ہوتا اس وقت یہاں کمرے میں تو.... اس کی آنکھوں میں مرچیں بھرنے لگیں۔ وہ کہاں ہو گا؟ کس حال میں ہو گا؟
"موسیٰ!" اس کی پکار دل گیر تھی اور پھر نظریں دیوار پر آویزاں اس کی تصویر پر پڑ گئیں۔ وہ مرے قدموں سے چلتی تصویر تک رک گئی۔ یہ چہرہ.... یہ آنکھیں....
وہ اٹھارہ انیس برس کی نوجوان لڑکی نہیں رہی تھی۔ چونتیس پینتیس برس کی جوان عورت تھی اور اس چہرے کی پرستش تب شروع کی تھی جب پہلی بار خواب دیکھنے شروع کیے تھے۔ مگر دل آج بھی اس لے پر دھڑکتا تھا۔ پندرہ برس کی محبت بھری قربت نے بھی دل نہیں بھرا تھا۔ وہ سوجاتا تب وہ اٹھ کر بیٹھ جاتی اور یک ٹک اس کا چہرہ دیکھتی۔ اسی وارفتگی و تحیر سے جب پہلی بار روبرو دیکھا تھا۔ بلکہ نہیں اس وقت تو وہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ تصور اتنا طاقت ور بھی ہوتا ہے۔
شادی کی رات.... تو یہ خواب نہیں تھا۔
یہ سچ مچ کا موسیٰ تھا یا اس کا کوئی ہم شکل.... اس کی آنکھیں کھلیں تو وہ اس کے چہرے پر جھکا اسے ہوش میں لانے کی تگ و دو میں تھا۔ اس کی آنکھوں میں پہلا تاثر خوف کا ابھرا۔ پھر وہ اپنے آپ میں سمٹتی پیچھے کو ہوئی۔ مگر یہ بھی ممکن نہ تھا۔ تب اس نے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیے اور وہ کپکپا رہے تھے۔

اور موسیٰ بھرپور دلچسپی سے چہرے پر پھیلی ہتھیلیوں کو دیکھ رہا تھا۔ اور یہ بھی جان گیا تھا کہ چند پل لرزنے کے بعد وہ انگلیوں کی درزوں سے اس کی جانب دیکھ رہی ہے۔
"تو یعنی میں اب تک اپنے بارے میں خوش فہمی کا شکار تھا کہ اچھا خاصا خوش شکل شخص ہوں جبکہ تم تو خوف کھا کر بے ہوش ہو گئیں۔ کیا واقعی بہت برا لگا ہوں؟" وہ مسحور کرتی مسکراہٹ چہرے پر سجائے اس سے مخاطب تھا۔
موسیٰ نے دھیرے سے اس کے ہاتھ کو چھونا چاہا اور وہ یوں بدکی جیسے وہ اسے بجلی کا ننگا تار لگانے کو بڑھا ہو۔ اس نے اس کے بڑھے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مار دیا تھا۔ موسیٰ کے متبسم چہرے پر خفت آمیز ناگواری جس میں حیرت کا عنصر غالب تھا' جھلکنے لگی۔ وہ سوالیہ مگر قطعی جانچتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ حسنل کے لب ہلے۔
"آپ.... آپ کون....؟"
"گڈ کوئسچن...." وہ کھل کر مسکرایا۔
"تم واقعی نہیں جانتیں کہ میں کون ہوں۔ سنا تو تھا کہ یہاں کی لڑکیوں کو گھونگھٹ اٹھانے کے بعد پتا لگتا ہے۔ کس کے پلے بندھی ہیں مگر دیکھ بھی لیا بلکہ جھیل رہا ہوں او گاڈ!"
وہ گردن پیچھے کر کے ہنس دیا۔ حسنل نے اپنے نم ہاتھ رگڑے۔ وہ آگے کو جھکا تھا۔
"بندے کو سمیع الدین کہتے ہیں۔ نکاح کے وقت نام سنا تھا یا ایسے ہی سائن کر دیا۔ یہ تو بے وقوفی ہے۔ کسی بھی کاغذ کو پڑھے بغیر سائن نہیں کرتے۔"
سرگوشی بہت مدھم تھی۔ شریر و گھمبیر لہجہ مگر سانسوں کی حدت نے اس کے گال کو دہکا دیا۔ اب شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی مگر اس نے کہا کہ وہ سمیع الدین ہے۔
"تو.... موسیٰ؟" حسنل کے منہ سے بلا سوچے سمجھے نکلا۔
"اوہ.... تو یہ بات ہے۔ ہاں موسیٰ بھی' مطلب موسیٰ بی.... بھی یہ دونوں میرے ہی نام ہیں۔" وہ پیچھے

ہو گیا تھا۔ اسے اپنی دلہن میں بے حد دلچسپی ہونے لگی تھی۔ حسین ' ہراساں ' حیران ۔۔۔ بہت مشکل نام والی بیوی جو پھٹی آنکھوں سے اب ساری شرم بھلائے اسے تک رہی تھی۔

موسیٰ نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی اور کرتے کے بازو فولڈ کرنے لگا۔ پھر بیڈ پر ڈھیری کی صورت پڑے کمبل کو اٹھا کر صوفے کی سمت اچھال دیا۔ چھنک کی آواز پر دونوں چونکے۔ کمبل صوفے پر ' اور یہ کوئی زیور تھا۔ جو زمین پر گرا تھا۔ اوہ حسنل کا ہاتھ بے ساختہ اپنی گردن پر جا ٹکا۔ یہ تو وہ وزنی گلوبند تھا جو اسے پھندے کی طرح اپنی گردن پر کستا محسوس ہوا تھا۔ مگر یہ اترا کیسے۔ پھر اس نے اپنے کان چھوئے اور گردن اور ماتھا۔۔۔ وہاں کوئی زیور نہیں تھا۔ ہاں وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

"بڑی مشکل سے ہوش میں لایا ہوں۔ ویسے تم نے موڈ خراب کر دیا۔ میں تو کسی انڈین مووی کا سین سوچ کر آیا تھا۔ دلہن گھونگھٹ نکالے بیٹھی ہو گی۔ مگر یہاں تو میل نرس کا کام کرنا پڑ گیا۔ اللہ جانتا ہے تم کن مشکلوں سے ہوش میں آئی ہو۔"

وہ معنی خیز نگاہوں سے کہتے ہوئے دوبارہ اس کے قریب آ بیٹھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے زیور اکٹھے کر لیے تھے پھر دوسری جانب پڑے اس کے بھاری دوپٹے کو اٹھا کر اس کی سمت بڑھایا۔

"تم اسے دوبارہ چہرے پر ڈال سکتی ہو۔"

حسنل کو پہلی بار دوپٹے کی غیر موجودگی کا احساس ہوا اور موسیٰ نے دوپٹا اس کے سر پر ڈال دیا۔ پھر بہت شوق سے گھونگھٹ الٹ دیا۔ دوپٹا اس کے شانوں پر ٹھہر گیا تھا۔ پھر وہاں سے بھی پھسل گیا۔ حسنل نے بے ساختہ دوپٹے کو دیکھا۔ اور پھر موسیٰ کو پھر اس کی نظریں سلام پھیرنے کے انداز میں اپنے بائیں کندھے کی طرف جہاں موسیٰ کا ہاتھ ٹکا تھا۔ اس کے پورے جسم برقی رو دوڑی تھی۔ موسیٰ نے ششدر ہو کر اسے دیکھا۔ جو اس کا ہاتھ جھٹک کر ایک جھٹکے سے اٹھی تھی اور اب پورے قد سے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ناقابل فہم سی کیفیت تھی جسے موسیٰ کوئی نام نہ دے سکا۔ وہ حیرت سے پوچھنا چاہتا تھا کیوں۔۔۔۔ تب ہی آواز حلق میں پھنس گئی۔

ایک ہوش ربا خیال ' اس نے مشرق کی کہانیاں سن رکھی تھیں۔ ان میں سے بعض کہانیاں وہ بھی تھیں جن میں لڑکیاں شادی پر راضی ہو جاتی ہیں۔ جبکہ ان کے دل میں کوئی اور بستا ہے۔ وہ یا تو کہہ نہیں پاتیں۔۔۔ یا کوئی سنتا نہیں ہے۔ یا پھر یہ کہ اگر کوئی سن بھی لے تو لڑکی کی پھر بھی کوئی نہیں سنتا اور لڑکی کو سر جھکا کر رہٹ کے بیل کی طرح باقی کی عمر گزارنی ہوتی ہے۔

تو کیا سمیع الدین کی زندگی میں جو عورت آئی اس کا بھی ایک ماضی تھا۔ اور اسے ایسی عورت نہیں چاہیے تھی جو ماضی رکھتی ہو۔

"یہ عورت۔۔۔" اس نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ سیاہی مائل سی گرین لہنگے میں دوپٹے کے بغیر وہ سیدھی کھڑی تھی۔ موسیٰ کو اپنے بدترین خدشات درست لگنے لگے۔ کوئی پل جاتا کہ وہ اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے جھٹکے سے اپنے سامنے بٹھاتا اور پوچھتا کہ کیا وجہ ہے اس کے اس انداز کی۔۔۔ کہ اس نے اس کا ہاتھ جھٹک ڈالا کیا کوئی اور۔۔۔ لیکن اگلے ہی پل اسے اس کی سراسیمگی پر رحم آ گیا۔ موسیٰ نے اس سے کہا کہ وہ اس کے بارے میں جاننے سے پہلے اپنے بارے میں سب بتائے گا۔ سب کچھ سچ۔۔۔ اس یقین سے کہ پھر وہ بھی سچ بولے گی۔

اور شاید حسنل کو اتنی ہی مہلت درکار تھی۔ اس نے سمیع الدین کے سارے سچ سنے اور پھر وعدہ کر لیا کہ وہ سچ کہے گی اور ثبوت بھی دے گی۔ اور ثبوت نے اور حسنل کی کہانی نے موسیٰ کو ششدر کر دیا۔

کوئی ایسے بھی کسی کو چاہ سکتا ہے کہ دعاؤں میں مانگنے لگے اور پا بھی لے۔ اس کا ایمان اتنا مضبوط نہیں تھا۔

وہ شروع سے اپنے گھر کے ماحول سے باغی تھی۔ اسے گھر اور مدرسے میں فرق نہیں لگتا تھا۔ مدرسے کی تو پھر چھٹی ہو جاتی ہے۔ یہاں ہر وقت دین کے حوالے

سے بات چیت ہوتی تھی۔ مفتی عبدالرحمٰن تو خیر بڑے درجے پر تعلیم و ترویج کرتے تھے۔ ان کے پاس ہر وقت لوگوں کا تانتا بندھا رہتا۔ آنے والے تمام مہمان ان ہی کے جیسے حلیے کے مالک ہوتے۔ وہ ننھی سی بچی سوچتی' دنیا میں سارے مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔ عمر بہت کم تھی اور ابتدائی تعلیم گھر کے اندر ہی دی جا رہی تھی۔ ابو کے انتقال کے بعد سے وہ ویسے بھی ایک تنہا بچی تھی اور اس کے ابو بہت اچھے ابو تھے۔ وہ اس کی سب فرمائشیں پوری کرتے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اسے گڑیا بھی لا کر دی۔ جو اس سے پہلے کسی بھی بچے کے کھلونوں کا حصہ نہ تھی کہ گڑیا میں جان ڈالنی پڑے گی اور یہ کہ گڑیا بھی بت کی ایک شکل ہے۔ سب کے اعتراضات پر ابو نے حلیمی سے کہا۔

"خواہش کو ضد نہیں بنانا چاہیے۔ میں اسے سمجھا دوں گا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے مجھے گڑیا واپس کر دے گی۔ ہتھوڑا مارنا لوہار کا کام ہے۔ میری بیٹی تو خام سونا ہے۔ مجھے پتا ہے کیسی ضرب لگانی ہے کیسی صورت ڈھالنی ہے۔"

ابو کے مزاج میں اعتدال تھا۔ امی کو اتنی لچک بھی منظور نہ تھی۔ انہوں نے موقع دیکھ کر گڑیا چھپا ڈالی۔ اور ابو تو تھے نہیں جو لا کر دیتے۔ اس نے ابو کے ساتھ ساتھ گڑیا پر بھی صبر کر لیا۔ وہ تو ایک روز اسے کاٹھ کباڑ سے مل گئی۔ اسے یوں لگا گڑیا نہ ہو' ابو ہوں۔ مگر شومئی قسمت امی نے دیکھ لیا۔ پلک جھپک کے اندر گڑیا اس سے جھپٹ کر کباڑیے کے حوالے کر دی۔ جو دروازے پر آیا کھڑا تھا۔ امی نے اس کے رونے مچلنے کی پروا نہ کی۔ دروازہ بند کر دیا اور کباڑیے کی آواز معدوم ہونے کے ساتھ ساتھ اسے اپنے دل کی دھڑکنیں معدوم ہوتی لگ رہی تھیں۔

وہ ایک آخری امید کے تحت نانا جان کے پاس بھاگی آئی۔ سارا شکوہ کہہ دیا۔ نانا جان نے فوراً" ملازم کو بھیجا مگر تب تک کباڑیا جا چکا تھا۔ تو نانا جان کہہ دیتے کوئی بات نہیں وہ اور لا دیں گے۔ انہوں نے تو نہ کہا۔ ہاں ان کے سامنے بیٹھے مہمان نے پیار سے کہہ دیا۔ رونا دیکھا نہ گیا تھا۔

حسنل نے چونک کر دیکھا سیاہ پینٹ کوٹ میں سرخ ٹائی لگائے کلین شیو شخص۔۔۔ اس نے حسنل کا ہاتھ پکڑا اور بہت محبت و شفقت سے اسے سمجھایا۔

"اتنی پیاری بچی کو بالکل بھی نہیں رونا چاہیے۔ بری بات۔۔۔ اور گڑیا۔۔۔ میں ایک اور گڑیا لا دوں گا۔"

حسنل کے آنسو خشک ہو گئے۔ اسے ایسی تسلی نانا جان کی طرف سے درکار تھی۔ اور یہ انکل۔۔۔ نرم مسکراہٹ۔۔۔ خوب صورت چہرہ' قدیت۔۔۔ وہ اسے اتنا پسند آ گئے کہ وہ گڑیا کا غم بھول کر انہیں یک ٹک دیکھتی جاتی تھی۔ اللہ جانے وہ کون تھے۔ جو نانا جان کے کتب خانے تک آ گئے تھے اور دوسرے روز وہ حسنل کے لیے ایک گڑیا لائے جس کے بال سنہری اور آنکھیں نیلی تھیں۔ بلکہ اس کے ساتھ ایک گڈا بھی تھا اور اس گڈے کی صورت اور حلیہ بالکل ان انکل سے مشابہ تھا۔ ویسے ہی کٹے جمے بال۔۔۔ کلین شیو' سیاہ تھری پیس۔۔۔ اور یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اسے گڑیا گڈا زیادہ پسند آئے تھے یا انکل۔۔۔

دونوں ماموؤں کو گڑیا والا تحفہ پسند نہیں آیا تھا۔ وہ اسے واپس کرنا چاہتے تھے۔ نجانے کیوں حسنل کو ان کی خاموشی پر دکھ ہوا۔ مگر پھر وہ بول پڑے۔

"بچی کو تحفہ دے کر واپس لینا' یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ آپ فی الحال اسے اسی کے پاس رہنے دیجیے۔ کچھ وقت گزرے گا تو خود ہی فراموش کر دے گی۔ اور یوں بھی گڑیا سے کب تک کھیلا جا سکتا ہے۔"

اور پھر وہ دن بھی آیا جب حسنل نے خود الماری سے گڑیا گڈا نکال کر کام والی ماسی کی بیٹی کو دے دیے۔ مگر وہ انکل یاد تھے۔ ان کا لباس و انداز نشست و برخاست اور پُرکشش کلین شیو چہرہ۔ اس نے امی اور بالخصوص ماموؤں کو کٹر' بے لچک' سخت دل کے خانے میں ڈال دیا وہ بھی اور ان جیسے دوسرے سب ایک سے ہوتے ہیں۔ اور دوسرے خانے میں انکل جیسے لوگ۔ جو لچک رکھتے ہیں۔ نرم دل کے ہوتے ہیں۔ دل رکھنا جانتے ہیں۔

گھڑی بھر کے مہمان آنے والے انکل کو اپنا آئیڈیل بنالیا۔ اسی خاکے پر اس نے پھر ایک شبیہہ گھڑی اور پھر اسے پالیا۔ اس نے موسیٰ کو تو بہت بعد میں دیکھا تھا۔ اس نے بہت پہلے طے کر لیا تھا۔ وہ اپنی زندگی اپنے اصولوں پر گزارے گی۔ اور کوئی اس پر جبر نہیں کرے گا۔

اسے بچپن میں چھوٹی کہانیاں پڑھنا پسند تھیں۔ اور نظموں میں تو گویا جان بند تھی۔ وہ سارے گھر میں بھاگتے پھرتے انہیں گنگنانا چاہتی۔

تتلی اڑی 'اڑ نہ سکی
بس میں بیٹھی سیٹ نہ ملی
ڈرائیور بولا 'آمیرے پاس
تتلی بولی 'چل بدمعاش

وہ لہک لہک کر گاتی۔ امی اس کا منہ دبوچ لیتیں۔ ایسی بے ہودہ گوئی.... مامیاں اس کے پہلو میں چونٹا بھرتیں۔ اسے آیات و دعائیں تو یاد ہوتی نہیں تھیں۔ نظمیں سن لو.... ایک روز ماموں سے بھی تھپڑ پڑ گیا۔

"نام کیا ہے الوباٹا
کھاتے کیا ہو گھی اور آٹا
بیوی کہاں ؟؟
گاؤں میکے....
لاتے کیوں نہیں....
لڑتی ہے
دو جوتے مارو
ہائے اچھی لگتی ہے۔

وہ گال پر ہاتھ رکھے دم بخود تھی۔

"باغی ہے تمہاری بیٹی آپا.... اس کے اطوار اچھے نہیں۔" ماموں نے فیصلہ سنا دیا۔ "کہاں سے سنی یہ نظم ؟"

امی نے اس کی ملائم چوٹی مٹھی میں کس لی۔ "پڑوس کا بچی گاتی ہے۔"

"اور تم نے فقط آواز آنے پر یاد کر لی۔ چالیس سنون دعائیں تو اب تک یاد ہوئی نہیں.... چلو سناؤ' نیا ہدد یکھیں تو کون سی دعا پڑھتے ہیں۔"

"چاند.... اوہ چاند.... اسے چاند بہت پسند تھا۔
چمکیلا' روشن گول گول۔
تم ندی میں جا کر دیکھو جب ندی میں نہائے چاند
کرنوں کی سیڑھی لے کر جگمگ کرتا جائے چاند
اس کی آواز سریلی اور سُر پختہ تھے۔

"یہ تم نے دعا سنائی ہے حسنل۔" امی کے پورے جسم میں چیونٹیاں رینگنے لگیں اور پھر ان کے ہاتھ حسنل کے گالوں پر برسنے لگے اور یہیں سے حسنل نے متنفر ہونا شروع کر دیا۔ امی خود ہی ہانپ کر کمرے سے نکل جاتیں۔

"تم دعا یاد کرتیں حسنل! امی نے دعا کہی اور تم نے ندی میں چاند کو نہانے بھیج دیا۔ تمہیں نظمیں ایک بار سننے میں یاد ہو جاتی ہیں اور...." صبغہ کے لہجے میں غم تھا۔

حسنل نے نگاہ اٹھائی۔ اگلے ہی پل اس نے دعا سنا دی۔ اور ایک نہیں' دو نہیں.... بہت ساری۔

"جب یاد تھیں تو امی کو کیوں نہیں سنائیں ؟؟"

صبغہ چیخ پڑی۔ اور حسنل نے جواب نہیں دیا۔ آنسو پونچھ کر اٹھ گئی۔

شروع میں جب وہ چھوٹی تھی۔ تب احتجاج ریکارڈ کراتی تھی۔ جو دل میں ہوتا کہہ دیتی مگر پھر جب کچھ ہوش سنبھالا۔ تب اس نے چیزوں کو ہضم کرنا سیکھ لیا۔ اس نے خود کو مخفی رکھنا سیکھ لیا۔ بہت شروع میں وہ ہر چیز پر اعتراض جڑ دیتی تھی کیوں ؟ کس لیے ؟ نہیں میں تو نہیں اور پکڑ میں آجاتی پھر اس نے سب کو ان کے حال پر چھوڑ دیا اور خود اپنے حال میں مست ہو گئی۔ اپنے خوابوں خیالوں کی من پسند دنیا۔

یہ البتہ یاد رہا ۔ وہ تو حسن المآب تھی۔ جسے اللہ نے موسیٰ دے دیا ورنہ ایسے خوابوں میں رہنے والیاں ساری زندگی دہری زندگی جیتی ہیں۔ جل جل کر کڑھ کڑھ کر اپنے آپ کو تباہ کرتی ہیں۔

☆ ☆ ☆

زندگی کی شروعات بہت خوب صورت تھی۔ حسن

المآب نے موسیٰ کو پالیا تھا۔
حسن المآب نے تو موسیٰ سے محبت کی تھی اس کی چاہ کی تھی اور معجزاتی طور پر اسے پایا تھا۔ اب اس کا عشق میں بے خود ہو جانا سمجھ میں آتا تھا۔ پر موسیٰ کی وارفتگی کو وہ کیا نام دیتی جو اس پرانے زمانے کی سی طرز پر ہوئی شادی کو یوں نبھا رہا تھا۔ جیسے جنموں کا پیار کشٹوں کے بعد ملا ہو۔ وہ جو گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا تھا۔ جس کے لیے عورت نئی چیز نہیں تھی یا پھر حسن نایاب نہیں تھا۔ مگر وہ اس پر یوں فریفتہ تھا۔ جیسے اسی نے تو مانگا ہو۔

اور خوشیوں کے پنڈولوں میں جھولتی حسنل نے وجوہات پر غور نہیں کیا۔ اس نے ہر شے کو اپنا حق سمجھ کر وصول کیا۔

یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ وہ چکور بن کر چاند پر فریفتہ تھی۔ یا وہ مور بن کر مورنی کو رجھاتا تھا۔ اور حسن المآب کو موسیٰ نہیں ملا تھا' سب کچھ مل گیا تھا۔ وہ سب جو وہ چاہتی تھی' اسے موسیٰ ملا تھا۔ اسے موسیٰ کی محبت بھی ملی تھی۔ اسے موسیٰ کے نام کی عزت و شہرت بھی مل گئی۔ ماں کے گھر سے رخصت نہیں ہوئی تھی گویا پنجرے سے چھوٹی تھی۔ اب اس کے لیے اڑان بھرنے کو کھلا آسمان تھا۔ (اسے خبر نہیں تھی ایسے پرندے پھنستے بھی سب پہلے ہیں)

"اچھا تو پھر تم نے میری جیکٹ کا کیا کیا؟" وہ بہت موڈ میں ہوتا تو بات یہیں سے شروع ہوتی۔

"اتنی بار بتایا تو ہے۔" وہ مصنوعی اکتاہٹ کا مظاہرہ کرتی۔

"نہیں ایک بار اور....."

"آپ ہر روز یہی کہتے ہیں۔"

"اور آپ ہر روز ایسے ہی شوق بڑھاتی ہیں۔"

"آپ یہ جملہ بھی روز کہتے ہیں۔" وہ خفگی سے دیکھتی۔

"جملہ بدل دوں۔" وہ پُرجوش ہو کر سیدھا ہوتا۔

"نہیں نہیں....." وہ پیچھے سرکتی۔ "آپ سوال بدل لیں۔"

موسیٰ کو اپنا دوسرا سوال بھی بہت عزیز تھا۔ وہ بار بار کرتا اور جواب سننے کی بے چینی عیاں ہوتی۔ وہ اسے بتائے کہ اس سے پہلے کسی اور شخص نے ایسی قربت سے اسے نہیں دیکھا۔ اس کے عارض دہک جاتے۔ پہلی بار تو طیش سے وہ اس سے کیسا ذلت بھرا تضحیک سے لبریز سوال کر رہا تھا۔ وہ ہاتھ جھٹک کر اٹھ گئی تھی۔ محبت اپنی جگہ..... عزت اپنی جگہ 'بھاڑ میں گئی عاشقی۔

"مجھے یقین ہے مگر بس ایک بار تصدیق کر دو۔" لمحے کا فسوں ٹوٹ گیا۔ وہ گھگھیانے لگا تھا۔ طیش کی جگہ وہ حیران رہ گئی۔ سو وہ باقاعدہ ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔

"میں شریف ماں کی بیٹی ہوں موسیٰ..... آپ کو یہ سوال کرنے سے پہلے سو بار سوچنا چاہیے تھا۔" وہ آگ بگولہ ہو رہی تھی۔ "اور اگر میں کہہ دوں کہ ہاں آپ سے پہلے بھی کسی اور نے..... ایسی قربت سے

اس سے جملہ مکمل نہ ہو سکا۔ موسیٰ نے تڑپ کر اسے دیکھا تھا۔

"نہیں..... ایسے مت کہنا حسنل کبھی بھی۔" اس نے یکدم اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے خود سے لپٹا لیا۔

"کبھی مذاق میں بھی ایسا مت کہنا۔ تمہیں برا لگا ہے تو جو چاہو سزا دے دو مگر....."

اس نے تیزی سے دور ہو کر اس کے کندھے تھام لیے حسنل کی آنکھوں کے آگے ہفت آسمان گھوم گئے۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ پھر اس نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"مجھے معاف کر دو۔ مجھے تمہارا یقین ہے مگر تمہارے منہ سے سن کر مجھے تسکین ملے گی۔ ایسے جیسے کوئی جلتے بدن پر مرہم رکھ دے۔ بس ایک بار فقط ایک بار۔"

وہ معذرت خواہ تھا۔ اس کی ناراضی کے خوف سے گھبرایا ہوا بھی..... مگر سوال سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔

"اور اگر میں کہہ دوں کہ ہاں..... تب آپ کیا کریں گے؟"

ایک زمانے کا ہیرو بلا کا دلکش مرد..... جس کی

آنکھیں سحر کار تھیں اور قدو قامت نشان امتیاز' وہ اپنی آنکھوں کو ہاتھ سے ڈھانپے ہچکیوں سے رو پڑا تھا۔

"موسیٰ!" وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھی۔ ایک ہاتھ اس کے زانو پر رکھ کر دوسرے سے آنکھوں پر جمے ہاتھ کو ہٹانا چاہا۔ مگر یہ مشکل ثابت ہوا اور حسنل ایک الہامی پل سے گزری یا جیسے کسی نے چپکے سے اس کے کان میں کہہ دیا۔ یہ سوال براہ راست اس سے نہیں تھا۔ سوال دراصل ایک خدشہ تھا۔ ایسا خدشہ جس کے جواب میں نفی کا یقین ہو۔ سوال دراصل کہانی تھا اور کہانیاں ماضی ہوتی ہیں۔ اور ہر کسی کا ماضی شاندار ہو ضروری نہیں۔ دراصل موسیٰ دیکھ اسے رہا تھا اور سوچ کسی اور کو رہا تھا۔ اور تب ہی حسنل کو یاد آ گئی وہ الجھی گفتگو جو محی الدین سہگل نے اپنے تئیں لپیٹ کر کی تھی۔

"میں تمہیں بتانا تو نہیں چاہتا مگر....." اور انہوں نے کھل کر تو کچھ نہ کہا مگر.... اوہ تو یہ سوال اس کے لیے نہیں تھا۔ مگر اس کے جواب سے موسیٰ کو قرار ملنا تھا۔

وہ ہلکی پھلکی ہو گئی۔ اس نے موسیٰ کا آنسوؤں والا ہاتھ تھام لیا۔ اس بار موسیٰ نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ ہاں اس نے نظریں چرا لی تھیں۔ حسنل نے اس کا نم ہاتھ اپنے گال پہ رکھا۔ موسیٰ کی نظریں بے ساختہ اس کی سمت اٹھیں۔ حسنل کی آنکھوں میں محبت آمیز مسکراہٹ تھی۔ پھر اس کا سر اثبات میں ہلا۔

"ہاں' ان ہاتھوں سے پہلے اس چہرے کو کسی اور نے نہیں چھوا اور ان ہاتھوں کو بھی....." اس نے موسیٰ کے دونوں ہاتھوں کو چھوڑ کر اپنے دونوں ہاتھ دکھائے پہلے الٹے پھر سیدھے....

"اوہ حسنل....." اس نے بے تابی سے اسے خود سے لپٹا لیا۔

"مجھے یقین تھا۔ مجھے یقین تھا۔ ڈیڈ نے کہا تھا۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ "مجھے معاف کر دو لیکن میں دوبارہ بھی تم سے یہ سوال پوچھا کروں گا۔"

اس نے کسی بچے سے ضدی لہجے میں پیشگی اطلاع لی یا اجازت طلب کی۔

"میں بار بار جواب دوں گی۔" اس نے پچکار کر کہا۔

"یہی جواب ناں کہ میرے علاوہ کوئی نہیں۔" وہ مسکرانے لگا تھا۔

"ہاں یہی جواب کہ آپ کے سوا کوئی بھی نہیں.... میں جھوٹ نہیں بولتی۔"

"مجھے یقین ہے.... مگر پھر بھی.... ہاں پھر بھی۔"



"اوہ!" وہ جو دبے قدموں نکلنے لگی تھی۔ لڑکھڑا کر رک گئی تھی۔ نجانے کیسے اس کا ہاتھ موسیٰ کے ہاتھ میں چلا گیا اپنے تئیں تو وہ چپکے سے بڑھی تھی۔ حالانکہ آئی بہت شوق سے تھی۔ عقیلہ بیگم نے اس کے لیے ڈھیروں ملبوسات تیار کروائے تھے جدید اور قیمتی اور بصد اصرار اسے پہنایا کرتی تھیں۔

وہ سیاہ چوڑی دار پاجامے میں ملبوس تھی۔ اس نے ایسا کسا ہوا پاجامہ اور اونچا کرتا پہلی بار زیب تن کیا تھا۔ امی ایسے کسی لباس کو بھی سخت ناپسند کرتی تھیں۔ جو جسم کی بناوٹ کو کسی بھی پہلو سے نمایاں کرتا ہو۔

جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو قدم جم گئے۔ موسیٰ صوفے پر براجمان' سامنے رکھی میز پر جھکا کچھ کاغذات کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ ہاتھ میں قلم تھا۔ دوسرے ہاتھ پر ٹھوڑی ٹکی تھی۔ گویا غور و خوض فرمایا جا رہا تھا۔

وہ تو اپنی تعریفیں سننے آئی تھی کچھ مایوس ہو کر صوفے کے عقب سے گزر جانا مناسب سمجھا۔ پر یہ کیا؟ جب وہ بالکل چپکے سے نکل جانے کو تھی۔ بری طرح مصروف موسیٰ نے اپنا ہاتھ اوپر کو اٹھایا' گردن پیچھے ڈھلکائی اور اسے کھینچتے ہوئے اپنے سامنے کر لیا۔ اس کے بال سرک کر دائیں جانب لہرا گئے۔ اس نے پل بھر کی بے اختیاری کے بعد کسمسا کر اپنا ہاتھ چھڑوانا چاہا۔

"پلیز موسیٰ.... کوئی آجائے گا۔"

"اوہ شٹ....!" موسیٰ نے اس کا ہاتھ تو نہ چھوڑا۔ اپنی گردن سیدھی کر لی۔ پھر اس ہاتھ کو اپنے سر سے

گھما کر اپنے سامنے پڑی میز سے کاغذ سرکاتے ہوئے اسے اپنے سامنے بٹھالیا۔ آنکھوں میں مصنوعی خفگی تھی۔

"کوئی...؟ آج تم مجھے بتا ہی دو کہ یہ کوئی کون ہے جس کے آجانے کے خوف سے تم خود بھی ڈرتی ہو اور مجھے بھی ڈرانے کی کوشش کرتی ہو۔" وہ جیسے دانت پیس رہا تھا۔ وہ ایک پل کو تو سمجھی نہیں پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔

"بولو..." اس کا لہجہ گھمبیر ہو گیا اور آنکھوں سے ان کہے جذبے چھلکنے لگے۔ وہ ہنوز جواب کا منتظر تھا اور پلکیں جھپکائے بناء اس کا گلاب چہرہ دیکھ رہا تھا۔ حسنل کی پلکیں حیا سے جھک گئیں۔

"جواب کیوں نہیں دیتیں؟" اس نے اپنے ہاتھ میں دبے اس کے ہاتھ کو بھینچا۔

"پلیز موسیٰ...!" بالآخر وہ ہار گئی۔ "کوئی دیکھ لے گا۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اگلے پل موسیٰ کا قہقہہ کمرے سے نکل کر باہر سڑک تک ہو آیا۔ حسنل کا ہاتھ اپنے ہونٹوں پر جا رکا۔

"آپ کام کر رہے تھے؟" اس نے ہوا سے پھڑپھڑاتے کاغذ دیکھے۔

"ہاں کام... پوئٹری چیک کر رہا تھا۔ نیو سانگ کے لیے... پر کچھ سوجھتا نہیں۔" وہ یکدم سنجیدہ ہوا۔ پھر اسے بغور دیکھا۔

"بلکہ ایسا نہ کروں کہ تمہیں سامنے بٹھا کر لکھوں' تمہارے اوپر لکھوں... ان حسین آنکھوں پر اور..." وہ اس کے نقوش گننے لگا۔

"یہ تو پھر بہت طویل غزل ہو گی؟" اس نے مصنوعی پریشانی کا اظہار کیا۔

"تمہیں کس نے کہا کہ میں محنت سے گھبراتا ہوں۔"

وہ اسے پہلی بار اپنے اسٹوڈیو تک لے آیا۔ حسنل حیران رہ گئی۔ ساؤنڈ پروف سرخ و سیاہ کے امتزاج سے سجا کمرہ... جدید و قیمتی میوزیکل انسٹرومنٹس...

دیوار پر اس کی مختلف تصاویر بھی آویزاں تھیں۔ خاص طور پر وہ جب وہ کہیں پرفارمنس دے رہا تھا۔ وہ اسے ایک ایک چیز کے بارے میں بتانے لگا۔

اس نے پیانو پر ہوا کی سی تیزی سے ہاتھ پھیرا۔ پورے کمرے میں جلترنگ سی بج اٹھی۔ اس نے طبلے کی جوڑی پر ایک ہاتھ مار کے تاسف آمیز مایوسی سے سر ہلا کر اسے بتایا کہ شدید خواہش و کوشش کے باوجود وہ آج تک طبلہ بجانا نہیں سیکھ سکا۔ ہاں البتہ گٹار اس سے اچھا کوئی اور نہیں بجا سکتا۔ ساتھ ہی اس نے دو اسٹول کھینچ لیے۔ بصد احترام اسے تشریف رکھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ گٹار ہاتھ میں پکڑے اس کے عین سامنے اسٹول پر بیٹھ گیا۔

"کیا سنو گی؟" اس نے گٹار کے تار پر ایک بار انگلی رکھ کر آواز پیدا کی اور پھر ذرا سا خمیدہ ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ حسنل کا سر نفی میں ہلا۔ اس کا ایک ہاتھ سینے پر دل کے مقام پر دھرا تھا۔ وہ دم بخود تھی۔ اس نے آنکھوں میں آنے والی نمی کو تیز تیز پلکیں جھپکا کر روکنے کی سعی کی تھی اور اس حال میں لگتا تھا آنکھیں نہ ہوں چاندنی سے نہائی جھیلوں میں ہزاروں دیے جلتے ہوں۔

مقام حیرت یہ تھا کہ اسے موسیٰ ملا... مگر اس سے بڑی بات یہ تھی کہ اسے موسیٰ کی محبت بھی ملی وہ جتنا بھی شکر ادا کرتی وہ کم تھا۔

نعمتوں اور عنایتوں کا شکر تو ضرور ہی ادا کرنا چاہیے۔ مگر اس وقت تو تحیر سے نکل کر وہ نعمت اور عنایت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ کیسا حسین خواب سا منظر تھا۔ وہ اسے سامنے بٹھا کر اس کے لیے گا رہا تھا۔ اس کی وارفتہ نگاہیں... اس کے وجود پر جمی تھیں۔ اسے پلکیں جھپکنا بھی گوارا نہ تھا۔

دل موہ لینے والے تبسم سے اسے دیکھتی تھی اور شاید یہ وہ وقت تھا جس کے ٹھہر جانے کی دعا مانگی جاتی ہے۔

"کیسا...؟" کب نغمہ مکمل ہوا اور اس نے گٹار سے انگلیاں اٹھائیں۔ وہ بری طرح چونکی۔

"یہ نغمہ میں نے سب سے پہلے تمہیں سنایا ہے۔" اس نے کہا "یہ گیت تمہارے نام۔"

اس نے گٹار رکھ دیا اور اس نے صرف یہ منہ زبانی نہیں کہا البم ریلیز ہونے پر یہ بات لکھوا بھی دی۔

"میری پیاری بیوی کے لیے۔"

اور موسیٰ بی کی بیوی ساری دنیا بالخصوص میڈیا کے لیے بڑی مسٹری تھی گویا... ایک بہت معزز مذہبی خاندان کی بیٹی... ایک گلوکار کی بیوی کیسے بن گئی اور وہ کس قدر ملکوتی حسن کی مالک تھی۔

موسیٰ کی بیوی دوسرے بہت سے شوبز سے وابستہ لوگوں کی بیویوں کی طرح سب کے سامنے نہیں تھی۔ وہ بس ایک ذکر تھی جسے ہر محفل میں چھیڑ دیا جاتا اور کوئی اور کیوں؟ خود موسیٰ ہی... اس کی گفتگو ہنی کے ذکر کے بغیر ادھوری تھی۔ اس کی ہنی یہ... اس کی ہنی وہ... شدید سے شدید مصروفیت میں بھی وہ ہر گھنٹے بعد اسے فون کرتا۔ اس کا فون آجاتا تو ایسے الرٹ ہو جاتا جیسے فرض شناس ایمبولنس کا ڈرائیور۔ آندھی ہو یا طوفان اسے آٹھ بجے گھر پہنچ جانا ہے کہ ہنی ڈنر پر اس کا ویٹ کر رہی ہو گی۔ شدید مصروفیت میں سے بھی وہ وقت نکال لیتا کہ کیا اچھا ہو کہ وہ اسے لنچ پر پہنچ کر سرپرائز دے یا شام کی چائے پر...

وہ بڑے فخر سے بتاتا کہ "اسے کبھی بھی چائے پسند نہیں رہی مگر صرف ہنی کی خاطر' بلکہ اس نے تو آج تک ہنی کو یہ بھی پتا نہیں لگنے دیا کہ چائے اس کا پسندیدہ مشروب نہیں ہے۔ ہنی یہ کہتی ہے۔ ہنی کی یہ عادت ہے اسے یہ پسند ہے اسے یہ ناپسند ہے۔ شروع میں تو وہ انٹرویوز سے احتراز برتتا تھا۔ پھر بعد میں جب قسم توڑ دی پھر اخباری انٹرویو ہو یا نشریاتی... بات کہیں سے بھی شروع ہو' ختم ہنی پر ہوتی یا جواب میں کہیں نہ کہیں سے ہنی آجاتی ٹی وی ہوسٹ لائیو شو میں سوال رکھتی اور آپ کی ہنی کیسی ہیں۔

وہ بہت فخر سے یہ بھی بتاتا کہ اس نے اپنی بیوی کا نام نکاح نامے پر سائن کرتے وقت پہلی بار سنا... اور پہلی بار اسے گھونگھٹ اٹھانے کے بعد دیکھا۔

کچھ رشک کرتیں کچھ حسد... جب وہ بتاتا وہ پہلی نظر کی محبت کا شکار ہوا۔ محبت آکاس بیل کی طرح اس کے وجود سے لپٹی ہے۔ اسے خود کے ختم ہونے کا ذرا غم نہیں۔ ہنی کی محبت چادر ہے جس نے اس کے وجود کو ڈھانپ لیا ہے۔

"تو کیا وہ بھی آپ سے اتنی ہی محبت کرتی ہیں؟" پروگرام کی میزبان رشک و حسد کے ملے جلے تاثر سے پوچھتی۔

"ہاں!" وہ سرشار ہو کر سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیتا... مزید ڈھیلا ہو کر دونوں بازو سر کے پیچھے باندھ کر جیسے جواب سوچتا۔ "اس کی محبت کو بتانے کے لیے تو میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ میری محبت تو کچھ بھی نہیں اس کی محبت کے سامنے... وہ مجھ سے عشق کرتی ہے یا عشق سے بھی بڑھ کر اگر کوئی چیز ہو تو۔" اس کا چہرہ جگمگانے لگتا۔

"یہ بات یقیناً" انہوں نے ہی آپ کو بتائی ہو گی۔" ایک میزبان اندر کی جلن پر قابو نہ پا سکی تو کہہ دیا۔

"کیا بات...؟" وہ فوری طور پر نہ سمجھا۔

"یہی کہ وہ آپ سے آپ کی محبت سے زیادہ محبت کرتی ہیں۔" میزبان کے لہجے میں چبھن تھی۔

"او... وو..." موسیٰ کے ہونٹ سیٹی کے انداز میں گول ہو گئے۔ اس نے بہت گہری نظر سے میزبان کو دیکھا۔ ایسے کہ وہ بوکھلا گئی۔ پھر وہ مسکرا دیا۔

"آپ سے کس نے کہہ دیا بی بی... محبت بتائی جاتی ہے۔ یہ تو محسوس ہو جاتی ہے۔ الہام بن کر دل پر وارد ہوتی ہے۔ پتا لگ جاتی ہے۔ آپ نے یہ کیوں سمجھ لیا محبت کا اظہار لفظوں میں ضروری ہے۔"

"او کے... او کے۔" میزبان نے ہاتھ اٹھا دیے۔

"ہم نے مان لیا ویورز... موسیٰ اور ان کی مسز ہنی... آج کے دور کے ہیر رانجھا ہیں۔ سسی پنوں ہیں سوہنی..."

"ایکسکیوزمی! یہ سب لوگ ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے۔ جبکہ ہم تو ساتھ ساتھ ہیں۔" موسیٰ نے تصحیح کی۔

"اوہ...!" میزبان کی کلاشنکوف کے برسٹ کی

طرح تڑتڑ چلتی زبان کو بریک لگ گیا۔
خواہ مخواہ چھیڑ بیٹھی۔ "تو سوال پھر ایک ہی رہ جاتا ہے۔ آپ انہیں کبھی اپنے ہمراہ لائے نہیں۔ کسی بھی فورم پر۔۔۔۔ بلکہ آپ انہیں یہیں ہمارے شو پر لائیے۔ کیوں آڈینس میں نے صحیح کہا ناں۔۔۔۔" وہ ناظرین کو مخاطب کر کے کہتی "ہم سب آپ دونوں کو ایک ساتھ دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کے منہ سے تو ان کی تعریفیں سنتے رہتے ہیں۔ کچھ ان سے بھی تو سنیں کہ آپ کے بیانات میں کتنی صداقت ہے۔ کیوں بھئی؟" اسے موسیٰ کو لاجواب کرنے کا راستہ سوجھ گیا۔

"ہمارے آڈینس کی تالیاں بتاتی ہیں موسیٰ۔۔۔۔ وہ سب میرے ساتھ ہیں۔" اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر تالی بجائی اور ناظرین کے ساتھ جا کر کھڑی ہو گئی۔

موسیٰ نے رخ بدلا۔ پروگرام کی میزبان کو دیکھا اور پھر اشتیاق کی ماری پرستاروں کو۔۔۔ جو تالیاں پیٹ پیٹ کر ہاتھ سرخ کر رہی تھیں۔ ہوسٹ اسے پھنسا کر اب تماشا دیکھ رہی تھی۔

"موسیٰ موسیٰ۔۔۔ لیس لیس۔" شور سا پڑ گیا۔

موسیٰ نے تحمل سے تالیاں سنیں پھر ہاتھ اٹھا کر سب سے گویا خاموش ہو جانے کی استدعا کی۔ اس کے لبوں پر دلفریب تبسم تھا۔ اس نے اپنے بالوں میں ہاتھ چلایا۔

"بھئی اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ ہنی خود ہی ان چیزوں کو اوائیڈ (نظر انداز) کرتی ہے۔ وہ یقیناً" اس وقت شو دیکھ رہی ہو گی۔ بھئی ہنی۔۔۔۔" اس نے رخ بدل کر ادھر ادھر دیکھا "کدھر ہے میرا کیمرہ۔۔۔ اوکے" اس نے کیمرے کی آنکھ میں آنکھ ڈالی۔۔۔ "تم سن رہی ہو؟ یہ سب لوگ کیا چاہتے ہیں۔ انہیں بتا دو کہ میری طرف سے کوئی پابندی نہیں۔۔۔۔ تم خود ہی۔" موسیٰ کا انداز و لہجہ محبت اور مان سے چور تھا۔ دیکھنے والی ہر آنکھ رشک سے بھر گئی۔

"ایسا تو نہیں موسیٰ۔۔۔ آپ کنزرو ٹو ہیں۔۔۔؟"
میزبان دوبارہ اپنی سیٹ پر آ گئی۔

موسیٰ بری طرح چونکا اس نے بھنویں باہم ملا کر اسے دیکھا۔ پھر لمبا سانس لے کر گویا کیل ٹھونک دی۔

"جس شخص کی بیوی ہنی جیسی ہو' اسے تھوڑا کنزرو ٹو ہونا پڑتا ہے۔" اس نے قہقہہ لگایا۔

اور وہ سب کو ایسے ہی گھما دیتا تھا۔ اب وہ ایک نو آموز' جگہ بنانے کے لیے جدوجہد کرنے والا گلوکار نہیں تھا۔ ملک کا سب سے بڑا سنگر تھا۔ سب سے زیادہ معاوضہ لینے والا سنگر۔۔۔ صرف ملک میں نہیں پوری دنیا میں اس کے فینز کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے اسٹائل کو کاپی کیا جاتا تھا۔ اس کے گیتوں کی لائنکس اربوں میں تھیں۔

حلقہ احباب وسیع سے وسیع تر تھا۔ جن میں دوست بھی تھے اور سچے دوست بھی تھے۔ ایسی ہی سچی دوست جو نمبرون مارننگ شو کی میزبان تھی۔

اس کی فرمائش نے اسے پہلی بار امتحان میں ڈال دیا۔ وہ ان کے گھر آئی بیٹھی تھی اور انکار نہ کرنے کا پکا وعدہ لینے کے بعد جب اس نے مدعا بیان کیا۔ دونوں اپنی جگہ سے اچھل پڑے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ قسم کیسے توڑی جا سکتی ہے کہ ہنی سب کے سامنے نہیں آئے گی۔"

"ویلنٹائن ڈے پر میں تم دونوں کو مہمان خصوصی بنانا چاہتی ہوں۔ موسیٰ اور ہنی۔۔۔ انکار نہیں سنوں گی تم نے وعدہ کیا ہے۔ میں تم لوگوں کی تمام شرائط ماننے کو تیار ہوں۔ جیسے بھی تم کہو مگر انکار نہیں کر سکتے۔" وہ ضدی بچی کی طرح نفی میں سر ہلاتی جا رہی تھی۔

"میری طرف سے کبھی بھی پابندی نہیں تھی۔ مگر ہنی خود ہی پسند نہیں کرتی۔ اور سب سے بڑھ کر دادا جان اجازت نہیں دیں گے۔ وہ ہنی کو یوں ٹریٹ کرتے ہیں جیسے کوئی خزانہ ہو۔"

وہ محی الدین سہگل کے تحفظات بتانے لگا۔ جن کی طویل فہرست تھی۔ ہنی یوں بیٹھی مسکرا رہی تھی جیسے کسی اور کا ذکر ہو۔

"آپ بھی تو کچھ بولیں۔۔۔" میزبان دوست نے کچھ مایوس ہوتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ موسیٰ کے پہلو سے

لگی بیٹھی تھی۔ موسیٰ کا ہاتھ اس کی سمت صوفے پر لمبا تھا۔ وہ بے ارادہ اس کے بالوں سے چھیڑ چھاڑ بھی کر لیتا تھا۔

"میں کیا بولوں..... یہ آپ کو جواب دے تو رہے ہیں۔ داداجان پسند نہیں کریں گے۔"

"او، تو میں ان سے پرمیشن لے لیتی ہوں۔"

دوست اچھلی۔

ہنی اور موسیٰ نے ایک دوسرے کو دیکھ کر شانے اچکا دیے۔ داداجان نے کب ماننا تھا۔ مگر اس وقت ان دونوں کو اچھلنا پڑ گیا۔ جب انہوں نے اجازت دے دی۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں....."

"اوہ یس....." وہ بہت جوش سے بولی۔ موسیٰ چند پل کی شدید حیرت کے بعد مسکرانے لگا۔

ہنی..... یعنی حسن المآب ششدر کھڑی تھی۔



ریٹنگ پیرامیٹر اگر غبارہ ہوتے تو اس روز پھٹ جاتے۔ کانچ کا گلوب ہوتے تو تڑخ جاتے۔

جب ویلنٹائن ڈے کے خصوصی شو میں سفید گھیر دار امبریلا فراک اور لمبے دوپٹے جس کے دامن اور کناروں پر سرخ پھول کڑھے تھے۔ پہنے ہوئے' سیاہ کوٹ پینٹ میں ملبوس موسیٰ کی کہنی میں ہاتھ پھنسائے۔ حسن المآب نے کیمرے کے سامنے پہلی بار انٹری دی۔ اس کے چہرے پر شرمیلی مسکان تھی۔ مگر اعتماد کی کمی نہ تھی۔ اس نے پاگل ہو جانے والی آڈینس سے جا کر باری باری ہاتھ بھی ملایا۔ وہ ریڈ پمپ شوز پہنے ہوئے تھی۔ سیٹ پر واپس جاتے ہوئے لکڑی کے پھٹوں پر بنائے گئے اسٹیج پر قدم رکھتے وہ کچھ گھبرائی۔ موسیٰ نے سیکنڈ کے سویں حصے میں اس کی پریشانی کو محسوس کر کے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ ہاتھ تھام کر اس نزاکت سے اوپر کو آئی جیسے دریائے نیلم کے چکنے پتھروں سے بچتا ہو۔

کیمرہ اسے ہر زاویے سے دکھا رہا تھا۔

موسیٰ حسب عادت اسے اپنے بہت نزدیک بٹھائے اس کی پشت پر ہاتھ لمبا لٹائے بیٹھا تھا۔

انٹرویو حسب معمول روایتی تھا۔ وہی گھسے پٹے سوالات ہاں مگر جوابات کا نیا پن سب کو متوجہ کر گیا۔ اسی رات یہ شو ڈاؤن لوڈ ہوتے ہی سب سے زیادہ دیکھا جانے والا شو بن گیا۔

خاص طور پر جب ایک رومینٹک دھن پر موسیٰ نے ہنی کے ساتھ ڈانس کیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جیسے بھول گئے کہ کہاں کھڑے ہیں۔ آڈینس خوشی سے چلا رہی تھی۔

موسیٰ نے ہنی کا ہاتھ تھام کر سر کے اوپر سے گھماتے ہوئے اسے بھی گھما ڈالا اور پھر گرنے سے پہلے تھام لیا۔ اور میوزک بند ہونے پر بانہوں میں تھامے تھامے نشست تک لے آیا۔

"آپ تو بہت اچھا ڈانس کرتی ہیں ہنی۔"

"بس ان کی انگلیوں کے اشارے پر ناچنا آتا ہے۔"

اس نے ذو معنی جملہ کہا۔ ایک ہاہا کار مچ گئی پھر ہنی نے بتایا ہر نئی دھن بنا کر اسے ساتھ لے کر جھومنا موسیٰ کی عادت ہے۔ پہلی پرفارمنس وہ اپنے اسٹوڈیو میں اسی کو سامنے بٹھا کر دیتا ہے۔

اور باتوں کے ساتھ ساتھ موسیٰ کی بیوی کے بے حد لمبے اور بہت سیدھے سلکی بال اور آنکھیں بھی موضوع بحث تھیں۔ بالوں کا رنگ قدرتی تھا۔ یا ڈائی..... تو پھر یہ کون سا کلر ہو گا اور یہ کہ دونوں کی ٹوٹلی ارینج میرج تھی۔ پھر بھی ایسی محبت.....

دوسری طرف ایک مسئلہ بھی کھڑا ہو گیا۔ اس نے دوست سے وعدہ نبھایا تھا۔ بیوی کے ساتھ آمد کا اب ہر چینل سے تقاضا ہونے لگا کہ وہ ان کے یہاں بھی ایسی دھواں دھار انٹری دے۔ یعنی ہنی کو ساتھ لائے۔ موسیٰ کہہ کہہ کر تھک گیا کہ اس کی طرف سے پابندی نہیں..... ہنی خود ہی آنا نہیں چاہتی۔

پھر ایک اور مسئلہ نکل آیا۔ ایک انٹرنیشنل ہیئر کلر

بنانے والی کمپنی اسے اپنے ایڈ میں شامل کرنا چاہتی تھی۔ یہاں بھی صاف انکار بھیج دیا گیا۔ مگر مصیبت یہ بن گئی کہ پاکستان میں اس ایڈ کو ڈائریکٹ کرنے والی لڑکی محی الدین سہگل کے عزیز دوست کی نواسی نکل آئی یہ اس کے لیے بہت بڑا پروجیکٹ تھا۔

"آپ کی جو ٹرمز اینڈ کنڈیشنز ہوں گی میں سب مان لوں گی مگر بس آپ ہاں کیجیے۔" وہ محی الدین کا گھٹنا پکڑے بیٹھی تھی۔

محی الدین نے بالآخر مان کر گیند ہنی کے کورٹ میں ڈال دی۔ اگر وہ چاہے تو...

"نہیں... نانا جان کو اچھا نہیں لگے گا۔ آئی مین میری فیملی کو۔"

اس نے بات ختم کر دی۔ محی الدین سہگل کا سر بلند ہو گیا۔ وہ ایسے ہی تو نہیں کہتے تھے کہ انہوں نے سمیع الدین کے لیے اچھی عورت ڈھونڈی تھی۔ موسیٰ نے کندھے اچکا دیے۔ وہ ہنی کی رضا میں راضی تھا اور ہنی بھی جانتی تھی کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ ہاں کرے۔

ایڈ ملک کی سب سے نامور ماڈل ایکٹریس کو مل گیا۔

مانو ہر جانب سکون چھا گیا۔

پر ایک بندی تھی جس کا رہا سکون بھی جاتا رہا۔

"تم مان جاتیں ہنی۔ آئی مین تمہاری فیملی تو اب موسیٰ کی فیملی ہے ناں اور جبکہ موسیٰ کے گرینڈ پا بھی راضی ہو گئے تھے۔"

یہ شہد گھلا کچھ ملال زدہ پُر خلوص لہجہ شہزاد عیسانی کا تھا۔

"اور موسیٰ تو تمہاری ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔" اس کا انداز دوستانہ تھا۔ کوئی دل میں جھانکتا تو پتا لگتا کیسے دل کو کاٹ دینے والا جملہ کہا تھا۔

ہنی کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ وہ موسیٰ کی ہاں کی حد جانتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ اسے کسی ڈبیا میں چھپا دیتا۔

"آپ نہیں سمجھیں گی شہزاد... موسیٰ کبھی نہیں مانتے میں جانتی ہوں۔" اس نے بات ہی ختم کر دی۔

"اتنی اچھی آفر خوش نصیبوں کو ملتی ہے۔" وہ اسے انکسار ہی تھی۔

"ہاں؟ وہ مترنم ہنسی ہنس دی۔ "وہ تو میں ہوں۔"

شہزاد کے باقی الفاظ گھٹ گئے۔ مانو زبان دانتوں تلے دب گئی۔

"ہاں... ہاں اس میں کیا شک...؟"

اس نے فقط سر ہلایا تھا۔ مگر اندر سے اس کے روئیں روئیں نے تصدیق کی تھی۔ بلکہ نوحہ کیا تھا۔ اس میں کیا شک... اس میں کیا...

"ہاں مگر میں تو تمہاری مصروفیت کے خیال سے کہہ رہی تھی۔ کچھ ٹائم گزر جاتا... میں تو بھئی تمہارے لیے بہت خوش تھی تمہیں پتا نہیں ہے شاید اس ایڈ کے لیے کتنی کوششیں کی جا رہی تھیں۔"

وہ کسی طرح ہاتھ نہیں آتی تھی۔

"ہاؤس وائف ہونا زیادہ بڑی جاب ہے۔ مگر انسان کچھ ٹائم اپنی ذات کے لیے بھی نکالے۔ اس کی اپنی بھی ایک پہچان ہونی چاہیے۔ اپنی شخصیت اپنا مقام۔"

یہ بات تو وہ ہر بار ردوبدل سے کیا ہی کرتی تھی۔ جواب جانتے ہوئے بھی... ہر بار قسم بھی کھاتی۔ آئندہ نہیں کرے گی۔

"میرا سارا وقت موسیٰ کے لیے ہے اور مجھے موسیٰ کے نام سے پہچانا جانا اچھا لگتا ہے۔ اس سے اچھی اور شہرت کیا ہو سکتی ہے اور کوئی مقام چاہیے بھی نہیں۔" اس کے منہ سے پھول جھڑتے گویا۔

"سب سلیبریٹیز کی وائف کچھ نہ کچھ کرتی ہیں ہنی پارلر... بوتیک جم اور بہت کچھ۔ تمہیں سرکل میں سب ڈل کہتے ہیں۔ مجھے اچھا نہیں لگا اس لیے تمہیں سمجھا رہی تھی۔ چھوٹی موٹی ایکٹویٹی تو ہونی چاہیے۔ تمہیں تو زیادہ فعال ہونا چاہیے تھا۔ تمہارے تو بچے بھی نہیں ہیں۔"

آخری جملہ بلا ارادہ تھا۔ مسکرا کر سنتی ہنی کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ شہزاد تو واقف تھی۔ موسیٰ بچہ پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

آخری جملہ موسیٰ نے بھی سن لیا۔ وہ تو ہمیشہ

جذبات سے لبریز ہو کر اسے بانہوں میں لے کر سرگوشی کرتا تھا۔

"تمہیں کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں... تم صرف ایک کام کیا کرو۔ مجھ سے محبت... اس کے سوا کچھ بھی نہیں چاہیے۔ تمہیں پتا ہے جو لوگ محبت کرتے ہیں۔ ان کے پاس کسی بھی اور کام کے لیے وقت بچتا ہی نہیں... آٹھ پہر بھی کم لگتے ہیں۔ زندگی تھوڑی پڑ جاتی ہے۔ موت بھی جدا نہیں کر پاتی۔"

"تو تمہارے خیال میں ہنی کو کیا کرنا چاہیے؟" وہ کچھ سوچتا ہوا پوچھنے لگا۔ دونوں چونکیں۔ ہنی خوش آمدید اور احترام دینے کے لیے حسب عادت کھڑی ہو گئی۔ موسیٰ نے اسے اپنے ساتھ لگا کر اس کے بالوں کا بے آواز بوسہ لیا اور اس کا ہاتھ تھامے تھامے بیٹھ گیا۔

"غم چھپانا ہے اور ہنسنا سرِ بازار بھی ہے۔" شہرزاد کو ادھورا ٹوٹا پھوٹا مصرعہ یاد آیا... حالانکہ اب تک تو اسے عادی ہو جانا چاہیے تھا ہنی کو پکارتے، دیکھتے، چھوتے ہوئے التفات کسی سے بھی مخفی نہیں تھا۔

"ہاں تو کیا کرے ہنی...؟" موسیٰ نے سوال دہرایا۔ شہرزاد نے سر جھکا۔

"تم مان کیوں نہیں لیتیں شہرزاد... مٹھاس بھری یہ نگاہیں یہ پُر محبت لمس تمہارا نصیب تھا ہی نہیں... ہو ہی نہیں سکتا۔ مان لو... اور صبر کر لو۔" اس کے اندر سے صدا اٹھی۔

"میرے ساتھ بوتیک میں آ جائے۔ میں بھی لان بنانا چاہتی ہوں۔ پاٹنر شپ پر کام کرتے ہیں۔"

"لان...!" موسیٰ نے ہنی کے چہرے پر دلچسپی نمودار ہوتے دیکھی اور تھوڑی دیر بعد ڈن کر دیا۔ حسن المآب کے چہرے پر مسرت تھی مگر ساتھ ہی وہ گھبراہٹ کا شکار بھی نظر آتی تھی۔

موسیٰ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر گرم جوشی سے دبایا "وہ ہے ناں تو ہنی کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت... ہاں بس یونہی... بی بریو تم کوئی عام عورت ہو۔"

موسیٰ نے اس کے سلکی بال بکھیر دیے۔ اس کی ناک دبا دی شرارتاً" پھر بلند آواز سے گردن پیچھے گرا کے ہنس دیا۔ شہرزاد نے پانی کا گلاس لبوں سے لگا لیا۔

کاش وہ یونہی رہتا "اسے بھی "میں ہوں ناں" جیسا کوئی جملہ کہہ دیتا۔ پر کیسے کہتا... ہنی سے نظریں ہٹتیں تو کہیں اور پڑتیں۔

☆ ☆ ☆

"تم انکار نہیں کر سکتے موسیٰ... پلیز۔" شہرزاد کا لہجہ بیک وقت التجائیہ اور تحکمانہ تھا۔ بلکہ اس میں قطعیت کا عنصر بھی موجود تھا۔

"یہ کیسی فرمائش ہے شہر...!" موسیٰ نے ذرا سنجیدہ ہو کر دیکھا "بلکہ ضد... بچوں جیسی۔"

"تم کچھ بھی کہو... بچوں سی یا بڑوں سی ہم کو صرف اسے پورا کرنا ہے۔"

"یہ پاسبل ہی نہیں ہے یار!" وہ اب تک انکار پر ڈٹا ہوا تھا۔

"پلیز موسیٰ...!" شہرزاد نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور سارا اصرار آنکھوں میں سما کر دیکھا۔

"میری حد تک تو ٹھیک ہے مگر ہنی..."

اس نے قصداً" جملہ ادھورا چھوڑا اور شہرزاد کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ کھینچ کر سینے پر بازو لپیٹ لیے۔ خدا جانے یہ اراداتاً" تھی یا غیر ارادی حرکت... مگر شہرزاد کے دل پر چھریاں چلا گئی۔ اپنی بیوی کے ساتھ تو اس کا انداز کچھ اور ہی ہوتا تھا۔ بات بعد میں شروع ہوتی تھی، سب سے پہلے وہ ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پہلو میں جگہ دیتا تھا۔

"تم اور ہنی الگ تو نہیں، مجھے دونوں ہی چاہئیں بس۔" وہ ناراضی کے اظہار کے لیے اٹھ کر دوسرے صوفے پر جا بیٹھی پھر اپنا بیگ ٹٹولنے لگی۔ پھر کھڑی ہو گئی یعنی خفا ہو کر جا رہی تھی۔

"گرینڈ پا کو اچھا نہیں لگے گا شہر... اور ہنی بھی کبھی نہیں مانے گی۔" موسیٰ کو اس کا خفا ہو کر جانا بھی منظور نہ تھا۔

"تم صرف اپنی بات کرو۔" وہ بیگ کا اسٹریپ

کندھے پر ڈالتی دوٹوک انداز میں بولی۔

"ریمپ پر چلنا اور بات ہے شہزاد۔۔۔ اور ہنی شاید کر بھی نہ سکے۔" اس نے پھر کنی کترا کر گزر جانا چاہا۔

"مجھے تم لوگوں سے ماڈلنگ والا پروفیشنل انداز چاہیے بھی نہیں۔۔۔ بس تم دونوں مہمان خصوصی ہو گے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے بس ریمپ پر آنا ہی ہے ناں۔۔۔ میرے کیریئر کا سوال ہے موسیٰ۔۔۔ ایکٹنگ کب تک چلے گی۔ مجھے اپنے لیے ایک سائیڈ بزنس اسٹیبلش کرنا ہے۔ ایک دھماکے دار انٹری۔۔۔ فیشن انڈسٹری میں بھی چند لوگوں کا راج ہے نیو کمرز کے لیے بڑا مشکل کام ہے جگہ بنانا۔۔۔ میرا اسٹارٹ اچھا ہو گا تو سمجھو' سارے راستے کھل جائیں گے ورنہ یہ بڑے مگرمچھ۔۔۔ کسی کی نہیں چلنے دیتے۔ تم سمجھتے کیوں نہیں ہو۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر تم دونوں کا نام لیا ہے اور ہنی اکیلی تھوڑی ہو گی تم ساتھ ہو گے۔"

"اور اگر ہنی راضی نہ ہوئی تو۔۔۔؟" موسیٰ کے انکار میں لچک پڑنے لگی۔

"تم بات کرو گے تو کبھی انکار نہیں کرے گی۔ اس نے پہلے کبھی تمہاری کسی بات سے انکار کیا ہے بھلا؟"

✲ ✲ ✲

شہزاد کا اندازہ صدفی صد درست ثابت ہوا۔ انٹری دھماکے دار ہی تھی۔ شہزاد ایک ہی رات میں برینڈ بن گئی تھی۔ آخری نمبروں سے پہلا نمبر ٹھک سے۔۔۔

ایک قیامت مفتی عبدالرحمٰن کے گھر پر بھی ٹوٹی تھی۔ مگر اس کا ذکر فی الوقت رہنے دیتے ہیں۔

تو بات ہو رہی تھی موسیٰ اور ہنی کے ریمپ پر جلوہ افروز ہونے کی۔۔۔

سنہری شیروانی جس کی بین اور پٹی پر سرخ ویلوٹ کی کڑھی ہوئی پٹی تھی۔ شلوار دھوتی نما تھی۔ پیروں میں اوپر کو مڑے ہوئے کھسّے۔۔۔ جبکہ سر پر بہت بڑا سنہرا و سرخ پگڑ تھا' سر سے چار گنا بڑا۔۔۔ یہ موسیٰ تھا اور ہنی وہ سنہری لہنگے اور کرتی میں ملبوس تھی سر سے ہوتا سنہری دوپٹا دونوں شانوں پر گرا ہوا تھا۔ سرخ آرگنزا کا دوپٹا کمر سے ہوتا ہوا دونوں کہنیوں پر بل کھا کر زمین پر گھسٹتا ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ لہنگا پیچھے سے فرش پر گھسٹتا آ رہا تھا جبکہ آگے سے اس طرح اٹھا ہوا تھا کہ سنہری نازک سینڈل میں اس کے پیر سب کو متوجہ کرتے تھے۔

اس کے جسم پر موجود زیورات مغلیہ دور کی یادگار تھے۔ نگوں سے مزین۔۔۔ وزنی اور بے پناہ خوب صورت۔۔۔

موسیٰ کا اعتماد و بے نیازی تو سمجھ میں آتی تھی۔ لیکن اس کی بیوی۔۔۔ جو ایک ہاؤس وائف کے طور پر مشہور تھی۔ اس کے اعتماد و بے نیازی نے سب کو ششدر کر دیا۔ وہ دراز قامت تھی اور سر اٹھا کر چلتی دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھی۔ بہت اونچی ہیل کے باوجود نہ اس کے قدم لڑکھڑائے نہ نظر گڑبڑائی۔ ڈائریکٹر کی ہدایت کے موجب اس نے اپنا ہاتھ موسیٰ کی کہنی میں پھنسا رکھا تھا۔ تالیوں کی بے پناہ گونج پر جب موسیٰ نے ہاتھ ہلا کر سب کا شکریہ ادا کرنا شروع کیا اور ہنی کو دیکھا کہ وہ بھی اتنی محبتوں کا جواب دے تب با اعتماد ہنی کسی گاؤں کی گوری کی طرح شرما گئی۔

اس نے بے ارادہ دوسرا ہاتھ موسیٰ کی کہنی میں پھنسے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اور چہرہ یوں موسیٰ کی بغل میں دے لیا جیسے چھپ جانا چاہتی ہو۔ سب کی تالیوں کا ہاتھ ہلا ہلا کر جواب دیتا موسیٰ چونکا۔ پھر اس نے چونک کر سوالیہ نگاہوں سے ہنی کو دیکھا۔

"اوہ!" اس نے ہلکا سا ہنس کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور جھک کر دھیرے سے کوئی سرگوشی کی' اللہ جانے کیا کہا۔ مگر ہنی کا حیابار چہرہ۔۔۔ فوٹوگرافرز میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ گر جائیں' بھلے سے پیر کچلے جائیں۔ مگر یہ شاٹ مس نہ ہو جائے۔ آڈینس کی سیٹیاں بے قابو ہو گئیں۔ کہنی میں ہاتھ اور مسکرا کر چند منٹ تک کھڑے رہنا ڈائریکٹر۔۔۔ کی ہدایت تھی۔ اس کے بعد کے تمام سین نیچرل تھے اور کیا خوب تھے۔

موسیٰ کی اگلی سرگوشی پر ہنی کھلکھلا کر ہنس دی۔

"وہ ہنستی ہے تو اس کی آنکھوں میں ستارے بھرے ہونے کا گمان ہوتا ہے۔"
میگزینز میں اس تصویر کے ساتھ یہی کیپشن درج تھا۔

ہنی کا حسن فطری ہے۔ اس کی نزاکت اس کی ہنسی اس کی مسکان سب نیچرل ہیں۔ وہ فاقہ زدہ ماڈلز کی طرح نہیں دکھائی دیتی ہے۔ نہ اس کا حسن بوٹاکس کا مرہون منت ہے۔ تو جو کچھ تھا وہ سچ تھا۔

ایک سوال یہ بھی اٹھا کہ آیا موسیٰ کی بیوی اس رات درات ملنے والی شہرت کو برقرار رکھنے کے لیے اس پروفیشن کو اپنائے گی۔ کچھ نے سوال رکھا اور کچھ نے مشورہ دیا۔ رکھنا چاہیے اور کچھ کا انداز تحکمانہ تھا۔ ہاں لازمی... کیوں نہیں۔

اور یہی بات جب ہنی سے براہ راست پوچھ لی گئی۔ وہ نارمل گھریلو حلیے میں موسیٰ کے ساتھ ڈنر کے لیے آئی ہوئی تھی۔ جب صحافیوں کے نرغے میں پھنس گئی۔ کریم کلر کی سگریٹ پینٹ کے ساتھ فیروزی پرنٹڈ لان کا دوپٹا کیپس تھی۔ دوپٹا اپنے مخصوص انداز میں سر پر اوڑھ رکھا تھا۔ چہرے کے گرد لپیٹ کر ایک پلو آگے لٹکتا... ایک کندھے سے پیچھے ڈال دیا۔

وہ زیر لب تبسم کے ساتھ سر جھکا کر سب کچھ سنتی رہی۔ پھر سر اٹھایا اور نفی میں گردن ہلا کر نہیں کہہ دیا اور اس کے بعد جیسے کچھ بھی نہ بولنے کی قسم کھالی۔ ہاں مسکراتی رہی۔ ہار کر صحافیوں نے موسیٰ کو پکڑ لیا، وہی کچھ بولے۔ اس نے بات ختم کردی۔

"ہنی اپنے فیصلوں میں آزاد ہے کرنا چاہے یا نہ کرنا چاہے۔"

"ایسا تو نہیں آپ انہیں گھر سے پکا کر کے لائے ہیں۔" ایک منہ پھٹ صحافی نے کہہ دیا۔ موسیٰ پوری طرح متوجہ ہو گیا۔

"اوکے! آپ کی مان لیتے ہیں، میں پکا کر کے لایا ہوں۔ آگے پھر...؟" صحافی لاجواب ہو گیا۔

"ایکسوزمی!" وہ اسے کسی کانچ کی گڑیا کی طرح سنبھالے اندر بڑھ گیا۔

اگلے روز یہ جملہ سو طرح کی تشریحات کے ساتھ اخبارات کی زینت تھا۔

مگر ان دونوں کو کوئی پروانہ تھی۔ میڈیا چڑھا دیتا ہے۔ اتار بھی دیتا ہے۔ سب نے مان لیا۔ موسیٰ کی بیوی کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اسے نہ ماڈلنگ کرنی ہے۔ نہ ایکٹنگ نہ کمرشل اور نہ ہی... آن ایئر ہونے کا شوق ہے۔ کسی بھی بہانے سے... لیکن آف ایئر... گڑ کھا کر گلگلوں سے پرہیز... اور گہرے سمندر میں تیراکی کے بعد یہ خواہش کہ پھر بھی نہ بھیگیں یہ ممکن نہیں ہوتا۔ رنگ ریز جتنا بھی محتاط ہو۔ ہاتھ رنگے جاتے ہی ہیں۔ رنگ ساز کے چہرے پر چھینٹا پڑ ہی جاتا ہے۔

موسیٰ ایک میوزیکل فلم بنانا چاہتا تھا۔ موسیٰ نے خود فلم پروڈیوس کرنے کا ارادہ کیا۔ پروڈکشن ہاؤس ہنی کے نام سے کھولا گیا۔ ہنی ہی اس کی روح رواں ہو گئی۔ فلم ہٹ ہو گئی۔ وہ رات ورات نمبرون پروڈیوسر بن گئی۔ کام کوئی نہیں کرتی تھی مگر اپنے ویل فرنشڈ آفس کا چکر ضرور لگاتی تھی۔

تمام کاموں کو دیکھنے کے لیے ملک کے بہترین دماغ ہائر کیے گئے تھے۔ انہیں بہترین پیکجز دیے گئے۔ ہنی کو فقط سائن کرنے ہوتے... مگر جب ایوارڈ کی تقریبات منعقد ہوتیں 'بیسٹ پروڈیوسر کا ایوارڈ لینے وہی اسٹیج پر جاتی۔ وہی اس کا مخصوص انداز... قیمتی' اسٹائلش 'خوب صورت' مکمل ڈھانپتا ہوا لباس... سر پر آگے پیچھے لٹکا کر ڈھکا ہوا دوپٹا... بڑی مشکلوں سے تو کسی تقریب کو شرف بخشتی تھی۔ اور اس پر بھی یہ کہ جہاں وہ پہنچ جاتی۔ جہاں وہ ہوتی... باقی سب پس منظر میں چلے جاتے۔

دوسرے تو بیویوں کو گھر چھوڑ کے آتے تھے۔ اس موسیٰ کا نرالا عشق تھا۔ پہلے تو بیوی فقط ذکر تھی جس سے دل اوب اوب جائے۔ کب بدلے گا موضوع... اور اب وہ اسے سایہ بنا کر ساتھ رکھتا تھا۔ تقریب عام سی ہو یا میڈیا کے حوالے سے... وہ زیر لب تبسم کے ساتھ بیٹھی ہوتی۔ موسیٰ اس کے کندھے سے منہ جوڑ

پریشر سب سے زیادہ۔۔۔ اور اس کی ماں اسکارلٹ۔۔۔ جو ایک لحاظ سے بستر مرگ پر تھی۔ اس کی جانب سے کی جانے والی اپیلیں۔۔۔ بھی کم زوداثر نہ تھیں۔

"حسنل! تم نے سب در کھٹکھٹائے نہ دستک دی تو اسی ایک دروازے پر۔۔۔" وہ خود سے خفا ہو گئی۔

اس میں ایک خوبی آج بھی بدستور تھی۔ وہ آج بھی نماز کی پابند تھی ہاں بس سب کچھ مل جانے کے بعد دعا مانگنا چھوڑ دی تھی۔

لیکن اب بھی کیا بگڑا تھا۔ اس نے مصلا بچھالیا اور ہاتھ اٹھالیے۔ اس نے رو رو کر موسیٰ کو مانگ لیا تھا۔

اس نے رو رو کر ایمانے کو بھی تو مانگا تھا ناں۔

(پہلے موسیٰ بچہ پیدا کرنے کے حق ہی میں نہ تھا پھر جب وہ خواہش مند ہوا۔ تب دونوں کے بالکل ٹھیک ہونے کے باوجود بچہ ہوتا نہیں تھا۔ حسنل نے تب بھی دعا کی تھی۔)

اور پہلے وہ گمشدگی کے دن تھے۔ ایک دو۔۔۔ تین

اور پھر یہ دعا کے دن تھے۔ پہلا دن۔۔۔ دوسرا۔۔۔ تیسرا۔۔۔ اور

دروازے پر دھڑ دھڑ دستک ہو رہی تھی۔

اسے بتایا گیا۔۔۔ "موسیٰ مل گیا ہے۔"

"کیا۔۔۔؟" وہ چیخی اور ننگے پیر بھاگی۔ ہر چینل پر بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔ اس کے سائلنٹ موڈ پر لگے موبائل پر بہت پہلے ہی سے کالز اور پیغامات کی بھرمار تھی کہ موسیٰ مل گیا۔

اندر کمرے میں جائے نماز ہنوز بچھی ہوئی تھی۔



انسپکٹر رام ناتھ کی نگاہیں موسیٰ بدرالدین یا سمیع الدین جو بھی تھا۔ اس پر جمی تھیں اور تیسری آنکھ اسے ایک خوش کن منظر دکھا رہی تھیں۔ وہ سرور کے عالم میں منظر کشی کی نوک پلک درست کر رہا تھا۔

ذرا سی بھی کمی برداشت نہ تھی۔

"ممبئی کا پریس کلب۔۔۔ سامنے پوری دنیا کے بڑے نیوز چینلز کے کیمرے اور اس کے منہ کے سامنے مونوگرام والے مائیک کا انبار۔۔۔

تیز روشنیاں۔۔۔ وہ اپنا بیان خوب اچھی طرح یاد رکھے گا۔ الفاظ کا چناؤ۔۔۔ ٹھہراؤ۔۔۔ وقفہ۔۔۔ مسکراہٹ۔۔۔ غم محنت۔۔۔ تکلیف وہاں تمام تاثرات کو بہت سلیقے سے پیش کرے گا۔

اس کا ہوم ورک پورا ہونا چاہیے۔ صحافی بہت تیز ہوتے ہیں۔ بال کی کھال نکالنے والے۔۔۔ وہ بہت متانت سے اور خود اعتمادی سے جواب دے گا۔ وہ کہے گا کہ۔۔۔

"میرے خبری بہت عرصے سے مجھے معلومات دے رہے تھے۔ کہ کوئی پاکستانی جاسوس اس راجستھانی علاقے سے نقشے حاصل کرنے کے لیے آنے والا ہے اطلاع تو پکی تھی مگر۔۔۔ وقت کا اندازہ نہیں تھا مگر میرے جیسے دیش بھگت کے لیے یہ تھوڑا اشارہ بھی بہت تھا۔ دن رات اپنے لوگ ہر بھیس میں لگادیے۔

مہینوں ناکامی ہوئی مگر ہمت نہیں ہاری۔

ان مہاشے کے گمان میں بہت سوں کو پکڑا۔ چھوڑا مگر بھگوان بھی جاننے والے جانتے ہیں 'انسپکٹر رام ناتھ جب کسی چیز کے پیچھے پڑجائے تو اسے نہیں روک سکتے۔ (یہاں میں امیتابھ والا انداز اپناؤں گا)۔

ایسے جون کے جھکڑ والے مہینے میں کون پاگل تار والے علاقے کا رخ کرتا ہے۔ چیل اپنا انڈا چھوڑ دیتی ہے مگر اس نے یہی دن چنے۔ تار کے اس طرف آکر نقشے بنانے کے لیے۔۔۔ لیکن۔"

(اب میں اپنی ٹوپی اتار کر بالوں میں ہاتھ پھیروں گا اور ٹھنڈے تھکان بھرے سانس لوں گا)

"لیکن یہ جانتا نہیں تھا۔ سب کی نظروں سے خود کو بچالے گا مگر آگے رام ناتھ ہے۔" (میں سینے پر زور سے ہاتھ ماروں گا)

"جو رام کی کرپا سے بھارت ماتا کے لیے اپنا ایک جنم تو کیا سات کے سات جنم وار دے گا۔"

اس کے بعد مجھے انعام واکرام سے نوازا جائے گا اور ممبئی میں ٹرانسفر کی درخواست میں خود دوں گا۔ سالا

جوڑ کر سرگوشیاں کرتا اور یہ بھی کیا خوب انداز تھا۔ خواہ وہ اس کے کان میں یہی کہہ رہا ہو۔ بدہضمی کی شکایت ہو رہی ہے۔ مگر دیکھنے والوں کو یوں لگتا۔ وہ حال دل کہہ رہا ہے۔ محبت کی کسی ادھوری نظم کو مکمل کر رہا ہے۔ کسی الف لیلوی داستان میں لحہ وصال کا ذکر ہے۔ کسی ایسی صبح کی کہانی ہے جس میں رات کے فسوں کار جادو ہو.... اور ہنی.... وہ کان میں منہ دے کر بیٹھا ہوتا۔

نگاہیں محبت و اشتیاق سے اس کے چہرے پر بار بار اٹھتیں اور وہ کسی ملکہ کی شان سے سر اٹھائے سامنے دیکھتی ہے۔ اردگرد دیکھتی بس اسی کو نہ دیکھتی کیا شان بے بے نیازی تھی۔ یا وہ اس کی وارفتگیوں کو اپنے حسن کا خراج سمجھ کر حق سے وصول کرتی تھی۔ تو کیا حسن ہی تھا جس کے زور پر وہ موسیٰ کے دل پر راج کرتی تھی۔

ہر کسی کی الجھی سوچیں یہیں آکر رک جاتیں لیکن دنیا میں حسن کی کمی تو نہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک چہرہ تو کس چیز نے موسیٰ کے پر کاٹ ڈالے تھے۔ دوسروں کی طرح شہرزاد بھی سوچتی....

ہنی کا بے نیازی والا مغرور انداز پبلک کے لیے تھا۔ جب وہ دونوں اکیلے ہوتے۔ تب آرتی اتارنے کا کام ہنی کرتی.... موسیٰ دیوتا ہو جاتا۔ نجانے یہ سوچا سمجھا رویہ تھا.... یا غیر ارادی طور پر.... دیکھنے والوں سے سہا نہ جاتا۔

دوسری طرف ہنی کی اپنی ایک پہچان بن چکی تھی۔ اس کے پیج پر لائکس کی تعداد کسی ٹاپ ایکٹریس سے کم نہ تھی۔ اس کے لباس کو کاپی کیا جانے لگا۔ جیسے وہ دوپٹا اوڑھتی تھی اور بہت بڑے فریم والے سیاہ گاگلز استعمال کرتی تھی۔ دوپٹے کا ہالہ اس کے چہرے کو گولائی میں ڈھانپ لیتا تھا۔ قمیص خواہ سلیولیس ہوتی گاگلز بھنویں اور گالوں کی ہڈیوں تک کو چھپا لیتے۔ ہاں ناک کی حسین نوک.... اور خوب صورت کٹاؤ کے ہونٹ.... اور دلی جذبات کا ترجمان بادلوں میں چھپتے چاند جیسا.... ڈمپل کے اوپر بنا تل.... چھپ جاتا.... نمایاں ہو جاتا.... مسکرا دیتا.... پھسل جاتا.... اور کبھی

جب وہ چشمے کو ماتھے سے گزارتی سر پر رکھ لیتی.... تب آنکھوں کا رنگ دکھائی دینے لگتا۔ مانو دنیا سنہری ہو گئی۔ اللہ یاد آجاتا۔

تو ہنی کی اب اپنی ایک شخصیت تھی۔ اپنی پہچان۔

وہ پروڈکشن ہاؤس کی مالک تھی۔ وہ لان بنا رہی تھی۔ موسیٰ کی زندگی پر اس حد تک حاوی ہو گئی تھی کہ اس کے کام کے حوالے سے بھی فیصلے کرنے لگی تھی۔ کس کے ساتھ کام کرنا ہے۔ کس کے ساتھ نہیں۔ پندرہ برس کے اس ساتھ نے اسے وہ سب کچھ دے دیا تھا جو وہ چاہتی تھی۔ من پسند طرز زندگی بلکہ صاف کہیں تو خوابوں، خواہشوں سے بڑھ کر.... (ایک اولاد کی کمی تھی۔ وہ بھی ایمانے کی صورت پوری ہوئی) ہر نیا دن جیسے اس کی کامیابیوں کو آگے ہی آگے بڑھاتا۔

پچھلے برس یہ بھی ہو گیا کہ اسے ملک کی موسٹ ایکٹو وومنز میں شامل کر لیا گیا اور اس برس تو دشمنوں کے سینوں پر کیل گڑ گئے۔ حسن المآب موسیٰ کو ایشیا کی پچاس پُرکشش خواتین میں شروع کے پانچ نمبرز میں جگہ مل گئی۔ اسے بلا کی جامہ زیب خاتون بھی کہا گیا۔ ایک ماڈرن مسلم وومن....

اور اتنی کامیاب اور شانت حسن المآب موسیٰ کو حلیمہ ایک منٹ میں آئینہ دکھا گئی۔ وہ اسے کسی گنتی میں رکھتی ہی نہ تھی۔ "حسد انسان کو ناقد بنا دیتا ہے۔" حسنل نے سوچا۔

"اور اللہ وعدہ خلافی پسند نہیں کرتا، انسان کی انسان سے اور پھر وہ.... جو اس سے وعدہ کر کے بھول جائے۔ نئی قسم کھانے سے پہلے پچھلا حساب تو بے باق کرتیں۔"

اور کیسی کالی رات ہے۔ وہ کھڑکی تک چلی آئی اور کیا موسیٰ کھو گیا؟ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ کتنی عجیب بات تھی۔ اس نے موسیٰ کی بازیابی کے لیے سارے سورسز استعمال کیے تھے۔ ہر فورم پر یہ بات اٹھائی تھی پوری دنیا کی طرف سے ایسا پریشر آیا کہ بھارتی حکومت کو بھی اپنی ساری مشینری لگانی پڑی۔ وہ برٹش نیشنل تھا۔ وہ

باجپائی ... دیکھتا ہوں کیا کر سکے گا۔ خود میرے کندھوں پر پھول ٹانکنے نہ آیا تو میں بھی اپنے پتا کا پتر نہیں ہوں گا۔"

انسپکٹر رام ناتھ کے لطف و سرور کی حد نہ تھی۔ وہ زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا۔

"اسے گرین شرٹ پہناؤں گا اور سر پر فلسطینوں والا کالا سفید مفلر... منہ باندھ دوں گا... نئیں ... منہ تھوڑا سا کھلا رکھوں گا۔ نہیں ڈھاٹا باندھوں گا' سر منہ ڈھکا ہوا' صرف آنکھیں کھلی ہوئی ہوں گی اور..."

ٹرن... ٹرن... چنگھاڑتی ہوئی ٹیلی فون کی یہ وہ رنگ ٹون تھی جو دنیا کے پہلے فون میں استعمال کی گئی۔ اس نے خوب بدمزہ ہو کر فون کو گھورا اور پینٹ کو مٹھی میں دبوچتا ٹیبل سے ٹانگیں اتار سیدھا بیٹھا۔

"ہری اوم! میں کیلاش بات کر رہا ہوں' مہاراجا کا بیٹا ریاست اودھ کے جانشین..."

"جی جی ... سرکار ... حکم ... کیسے یاد کیا؟" وہ گڑگڑاتی آواز میں الرٹ ہو گیا۔ اسے اپنا نام تک بھول گیا۔

"میں نے یہ کہنے کے لیے فون کیا ہے کہ ہمیں آنے میں کچھ اور دیر لگے گی۔ وہ ٹھیک تو ہے ناں... اس نے کچھ کھایا پیا... ہم ڈاکٹر ساتھ لا رہے ہیں مگر تم اسے کسی کو دکھا دو..."

رام ناتھ کو فوراً" اندازہ ہوا کہ یہ کس کا ذکر ہے... لیکن ان سب تک اس کا ذکر کیسے پہنچا؟

"جی سرکار! میں خوب خیال سے رکھوں گا۔ ایسے ویلش دروہی کے لیے..."

"ہیلو ہری اوم! سگنلز کا پرابلم ہے۔ تم ہر طرح سے خیال رکھو۔ ہمارے ساتھ میڈیا کے کچھ لوگ بھی ہوں گے' اس لیے..."

لائن کٹ گئی۔ رام ناتھ نے ریسیور کو چہرے کے سامنے لا کر گھورا پھر کھینچ کر پینٹ اوپر کی اور پیٹ اندر کر کے بٹن بند کرتے ہوئے وہ موسی کی چارپائی کی طرف آ گیا۔ وہ بے حس و حرکت پڑا تھا۔ پھر شاید رام ناتھ کی نظروں کی چبھن نے چونکایا' اس نے دھیرے سے پلکیں اٹھا کر دیکھا۔

ان آنکھوں میں خالی پن تھا۔ موت جیسی خاموشی۔

(وہ ذہنی طور پر ہوش میں آ رہا تھا۔)

اور اب اس کی آنکھوں سے آنسو نکلنے شروع ہوئے۔ وہ ایک لکیر کی صورت کنپٹی سے گزر کر کان کے پیچھے بالوں میں گھس رہے تھے۔

کتنے دنوں بعد کسی انسان کو دیکھا تھا۔ انسان کتنی خوب صورت چیز ہے۔ اسے سوچ آئی... وہ رونا چاہتا تھا۔ مگر ابھی جسم میں اتنا پانی نہیں آیا تھا۔

ہری اوم ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبا تھامے چیختا آ رہا تھا۔

"میرے کو لڑکا ہوا انسپکٹر صاحب..."

رام ناتھ چونک کر مڑا... "بدھائی ہو۔" اس نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ہری اوم نے ایک بڑا لڈو اپنے ہاتھوں سے اس کے منہ میں ڈالا۔

رام ناتھ دوبارہ اپنی سیٹ پر گیا۔ اسے بہت بڑی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔ اسے پلان دوبارہ ترتیب دینا ہو گا۔

اس نے تو محض ٹیبل پر پڑے کاغذات اور شناخت کو دیکھتے ہوئے اسٹوری گھڑی تھی۔ جیون نے یہی بتایا تھا کہ یہ کوئی پاکستانی ہے جو مرے حالوں میں پڑا تھا۔ ایک ساربان اٹھا کر لایا تھا۔

رام ناتھ کے لیے اتنی معلومات کافی تھیں۔ اس نے اپنی مرضی کی خیال آرائی کی تھی۔ وہ بہت مضبوط کیس بنانے والا تھا' بنا لیتا مگر یہ مہاراج کیلاش کو کیسے اس کی خبر پہنچی۔ اور یہ شخص کون تھا؟

اسے اپنے عزائم ملیا میٹ ہوتے نظر آئے جب ہری اوم نے اپنا منہ کھولا۔

"ابھی ان حالوں میں پڑا ہے۔ جانا مانا گانے والا ہے کلاکار... بہت اچھی آواز ہے۔ سرسوتی ماں کی خاص کرپا ہے اس پر... ڈوبے والے اودھ کے باہر رہنے والے لڑکے کا متر ہے' تاج پوشی کے جشن میں آیو تھا اور دوسرے یار ساتھ تھے انگریز بھی دوسرے بھی۔

واپسی سے ایک روز پہلے ریگستان کا چاند اور آسمان دیکھنے "کھلے" میں گئے جیپوں میں بھر کے۔ اس نے جد (ضد) کر کے جیپ چلانے کو لے لی۔ اندھا ہو کر بھگائی راستہ بھٹکا اور اور آگے ریت کے طوفان میں پھنس گیا۔

ساری دنیا کے ٹی وی والے چیخ رہے ہیں۔ ادھر سفارت خانہ ' سپھارت کھانے (سفارت خانہ والے پاگل ہو گئے ' سالا رہتا پاکستان میں اور پیدا انگلستان میں ہوا... ابھی تو ہماری چوکی سب سے الگ تھلگ دور نہ کوئی اخبار نہ فون کے سگنل ملتے۔ کل صبح صبح ہیلی کاپٹر چلا تھا۔

غاب یورپ میں ہوا اور ملا ادھیر بیجھم سے... وائرلیس پر ملی تھی اطلاع آپ نا ہی تھے تو منے انسپکٹر بن کر بات کر لی۔ پر مان گیا جا گو راکھے سائیاں مار سکے نہ کوئی...

"اور مہاراج کیلاش کو اطلاع دے دی کہ مل گیا ہے یہ؟" رام ناتھ نے بے حد صبر سے کتھا سنی تھی۔ سرد ترین نگاہوں سے ہری اوم کو گھورا۔

"ہاں... صاب!" ہری اوم کو گڑبڑ کا احساس ہوا۔

"سالے... کتے... تیری تو۔" رام ناتھ نے ایک جارحانہ ہاتھ مار کے ساری ٹیبل گرا دی۔

لڈو لڑھکتے دور تک گئے۔

ہری اوم ہاتھ باندھے کپکپاتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنی غلطی سے قطعاً"انجان تھا۔ رام ناتھ بھرے سانڈ کی طرح ہر شے تہس نہس کر دینے والا تھا۔ وہ پاگل ہو رہا تھا۔

"سرکار! میں نہ بھی بتاتا تو بستی سے کوئی بھی بتا دیتا۔ مہاراج کے بندے مانو سارے راج میں گھوم رہے تھے۔ بچے بچے کو کھبر (خبر) تھی۔ وہ اونٹ والا موہن تو پہلے ہی پھوجیوں (فوجیوں) کا کھبری ہے 'وہی تو لایا اس کو...

میرے بتانے نہ بتانے سے کیا ہوتا۔ جھاڑو کا تیلا لے کر ریت کو کھود رہے تھے۔ سب ایک ایک ذرہ اور ہر جگہ پہنچ اگلے 'جہاں جہاں سے یہ گزرا... مگر یہ ہر جگہ سے آگے بڑھ جاتا تھا۔"

"میری طرف سے بھاڑ میں جاتا۔ ٹکتا یا چلتا..." رام ناتھ حلق کے بل چلایا۔ "تو نے... میری مرضی بغیر فون کھڑکائے کیسے؟"

رام ناتھ ہری اوم کے شانے میں انگلیاں گاڑ کر چلایا۔ وہ پھوں پھوں کر رہا تھا۔

"ارے پارس ہاتھ لگا تھا۔ لی جاتا میں... کال کوٹھری میں گال دیتا... صحرا میں مر گیا۔ ریت میں دب گیا۔ لوگ چار دن بول کر بھول جاتے۔ گمشدہ قرار دیتے۔

تڑپ کا پتا تھا۔ وانٹڈ دہشت گرد بنا دیتا اس کو' یہ خود کہہ دیتا کہ نو گیارہ کو جہاز بلڈنگ سے میں نے ٹکرائے تھے۔ اسامہ میرا باپ ہے اور گولڈن ٹیمپل پر حملہ اس پر ڈال دیتا پر تیری ایفی شینسی نے واٹ لگا دی۔"

اس کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ وہ گرے ہوئے لڈوؤں کو پیروں سے مسلتا گلاس کو ٹھوکر مارتا پاگل سانڈ کی طرح دیواروں سے سر ٹکرا رہا تھا۔

کانسٹیبل ہری اوم کو سارا معاملہ سمجھ میں آ گیا۔ انسپکٹر رام ناتھ موسیٰ کو کس طرح استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ بھانپ گیا۔

ہری اوم نے جان لیا تھا کہ یہ پلان عملاً"ناممکن ہوتا لیکن خیالی پلاؤ بنانے کے لیے بہترین... وہ سی ایم پرشاد باجپائی والے تمام قصے سے بخوبی واقف تھا۔

وہ کہنا چاہتا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں اس نے بخوبی اس معاملے کو حل کیا تھا۔ جس معاملے میں تین ممالک کی پولیس فوج اور ریاست کا راج شامل ہو' اسے اتنی آسانی سے ہضم نہیں کیا جا سکتا تھا۔

لیکن اس وقت رام ناتھ کو کچھ بتانا یا سمجھانا ناممکن تھا۔ وہ بعد میں ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچتا تو حقیقت روشن ہو جاتی۔

مگر رام ناتھ کا دماغ کسی صورت ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا۔ وہ کھول رہا تھا۔ کینہ توز نگاہوں سے بھیگی پلکوں کو جھپکتے موسیٰ کو کچا چبا جانے کے خیال سے گھور رہا تھا۔

موسیٰ کی نگاہ پیلی مدقوق روشنی والے بلب پر تھی۔

اس کے پیٹ میں درد تھا۔
فوجیوں کا مخبر ساربان موہن ۔۔۔ وید جی کے ہمراہ داخل ہوا۔ ہری اوم سراسیمہ سا کھڑا ہوا تھا۔ رام ناتھ کو اپنے تاثرات چھپانے کے لیے بے حد مشقت جھیلنی پڑی۔
مٹی کی رکابی میں یہ کھچڑی نما ملغوبہ تھا اور کچھ دیسی دوائیاں ۔۔۔ موہن کو مہاراج کیلاش کی جانب سے انعامات کا یقین تھا اور وہ یہ بھروسا رام ناتھ اور ہری اوم کو بھی دینا چاہتا تھا۔
وید جی کے لیے یہ سنہری موقع تھا۔ مہاراج کے مہمان کی جان بچانے میں وہ موہن کے برابر بلکہ اس سے بڑھ کر رہے تھے۔
بڑھاپے کے باعث نسخے بیٹے اور بہو سے بنواتے تھے۔ سالوں بعد آج ایک آنکھ کی عینک سے نسخے پڑھ پڑھ کر خود دوائی تیار کی تھی۔ اور اتنے دن کے فاقے کے بعد کا کھانا بھی۔
زندگی میں سب کو ایک سنہری موقع ضرور ملتا ہے۔ زندگی بدلنے کا۔۔۔



"کیوں آجاتے ہو تم لوگ ادھر کام کرنے' گانے وانے گانے کے لیے ۔۔۔ ادھر سے پیٹ بھرتا نہیں کیا۔"

موسیٰ نیم دراز حالت میں کرسی پر بیٹھا تھا اور رام ناتھ ہاتھ پر بید کو برساتا اس کے گرد طواف کرتے ہوئے مسلسل کچھ نہ کچھ بول رہا تھا۔
وید جی کا تجربہ اور حکمت باکمال تھی۔ چاول کا ملغوبہ اس کے معدے میں ٹک گیا تھا۔ اور دوائیاں اثر کر رہی تھیں' اس کی کمر میں شدید درد تھا لیکن لیٹنے سے کرسی پر بیٹھنا میٹھا درد دے رہا تھا۔
رام ناتھ کا پلان فیل ہو چکا تھا۔ سارا معاملہ اس کے علم میں آچکا تھا سمجھ میں آگیا تھا۔ لیکن کھسیاہٹ' ناکامی۔ اسے موسیٰ سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔
موسیٰ ہوش میں آچکا تھا۔ شدید نقاہت کے باوجود وہ اٹھ بیٹھا تھا۔
لیکن اسے رام ناتھ کا غصہ' طنزیہ انداز' نفرت سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ مگر اسے اپنے گرد دیکھنا اس کی آواز کو سننا اچھا لگ رہا تھا۔
ایک بولتا انسان ۔۔۔ (جبکہ اسے لگا تھا' اب وہ کبھی انسان نہیں دیکھے گا)
"برے لگتے ہیں مجھے سب پاکستانی ۔۔۔ بلکہ پاکستانی نہیں مجھے سارے مسلے زہر لگتے ہیں جب تم لوگوں نے الگ دیش بنالیا تھا۔ تو ساروں کو ساتھ لے کر کیوں نہ گئے؟
اور مجھے تمہارے گانے یاد آگئے ہیں۔ تم تو اچھے خاصے خوب صورت آدمی ہوتے تھے۔ ہاں سمجھا ریت کھا گئی ہے ناں۔۔۔ ہاہاہا۔"
وہ بھڑاس نکال رہا تھا لیکن کیوں ۔۔۔ موسیٰ سمجھ نہیں پایا۔
اچھا سناؤ ناں' وہ گانا وہی
"تیری طلب جگاتی ہے۔"
"گاؤ ۔۔۔!" اس نے چھڑی گردن میں چبھو دی اور حلق کے بل چیخا۔۔۔
موسیٰ کے لیے بولنا محال تھا۔ وہ بہت دیر سے کچھ نہیں بولا تھا لیکن گانا گانا۔ اس نے اچنبھے سے ہری اوم کا چہرہ دیکھا تو وہ ملتجی انداز میں گانے کا کہہ رہا تھا۔ وہ ایک دم شروع ہو گیا۔ مگر آواز ۔۔۔ کی کپکپاہٹ اور لاچاری۔
"ہاہاہا ۔۔۔" رام ناتھ ہنستے ہنستے دہرا ہو گیا۔ "ارے اس کے گلے میں تو شیطان بولتا ہے ۔۔۔ ہاہاہاہا۔"
موسیٰ کی سانس پھول گئی تھی۔ اس نے سر جھکا لیا۔
"ارے یاد آیا ۔۔۔ ہری اوم! ان کے دھرم میں تو گانا منع ہے ناں پھر بھی گاتے ہیں کیوں گاتے ہو ۔۔۔؟"
ہری اوم کو کھسیانی بلی کھمبا نوچے کی مثال رام ناتھ پر صادق نظر آرہی تھی۔ وہ اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔
اس کا استہزائیہ انداز اور ذلیل و خوار کرتے جملے وہ

پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اب کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ پتا نہیں اندر کی بھڑاس ' ناکامی اور نفرت کو وہ کس کس طرح نکالنے والا تھا۔

"لیکن تم لوگ بھی کچھ گاتے ہو ناں کوئی دھارمک چیز... کیا کہتے ہیں اس کو۔" اوم ناتھ پیشانی مسلنے لگا۔ ارے وہ جو اجمیر کی نگری میں گاتے ہیں۔ قوالی... نہیں بلکہ ہاں نوت... نوت کہتے ہیں ناں نوت نہیں... نوت شریف (نعت شریف) اچھا چلو سناؤ... وہ بھی سناؤ اچھی سی سانانا۔"

اسے کوئی نعت یاد نہیں تھی کبھی پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ہاں... لیکن کبھی ڈرائیور کو فون کرتا تو بیک گراؤنڈ میں یہ نعت سنائی دیتی تھی۔

زمین میلی نہیں ہوتی زمن میلا نہیں ہوتا
محمد کے غلاموں کا کفن میلا نہیں ہوتا
جو نام مصطفیٰ چومیں نہیں دکھتیں کبھی آنکھیں
بس... باس... بس...

اس کا دوسرا شعر ادھورا رہ گیا۔ رام ناتھ سخت ناگواری کے عالم میں اسے رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

"بورنگ 'نیند آنے لگے۔ ذرا جوش نہیں ذرا تھرل نہیں... تم نے بھی بھجن گایا ہے؟"

موسیٰ ناسمجھی کے عالم اب کچھ پریشانی سے رام ناتھ کو دیکھ رہا تھا۔ یہ شخص کیا چاہتا تھا۔ کیا یہ سائیکو کیس تھا' اس نے استفہامیہ نظروں سے ہری اوم کا چہرہ دیکھا تو وہاں سے مسلسل کہنا ماننے کی خاموش تاکید تھی۔

"چلو اوم جے جگدیش سناؤ... میرے من کو اس وقت شانتی کی ضرورت ہے۔ چلو شروع ہو جاؤ۔" وہ خود اذیتی کا شکار تھا۔ اور اسے ٹارچر کر رہا تھا۔ وہ گھوم کر اپنی گھومنے والی کرسی پر جا بیٹھا۔

موسیٰ کو عجیب سا ندامت کا احساس ہوا' پتا نہیں کیوں وہ نعت پوری کرنا چاہ رہا تھا مگر ادھر رام ناتھ منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

نظریں ملنے پر ہاتھ کے اشارے سے آغاز کا حکم دیا۔

موسیٰ کو یہی کرنا تھا' اسے پہلی بار رام ناتھ کے رویے کا اندازہ ہونے لگا۔

اوم جے جگدیش ہرے... سوامی جے جگدیش ہریش

رام ناتھ جھوم رہا تھا۔

اس نے بھجن مکمل نہیں کیا تھا کہ آواز بھر آئی اس کا سر ڈھلک سا گیا۔ وہ چپ ہو گیا تھا۔

اسے نجانے ایسا کیوں لگا تھا کہ وہ انسپکٹر رام ناتھ آج اسے مذہب بدلنے پر مجبور کر دے گا۔

کلمہ پڑھا کر مسلمان کرتے ہیں' کیا بھجن گانے سے ہندو ہو جاتے ہیں۔

کہیں وہ ہندو تو نہیں ہو جائے گا۔

اتنا عجیب و غریب خطرہ... اس کا دل زور سے دھڑکا۔ تکلیف... خوف... اسے حیرت ہوئی' ایسا تو ان تین دنوں اور تین راتوں کے لیے ایک پل میں محسوس نہ ہوا تھا۔

وہ سہمی نگاہوں سے ہری اوم اور رام ناتھ کو دیکھنے لگا۔

"عجیب لوگ ہو تم' بھجن تو خوب گایا۔ حیرت ہوئی مجھے... مجھ سے کسی نوت کی بات کرو تو مجھے نہیں آئے گی۔ تم لوگ عجیب ہو' ہمارے بھجن گاتے ہو یار... میں تو کبھی نہ گاؤں... میں تو بس یہ جانتا ہوں۔ تمہارا ایک بھگوان ہے جسے تم... اللہ کہتے ہو اور ایک وہ ابھی تم سے نوت میں نام لیا تھا کیا نام؟" وہ اسی سے پوچھ رہا تھا۔

موسیٰ کے دل پر آرے چل گئے۔ وہ زندہ کیوں رہ گیا۔ ایسا طعنہ ایسا الزام۔ ایسا آئینہ...

اس کی ناپاک زبان سے یہ نام ادا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کبھی نہیں' وہ اس قابل نہیں تھا۔

"کالے پتھر کو تم بھی چومتے ہو؟ ہم پر پتھر کو پوجنے کا الزام کیوں لگاتے ہو۔"

موسیٰ کو اپنی ساری زندگی برباد لگی۔ سارا علم' ساری ڈگری اس کے پاس۔ اس الزام کا کوئی جواب نہیں تھا۔ کاش وہ دے سکتا لیکن وہ نہیں جانتا تھا۔ اسے کیوں نہیں پتا تھا۔ اس نے کبھی جاننے کی کوشش

کیوں نہ کی۔
"آج جسے دیکھو' ادھر منہ اٹھا کر آجاتا ہے میوزک بنانے کام کرنے... اتنا مڑوڑ اٹھنا تھا۔ تو ٹکڑے کیے کیوں...
تم لوگ دوغلے اور منافق ہو اور سنو' ہو تم پاکستانی اور پیدا انگلینڈ میں ہوئے۔ یہ کیا چکر ہے استاد...؟"
"میری مدر برٹش ہیں۔" موسیٰ کو پہلی بار بستر مرگ پر پڑی ماں یاد آئی تھی۔
"تو تم پھر مسلم ہویا کرسچین... ویسے تمہارے ہاں کی واحد بات جو مجھے پسند ہے' وہ چار شادیاں ہیں... بڑے مزے ہیں۔ تم نے کتنی کر رکھی ہیں...؟"
"ایک..." اسے حسن المآب کا دلدار چہرہ یاد آیا۔
"باقی کب کرو گے؟ چلو چھوڑو... صبح سے پہلے تو تم نے چلے جانا ہے پھر ہم جیسوں کو تمہیں لائیو سننے کا موقع کب ملے گا۔ گاؤ... گائے جاؤ... گانتوی منتر سناؤ یا تم بھی وہ پرانے رفیع کی طرح بھجن گانے سے انکار کرو گے؟ اس نے کیا تھا انکار... تو لتا دیوی نے زندگی بھر پھر اس کے ساتھ گانا نہ گانے کا وچن کیا تھا۔ لیکن تم انکار نہیں کر سکو گے... گاؤ... آج مجھے صرف شانتی چاہیے۔ وہ ایک چھوٹی سی بوتل کھول رہا تھا غم غلط کرنے کے لیے...
"آجا ہری اوم! تیرے لڑکے کی خوشی مناتے ہیں۔" اس نے ریکارڈ رکھنے والی الماری کھولی جہاں بوتلیں سجی تھیں اس نے چار بوتلیں میز کے درمیان رکھ دیں۔ "چل شروع ہو جا..."
دفعتاً" اس نے سراسیمہ آنکھوں والے... موسیٰ کی ٹھوڑی اپنے ہاتھ میں جکڑ لی۔
"پی لے... تو بھی پی لے..."
"اوں... اوں۔" بوتل سے اٹھتی بو جانی پہچانی تھی۔ مگر اسے جی بھر کے کراہت آئی۔ وہ زور... زور سے نفی میں سر مارنے لگا۔ مگر رام ناتھ کے اشارے میں ہری اوم نے اسے جکڑ لیا اس کے منہ کو جبرا" دباتے ہوئے اس نے اس کے منہ میں کافی سارا مشروب انڈیل دیا تھا۔

اس کے منہ' حلق اور پھر معدے میں آگ لگ گئی۔ گھن کراہیت غلاظت کا احساس... کیا...؟
نہیں... اس نے شاید وعدہ کیا تھا' وہ شراب کو اب کبھی ہاتھ نہ لگائے گا۔
وہ تینوں ناچ رہے تھے۔ جھوم رہے تھے۔ موسیٰ کے معدے نے اتنی تیزابی شے کو قبول نہ کیا۔ اس نے قصدا" بھی زور لگایا تھا۔ ایک بڑی الٹی... وہ بے حال ہو کر کرسی سے الٹ گیا... وہ اپنی ہی پھیلائی گندگی پر گر گیا تھا۔
وہ بے بسی اور لاچاری سے زمین پر پڑا سوچ رہا تھا۔
اس نے کچھ قسمیں کھائی تھیں کون... کون سی...
موت بے بسی اور بے چارگی ہے۔ خوف ہے۔ انجام ہے۔ موت دکھ ہے۔ موت خوشی ہے۔ مگر کیا موت ذلت ہے؟ غلاظت ہے؟ گندگی ہے؟
اس نے موت کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا۔ اسے اب مرنے کی خواہش شدید ہونے لگی مگر اب یہ ممکن نہیں تھا۔
اللہ اسے زندہ رہنے کا ایک اور موقع دے چکا تھا۔



جیک اور مائیکل نے اچنبھے سے ایک دوسرے کی صورت دیکھی اور پھر اسے دیکھا جو بری طرح کام میں مگن تھی۔ ان کے خیال سے تو اسے ہواؤں میں اڑنا چاہیے تھا۔ جیک کو دیکھ کر وہ مسکرائی تھی۔ اور مائیکل کو استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے پرجوش انداز میں ہاتھ آگے بڑھایا۔
"کانگریچولیشن... فائنلی وہ مل گیا۔"
"ہاں...!" اس نے ہونٹ پھیلائے مگر یہ مسکراہٹ نہیں تھی۔
"ہمارا تو خیال تھا' تم خوشی سے چھلانگیں مارتی پائی جاؤ گی۔" جیک نے کہا۔
"ہاں خوش ہوں میں۔" اس نے پھر ہونٹ پھیلائے۔ وہ ان دونوں کو نظر انداز بھی نہیں کر رہی

تھی۔ مگر متوجہ بھی نہیں تھی۔ بہت مصروف دکھائی دیتی تھی۔

"ہم موسیٰ کے مل جانے کی بات کررہے ہیں ڈیر!" جیک کو یاددہانی کی ضرورت محسوس ہوئی۔

"میں جانتی ہوں۔" وہ ہاتھ جھاڑ کر اپنی کرسی پر براجمان ہوگئی۔

"تمہارا بی ہیویر عجیب ہے سوئٹ!" مائیکل نے صاف گوئی سے کہا "ہم تو سلیبریٹ کرنے آئے تھے۔"

"اوہ.... تو پھر کیا منگواؤں کافی؟" اس نے ریسیور کان سے ٹکایا۔

"نو تھینکس....!" جیک نے شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھا۔

"ارے تم تو ناراض ہوگئے۔ کہیں میری شام خراب کرنے کا ارادہ باندھ کر تو نہیں آئے تھے۔ پاکستانی کھانا کھاؤں گا۔" اس نے اس کے لہجے کی نقل اتاری۔

"تو پھر ویک اینڈ پر رکھو ناں۔ آج تو سچ بہت مصروف ہوں۔ آج ہم لائیو شو کرتے ہیں ناں۔" اس نے مائیکل کو دیکھا' وہ آنکھیں سکیڑ کر دیکھنے لگا۔ وہ ٹاپک پر آ ہی نہیں رہی تھی۔ مگر کیوں؟ کہاں تو موسیٰ کے گم ہوجانے اور ملنے کی فکر نے اسے ادھ موا کردیا تھا اور اب ایسا سرسری انداز۔ بھلا کیوں....

وہ تو اپنے ٹاپس کے کرے اسٹار کو ملنے کی خوشی بھی چاکلیٹ بانٹ کر سلیبریٹ کیا کرتی تھی۔

تو وہ اس موضوع پر بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر کیوں جیک نے سوچا' وہ اس سے بعد میں ضرور پوچھے گا۔ اور کھڑا ہوگیا۔ مائیکل نے بھی تقلید کی۔

جیک کے چہرے پر خفگی تھی۔ اسے یک دم اپنے رویے کا احساس ہوا۔ وہ بھی کھڑی ہوگئی۔

"جیک!" اس نے کچھ سوچ کر پکارا' جیک کا ہاتھ ہینڈل پر تھا۔ وہ مڑے بغیر رک گیا۔

"میں اس ٹاپک پر بات نہیں کرنا چاہتی پلیز.... تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہاں۔ میں خوش ہوں اور تم دونوں کی بہت ممنون کہ تم نے مجھے ہر پل اموشنلی سپورٹ کیا۔ بٹ پلیز ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ می۔"

جیک نے بے ساختہ اسے دیکھا۔ وہ بہت مجبور نظر آنے لگی تھی۔ اس نے نمی کو چھپانے کی کوشش کو چھپایا نہیں تھا۔

"اٹس او کے!" وہ دوستانہ انداز میں مسکرادیا۔

"ویک اینڈ پر پارٹی البتہ رکھ لیتے ہیں' خوب مرچوں والے پاکستانی کھانے۔" وہ بھیگی مسکراہٹ سے اسے اکسا رہی تھی۔ جیک نے اسے گھورا۔

"تم بھی مائیکل پلیز...." دونوں نے اثبات میں سر ہلادیا۔



وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ سا تھا۔ جسم کے پھوڑوں' پھنسیوں اور زہریلے مچھروں' مکھیوں کے ڈنکوں نے اسے بخار میں مبتلا کردیا تھا۔ اس کے پاسپورٹ اور دیگر کاغذی کارروائی مکمل ہونے تک وہ چار روز ممبئی کے ایک بڑے ہاسپٹل میں زیر علاج رہا تھا۔

اس کی قوت مدافعت بے حد کمزور ہوچکی تھی۔ ہڈیوں میں درد' گلے میں شدید تکلیف اور آنکھوں کے گرد سیاہ ترین حلقے تھے اور آنکھوں کا خالی پن دل دہلا دینے والا تھا۔ سب سے زیادہ مسئلہ معدے کا تھا۔ جس میں زخم بن گئے تھے۔ وہ کچھ بھی کھا نہیں پا رہا تھا۔ ڈرپ کے ذریعے توانائی دی گئی تھی۔

اس میں چلنے کی سکت نہیں تھی۔ اسے کراچی چھوڑنے کیلاش اور ایڈورڈ دونوں آئے تھے۔ ایڈورڈ اس کی وہیل چیئر کو دھکیلتا تھا۔

کلوز سے کلوز فوٹیج حاصل کرنے کے لیے چینلز کے نمائندے ایک دوسرے کو کچلنے کے درپے تھے۔

وہ کاٹن کے لائٹ ایش گرے کلر کے شلوار سوٹ میں ملبوس تھی۔ اس نے دوپٹا سر سے گزار کر پیچھے پلو گرا رکھا تھا۔ بڑے بڑے شیشوں والے سیاہ چشمے میں اس کی ناک کی نوک اور دوپٹے کے دائرے میں صرف

ہونٹ اور ذرا سی ٹھوڑی دکھائی دیتی تھی۔
شہرزاد کو اتنے میڈیا کا سامنا کرنا تھا۔ وہ بلیک جینز پر بیگی سفید و سیاہ شرٹ میں ملبوس تھی۔ اس کی کلائی پر سیاہ سفید ڈاٹس والا بڑا ہینڈ بیگ لٹکا تھا۔ گلاسز نے اس کے چہرے کو بھی آدھا چھپا رکھا تھا اور آنکھوں کے تاثرات کو۔۔۔
محی الدین سہگل بہت خواہش اور ضد کے بعد بمشکل ایئرپورٹ تک آئے تھے۔ ان کی وہیل چیئر کو حسنل دھکیلتی تھی۔ وہ بوڑھے تھے۔ بیمار معذور لاچار۔ موسیٰ کی پہلی نگاہ شہرزاد پر پڑی اور شہرزاد خود کو کس طرح بھاگ کر لپٹ جانے کی خواہش سے روک پائی۔ یہ تاثر سیاہ گلاسز میں چھپ گیا تھا۔ وہ قدم سختی سے روکے دانت بھینچے کھڑی رہ گئی۔
حسنل کو زوردار جھٹکا لگا۔ یہ۔۔۔ یہ موسیٰ تھا۔۔۔ موسیٰ بی۔۔۔ اس کا موسیٰ اس کی آنکھیں صدمے اور خوف سے بھر آئیں۔ چیئر کے ہینڈل پر جمے اس کے ہاتھوں کی پکڑ میں بے حد دباؤ آگیا۔
"سم۔۔۔ سم اِی۔۔۔!" محی الدین نے انگلی سے سامنے اشارہ کیا۔ ان کے ہاتھ میں رعشہ تھا۔ حسنل کا سر اثبات میں ہلا تو محی الدین کی انگلی بے جان ہو کر گر گئی۔ ان کا سر نفی میں ہل رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو بہنے شروع ہو گئے تھے۔ یہ ملن کے آنسو تھے یا سمیع الدین کی حالت کے۔۔۔
حسنل گرد و پیش کے شور، روشنیوں سے بے گانہ ہو گئی۔ اسے پتا ہی نہ چلا اور ایک قطرہ گال سے پھسلتا دوپٹے کے دائرے میں گم ہو گیا۔

ایمانے کو کسی تصدیق کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ پیلی پھول دار فراک میں پیارے سے بال بنا کر خوب تیار ہو کر آئی تھی۔ اس کی پہلی سرسری نگاہ میں اچنبھا تھا مگر وہ اگلے ہی پل بے قابو ہو کر دوڑتی موسیٰ کی وہیل چیئر تک جا پہنچی۔
"پاپا۔۔۔!" اس کی آواز اشتیاق اور تحیّر سے پھٹی پڑ رہی تھی۔
"پاپا۔۔۔!" اس نے دلوں کو پگھلا دینے والی چیخ ماری۔ موسیٰ تحیّر کے عالم میں ساکت اس چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ جو سب کچھ بھلا دینے پر یادداشت کے پردے پر جگمگاتا رہا تھا۔ اس نے اللہ سے معافی مانگی تھی۔ کہ اسے ایک موقع دے کہ وہ اس چہرے کو دیکھ سکے، اس نے اللہ سے زندگی مانگی تھی کہ وہ اس وجود سے لپٹ جائے۔ اس نے مہلت مانگی تھی کہ وہ اس گلاب گداز چہرہ کو چوم لے۔۔۔
وہ اپنی ساری توانائی صرف کر کے ذرا سا جھکا۔ اسے زندگی مل گئی تھی۔ وہ اس چہرے کو چوم سکتا تھا۔۔۔ چھو رہا تھا۔
(اور ایسا ہی ایک چہرہ بالکل یہی رنگ روپ۔۔۔ ادائیں۔۔۔ وہاں لندن کے اپارٹمنٹ میں اس کا منتظر تھا۔ اس نے اس چہرے کو بھی ایک بار دیکھنے کی خواہش کی تھی۔۔۔ بس ایک آخری بار)
وہ ایمانے پر جھک آیا، اس نے اس کی پیشانی پر ایک طویل بوسہ دیا۔
"مجھے آپ کی گود میں بیٹھنا ہے۔" یہ ایک ساکت لمحہ تھا۔ اس کی دھیمے سے کہی باتیں کسی کے کان نہیں پڑی تھیں۔ مگر بے تابی کا انداز عجلت بھرے پچکارتے جملے پر آنکھ اشک بار تھی۔
کیمرے کے ذریعے لاکھوں لوگ اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ یہ کہنے سننے کا نہیں محسوس کرنے کا وقت تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سیٹی کی دھن بجاتا وہ گھر میں داخل ہوا۔ سامنے ہی صحن سے ملحقہ برآمدے میں عیسیٰ منہ لٹکائے چارپائی پر بیٹھا نظر آگیا۔ اونچی آواز میں سیٹی بجاتا وہ دھپ سے اس کے سامنے بچھی چارپائی پر بیٹھا۔

"خیر تو ہے دولہا راجا کے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں۔ سنا تو یہی تھا کہ محبت کی شادی کرنے والوں کے چہرے ٹیوب لائٹ کی طرح چمکتے ہیں اور تیرے کیس میں تو مجھے سو فیصد یقین تھا کہ ادھر میں گھر کا دروازہ کھولوں گا اور تیز شعاعوں سے میری آنکھیں چندھیا جائیں گی۔ پر تو تو یہاں جلی ہوئی ٹیوب لائٹ بنا بیٹھا ہے۔"

فہد کے شرارتی انداز سے کہے جملوں پر تپ کر عیسیٰ نے اپنے بازو کے نیچے سے تکیہ اٹھا کر اسے دے کرنے دیں۔ مجھے تو ڈر ہے ولیمہ پر ٹینٹ لگوانے کے بجائے کھلے میدان میں ہی نہ بٹھا دیں۔ اب تو ہی بتا کیا کروں کیسے سمجھاؤں ابا کو؟ مجھے تو لگتا ہے شادی سے پہلے میں ٹینشن سے ہی آدھا رہ جاؤں گا۔"

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجیے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

عیسیٰ نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"تجھے بھی تو ٹینشن لینے کا شوق ہے۔ ماموں پوری برادری میں کنجوس مشہور ہیں، یہ بھی کوئی نئی بات ہے۔ مجھے مت گھور سچ کہہ رہا ہوں۔"

"میں کیا کروں۔ میری اپنی نئی نئی نوکری ہے۔ شادی کے لیے کچھ سالوں کی مہلت مل جاتی تو کچھ پیسے ویسے جوڑ ہی لیتا مگر الوینہ کے والدین انتظار نہیں کرنا

## سدرہ حیات



مارا۔ جسے دونوں ہاتھوں سے کیچ کرتا فہد ہنس پڑا۔

"اڑا لے مذاق نکال لے جتنے دانت نکالنے ہیں۔ جب تیرا وقت آئے گا تب پوچھوں گا۔" عیسیٰ نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

"میری زندگی میں کچھ سالوں تک تو اس شادی جیسے حادثے کا کوئی امکان نہیں ہے میری والدہ ماجدہ مجھے اپنے پیروں پر پوری طرح جما دیکھنا چاہتی ہیں۔ تو بتا مسئلہ کیا ہے۔" فہد کے پوچھنے کی دیر تھی عیسیٰ شروع ہو گیا۔

"یار! تجھے تو پتا ہے۔ یہ شادی کتنی مشکلوں سے ہو رہی ہے۔ اوپر سے ابا ساری بچتیں میری شادی پر ہی کرنا چاہتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ فضول میں پیسہ اڑائیں۔ مگر جو جائز اخراجات ہیں ان کو تو پورا چاہتے۔ انہیں اپنے فرض سے سبک دوش ہونے کی جلدی ہے۔ ایسے میں، میں کیا کروں۔" عیسیٰ نے پریشانی سے اپنا ماتھا مسلا۔

"میری مان ماموں سے پیسے مانگ۔ کسی کا قرض ادا کرنے کے بہانے اور شادی کے اخراجات میں لگا دے۔" فہد نے مزے سے مشورہ دیا۔ عیسیٰ نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔

"اور وہ تو جیسے دے ہی دیں گے اور ویسے بھی وہ سارا کچھ خود دیکھ رہے ہیں مجھے کہاں کرنے دیں گے۔ تیرے سارے آئیڈیے فلاپ ہی ہوتے ہیں۔"

"اچھا ٹینشن نہ لے۔ میرے اور خاص کر میری والدہ کے ہوتے ہوئے تیرا ولیمہ کھلے آسمان تلے نہیں ہو سکتا۔" فہد نے اسے تسلی دی۔ عیسیٰ کا اعصابی تناؤ


ناولٹ
Junaid-Ansar

کچھ کم ہوا۔ جانتا تھا کہ پھوپھو اباجی کو سنبھال لیں گی۔

"عظمیٰ! یہ کیا بھئی اکلوتے بھائی کی شادی ہے اپنی دوستوں کو بلاؤ۔ دودھیاں ننھیال کی ساری کزنز کو اکٹھا کرو۔ کوئی ڈھولک شولک رکھو کوئی لڈی وڈی ڈالو۔ بلکہ تمہیں وہ گانا گانا چاہیے وہ کیا تھا ہاں ویر میرا گھوڑی چڑھیا" عظمیٰ کو آتے دیکھ کر فہد نے مخاطب کیا۔

"رہنے دیں فہد بھائی کیسی شادی کہا کا ہلا گلا۔ امتحانات نے سارا مزا کرکرا کر دیا ہے اور ویسے بھی شادی ایک ایسا ایونٹ ہے جس میں صرف دولہا دلہن ہی فارغ ہوتے ہیں۔ باقی سب تو اپنے کام دھندوں میں ہی لگے رہتے ہیں۔" خفگی سے کہتی اپنی کتابیں اٹھا کر وہ واپس اندر چلی گئی۔

"اس کو کیا ہوا۔" فہد حیران ہوا" کل تک تو وہی سب سے زیادہ ایکسائٹڈ تھی۔"

"ناراض ہے مجھ سے۔ اب تو بتا اس میں بھی میرا قصور ہے کہ اس کے امتحان کالج والوں نے آگے کر کے عین میری شادی کے دنوں میں رکھ دیے ہیں۔"

معاملہ سمجھ میں آتے ہی فہد کے منہ سے ہنسی چھوٹی۔ "یار مان نہ مان تیرے ستارے گردش میں ہیں۔ دعا کر تیری شادی وقت پر خیر خیریت سے ہو جائے۔"

عیسیٰ گہری سانس لے کر رہ گیا۔ دعا تو اس کی بھی یہی تھی کہ یہ شادی خیر و عافیت سے ہو جائے۔



برتنوں کی کھٹ پٹ سے اس کی آنکھ کھلی۔ مندی مندی آنکھوں سے گھڑی دیکھی جو صبح کے نو بجا رہی تھی۔ آج اتوار کا دن تھا اور اسے اپنی شادی کے بہت سے کام کرنے تھے۔ شادی میں چند دن ہی باقی تھے۔ اسی لیے اس کا ارادہ تھا کہ آج اباجی کے ساتھ ہی نکلے گا تاکہ ان کے کیے گئے انتظامات کا بھی جائزہ لے سکے۔ جمائیاں روکتا وہ پیروں میں چپل پہن رہا تھا جب اماں ابا کی تکرار کانوں میں پڑی۔

"نیک بخت مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہے اور تمہیں نان پراٹھے سوجھ رہے ہیں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے اس فضول خرچی کی۔ بلکہ مہندی پہ کھانا دینے کی بھی ضرورت نہیں۔ چائے سموسے ٹھیک رہیں گے۔" ابا کی اس نئی بات پر عیسیٰ اور اماں تڑپ ہی تو اٹھے تھے۔

عیسیٰ جلدی سے اٹھ کر برآمدے میں کھلنے والے دروازے میں آ کھڑا ہوا۔ سامنے ہی ابا ہاتھ میں اخبار لیے بیٹھے تھے۔ میز پر ناشتے کے خالی برتن پڑے تھے۔ ان کی دروازے کی طرف پشت تھی اسی لیے اسے نہ دیکھ پائے۔ اماں قریبی چارپائی پر بیٹھی ناشتہ کر رہی تھیں مگر ابا کی بات سن کر ان کا منہ تک جاتا نوالہ ہوا میں ہی رک گیا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ کچھ خدا کا خوف کریں۔ اتنی کنجوسی اچھی نہیں ہوتی۔ مہنگائی ہے تو کیا سوکھے منہ لوگوں کو رخصت کر دیں۔ کھانا تو کھلانا ہو گا۔ بے شک آپ نان پراٹھے نہ رکھیں۔ ایک ہی بیٹا ہے کچھ خیال کریں۔" اماں نے خفگی سے احتجاج کیا۔ ورنہ ابا سے بعید نہ تھا۔ چائے سموسوں پر ہی ٹرخا دیتے۔

"ہاں تو ولیمہ والے دن کھلا دیں گے کھانا بھی۔ یہ تم عورتوں کے شوق ہیں ورنہ مہندی کی ضرورت ہی نہیں ہے۔"

"ساری عمر آپ نے یوں ہی کنجوسی دکھائی ہے اب میرے پتر کی شادی میں اس طرح نہ کریں۔ میری خوشی نہ خراب کریں۔" ناشتہ چھوڑ کر اماں اپنے آخری حربے پر آ گئی تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ حربہ بھی کم ہی کام کرتا تھا۔ ابا ان کے رونے سے بے نیاز اخبار میں کوئی خبر پڑھنے میں مصروف تھے۔ کچھ دیر بعد اخبار تہ کرتے باہر جانے کے لیے اٹھ گئے، ہاتھ میں اخبار بھی تھا۔

اماں اب بائیں ہاتھ سے آنسو صاف کرتی دائیں ہاتھ سے نوالے منہ میں ڈالتی ناشتہ دوبارہ سے شروع کر چکی تھیں۔ جبکہ عیسیٰ دروازے پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ

نہ جانے اس شادی میں اور کتنے مسائل کھڑے ہونے باقی تھے۔ جانے وہ دن کب آئے گا جب الوینہ اس کے گھر کے آنگن میں دلہن بن کر آئے گی۔ الوینہ کا تصور ذہن میں آتے ہی اس کے تنے ہوئے اعصاب پُرسکون ہو گئے۔ لبوں پر خوب صورت مسکراہٹ پھیل گئی۔ الوینہ اس کے دل کی اوّلین خواہش تھی جو اب اس کی زندگی میں شامل ہونے جارہی تھی۔



پروفیسر درانی کے کلاس روم سے نکلتے ہی اسٹوڈنٹس نے سکون کا سانس لیا۔ ان کی موجودگی میں اکثر کا سانس حلق میں اٹکا رہتا تھا اور پھر ان سب کا تو آج اس یونیورسٹی میں پہلا دن تھا۔ سب کی شکلیں دیکھ کر صاف لگ رہا تھا کہ پروفیسر درانی اپنی دھاک بٹھانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ کچھ معصوموں کی ہونق صورتیں اور پیشانی سے پھوٹتے پسینے ظاہر کر رہے تھے کہ وہ اپنے یونیورسٹی آنے پر خود کو کوس رہے تھے۔ دائیں طرف پہلی رو میں تین لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ صبح سے اکٹھے ہونے کی وجہ سے تینوں میں اچھی دوستی ہو چکی تھی۔

"اس کلاس کے بعد کیفے چلتے ہیں مجھے شدید بھوک لگ رہی ہے۔ ناشتہ بھی میں ڈھنگ سے نہیں کرکے آئی۔" اریبہ نے دونوں کی طرف دیکھا۔

"میری بھوک تو پروفیسر درانی نے اڑا دی ہے۔ اف ان کو کون برداشت کرے گا۔" صبا نے بے چارگی سے کہا۔ وہ اپنے چہرے پر آیا پسینہ رومال سے پونچھنے میں مصروف تھی جو گرمی کے باعث بھی تھا اور کچھ پروفیسر درانی کی بدولت بھی۔ بوتل سے منہ لگا کر پانی پیتی الوینہ اس کی بات سن کر منہ سے بوتل ہٹاتے ہوئے بولی۔

"ریلیکس! ٹیچرز تو ایسے ہی ڈراتے ہیں۔ تم سر پر سوار مت کرو' ایک کان سے سنو' دوسرے سے نکال دو۔"

"الوینہ ٹھیک کہہ رہی ہے' اپنا خون خشک کرنے سے کیا ہوگا۔" اریبہ نے بھی اسے پُرسکون کرنا چاہا۔

"وہ دیکھو۔" بوتل بند کرتی الوینہ نے آنکھ کے اشارے سے انہیں ساتھ والی رو کی طرف متوجہ کیا۔ جہاں پر بیٹھی لڑکیاں اپنا میک اپ درست کر رہی تھیں۔

"کچھ دیر پہلے ان کے چھکے چھوٹے ہوئے تھے اور اب سب بھول بھال کر اپنی حالت درست کر رہی ہیں۔" صبا بھی ان کے ساتھ مسکرائی۔

کلاس ختم ہو چکی تھی۔ ساری کلاس زور و شور سے باتوں میں مصروف تھی۔ جب کسی کے ڈیسک بجانے پر سب ہڑبڑا کر سامنے ڈائس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوئے۔ ایک خوش شکل نوجوان چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ سجائے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے دائیں طرف دو اور نوجوان کھڑے تھے جو سارے اسٹوڈنٹس کا جائزہ لے رہے تھے۔ ڈائس پر کھڑے نوجوان نے سب کو متوجہ دیکھ کر بات کا آغاز کیا۔

"السلام علیکم اسٹوڈنٹس' میں آپ سب کو ویلکم کرتا ہوں اس یونیورسٹی میں۔ آج آپ کا پہلا دن ہے سب نیا نیا لگ رہا ہوگا لیکن پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے ایک دو ہفتوں میں آپ اس ماحول کے اس سسٹم کے عادی ہو جائیں گے۔" پھر اس نے رک کر سب کے سوالیہ چہروں پر نظر ڈالی۔

"ہم یونیورسٹی میں ایک سوسائٹی چلاتے ہیں ہیلپنگ گائیڈ کے نام سے۔ جب بھی آپ لوگوں کو کوئی مسئلہ ہو' آپ ہمارے پاس آسکتے ہیں۔" مسکراتے ہوئے اس نے سب پر نظر ڈالی۔

"اس کے ساتھ ساتھ ہم اسٹوڈنٹس کو کم پیسوں میں کتابیں بھی منگا کر دیتے ہیں۔ آپ لوگوں کو جو بھی کتاب چاہیے ہو' آپ ہم سے منگوا سکتے ہیں۔" اس کے خاموش ہوتے ہی ایک لڑکا بول پڑا۔

"پروفیسر درانی نے ہمیں ایک کتاب لینے کا کہا ہے جو کہ ان کے مطابق لائبریری سے نہیں ملے گی۔" عیسیٰ نے سر ہلایا۔

"جی بالکل' وہ آپ کو خریدنی پڑے گی اور یقیناً"

انہوں نے اگلی کلاس میں لانے کا کہا ہو گا جو کہ بدھ کے دن ہو گی۔ ہم آپ کو وہ کتاب رعایتی قیمت پر منگوا کر دے سکتے ہیں۔ کون کون ہے جو کتاب منگوانا چاہتا ہے۔" سبھی اسٹوڈنٹس کے ہاتھ کھڑے دیکھ کر اس نے سر کو خم دیا۔

"او کے' چونکہ وقت کم ہے اس لیے آپ سب اپنا نام لکھوا کر تین' تین سو روپے جمع کروا دیں۔" اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ دونوں مستعدی سے آگے بڑھے۔ آدھے گھنٹے میں وہ سارے اسٹوڈنٹس سے پیسے وصول کر چکے تھے۔ ان تینوں کے جاتے ہی ایک لڑکا ان پروفیسر کا پتا کرنے چلا گیا جن کی کلاس تھی۔

"یہ کلاس نہ ہوئی نا تو کیفے چلیں گے۔" الوینہ نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم دونوں ہو آنا' میرا موڈ نہیں ہے۔" صبا کے کہنے پر دونوں نے اسے گھورا۔

"ابھی تو تمہیں سمجھایا تھا۔" اریبہ نے اپنا سر پیٹا۔

"بات تو سنو۔ وہ اصل میں میرے پاس صرف کرائے کے پیسے ہی رہ گئے ہیں۔" صبا نے نظریں جھکائے اپنی مجبوری بتائی۔

"تو کیا ہوا' ہم مل بانٹ کر کھالیں گے۔ دوستی میں سب چلتا ہے کسی دن ہم تم سے کھالیں گے۔" الوینہ نے جلدی سے کہا۔ اریبہ نے بھی اس کی تائید کی۔ اس سے پہلے کہ شرمندہ ہوتی صبا کچھ کہتی۔ وہ لڑکا واپس آیا اور اعلان کرنے والے انداز میں بولا۔

"پروفیسر طلال چھٹی پر ہیں۔" اس خبر پر سارے خوش ہوتے اپنی سیٹوں سے اٹھ رہے تھے کہ اس کی دوسری بات سن کر وہیں جم گئے۔

"بری خبر یہ ہے کہ سینئرز ہمیں الو بنا کر چلے گئے ہیں۔ ہم سے پیسے بٹور کر پوری کلاس کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے چلی گئی ہے اور یہ میں اپنے گناہ گار کانوں سے سن کر آ رہا ہوں۔" یہ سنتے ہی سب کے منہ لٹک گئے۔ کچھ کے چہرے غصے سے لال پیلے ہو گئے۔

الوینہ کا تو بس نہیں چل رہا تھا' ان تینوں کو ہی کچا چبا جاتی۔ صبا اپنے پیسے ڈوب جانے پر افسردہ تھی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ یقیناً" سینئرز کہیں بیٹھے ان کے پیسوں پر عیش کر رہے تھے۔



"یہ جونیئرز تو بڑے بے وقوف نکلے۔ بغیر کوئی سوال جواب کیے سب نے پیسے نکال دیے۔" سہیل نے مزا لیتے ہوئے کہا۔ ان کی آدھی سے زیادہ کلاس اس وقت کیفے میں بیٹھی تھی۔ بریک ہونے میں ابھی ٹائم تھا پر ان کی کلاس ٹائم سے پہلے ختم ہو گئی تھی۔ بریک ٹائم والا رش نہیں تھا کیفے میں۔

"وہ بے چارے بھی کیا کرتے یار۔ پروفیسر درانی سے ڈرے بیٹھے تھے ایسے میں کیا خاک سمجھتے۔" فہد نے سموسہ کھاتے ہوئے اپنی طرف سے ٹھوس وجہ بتائی۔

"مجھے بھول گئے اصل میں تو یہ میری کارکردگی تھی جو جونیئرز اتنی جلدی ٹریپ ہو گئے۔" چائے کی چسکی لیتے ہوئے عیسیٰ نے سارا کریڈٹ لیا۔

"یہ تو خیر عیسیٰ ٹھیک کہہ رہا ہے' اس کی کارکردگی لاجواب تھی۔" سہیل متفق ہوا۔

"تیرے اس ٹیلنٹ کی وجہ سے ہی تو سب نے تجھے آگے کیا تھا۔ شاباش میرے یار اگلے سال بھی جونیئرز کو بے وقوف بنانا اور ہمیں عیش کروانا۔" فہد نے اس کا کندھا تھپکا۔

اسی طرح کی خوش گپیاں کرتے انہوں نے سموسے اور چائے ختم کی۔ کیفے کے ملازم کے بل لانے پر عیسیٰ نے پیسے نکالے جتنے اس کے مطابق بنتے تھے۔ ان دوستوں میں ایسا ہی چلتا تھا کبھی ایک بل ادا کرتا تو کبھی دوسرا۔

"آپ کا بل ایک ہزار پچاس بنتا ہے۔" ملازم نے دانت نکالتے ہوئے بتایا۔

"خیر تو ہے بھائی! ہم روز آتے ہیں کیفے۔ پرانے

اسٹوڈنٹس ہیں ہمارے ساتھ تو گیم کرنا چاہ رہا ہے۔" فہد نے اسے لتاڑا۔

"ہمارا بل ایک سو پچاس بنتا ہے۔ تین چائے اور چھ سموسے منگوائے تھے ہم نے۔" عیسیٰ نے بھی اسے گھورا۔

"سرکار! میں آپ کو پہچانتا ہوں۔ روز یہی منگواتے ہیں آپ مگر آج وہ ان تین لڑکیوں کا بل بھی آپ کے کھاتے میں ڈالا گیا ہے۔" ایک میز چھوڑ کر بیٹھی تین لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا جو اپنی باتوں میں لگی ہوئی تھیں۔

"ہمارا ان سے کیا واسطہ۔" عیسیٰ الجھا۔

"تو کسی کے بھی کہنے پر دوسرے کے کھاتے میں پیسے ڈال دے گا۔" فہد تپ کر بولا۔

"میں اب کیا کروں وہ خود کہہ رہی تھیں آپ تینوں کے نام لے کر کہ آپ نے ان کے پیسے دینے ہیں اس لیے بل میں لکھ لیں۔"

تینوں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یہ کون تھیں جو اتنے دھڑلے سے جھوٹ بول رہی تھیں اور ابھی تک کیفے میں بیٹھی ہوئی بھی تھیں۔

"دیکھیں صاحب! لڑکیاں ہیں' آپ خود ہی ان سے بات کریں۔ آپ نے ان کے پیسے دینے ہوں گے تب ہی تو بیٹھی ہیں۔" ملازم نے اپنی جان چھڑانا چاہی۔

"اچھا پہلے بتا' منگوایا کیا کیا ہے انہوں نے بھلا نو سو کا بل بنا کیسے لیا۔" فہد نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔

"تین پلیٹ بریانی' تین چائے' آٹھ سموسے' تین رول پراٹھے۔"

"ہیں! اتنا کھا گئیں۔ لگتی تو نہیں ہیں اتنا کھانے والی۔" فہد نے مڑ کر ان پر نظر ڈالی۔

"چائے اور تین سموسوں کے علاوہ باقی سب تو انہوں نے پیک کروا لیا۔" ملازم نے دانت نکالتے ہوئے بتایا۔

"تو جا' ہم ذرا ان سے بات کر کے تجھے بلاتے ہیں۔" سہیل نے اسے چلتا کیا پھر دونوں کی طرف دیکھا "اب کیا کرنا ہے۔"

"بات کرتے ہیں ان سے' کس کھاتے میں ہمارے پیسوں سے کھانا چاہ رہی ہیں۔" عیسیٰ اپنی جگہ سے اٹھتا ان کے ٹیبل کی طرف بڑھا۔ فہد اور سہیل بھی اس کے پیچھے گئے۔

"میں پوچھ سکتا ہوں کس وجہ سے آپ نے اپنا بل ہمارے کھاتے میں ڈالنا چاہا ہے اور وہ کون سے پیسے ہیں جو ہم نے آپ کے ادا کرنے ہیں۔" ان کے سر پر پہنچ کر عیسیٰ نے تحمل سے پوچھا۔

چائے کا آخری گھونٹ لیتی الوینہ نے اطمینان سے پیالی خالی کر کے میز پر رکھی پھر اس کی طرف دیکھا جو اس کے بولنے کا منتظر تھا۔

"قرض دار تو آپ بہت سوں کے ہیں' یہ اور بات ہے کہ وصولی صرف ہم کر رہے ہیں۔" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولتی وہ پُر اعتماد سی لڑکی اسے حیران کر رہی تھی۔

"کس قرضے کی بات کر رہی ہیں؟" عیسیٰ متذبذب سا اس کی آنکھوں کو دیکھے گیا۔ سیاہ گہری آنکھوں پر اٹھی ہوئی لمبی پلکیں۔

"یادداشت کمزور لگتی ہے آپ کی بھول گئے آپ ان معصوموں کو جن کی معصومیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ لوگوں نے کل ان سے پیسے بٹورے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے بھی آپ لوگ اپنے کارنامے پر غالباً" خوش ہو رہے تھے۔ تو میں نے سوچا آپ لوگوں کو وہ یادگار دن پھر سے یاد کروا دوں۔" مسکرا کر کہتی وہ انہیں اصل قصہ سمجھا چکی تھی۔

"وہ تو مذاق تھا۔" فہد جلدی سے بولا۔

"مذاق صرف تب تک مذاق رہتا ہے جب کسی کو اس سے نقصان نہ پہنچے۔ کل آدھی سے زیادہ کلاس کے پاس واپسی کا کرایہ نہیں تھا۔ یونیورسٹی کے پہلے ہی دن اپنے کلاس فیلوز سے مدد لیتے۔ انہیں کس قدر شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ آپ لوگوں کو اس کا احساس تک نہیں۔" اپنی جگہ سے اٹھتے اس نے اپنا بیگ اٹھایا۔ نظریں ابھی بھی عیسیٰ پر تھیں۔

"کچھ زیادہ ہی ہو گئی ہے یار" سہیل نے عیسیٰ کا کندھا ہلایا جو ابھی تک ویسے ہی کھڑا تھا۔
فہد کے بلانے پر اس نے سر جھٹکنا چاہا۔ مگر کچھ تھا جس سے وہ پیچھا نہیں چھڑا پا رہا تھا۔ بے چینی سی بے چینی تھی جس کو وہ کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔



"اف یہ لڑکیاں کتنا لکھتی ہیں انہیں کی وجہ سے ہمارے نمبر کم آتے ہیں یہ کمپیٹیشن جو بڑھا دیتی ہیں۔" خود سے باتیں کرتا ہاتھ میں ساری کلاس کی اسائینمنٹس پکڑے وہ پروفیسرز کے دفاتر کی طرف جا رہا تھا۔
کلاس کا سی آر ہونے کی وجہ سے سب کی اسائنمنٹس جمع کروانا اس کی ذمہ داری تھی لڑکیوں کی اٹھارہ انیس صفحوں کی اسائنمنٹ کے آگے اپنے دو صفحے اسے کچھ بھی نہیں لگ رہے تھے۔ جھنجلاتا ہوا وہ اوپر جاتی لفٹ کی طرف آیا۔
سیڑھیوں سے کچھ فاصلے پر آمنے سامنے دو لفٹس لگائی گئی تھیں جو شروع میں ہر وقت ہی استعمال میں رہتی تھیں۔ اسٹوڈنٹس شوق میں اور پروفیسرز اپنے دفتر تک جانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ مگر کچھ عرصے سے اس طرف کا رخ کم ہی کیا جاتا تھا اور اس کی وجہ ایک لفٹ کا خراب ہونا تھا۔ عیسیٰ اپنی جون میں لفٹ تک آیا۔ پیچھے سے اسامہ کی آواز آئی۔
"تو تیسری منزل پر جا رہا ہے۔"
"ہاں یار اسائنمنٹ جمع کروانی ہے۔" عیسیٰ نے اسے جواب دیا۔
"چل میں ادھر سے چلتا ہوں مجھے پروفیسر ذکی سے کام ہے۔"
اسامہ نے دوسری لفٹ کا بٹن دبایا۔ عیسیٰ لفٹ کا دروازہ کھلنے پر اندر داخل ہوا اسی وقت الوینہ کو اندر آتے دیکھ کر عیسیٰ کو خوشگوار سا احساس ہوا اس پر ایک سنجیدہ سی نظر ڈال کر وہ تیسرے فلور کا بٹن دبا چکی تھی۔
لفٹ کا دروازہ بند ہونے والا تھا جب سامنے والی لفٹ میں کھڑا اسامہ زور سے بولا۔
"عیسیٰ اس لفٹ میں نہ جا۔" اور اسی وقت لفٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ اسامہ کی بوکھلاہٹ پر وہ ابھی حیران ہو ہی رہا تھا کہ اس کے ذہن میں کلک ہوا۔
"او نو۔۔۔ شٹ۔" عیسیٰ نے بائیں ہاتھ کا مکا لفٹ کے دروازے پر مارا۔ "کیا ہوا" خاموش کھڑی الوینہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔
"یہ لفٹ خراب ہے۔"
"کیا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مطلب پھر یہ بند کیوں نہیں کی گئی۔"
"باہر نوٹس لگایا گیا ہے مگر جلدی میں، میں نے دیکھا ہی نہیں۔ کچھ عرصے سے لفٹ اتنی استعمال میں نہیں رہی تھی۔ مجھے دھیان نہیں رہا اور اسامہ نے بھی اینڈ پر یاد کرایا۔" افسوس سے ہاتھ دیوار پر رکھے عیسیٰ نے کہا۔
"پر لفٹ تو چل رہی ہے۔ آپ مذاق کر رہے ہیں۔" حواس باختہ سی الوینہ نے اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے اسے دیکھا۔
"عجیب باتیں کر رہی ہیں، آپ میں کیوں اس سچویشن میں آپ سے مذاق کروں گا۔ ایک لفٹ خراب ہے یہ آپ کسی سے بھی پوچھ لیں۔ وہ بتا دے گا۔" عیسیٰ کا پہلے ہی گرمی سے برا حال تھا اوپر سے نیا مسئلہ۔
"تو اب ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھیں گے، کچھ کریں۔" اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا لفٹ کا دروازہ کھل گیا۔
"دیکھا۔ میں کہہ رہی تھی ناں آپ مذاق کر رہے تھے حد ہوتی ہے ویسے۔" اسے گھورتی ہوئی وہ باہر نکلی۔
"اس کا مطلب ہے اسامہ خراب والی لفٹ میں سوار ہوا ہے۔" عیسیٰ کو اچانک خیال آیا۔
"اب آپ اپنی بات سنبھال رہے ہیں۔" الوینہ نے دونوں بازو اپنے گرد باندھتے ہوئے اسے دیکھا جس کے چہرے پر پریشانی تھی۔

"آپ میرے ساتھ آئیں میں دکھاتا ہوں آپ کو کہ میں سچ بول رہا ہوں۔" اس کی پریشانی دیکھتے ہوئے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ نیچے آگئی تھی۔

اس بار بھی وہ لفٹ سے ہی آئے تھے۔ دوسری لفٹ کے ساتھ لگا نوٹس پڑھتے ہی وہ بھی پریشان ہو گئی۔

"اوپر جا کر دیکھتے ہیں کہ لفٹ کھلی یا نہیں کیونکہ یہ لفٹ اگر چل پڑے تو پھر کھلتی نہیں ہے۔" عیسیٰ جلدی سے لفٹ کی طرف بڑھا۔

"لفٹ کو چھوڑیں سیڑھیوں سے جاتے ہیں اس کا کیا اعتبار۔"

الوینہ نے اسے روکا۔ عیسیٰ نے سر ہلایا۔ دونوں جلدی جلدی سیڑھیاں پھلانگتے دوسری منزل پر پہنچے۔ عیسیٰ کی بات صحیح تھی۔ لفٹ آچکی تھی لیکن دروازہ بند تھا۔ عیسیٰ نے تین چار بار بٹن دبائے اسامہ کو بھی ایک دو آوازیں دیں۔

"اندر آواز نہیں جا رہی ہوگی۔ لفٹ کا دروازہ ہی کھلوانا پڑے گا۔" الوینہ نے پریشانی سے کہا۔

"ہوں۔ کیا کریں، کس کو بلائیں۔" عیسیٰ اپنی پیشانی مسلتا اس کی جانب مڑا۔

"نیچے جا کر انتظامیہ کو اکٹھا کرتے ہیں۔" الوینہ نے مشورہ دیا۔

دونوں پھر سے سیڑھیاں پھلانگتے نیچے آئے۔ ایک اٹینڈنٹ کو روک کر معاملہ سمجھایا۔ پہلے تو وہ یہ ماننے پر تیار نہیں تھا کہ لفٹ چل پڑی ہے۔ پھر اس نے انہیں یہ کہہ کر ٹال دیا۔

"افتخار صاحب کھانا کھا کر آتے ہیں تو بتاتا ہوں۔"

"یہ کچھ نہیں کرنے والے۔" الوینہ نے تپ کر کہا۔

"ہوں انتظامیہ کو اکٹھا کرنے کا طریقہ ہے میرے پاس۔" عیسیٰ نے اسے چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کے ساتھ چلتی وہ ایک کارنر تک آئی جہاں ایمرجنسی بیل لگی ہوئی تھی۔

عیسیٰ کے بیل دباتے ہی سب دفتروں میں ایمرجنسی سائرن بجنا شروع ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں دروازے کھلنا شروع ہو گئے۔ دس منٹ میں پوری انتظامیہ اور پروفیسرز وہاں موجود تھے۔ عیسیٰ نے انہیں بتایا کہ ایک اسٹوڈنٹ لفٹ میں بند ہو گیا ہے اور اب دروازہ کھلوایا جائے۔ لفٹ کھلوانے کے لیے عملہ بلایا گیا جو بیس منٹ میں یونیورسٹی پہنچا۔ اس دوران وہاں موجود سارے افراد بے چینی کا شکار رہے۔ عیسیٰ الگ پریشان تھا۔ جانتا تھا اسامہ کتنے کمزور دل کا تھا۔ الوینہ کا خیال تھا کہ وہ یقیناً "بے ہوش ہو گیا ہوگا تبھی اس کی کوئی آواز نہیں آ رہی۔

لفٹ کا دروازہ کھلتے ہی دونوں بے اختیار آگے بڑھے۔ مگر اندر کا منظر دیکھ کر دونوں شاکڈ رہ گئے۔ لفٹ خالی تھی اور اسامہ کا وہاں نام و نشان تک نہ تھا۔ وائس چانسلر کی گھورتی غصیلی نگاہوں کو اپنے اوپر محسوس کر کے دونوں نے تھوک نگلتے ہوئے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

"شرم آنی چاہیے آپ دونوں کو۔ اتنا وقت ضائع کیا ہے آپ نے ہم سب کا۔" وائس چانسلر نے دونوں کو جھاڑا۔

"سر! آپ یقین کریں ہمارے سامنے وہ لڑکا لفٹ میں سوار ہوا اور تب ہی تو لفٹ دوسری منزل تک گئی۔" عیسیٰ نے اپنی صفائی دینا چاہی الوینہ نے جھٹ سے سر ہلایا۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر دونوں کو بولنے سے روکا۔

"آخری وارننگ دے رہا ہوں۔ آپ لوگوں کو اپنی فولنگ اسٹوڈنٹس تک محدود رکھیں پروفیسرز اور انتظامیہ کو نشانہ مت بنائیں ورنہ اگلی بار میں لحاظ نہیں کروں گا۔" سخت الفاظ میں کہتے وہ چلے گئے۔ وہ دونوں بھی حیران پریشان سے چلتے ہوئے باہر کی طرف چل پڑے۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر وہ گیا کدھر۔" عیسیٰ نے الوینہ کی طرف دیکھا جو خود بھی اسی کشمکش میں تھی۔

"ہوں۔ ہمارے سامنے ہی تو وہ لفٹ میں سوار ہوا تھا۔"

”شکر ہے ہم دونوں آ گئے۔“ اس آواز پر دونوں نے چونک کر سامنے دیکھا۔ کچھ فاصلے پر کھڑا وہ اسامہ ہی تھا۔ دونوں اس کے قریب گئے۔

”تم کہاں تھے۔“ عیسیٰ نے پوچھا۔

”میں تو ادھر بینچ پر تم دونوں کا انتظار کر رہا تھا۔“ اسامہ نے بینچ کی طرف اشارہ کیا۔

”آپ لفٹ میں نہیں تھے؟“ الوینہ جلدی سے بولی۔

”نہیں لفٹ کا دروازہ بند نہیں ہو رہا تھا۔ میں گھبرا کر باہر نکل آیا' میرے نکلتے ہی لفٹ بند ہو گئی۔ میں تو پریشان ہو گیا' کہیں تم دونوں اندر ہی نہ پھنس جاؤ۔ ان لفٹس کا کیا اعتبار' تم لوگ اگر پانچ منٹ تک نہ آتے تو میں سوچ رہا تھا کہ کسی کو جا کر بتاؤں۔ پریشان ہو گیا تھا میں۔“ اسامہ نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔

عیسیٰ نے الوینہ کی طرف دیکھا جو پہلے ہی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دونوں کی نظریں ملنے کی دیر تھی۔ ہنسی کا فوارا تھا جو دونوں کے منہ سے نکلا تھا۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے بے ساختہ ہنستے ہوئے وہ دونوں اسامہ کو عجیب لگے تھے۔

”میں پریشان ہو رہا تھا اور تم دونوں ہنس رہے ہو۔“

اس کو جواب دینے کے بجائے وہ اور زیادہ ہنسنے لگے تھے۔ الوینہ کی تو آنکھوں تک میں پانی آ گیا تھا' یوں ہنستے ہوئے ان کو ان کے حال پر چھوڑ کر اسامہ آگے بڑھ گیا۔

”یہ ابھی سوچ رہا تھا اور ہم نے اتنا ہجوم اکٹھا کر لیا تھا۔“ ہنسی روکتے ہوئے عیسیٰ نے کہا۔

”بے عزتی بھی بہت ہو گئی آج۔“ الوینہ نے اپنی آنکھیں پونچھیں۔ اس کے چہرے پر پھیلی مسکان' لمبی بھیگی پلکیں سامنے والے کو مبہوت کرنے کے لیے کافی تھیں۔ عیسیٰ نے بمشکل اس پر سے نگاہ ہٹا کر ہاتھ میں پکڑی اسائنمنٹس کو دیکھا۔

”ٹھیک ٹھاک قسم کی ہو گئی سب کے سامنے اور یہ اسائنمنٹ جمع کروانی تھی' بھول ہی گیا۔“

”آپ یہ جمع کروائیں۔ میں بھی کلاس کے لیے لیٹ ہو گئی ہوں۔ ابھی تک تو آدھی کلاس گزر چکی ہو گی۔“ کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتی وہ آگے بڑھی۔

”الوینہ!“ عیسیٰ نے بے اختیار اسے پکارا۔ الوینہ اس کی طرف مڑی سوالیہ نظریں اس کے بولنے کی منتظر تھیں۔

”اس دن کے لیے سوری۔ آپ واقعی ٹھیک کہہ رہی تھیں ایسا مذاق جو کسی کو نقصان پہنچائے' وہ مذاق نہیں ہوتا یقیناً“ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ پر یہ ہمارا ایک مائنڈ سیٹ ہے کہ نئے آنے والے اسٹوڈنٹس کی فولنگ کی جائے اور پہلے کبھی ہم نے اس رخ سے نہیں سوچا۔ اس دن بہت سے اسٹوڈنٹس نے ہماری وجہ سے تکلیف اٹھائی اور اس بات کا احساس ہمیں اس وقت نہیں ہوا تھا۔“ عیسیٰ نے وضاحت کی۔

”اٹس اوکے اور پھر ہمارا تو حساب بھی برابر ہو چکا ہے۔“ اس کی شرمندگی دیکھتے ہوئے الوینہ نے شرارت سے کہا جس پر عیسیٰ بھی مسکرانے پر مجبور ہو گیا تھا۔

واقعی وہ تو اپنا حساب بڑے اچھے طریقے سے پورا کر چکی تھی۔ دوستانہ مسکراہٹوں کا تبادلہ کرتے دونوں اپنے اپنے راستوں پر مڑ گئے۔



ان دنوں عیسیٰ کے ستارے چمک اٹھے تھے' کم از کم اسے تو یہی لگتا تھا۔ الوینہ اور اس کے درمیان ایک شناسائی سی قائم ہو گئی تھی۔ کبھی ہلکی پھلکی بات چیت ہو جاتی اور کبھی دور سے ایک دوسرے کو دیکھ کر دونوں دوستانہ انداز میں مسکرا دیتے اور عیسیٰ کے لیے یہی کافی تھا۔ اس کے لبوں پر پھیلی خوب صورت مسکراہٹ دیکھ کر ہی اس کا دل شاد ہو جاتا۔

وہ اس وقت لان میں بیٹھا آج کی کلاس میں ہونے والے ٹیسٹ کی تیاری کر رہا تھا۔ ایک کتاب ہاتھ میں تھی اور کچھ کتابیں اس کے آس پاس بکھری ہوئی

تھیں۔ قریب ہی فہد بیٹھا مصروف سے انداز میں موبائل پر گیم کھیل رہا تھا۔

"کچھ پلے پڑا ہے تو مجھے بھی بتا دے۔" فہد نے عیسیٰ سے کہا۔ نظریں ابھی بھی موبائل پر تھیں۔

"تو یہ گیم چھوڑ اور اپنی کتاب کھول' یہ کتابیں سجانے کے لیے نہیں ہوتیں۔ اگر ایک آدھ ٹاپک پڑھ لے گا تو قیامت نہیں آجائے گی نہ تیری شان گھٹے گی۔" عیسیٰ پہلے ہی مشکل ٹاپک کی وجہ سے اکتایا ہوا تھا۔ اس کے بولنے پر الٹ پڑا۔

"حوصلہ رکھ یار! ابھی تو مجھے دو ٹاپک اور پڑھنے ہیں۔" فہد نے ڈھٹائی سے کہا۔

"سہیل کہاں ہے؟"

"اسے بھوک لگ رہی تھی' عدیل لوگوں کے ساتھ کیفے گیا ہے۔" فہد نے مزے سے بتایا۔

"بس پڑھنے کے وقت تم لوگوں کے پاس سو بہانے ہوتے ہیں۔" عیسیٰ نے غصے سے کتاب بند کی۔

"اچھا ریلیکس کر' چھوڑ پڑھنا۔ اپنے سینئر تابر بھائی کے پاس چلتے ہیں۔" فہد نے موبائل بند کرتے ہوئے اسے دیکھا۔

"وہ رضا بھائی' چھوڑ یار وہ صرف لڑکیوں کو نہ نہیں کرتے۔ ہمیں تو وہ صاف منہ پر نہ کر دیں گے۔" عیسیٰ نے منہ بنایا۔

"تو ہم کون سا اکیلے جائیں گے۔ کائنات مجھ سے پوچھ رہی تھی اس ٹاپک کا' اسے ساتھ لے کر جائیں گے۔" فہد نے آنکھ دباتے ہوئے حل پیش کیا۔ عیسیٰ کے چہرے پر بھی اطمینان پھیل گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتے الوینہ اسے پکارتی ہوئی قریب آئی۔

"مجھے آپ کی ہیلپ چاہیے تھی۔" الوینہ نے بیٹھتے ہوئے اپنی کتابیں گھاس پر رکھیں۔

"پروفیسر درانی نے ایک اسائنمنٹ دی ہے' مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا اگر آپ گائیڈ کردیں۔" الوینہ نے الجھے ہوئے انداز میں کتاب کھول کر ٹاپک نکالا۔

"بالکل ٹھیک بندے کے پاس آئی ہیں آپ۔ اوہو ہو کیا اسائنمنٹ بنانا ہے یہ اعلا... تب ہی تو اتنی واہ واہ ہے اس کی۔" فہد نے توصیفی انداز میں کہتے ہوئے عیسیٰ کا کندھا تھپکا۔

اس کے لمبی چھوڑنے پر جہاں الوینہ خوش ہوئی وہیں عیسیٰ گڑبڑا گیا۔

"آپ تھوڑا بہت بتادیں۔" الوینہ نے کتاب اسے پکڑائی۔ دس منٹ اس نے الوینہ کو سمجھایا کہ اسائنمنٹ میں کیا کرنا ہے۔ اس دوران فہد اپنی گیم دوبارہ سے شروع کرچکا تھا۔

"ہماری کلاس کی کائنات سے مل لیجئے گا وہ بہت اچھی ٹپس دے گی اسائنمنٹ کے بارے میں۔" عیسیٰ نے کتاب بند کرتے ہوئے مشورہ دیا۔

"تھینک یو۔ آپ نے بہت اچھا گائیڈ کیا ورنہ مجھے خود تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔" الوینہ نے مسکراتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنی کتابیں سنبھالتی اٹھ گئی۔

"واپس آجا' چلی گئی ہے۔" فہد نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا اور اس کے کھلے ہوئے چہرے کو بغور دیکھا تھا۔



کیفے آتے ہی اپنی دوستوں کے ساتھ بیٹھی وہ اسے نظر آگئی تھی۔ بے اختیار قدم ان کی ٹیبل کی طرف اٹھ گئے۔ منہ میں اسٹرا ڈالے جوس کے گھونٹ لیتی وہ کسی بات پر سرہلا رہی تھی۔ اس کے قریب آکر سلام کرنے پر تینوں چونکیں۔ خوش دلی سے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اسے بیٹھنے کی آفر کی۔ جس پر خوش ہوتا عیسیٰ فوراً" ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"کیسی جارہی ہے۔ آپ لوگوں کی پڑھائی؟" عیسیٰ نے بات کا آغاز کیا۔

"پڑھائی کا تو بالکل نہ پوچھیں عیسیٰ بھائی! پروفیسر درانی نے جان عذاب کی ہوئی ہے۔" اریبہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"تو پھر خوش ہوجائیں۔ اگلے ہفتے سے اسپورٹس ویک شروع ہو رہا ہے اور اسپورٹس ویک میں ساری

کلاسز آف ہوتی ہیں۔ پروفیسر درانی تک کلاس نہیں لیتے۔" عیسیٰ کی بات سنتے تینوں ہی خوش ہو گئیں۔
"بڑی اچھی خبر سنائی ہے۔ کم از کم اس بورنگ روٹین سے ہٹ کر کوئی انجوائے منٹ تو ہو گی۔" الوینہ ایکسائٹمنٹ سے بولی۔ جوس ختم کر کے وہ اب پوری طرح متوجہ تھی۔
"اسپورٹس ویک میں سپورٹس کے ساتھ اور بہت سے ایونٹس ہوتے ہیں۔ آپ سب انجوائے کریں گی۔ بلکہ ہماری کلاس نے مشترکہ طور پر فیصلہ کیا ہے کہ اپنے معصوم سے جونیئرز کو ویلکم پارٹی دیں۔" عیسیٰ نے معصوم پر زور دیتے ہوئے شرارت سے کہا۔
"شکر ہے سینئرز کو بھی خیال آیا۔" اریبہ اس نئی خبر پر مزید خوش ہوئی۔
"ہم تو ویسے حساب برابر کر چکے ہیں اور....." صبا کی بات کاٹتے ہوئے الوینہ جھٹ سے بولی۔
"تو کیا ہوا' ویلکم لینا ہمارا حق ہے اور کل کو ہم بھی تو سینئرز کو فئیرویل دیں گے۔" اب وہ صبا کی پلیٹ سے چپس اٹھا کر کھا رہی تھی۔
عیسیٰ نے اسٹرا سے جوس پیتے ہوئے سر ہلایا۔
"جی ہاں' یہ تو آپ لوگوں کا پیدائشی حق ہے۔ بہرحال ایک بات بتاؤں۔" عیسیٰ نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا "پہلے سے خبردار کر رہا ہوں' ویلکم میں ہماری طرف سے چھوٹے موٹے معصوم سے مذاق ہوں گے اس لیے ذرا دل بڑا کر کے آئیے گا۔"
"لگتا ہے سینئرز ہمارے رعب میں آ گئے ہیں۔" اریبہ نے شرارت سے الوینہ کو دیکھا۔
"اچھا مذاق کریں گے تو ہم بھی انجوائے کریں گے۔" الوینہ نے شاہانہ انداز میں کہتے ہوئے چپس منہ میں رکھا۔
"عیسیٰ بھائی! اتنی خوفناک نہیں ہے الوینہ' جتنا آپ ڈر رہے ہیں۔" صبا نے اپنی دوست کی طرف داری کی۔
"یہ تو اتنا ڈر گیا ہے کہ رات کو خوابوں میں بھی آپ کی دوست کو ہی دیکھتا ہے بس پھر تمام رات ڈرتے ہی گزر جاتی ہے بے چارے کی۔"
پیچھے سے آتی فہد کی آواز پر عیسیٰ نے مڑ کر اسے گھورا۔
"اس کی باتوں پر مت جائیے گا۔ اس کی زیادہ تر باتوں کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔" اسے گھورتے ہوئے عیسیٰ نے ان تینوں سے کہا۔
"اتنا تو ہم فہد بھائی کو جان گئے ہیں' مذاق کرنے کی عادت ہے انہیں۔" اریبہ بولی۔
"لیکن اس بات کو مذاق نہیں سمجھیں۔ یہ آپ لوگوں کو خبردار کرنے ہی اس لیے آیا ہے کیا خبر الوینہ صاحبہ ہمیں وہیں گاڑ دیں۔ اب سینئرز کی بھی کوئی عزت ہے۔"
"جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" فہد کی بات ختم ہوتے ہی عیسیٰ اور الوینہ کے منہ سے ایک ساتھ یہ الفاظ نکلے تھے۔ الوینہ نے بے اختیار عیسیٰ کی طرف دیکھا تھا جو اسی کو دیکھ رہا تھا۔



اسپورٹس ویک ان کے لیے خوب ہلا گلا اور انجوائے منٹ لے کر آیا تھا۔ نا صرف اسٹوڈنٹس بلکہ کچھ پروفیسرز نے بھی گیمز میں حصہ لیا تھا۔ سینئر اور جونیئر اسٹوڈنٹس کے درمیان مختلف میچز ہوئے تھے جن میں سے کچھ سینئر اسٹوڈنٹس جیتے تھے اور کچھ میں جونیئرز کا پلڑا بھاری رہا تھا۔
لڑکے اور لڑکیوں کے میچز الگ سے ہو رہے تھے مگر سپورٹس ویک کے آخر میں دونوں طرف کے نتائج ملا کر سینئرز اور جونیئرز کے درمیان جیت کا فیصلہ ہونا تھا۔ پروفیسرز میں سے کچھ سینئرز کو سپورٹ کر رہے تھے اور کچھ نئے آنے والوں کا ساتھ دے کر ان کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ اور تو اور پروفیسر درانی کو اپنی سپورٹ کرتے دیکھ کر جونیئرز خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔
اسپورٹس کے ساتھ کچھ اور ایونٹس بھی تھے جو نئے اسٹوڈنٹس نے بہت انجوائے کیے۔ ان میں بک

فیئر' کھانے پینے کے اسٹالز' کلچرل ڈے اور مووی نائٹ شامل تھے۔ اسٹالز والے دن سینئرز کو کافی نقصان ہوا تھا کیونکہ کچھ جونیئرز ان کے اسٹالز سے خوب کھا پی کر پیسے دیے بغیر ہی پچھلا بدلہ اتار کر چلے گئے تھے۔ اور یہ کارروائی جونیئرز کے تین ٹولوں نے مل کر کی تھی۔ اس قصے کو سن کر الوینہ نے بہت انجوائے کیا بلکہ اسے تو افسوس ہوا تھا کہ اسے پہلے کیوں نہ خبر ہوئی جبکہ فہد اور عیسیٰ نے باجماعت بیٹھ کر شکر ادا کیا تھا کہ اس بار انہوں نے کوئی اسٹال نہیں لگایا تھا اور وہ بھی ٹھگ لیے جانے والے کلاس فیلوز کے سامنے جو منہ لٹکائے کافی دیر اپنے نقصان پر افسردہ رہے تھے۔

مگر یہ افسوس زیادہ دیر نہیں رہا تھا کیونکہ میچز کا فیصلہ ہو گیا تھا اور سینئرز اس بار کے اسپورٹس بک کے ونر ٹھہرے تھے۔ ٹرافی ہاتھوں میں لے کر پوری یونیورسٹی میں انہوں نے جلوس کی صورت میں چکر لگایا تھا اور جونیئرز کو خوب ہی تپایا تھا۔

آج اسپورٹس ویک کا اختتام ہو رہا تھا۔ رات کا وقت تھا مگر پوری یونیورسٹی میں ہلچل سی دکھائی دے رہی تھی۔ آج سینئرز کی طرف سے جونیئر اسٹوڈنٹس کو ویلکم پارٹی دی جا رہی تھی۔ پوری یونیورسٹی کسی دلہن کی طرح سجی سجائی' روشنیاں بکھیرتی' شان سے کھڑی گویا آنے والوں کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔

کسی کام سے باہر کی طرف آتا عیسیٰ ٹھٹک کر رکا تھا۔ سامنے سے وہ مدھم چال چلتی ارد گرد کی رونقوں کو دیکھتی چلی آ رہی تھی۔ میرون رنگ کے اسٹائلش ٹراؤزر شرٹ کے ساتھ اس نے پنک کلر کا دوپٹہ کندھوں پر پھیلا رکھا تھا۔ شرٹ اور دوپٹے پر خوب صورت کام تھا۔ دونوں کلائیوں میں چوڑیاں پہنی ہوئی تھیں۔ کانوں کے جھمکے اس کے کندھوں تک آتے خوب صورت بالوں کے ساتھ بہت جچ رہے تھے۔ لائیٹ سے میک اپ نے اس کو بہت حسین روپ بخشا تھا عیسیٰ کو اس پر سے نظر ہٹانا مشکل لگا۔

الوینہ کو اپنے قریب آتا دیکھ کر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھا۔

"کیا ماجرا ہے' آج تو جونیئرز پہچانے نہیں جا رہے۔" لب دانتوں میں دباتا وہ شرارت سے بولا۔

"اچھا میں۔ بھی یہی سوچ رہی تھی جو سینئرز کبھی منہ دھو کر نہیں آئے' آج اتنے تیار شیار۔ خیر تو ہے۔" سامنے بھی الوینہ تھی غورا" اس کی تیاری پر چوٹ کی۔ عیسیٰ بھی آج کچھ کم نہیں لگ رہا تھا۔ بلیک کلر کے تھری پیس سوٹ میں نک سک سے تیار خاصا ڈیشنگ لگ رہا تھا۔ دونوں ہاتھ پینٹ کی پاکٹ میں ڈالتا وہ اس کی حاضر جوابی پر ہنسا۔

"ہمارا تو آج تیار ہونا بنتا ہے آخر' ہم جیتے ہوئے کھلاڑی ہیں۔"

"تو بس پھر ہم بھی آپ کی خوشی میں خوش۔ اتنا تو سینئرز کا حق بنتا ہے اور کہتے ہیں نا کہ کبھی کبھی ہارنے میں بھی بڑا مزا آتا ہے۔"

"ہوں۔ صحیح کہا ہارنے کا بھی اپنا ہی مزا ہے۔ کچھ لوگوں سے ہار کر عجیب سی خوشی ہوتی ہے۔ ایسی خوشی کہ بار بار ہارنے کو دل چاہے۔" ایک جذب سے بولتا وہ اس کے خوشی سے دمکتے چہرے کو دیکھے گیا۔ اس کے جذبوں سے بے خبر وہ شوخی سے بولی۔

"اگلی بار پھر آپ لوگ ہارنے کا مزا لیجئے گا۔"

"دیکھتے ہیں ابھی ہمارا ایک سال باقی ہے۔"

"باقی سب اسٹوڈنٹس کدھر ہیں۔" الوینہ نے اکا دکا اسٹوڈنٹس کو ارد گرد پھرتے دیکھ کر پوچھا۔

"ہمارے ڈپارٹمنٹ کے اس طرف ہیں سب۔" عیسیٰ نے ہاتھ کے اشارے سے سمجھایا "اریبہ اور صبا بھی وہیں ہیں' آپ ہی کا انتظار کر رہی تھیں۔" الوینہ سرہلاتی آگے بڑھ گئی۔ اس کی نظروں نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا

☆ ☆ ☆

ہال میں داخل ہوتے ہی تازہ پھولوں کی بارش میں ان کو خوش آمدید کہا گیا تھا۔ اس شاندار استقبال پر خوش ہوتے' پھولوں کی خوشبو کو اپنے اندر سموتے جونیئرز اپنی مقرر کردہ کرسیوں کی طرف بڑھے تھے۔ کرسیوں پر بیٹھتے ہی چیں چیں کی آوازیں پورے ہال

میں گونج اٹھی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی سینئرز کی شرارتی مسکراہٹیں اور بلند قہقہے بھی سننے کو ملے تھے۔ کرسیوں کے گدوں کے نیچے سے نکلنے والے بچوں کے کھلونے جو دباؤ پڑنے پر چیں چیں کی آواز نکالتے ہیں' دیکھ کر سب ہی مسکرانے پر مجبور ہو گئے۔

فنکشن کے دوران اور بہت سی چھوٹی موٹی شرارتیں تھیں جنہیں اسٹوڈنٹس سمیت پروفیسرز نے بھی بہت انجوائے کیا تھا۔ کچھ اسٹوڈنٹس کے بارے میں پیش گوئیاں بھی کی گئی تھیں کہ یہ آنے والے سالوں میں کیا کچھ کرنے والے ہیں اور ان میں سرفہرست الوینہ کا نام تھا اور اس کے بارے میں کہا گیا تھا ممکن ہے کہ کچھ ہی عرصے میں پروفیسر درانی بھی اپنے اسٹوڈنٹس کو قابو کرنے کے لیے الوینہ کی خدمات لینا شروع ہو جائیں اور ہو سکتا ہے کچھ سالوں بعد سینئرز یہاں آئیں تو وہ وائس چانسلر کی کرسی سنبھالے بیٹھی ہو۔ اپنے بارے میں سینئرز کی ان پیش گوئیوں پر وہ مسکرا رہی تھی۔

فنکشن کے اختتام پر کھانے کا مرحلہ تھا۔ کھانے کا اہتمام ڈیپارٹمنٹ کے لان میں کیا گیا تھا۔ مزے دار کھانا کھاتے' دوستوں کے ساتھ گپیں لگاتے سب ہی مگن سے اس خوب صورت رات کو انجوائے کر رہے تھے۔ بے فکری سے ہنستے بہت سے یادگار لمحوں کو وہ اپنے دامن میں سمیٹ رہے تھے۔ کھانے کے بعد چائے پیتی الوینہ کو اچانک اپنے کلچ کا خیال آیا جو اس کے ہاتھ سے غائب تھا۔

"اوہو۔ میں اپنا کلچ ہال میں بھول آئی۔" اسے یاد آیا کہ وہ اپنی کرسی پر ہی بھول آئی تھی۔

"رکو میں ابھی آتی ہوں۔" صبا نے روکنا چاہا۔

"میں بس لے کر آتی ہوں۔ تم دونوں اپنی پلیٹ صاف کر لو۔" وہ دونوں سویٹ ڈش کھا رہی تھیں۔ ان کو وہیں چھوڑ کر وہ آگے بڑھ گئی۔

"الوینہ! آپ کہاں جا رہی ہیں؟" اپنے پیچھے عیسیٰ کی آواز سن کر وہ رکی۔

"میں ہال میں اپنا کلچ بھول گئی تھی وہی لینے جا رہی ہوں۔" اس کی طرف مڑتے ہوئے بتایا۔

"آپ رکیں' میں لاتا ہوں۔"

الوینہ نے منع کرنا چاہا۔

"کوئی مسئلہ نہیں ہے' میں لے آتا ہوں۔" نرمی سے کہتا وہ ہال کی طرف چلا گیا۔ ابھی اسے گئے چند لمحے ہی گزرے تھے کہ کائنات کو اس طرف آتے دیکھ کر وہ مسکرائی۔ کائنات بھی مسکراتی ہوئی قریب آگئی۔

"یہاں کیوں کھڑی ہو؟"

"ہال میں کلچ بھول گئی تھی وہی لینے جا رہی تھی عیسیٰ مل گئے انہوں نے کہا میں لے آتا ہوں۔" الوینہ نے بتایا۔

"میرا بھی ایک ایئر رنگ نہیں مل رہا۔ میرا خیال ہے ہال میں ہی کہیں گرا ہے۔ سوچا جا کر ایک نظر دیکھ لوں۔" اپنے دائیں کان کو چھوتے ہوئے اس نے بتایا۔

"وہ عیسیٰ بھائی آ رہے ہیں۔" سامنے دیکھتے ہوئے کائنات آگے بڑھی۔ پٹاخوں کی کان پھاڑ دینے والی آوازیں فضا میں گونجی تھیں۔ تین چار پٹاخے اکٹھے چھوڑے گئے تھے۔ الوینہ نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کائنات کو دیکھا جو یک دم جھٹکے سے نیچے گری تھی۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے الوینہ جلدی سے اس کی طرف بڑھی۔ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے الوینہ کو چھت سے قہقہوں کی آوازیں سنائی دیں۔ ایک نظر ان بدتمیز لڑکوں کو دیکھ کر اس نے کائنات کے پاؤں کا جائزہ لیا جس سے پٹاخہ چھو کر گزرا تھا اور پاؤں پر زخم چھوڑ گیا تھا۔ عیسیٰ ان کی طرف آیا۔

"کیا ہوا؟" وہ پریشان سا سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

الوینہ نے اسے سچویشن سمجھائی۔ غصہ تو اسے شدید آ رہا تھا جس پر وہ بمشکل قابو پائے ہوئے تھی۔

"کائنات! آپ ٹھیک ہیں' چل سکیں گی۔" عیسیٰ نرمی سے کائنات مخاطب ہوا۔

"جی۔ میں کوشش کرتی ہوں۔" وہ شرمندہ سی

الوینہ کا ہاتھ پکڑ کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ کائنات کو ڈھونڈتی ہوئی اس کی دوستیں اس طرف آگئیں۔
کائنات بمشکل اپنی تکلیف ضبط کرتی ان کا سہارا لے کر ان کے ساتھ چل پڑی۔
عیسیٰ نے ہاتھ میں پکڑا کلچ الوینہ کی طرف بڑھایا۔
"یہ جھمکا بھی کرسی پر پڑا ملا تو میں لے آیا۔" دوسرے ہاتھ میں پکڑا ایئر رنگ بھی الوینہ کو دکھایا۔
"یہ کائنات کا ہے۔" الوینہ نے دونوں چیزیں تھام لیں۔

"چلیں، یہاں ویسے بھی پٹاخوں کی وجہ سے کافی شور ہے۔" عیسیٰ نے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا مگر اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھتی، سامنے کا منظر دیکھ کر وہ اپنی جگہ ہی کھڑی رہی۔ اس کا کلاس فیلو اپنے دھیان میں آگے بڑھ رہا تھا کہ اپنے قریب پٹاخے کی زوردار آواز سن کر بے اختیار اس کے جسم نے جھٹکا کھایا۔ ڈر تو وہ اچانک پٹاخے کے پھٹنے سے گیا تھا مگر نیچے پڑے پتھر سے پاؤں ٹکرانے کی وجہ سے سنبھل نہ سکا اور گر پڑا۔
نیچے گرا لڑکا اب اپنی جگہ سے اٹھتا ہوا خجل سا اوپر دیکھ رہا تھا۔ ساتھ اپنے کپڑے بھی جھاڑ رہا تھا جن پر مٹی لگ چکی تھی۔
"الوینہ! چلیں" عیسیٰ نے اسے وہیں کھڑا دیکھ کر پکارا۔

الوینہ اپنے اوپر قابو پاتی مڑنے لگی۔ اسی وقت اوپر سے اس لڑکے پر پانی گرایا گیا اور فضا قہقہوں اور سیٹیوں سے گونج اٹھی۔ عیسیٰ نے بھی اس کی نظروں کے تعاقب میں یہ منظر دیکھا پھر الوینہ کے سرخ چہرے کو دیکھا جس پر واضح غصہ تھا۔ ایک اشتعال کی لہر تھی جو الوینہ کے اندر اٹھی تھی، وہ تیزی سے چھت پر جانے والی سیڑھیوں کی طرف ۔۔۔ بڑھی تھی۔ عیسیٰ بھاگ کر اس کے پیچھے گیا۔
وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ وہ غصے میں کیا کرنے جا رہی تھی۔
"الوینہ ۔۔۔ میری بات سنو ۔۔۔ کیا کرنے جا رہی ہو" تیزی سے سامنے آکر اس کا راستہ روکا۔

"دیکھا نہیں ہے آپ نے! کس قدر بدتمیز ہیں۔ پہلے ان کی وجہ سے کائنات کا پاؤں زخمی ہوا اور اب طلحہ کے ساتھ جو بدتمیزی کی ہے انہوں نے۔"
"سب دیکھا ہے میں نے، مجھے یہ بتاؤ تم کیا کرنے جا رہی ہو؟" عیسیٰ نے اس کے سرخ چہرے اور تنے ہوئے تاثرات کو دیکھا۔
"میں ان کا منہ توڑنے جا رہی ہوں۔ بدتمیز سمجھتے کیا ہیں آخر۔ کسی کی بے عزتی کرنے کا حق نہیں ہے انہیں۔"

"وہ تمہاری بات نہیں سمجھیں گے۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ وہ فائنل ایئر کے بدتمیز اور اوباش قسم کے لڑکے ہیں۔ تم میرے ساتھ چلو میں جا کر پروفیسرز سے بات کرتا ہوں وہ اس بدنظمی کا نوٹس لیں گے۔" عیسیٰ نے تحمل سے اسے سمجھانا چاہا۔
"آپ ضرور پروفیسرز سے بات کریں مگر میں بھی انہیں چار سنا کر ان کی بے عزتی کر کے ہی دم لوں گی۔ آپ ہٹیں آگے سے۔" وہ کسی طرح ماننے کو تیار نہیں تھی۔
"الوینہ! بات کو کیوں نہیں سمجھ رہیں تم، ہر کوئی باتوں سے شرمندہ نہیں ہو جاتا۔ نہ ہی اپنی غلطی مانتا ہے۔" عیسیٰ نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا ورنہ دل تو چاہ رہا تھا زبردستی بازو سے پکڑ کر یہاں سے لے جائے جو کوئی بات سمجھنے کو تیار نہیں تھی۔
"کچھ غلط ہوتا دیکھ کر میں چپ کر کے نہیں بیٹھ سکتی اور پھر بھول گئے اپنا قصہ، آپ لوگوں کو بھی میں نے غلطی کا احساس دلایا تھا، پہلے میں چپ نہیں رہی تو آج بھی نہیں رہوں گی۔ ان سب کا دماغ درست کر کے رہوں گی۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتی وہ اس کے راستہ چھوڑنے کی منتظر تھی۔
"تم ہمیں ان لڑکوں سے ملا رہی ہو، جانتی بھی ہو، وہ کس قماش کے لوگ ہیں۔" ریلنگ پر ہاتھ رکھتا وہ سلگتے لہجے میں بولا۔ کچھ تھا اس کی ضبط سے سرخ ہوتی آنکھوں میں کہ الوینہ دو قدم پیچھے ہوئی۔
"میں نے ایسا کچھ نہیں کہا مگر آپ میرے راستے

سے ہٹ جائیں۔"

"ہم واپس جا رہے ہیں ورنہ میں ادھر ہی کھڑا رہوں گا۔" عیسیٰ نے اسے نیچے چلنے کا اشارہ کیا۔

"آپ کون ہوتے ہیں میرے بارے میں فیصلہ کرنے والے۔ میں بات کیے بغیر ہرگز نہیں جاؤں گی۔"

"میں تمہیں اوپر نہیں جانے دوں گا۔" اس کا سخت لہجہ الوینہ کو مزید تپا گیا۔

"کیوں اور کیسے نہیں جانے دیں گے میں اپنی مرضی کی مالک ہوں اور میری یہ سمجھ میں نہیں آ رہا آپ کے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔"

"میں نہیں چاہتا تمہارا نقصان ہو ایسے لوگوں سے دامن بچانا ہی بہتر ہوتا ہے۔"

"نقصان میرا ہو گا نا۔ آپ کیوں میری فکر میں گھل رہے ہیں۔"

"کیونکہ محبت کرتا ہوں تم سے۔ نہیں دیکھ سکتا تمہیں ایسے اوباش لوگوں کے منہ لگتے جو لڑکی کی عزت کرنا نہیں جانتے۔" شدید اشتعال کی کیفیت میں بے اختیار اس کے منہ سے وہ سچائی نکل گئی تھی جو وہ یوں الوینہ کے سامنے کہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

الوینہ تو اپنی جگہ پتھرا سی گئی تھی۔ کچھ لمحوں بعد عیسیٰ نے اس کی بے یقین آنکھوں میں دیکھا مگر نظریں ملتے ہی وہ مڑی اور تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی۔

"الوینہ... الوینہ میری بات سنو۔ الوینہ۔" عیسیٰ بھی سیڑھیاں پھلانگتا اس کے پیچھے باہر آیا مگر آس پاس لوگوں کو دیکھ کر وہیں رک گیا۔ اگر یہاں اس کے پیچھے بھاگتا تو پتا نہیں کتنے قصے بن جاتے اپنی جگہ کھڑے بے بسی سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔



اسے ڈھونڈتا وہ یہاں تک آیا تھا۔ ڈپارٹمنٹ سے باہر جاتی سیڑھیوں پر اسے بیٹھا دیکھ کر قریب آیا۔

"منہ تو تو نے ایسے بگاڑ رکھا ہے جیسے کھانا نہ ملا ہو۔ حالانکہ میں گواہ ہوں میرے ساتھ ہی تو نے کھانا کھایا ہے۔ پھر اس افسردگی کی وجہ بیان کرنا پسند کرے گا۔" بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا فہد اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ عیسیٰ بازو گھٹنوں پر رکھے، دونوں ہاتھوں کو آپس میں باہم ملائے ان کے اوپر ٹھوڑی رکھے بیٹھا تھا۔

"نہ کر یار! موڈ نہیں ہے۔"

"اور اس موڈ شریف کو کیا ہوا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، ساری یونیورسٹی میں تو اڑتا پھر رہا تھا۔"

"یار وہ... الوینہ..."

"اچھا بھابھی جی کا مسئلہ ہے۔" اس نے لقمہ دیا۔

"وہ ناراض ہو گئی ہے۔" عیسیٰ نے بے چارگی سے کہا۔

"شاباش اور تو نے کیا کیا ہے؟" فہد نے اسے مزید بولنے پر اکسایا۔

"اظہار محبت۔" گہرا سانس لیتے ہوئے اسے بتانا پڑا۔

فہد اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ "تو نے کہہ دیا۔"

"ہاں، وہ سچویشن کچھ ایسی ہو گئی تھی میرے منہ سے نکل گیا۔" نظریں چراتے ہوئے اس نے گویا اعتراف جرم کیا۔

"پھر تیرے ساتھ کیا ہوا، یقیناً" تیری طبیعت صاف کر کے گئی ہو گی اگر تو بتانا نہ چاہے تو اور بات ہے ورنہ ایک آدھ تھپڑ تو تجھے پڑا ہی ہو گا۔" فہد نے جانچتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہی تو بتا رہا ہوں، وہ بس خاموشی سے کچھ کہے بغیر ہی چلی گئی۔" عیسیٰ پریشان سا بولا۔

"یعنی نہ تو طوفان آیا نہ بجلی کڑکی اور تو بھی صحیح سلامت بیٹھا ہے پھر مسئلہ کیا ہے، ریلیکس ہو جا۔" فہد نے اطمینان سے کہا۔

"کیسے ہو جاؤں ریلیکس، وہ تو اب میری شکل بھی دیکھنا پسند نہیں کرے گی۔" عیسیٰ نے گہرا سانس لیا۔

"بے وقوف... بدھو! تیری سمجھ میں اتنی سی بات نہیں آ رہی ہے۔" اس تعریف پر عیسیٰ نے اسے گھورا۔

"دیکھ۔ اگر اسے غصہ آتا تو وہ اسی وقت تجھے ٹھیک ٹھاک بے عزت کر دیتی۔ مطلب کچھ ری ایکشن ضرور شو کرتی۔ یوں خاموشی سے نہ جاتی اور اب جبکہ وہ خاموشی سے چلی گئی ہے تو صاف مطلب ہے کہ اس کے دل میں تیرے لیے نرم گوشہ ہے۔" فہد نے بڑے مدبرانہ انداز میں اسے سمجھایا جس پر وہ تھوڑا پُرسکون ہوا۔

"اب تو نے یہ کرنا ہے کہ خود اس سے جا کر بات کر۔ کیونکہ لڑکی جتنی بھی خود اعتماد اور بولڈ ہو' اس معاملے میں وہ پہل دوسری طرف سے چاہتی ہے اور اب تو نہ بولا تو وہ بھی کبھی نہیں بولے گی اور تو کون سا فلرٹ کر رہا ہے شادی کرنا چاہتا ہے تو ہمت کر۔ پروپوز کر دے جا کر۔" فہد نے اس کا کندھا تھپک کر حوصلہ بڑھایا۔

اور یہ فہد کا دلایا ہوا حوصلہ ہی تھا کہ وہ اگلے دن اسے تلاش کرتا ہوا لائبریری آ گیا۔ صبا اور اریبہ سے پتا چلا تھا کہ وہ لائبریری گئی ہے۔ ایک طرف بیٹھی وہ اسے نظر آ گئی تھی۔ کتاب پر نظریں جمائے وہ پڑھنے میں مگن تھی۔ انگلی سے ہلکا سا ٹیبل بجا کر اسے متوجہ کرتا وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسے دیکھ کر وہ چونکی مگر فوراً" ہی نظریں کتاب پر جما دیں۔

"میں مصروف ہوں۔" ساتھ ہی بتا بھی دیا۔

"تھوڑا سا ٹائم چاہیے۔" عیسیٰ نے سرگوشی کی۔

"اب یہاں تک آنے کی ہمت کر لی تھی تو بات تو کرنی ہی تھی..... اس کے سوالیہ نظروں سے دیکھنے پر ذہن میں الفاظ ترتیب دیتے ہوئے اس نے بات کا آغاز کیا۔

"کل کے لیے آئی ایم سوری۔ میں کچھ زیادہ ہی غصہ کر گیا۔ بعد میں مجھے اپنے لہجے کی سختی کا احساس ہوا۔ بس میں نہیں چاہتا تھا کہ تم ان جیسے لڑکوں سے جا کر بات کرو۔"

"میں بھی کچھ تلخ ہو گئی تھی۔ اس وقت اتنا شدید غصہ آ رہا تھا کہ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ تھینکس' آپ نے روک دیا ورنہ اچھی خاصی جھڑپ ہو جاتی تھی۔ بعد میں' میں نے سوچا اس پر' واقعی ہر کوئی باتوں سے نصیحت نہیں پکڑتا اور ایسے لوگوں کی درستی آسان نہیں ہوتی۔" ہلکے نیلے رنگ کے جوڑے میں' جھکی نظروں کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف کرتی وہ اسے اور بھی پیاری لگی۔

"اب یہ مت سمجھنا کہ اپنی آخری بات کے لیے بھی میں سوری کر رہا ہوں۔ یہ مانتا ہوں کہ طریقہ غلط تھا پر اپنی فیلنگز کے لیے شرمندہ نہیں ہوں۔ جب ہم پہلی بار ملے تھے تب سے یہ جذبہ میرے دل میں ہے۔" یہ اس کی نرمی کی وجہ تھی کہ وہ اتنا کچھ بول گیا تھا۔ ویسے بھی فہد نے اسے کہہ کر بھیجا تھا کہ لائبریری میں بات کرنا زیادہ آسان ہو گا۔ آہستہ آواز میں اس سے سب کہہ دینا' وہ بے چاری بھی رولز کا لحاظ کرتی اپنے آپ پر قابو رکھے گی اور یہ مشورہ اسے خاصا معقول لگا تھا مگر وہ بھول گیا تھا کہ غصے میں الوینہ کو رولز یاد کہاں رہتے تھے۔

الوینہ نے اسے گھورا "یہ آپ سے تم پر کیوں آ گئے ہیں آپ۔"

"آں۔ اب کل میں نے اتنی ہمت کر ہی لی تو سوچا اسے برقرار ہی رکھوں اور دیکھو میں تم سے بڑا ہوں۔" وہ گڑبڑایا پر جیسے ہی اپنی سنیارٹی کا خیال آیا فوراً" سنبھل گیا۔

"آپ کی بات ختم ہو گئی ہے تو میں پڑھ لوں۔" الوینہ نے نظریں جھکا کر کتاب پر مرکوز کیں۔

"کیا مطلب اور جو نئی بات شروع ہوئی ہے اس کا کیا؟" عیسیٰ حیران سا اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے خاموش دیکھ کر مزید بولا۔

"اگر تم میری بات کو' میری فیلنگز کو مذاق سمجھ رہی ہو تو یہ زیادتی ہے..... میں' میں واقعی تم سے محبت کرتا ہوں اور اس محبت کو دل سے نکال نہیں سکتا۔" دھیمے مگر مضبوط لہجے میں بولتا وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

الوینہ کی جھکی پلکوں کی لرزش' اس کا اپنے ہاتھوں کو مسلنا دیکھ کر عیسیٰ کے چہرے پر بھرپور مسکراہٹ آ گئی یعنی وہ اپنے اعتماد کو بحال کرنے کی کوشش کر رہی

تھی۔ تھی تو آخر لڑکی ہی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔ عیسیٰ نے اس کی مشکل آسان کرنا چاہی۔

"الوینہ۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟" خود کو کمپوز کرتے ہوئے پہلے اس نے اردگرد دیکھا پھر شکایتی نظروں سے عیسیٰ کو گھورا۔

"آپ مجھے لائبریری میں پرپوز کر رہے ہیں۔"

لب دانتوں میں دباتا وہ شرارت سے بولا۔ "یعنی تمہیں صرف جگہ پر اعتراض ہے پرپوزل کرنے پر نہیں۔"

"میں نے ایسا نہیں کہا۔" الوینہ بدکی۔

"تو جواب بھی تو نہیں دے رہیں۔" عیسیٰ نے بے چارگی سے کہا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی۔ عیسیٰ نے رنگ کیس ٹیبل پر رکھ کر اس کی طرف کھسکایا۔

"ول یو میری می (کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟)" اس کی کھلی حیران آنکھوں میں جھانکتا' خوب صورت لہجے میں بولتے ہوئے وہ اس کے چہرے پر دھیمی مسکان لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"بھئی میں نے سوچا آج اگر خالی خولی پرپوز کر دیا تو ساری زندگی تم سے طعنے سننے کو ملیں گے۔" شرارتی لہجے میں بولتا وہ اسے اپنا اپنا سا لگا۔ رنگ کیس اٹھا کر کھولتے ہوئے اسے ایک خیال آیا۔

"اور ہمارے گھر والے؟ ان کی مرضی کے بغیر ہم کیسے فیصلہ لے سکتے ہیں۔" جھجک کر بولتے اس کے چہرے پر پریشانی لہرائی۔

"تو ہم مل کر انہیں منالیں گے۔ یہ کوئی اتنا بڑا ایشو نہیں ہے۔ یونیورسٹی کے بعد جاب ملتے ہی میں اپنے گھر والوں کو تمہارے گھر بھیج دوں گا۔" عیسیٰ نے اطمینان سے کہا۔ وہ خوش تھا کہ الوینہ نے اس کی محبت اور پرپوزل کو قبول کر لیا تھا۔

کچھ دیر بعد لائبریرین نے آکر ان دونوں کو اتنی دیر سے بیٹھے باتیں کرتا دیکھ کر اٹھا دیا تھا اور وہ اٹھ بھی گئے تھے۔ اس دن لائبریری سے نکلتے انہوں نے طے کر لیا تھا کہ یہ بات دونوں کے بیچ میں ہی رہے گی۔ تعلیم مکمل ہوتے ہی ایک خوب صورت اور مضبوط بندھن میں بندھ جائیں گے۔

جس مرحلے کو عیسیٰ سب سے آسان سمجھے بیٹھا تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ وہی سب سے مشکل مرحلہ تھا۔



بالآخر وہ مرحلہ آن پہنچا جب عیسیٰ نے الوینہ سے شادی کی خواہش اماں ابا کے سامنے رکھی اور اب سر پکڑے بیٹھا سوچ رہا تھا کہ ایسا کون سا اعتراف جرم کر لیا ہے جس کے نتیجے میں اتنا شدید ردعمل سامنے آیا ہے۔

کمرے میں اس وقت سخت تناؤ کا عالم تھا۔ اماں بستر پر بیٹھی اپنا دوپٹہ پکڑے پھپک پھپک کر رو رہی تھیں۔ ابا بستر کے دوسری طرف براجمان تھے اور ان کے بالکل سامنے عیسیٰ کرسی پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرانی کے ساتھ ساتھ مسکینی پھیلی ہوئی تھی۔ جبکہ ابا کا چہرہ غصے کی زیادتی کی وجہ سے سرخ تھا۔ آنکھیں الگ غضب ناک سی اپنے سپوت پر جمی تھیں پچھلے دس منٹ سے وہ اسے سخت سست سنا رہے تھے۔ مگر نہ غصہ قابو میں آرہا تھا نہ ہی الفاظ کا ذخیرہ کم پڑ رہا تھا۔

"خاندان میں اتنی بچیاں ہیں اور ہم رشتہ لینے باہر غیروں میں چلے جائیں۔ ہے کوئی تک غضب خدا کا جو کام سات پشتوں میں کسی نے نہیں کیا' وہ کرنے چلے ہیں۔ نئی ریت ڈالنا چاہ رہے ہیں ماڈرن جو ہوئے ہو نہ۔" تپے ہوئے انداز میں بولتے ابا نے اپنی واسکٹ کو جھٹکا دیا۔

یہ ان کی عادت تھی غصے میں بار بار واسکٹ کو آگے سے پکڑ کر جھٹکتے جو آگے سے کھلی ہی رہتی تھی۔ ابا کے الفاظ سن کر اماں کے رونے میں مزید تیزی آگئی۔

"صاحبزادے! ہم نے آپ کو یونیورسٹی پڑھنے بھیجا تھا یا یہ کارنامہ کرنے۔" کڑی نگاہ سے دیکھتے ابا نے اس کو مزید سر جھکانے پر مجبور کر دیا۔

"ہائے ہمارا کیا بنے گا' ہمارا بڑھاپا تو ڈوب گیا۔ وہ

کرے گی ہمیں کہاں پوچھے گی۔" پہلی بار اماں نے بھی منہ کھولا۔

"عشق کا بھوت سوار ہے تمہارے بیٹے کے سر پر ' ہماری فکر تھوڑی ہے۔ کل تک میں سینہ تان کر محلے میں پھرتا تھا کہ میرے بیٹے جیسا شریف کوئی نہیں اور اس نے یہ رنگ دکھایا ہے۔ اپنی ہی بہن کا سوچ لیا ہوتا تو کچھ شرم لحاظ باقی رہ جاتا۔" ابا کسی طرح چپ ہونے میں نہیں آرہے تھے۔

"ہاں ہمیں تو جیسے محلے کی لڑکی چھیڑتا ہوا رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہوں ناں۔" عیسیٰ نے جل کر سوچا۔

"ہائے میری پھول سی بچی اس کی تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی کیا بنے گا میری بچی کا۔" اماں نے لقمہ دیا۔

عیسیٰ نے گہرا سانس لیا۔ ابا دونوں ہاتھ اٹھاتے اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے۔

"بس اگر اس گھر میں رہنا ہے تو خبردار جو آئندہ اس لڑکی کا نام لیا۔ میں اپنے گھر میں نئے رواجوں کو پروان نہیں چڑھنے دوں گا۔" فیصلہ کن انداز میں کہتے وہ باہر نکل گئے اور عیسیٰ بے چارگی سے اپنی جگہ بیٹھا سوچ رہا تھا' ماں باپ ہر چیز میں بچوں کی خوشی اور مرضی کا خیال رکھتے ہیں بس ایک شادی ہے زندگی کا سب سے اہم فیصلہ، جو ہر حال میں اپنی مرضی سے کرنا چاہتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

"ہنس لے تو ہنس سکتا ہے ایسی سچویشن کا سامنا جو نہیں کرنا پڑا تجھے۔" فہد کو بری طرح ہنستے دیکھ کر عیسیٰ بگڑا۔ وہ اپنی ہنسی کو بریک لگاتا بولا۔

"تو تو کیا سمجھے بیٹھا تھا ادھر تو الوینہ کا نام لے گا ادھر ماموں کہیں گے کہاں ہے میری بہو فوراً" مجھے اس کے پاس لے کر چلو اور ممانی جان اپنی بہو کو گلے سے لگا لیں گی۔ لالے ایسا فلموں اور ڈراموں میں ہو سکتا ہے اصل میں نہیں، بلکہ ایسے ڈرامے بھی اکا دکا ہی ہوں گے جن میں اتنی محبت نچھاور کی جائے۔"

"ہاں تو ایسی صورت حال کے بارے میں بھی نہیں سوچا تھا۔ مجھے تو لگ رہا ہے میں محلے کی لڑکی بھگا لایا ہوں، جو اماں ابا یوں بھگو بھگو کر مار رہے ہیں کہ شرم سے ڈوب مرنے کا جی چاہ رہا ہے۔" عیسیٰ کی بات پر ایک بار پھر فہد کو زور کی ہنسی آئی جس کو بمشکل دباتے ہوئے بولا۔

"لگتا ہے آخری آپشن یہی رہ جائے گا تیرے پاس۔"

"بکواس نہ کر۔ الوینہ نے یہ سن لیا نا تو جان سے مار دے گی مجھے اور پھر شادی دو دن کا کھیل نہیں ہے۔ زندگی بھر کا معاملہ ہے' دیکھا جائے تو دو فرد نہیں دو خاندانوں کا ملاپ ہے جو آنے والی نسلوں کے امین ہوتے ہیں۔" سنجیدگی سے بولتے اپنے دوست پر فہد کو پیار آیا۔ ملائمت سے اس کندھے پر ہاتھ رکھتا بولا۔

"مذاق کر رہا ہوں یار! تو اتنی ٹینشن نہ لے۔ آخر کو میری اماں حضور تیری پھوپھی حضور کس دن کام آئیں گی۔ وہ ہیں نا' سمجھائیں گی اپنے بھائی بھابی کو۔" اس کی بات سے عیسیٰ کو تھوڑا حوصلہ ہوا۔

پھر واقعی پھوپھو نے اماں ابا کو اپنی طریقے سے ہینڈل کیا تھا اور اس بات پر راضی کر لیا کہ کم از کم الوینہ کو دیکھے' اس سے ملے بغیر کوئی فیصلہ نہ کریں۔ ضروری نہیں ہے کہ بیٹے کی پسند کی گئی لڑکی بری ہی ہو۔

عیسیٰ کو تو یقین ہو گیا تھا کہ اس کی لو اسٹوری میں بہت سارے ٹوئسٹس ہیں اور اس کی وجہ اماں ابا کا الوینہ کے گھر جانا تھا۔ اماں کو تو الوینہ پہلی نظر میں ہی بھا گئی تھی بلکہ اس کی امی کا رکھ رکھاؤ دیکھ کر بھی وہ خاصی خوش تھیں۔ مگر ابا کو وہ گھرانہ ایک آنکھ نہ بھایا تھا اور اس کی وجہ الوینہ کے ابو تھے جو بچپن میں ابا کے کلاس فیلو رہ چکے تھے۔ اس وقت بھی ابا کی ان سے اَن بن رہتی تھی اسی لیے ابا کچھ اکھڑے اکھڑے سے تھے۔ جبکہ وہ پرانی باتوں کو بھلا کر بڑی اپنائیت اور عزت سے ملے تھے۔

اماں اور پھوپھو کے ووٹ کی بدولت یہ رشتہ کسی نہ کسی طرح طے پا گیا تھا۔ پر عیسیٰ کے دل کو دھڑکا ہی لگا ہوا تھا کہیں کسی مرحلے پر بنتی بات بگڑ ہی نہ جائے۔

☆ ☆ ☆

"اپنی تصویر ہی وٹس ایپ کر دو۔ وہ کیا ہے کہ میری کزنز اور بہن اپنی دلہن بھابی کو پیلے جوڑے میں دیکھنا چاہ رہی ہیں۔" شرارت سے کہتا' موبائل کان سے لگائے وہ بستر پر دراز ہو گیا۔ آج مہندی کا فنکشن تھا اور اسی کی مناسبت سے اس نے سفید شلوار کے اوپر بادامی رنگ کا کرتا پہن رکھا تھا۔

"دلہن۔" دوسری طرف پیلے اور سبز امتزاج کے خوب صورت جوڑے میں ملبوس "دلہن" چیخ اٹھی۔

"وہاں مجھے سارے کہیں دلہن کہہ کر تو مخاطب نہیں کرنے والے۔" اس کے چڑنے پر عیسٰی محظوظ ہوا۔

"بھئی' ہمارے ہاں ایک سال تک بہو کو دلہن کہہ کر ہی پکارا جاتا ہے تو اب تم سمجھ لو کہ تمہارا نام دلہن رکھ دیا گیا ہے۔"

"کیا کیا۔ میں کیوں بدلوں نام۔ نہیں بھئی اگر ایسے ہی کرنا ہے تو کل آنے کی ضرورت نہیں ہے۔" الوینہ تو اپنی جگہ سے ہی اچھل پڑی تھی۔ ساتھ ہی اپنی خفگی کا بھی اظہار کر دیا۔

عیسٰی بدمزا سا اٹھ کر بیٹھا "اچھا بس اب مذاق میں بھی ایسی بات مت کرنا پہلے ہی ہماری شادی اتنی مشکلوں سے ہو رہی ہے۔"

"پہلے آپ اپنے الفاظ واپس لیں پھر نہیں کروں گی۔" لب دانتوں میں دباتی وہ فرمائشی انداز میں بولی۔

"اوکے ہم اپنے الفاظ واپس لیتے ہیں اب تم اپنی پیاری سی تصویر بھیج دو۔"

"میں مایوں بیٹھی ہوئی ہوں اور مایوں کی دلہن کو دولہا نہیں دیکھتے۔" دولہا پر زور دیتی وہ شرارت سے مسکرائی۔

عیسٰی زیر لب مسکرایا۔ "مایوں بیٹھے دو دن ہو چکے۔ اسی لیے تو دو دن بعد کال کر رہا ہوں اور آج مایوں نہیں مہندی کا فنکشن ہے اور یہ صبا اور اریبہ کدھر ہیں اصولاً "ان کو میرا یہ کام کرنا چاہیے۔"

"صبا اور اریبہ کمرے میں نہیں ہیں اسی لیے تو میں آپ سے بات کر رہی ہوں ورنہ وہ کرنے تھوڑی دیتیں۔ وہ اب صرف آپ کو اپنی سالیوں کے روپ میں ہی نظر آئیں گی۔" الوینہ نے خبردار کیا۔

"جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔" عیسٰی نے مصنوعی افسردگی سے کہا۔

الوینہ کی کھنکتی ہوئی ہنسی کی آواز اس کے کانوں میں رس گھولتی چلی گئی۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ کل آنے دو' سب کو دیکھ لوں گا۔ تمہیں بھی جی بھر کر دیکھوں گا۔" جذب سے کہتا وہ لائن کے دوسری طرف موجود الوینہ کو آنکھیں جھکانے پر مجبور کر گیا۔

"اچھا بس اب فون بند کریں۔" اس سے پہلے کہ عیسٰی احتجاج کرتا زوردار آواز سے اس کے کمرے کا دروازہ کھولتا فہد کمرے میں آیا۔

"بعد میں بات کرتا ہوں' یہاں جو تمہارا رقیب روسیاہ ہے نا' وہ آدھمکا ہے۔" فہد کو بری طرح گھورتے ہوئے اس نے فون بند کیا۔

"یار! کیا مسئلہ ہے ہمیشہ غلط ٹائم پر تو انٹری مارتا ہے۔ اب تو اس حقیقت کو تسلیم کر لے کہ تیرا دوست شادی شدہ ہونے جا رہا ہے۔"

"زیادہ اوور ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ جتنا تو اتاولا ہوا جا رہا ہے اس سے کہیں زیادہ ہماری دعا ہے کہ تو جلد از جلد شادی شدہ ہو کر اپنی بیوی کو پیارا ہو جائے۔" اس کے شکایتی انداز پر فہد تپا۔

"ایسی کیا ایمرجنسی ہوئی ہے۔" عیسٰی نے پوچھا۔

"یار! مجھے لگ رہا ہے' کھانا کم پڑ جائے گا۔" فہد نے سنجیدگی سے بتایا۔

"ایک تو یہ ابا بھی نا۔ پہلے ان چائے سموسوں سے ڈرایا ہوا تھا۔ مجھے تو خواب میں بھی چائے سموسے نظر آنے لگے تھے اور اب یہ مسئلہ۔" عیسٰی پریشان ہوا۔

"اچھا اب ماموں کو کچھ کہنے کا فائدہ نہیں ہے۔ ابھی کھانا شروع ہونے والا ہے۔ ہم جا کر ایک دیگ اور لے آتے ہیں۔ چل' سہیل گاڑی نکال رہا ہے۔"

عیسٰی نے تشکر سے اپنے دوست جیسے بھائی کو دیکھا جو ہر مشکل میں ساتھ ہوتا تھا۔ آگے پیچھے چلتے دونوں باہر

نکلے۔ آخر جلد از جلد دیگ کا انتظام بھی تو کرنا تھا۔



"اپنے منہ کے زاویے درست کرلے۔ تجھے دیکھ کر لگ رہا ہے ہم زبردستی شادی کرانے کے لیے اٹھا لائے ہوں۔" فہد نے اس کے پریشان اور بے چین تاثرات دیکھ کر کہا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہ بارات لے کر لڑکی والوں کے ہاں پہنچے تھے۔ اور بیٹھتے ہی فہد نے اس کے تاثرات نوٹ کیے تھے۔

"یار! یہ فنکشن کب ختم ہوگا۔ ایک تو گرمی اوپر سے سخت ٹینشن ہو رہی ہے۔ بلکہ تو جاکر ابا سے پوچھ نکاح کب ہوگا۔" ٹشو سے پیشانی پونچھتا وہ نروس اور ٹینس سا تھا۔

"شرم کرلے کچھ۔ ہم کہیں بھاگے نہیں جارہے۔ ہو جائے گا ابھی نکاح بھی اور آئے کس لیے ہیں۔" فہد اپنے مخصوص مطمئن انداز میں بولا۔

"مجھے ایسی سچویشن کا سامنا کرنا پڑا تو پتا لگتا اوپر سے اس قدر گرمی میں یہ شیروانی۔" اپنے اندر کا ابال نکالتا وہ اس پر الٹ پڑا۔

"اچھا حوصلہ کر میں ماموں کو دیکھتا ہوں۔" بالآخر فہد کو اس کی حالت پر ترس آ ہی گیا۔ جون کی شدید گرمی میں شیروانی پہن کر ٹینٹ میں بیٹھنا واقعی خاصا مشکل تھا۔ فہد کے جاتے ہی اس نے سہیل کو ڈھونڈنے کے لیے نظریں دوڑائیں جو سامنے کچھ فاصلے پر کھڑا کسی بزرگ شخصیت سے خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ دل میں اسے ٹھیک ٹھاک سنا کر گھڑی پر نظر دوڑائی۔ اور فنکشن کے ختم ہونے کے وقت کا اندازہ کیا۔

سفید رنگ کی شیروانی جس پر ڈل گولڈن کام تھا اس پر خوب جچ رہی تھی۔ ساتھ میرون رنگ کی پگ تھی جو اس نے قریبی کرسی پر رکھی ہوئی تھی۔ پسینا پونچھتا وہ خود کو ریلیکس کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ کیونکہ اگر اسی طرح پھاڑ کھانے والی کیفیت میں رہتا تو یقیناً "لڑکی والوں سے ان بن ہو جانی تھی اور یوں اس کی اپنی وجہ سے کوئی مسئلہ ہو جاتا تھا جس کا اسے دھڑکا لگا ہوا تھا۔

ابھی وہ کسی حد تک ریلیکس ہوا ہی تھا کہ فہد اور سہیل تیزی سے اس کی طرف آئے۔

"یار! ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔" فہد کے منہ سے نکلنے کی دیر تھی۔ عیسیٰ جھٹکے سے کرسی پر سے اٹھا۔

"کیسا مسئلہ؟"

"تیرے ماموں نے کوئی لڑائی ڈال دی ہے۔" فہد نے بتایا۔

"ابا کدھر ہیں؟" عیسیٰ نے پریشانی سے پیشانی مسلی۔

"ماموں کو ہی ڈھونڈ رہا تھا پر ملے نہیں۔ تو تو چل اپنے ماموں کو سنبھال چل کر۔" اسے لے کر دونوں ٹینٹ کے اس حصے میں پہنچے جہاں سے مردوں کی آمدو رفت ہو رہی تھی۔ وہاں ایک طرف اچھا خاصا جمگھٹا تھا۔ جن میں عیسیٰ کی برادری کے کچھ لوگ تھے اور کچھ الوینہ کے رشتہ دار اور پریشان سے الوینہ کے ابو بھی کھڑے تھے۔ انہیں قریب کھڑا دیکھ کر ماموں متوجہ ہوئے۔ ان کے چہرے کے تاثرات بگڑے ہوئے تھے اور لہجہ تیز تھا۔

"لو عیسیٰ بھی آگیا۔ اسے بھی تو خبر ہو کہ کیسے اس کے ہونے والے سسرالیوں نے دھوکا دیا ہے؟" الوینہ کے ابو نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر ماموں کسی کو بولنے دیتے تب نا۔ اپنی برادری کے لوگوں کو انہوں نے ساتھ ملایا ہوا تھا جو ان کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ عیسیٰ ناسمجھی سے دیکھ رہا تھا۔

"آخر ہوا کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"بتا تو رہا ہوں' دھوکا دینے چلے تھے ہمیں۔ وہ تو مجھے پتا چل گیا ورنہ تم ساری زندگی بیٹھ کر اپنی قسمت کو روتے۔ یہ تو شکر کہ مجھے معلوم پڑ گیا۔ اپنی بیٹی کی دوسری شادی کرنے چلے ہیں تم سے۔"

"ہیں! یہ کب ہوا۔" فہد اور سہیل نے حیرت سے عیسیٰ کو دیکھا جو خود شاک کی سی کیفیت میں تھا۔

الوینہ کے ابو شرمندہ شرمندہ سے کچھ کہنے کے لیے آگے بڑھے مگر ماموں کی دو دھاری تلوار جیسی زبان

کے آگے کہاں ٹھہر سکتے تھے۔ وہ تو آج کسی کو بولنے نہیں دے رہے تھے۔

"یہ کیا چکر ہے تو نے مجھے بھی نہیں بتایا۔" فہد نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"مجھے کیا پتا" عیسیٰ نے حواسوں میں آتے ہوئے اپنا موبائل نکالا اور الوینہ کو کال ملائی۔ تیسری بیل پر کال ریسیو کی گئی۔

"کیا ہو گیا ہے عیسیٰ! تھوڑا تو صبر کر لیں۔" دوسری طرف سے الوینہ کی مسکراتی ہوئی آواز آئی۔

"پہلے تم مجھے یہ بتاؤ' یہ ہماری پہلی شادی ہے نا۔" بے اختیاری میں عیسیٰ کے منہ سے نکلا۔

"یہ کیسا مذاق ہے۔" الوینہ کو ہنسی آئی۔

"نہیں 'میرے کہنے کا مطلب ہے تمہاری پہلی شادی ہے نا۔ دیکھو تم سیریسلی مجھے بتا دو' میں سب ہینڈل کر لوں گا۔ بس سچ بتاؤ کہیں میٹرک 'ایف ایس سی میں کوئی نکاح' شادی یا منگنی وغیرہ تو نہیں ہوئی تھی۔" عیسیٰ نے گڑبڑاتے ہوئے بالآخر پوچھ لیا۔

"نہیں اور اگر ایسا ہوتا تو میں کیا جھوٹ بولتی۔ صاف صاف بتا دیتی۔ پر آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں۔" دوسری طرف میرون رنگ کے خوب صورت لہنگے میں ملبوس وہ شادی کے دن عیسیٰ کی طرف سے ایسے سوال پر حیران سی تھی۔

عیسیٰ کا سانس بحال ہوا۔ مختصراً" اسے معاملہ بتا کر بولا۔

"اب تم ایسا کرو نفل پڑھنا شروع کرو۔ میں ادھر سچویشن سنبھالتا ہوں۔" عیسیٰ نے موبائل بند کیا۔

دوسری طرف دلہن کا خوب صورت روپ دھارے الوینہ اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ بھلا اس حلیے میں وہ نفل کیسے پڑھے گی۔

موبائل جیب میں رکھتا وہ آگے آیا۔ ساری بات سن کر فہد بولا۔ "بس یار! یہ جو تیرے ماموں ہیں نا۔ تیری شادی اپنی صاحبزادی سے کرانا چاہتے ہیں اور یہاں تو کم از کم ہونے نہیں دیں گے۔"

"ہاں اور یہ جو بار بار ہونے والی سسرال کہہ رہے ہیں ان کے ہوتے ہوئے تو آج نہیں ہو سکتی تیری۔" سہیل نے بھی زبان کھولی۔

"ماموں! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے 'ایسا کچھ نہیں ہے۔ بس اب ختم کریں۔" عیسیٰ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہیں باز رکھنا چاہا۔

"ارے واہ! کیسے ختم کر دیں۔ لڑکی پہلے سے شادی شدہ تھی یہ بات انہیں بتانی چاہیے تھی اور میاں غلط فہمی نہیں ہوئی مجھے 'خود ٹینٹ سروس والے سے بات ہوئی ہے میری اور یہ اپنے سسر سے پوچھو نا جو چپ ہو کر کھڑے ہیں۔" ماموں نے الوینہ کے ابو پر چوٹ کی جن کو وہ خود اتنی دیر سے بولنے نہیں دے رہے تھے۔

عیسیٰ نے انکل کی طرف دیکھا جو شرمندہ سے کھڑے تھے اسے ان کے انداز پر حیرت ہوئی۔

"اور تمہارے لیے کوئی لڑکیوں کی کمی ہے۔ ایک سے ایک اچھی لڑکی مل جائے گی۔ چلو بھئی چلو ہمیں نہیں کرنی اپنے لڑکے کی شادی ان دھوکے باز لوگوں میں۔" ماموں نے مسلسل بولتے ہوئے سب کو اشارہ کیا۔

"آج سمجھ میں آیا انتشار پھیلانے والے لوگ کون ہوتے ہیں۔" فہد نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"میں بڑا شرمندہ ہوں آپ سب سے۔ یہ خالد صاحب جو ٹینٹ والے کا حوالہ دے رہے ہیں 'وہ بے چارہ تو اپنی طرف سے ٹھیک کہہ رہا تھا۔" سب ہی نے چونک کر انہیں دیکھا جو نظریں جھکائے انکشاف کر رہے تھے۔

"کس عمر میں بیٹی کی شادی کی تھی کہ اسے خود خبر نہیں۔"

فہد کے آہستہ سے بولنے پر عیسیٰ نے اسے کھا جانے والے انداز میں گھورا۔

"آپ لوگوں کو تو معلوم ہے مہنگائی کس قدر ہے۔ ہم جیسے لوگوں کی تو کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ ایسے میں شادی کے خرچے پورے کرتے کرتے میں نے اخبار میں خبر دیکھی جو کہ ٹینٹ سروس والوں کی طرف سے تھی۔ ٹینٹ کے ساتھ ساتھ وہ کھانے کا انتظام بھی کرتے ہیں

ان کی اسکیم تھی کہ دوسری شادی کرنے والوں کے لیے ایک دیگ فری۔ بس اسی چکر میں میں نے ان سے رابطہ کر لیا۔" ان کی بات سنتے کچھ لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ آئی تھی تو کچھ ان کا احساس کرتے سنجیدہ ہو گئے۔

"ہاں تو یہ کون سی شرافت ہے۔" ماموں جھٹ سے بولنا شروع ہوئے مگر پھوپھا نے ان کا ہاتھ دبا دیا۔

مگر وہ بھی اپنے نام کے ایک تھے' خاموش ہوتے ہوئے بھی ابا کو مخاطب کیا۔ "دیکھ رہے ہیں بھائی صاحب۔ ایسے خاندان میں رشتہ کریں گے اپنے بیٹے کا۔"

انہیں گھور کر عیسیٰ نے ڈرتے ڈرتے خاموش کھڑے ابا کو دیکھا جو نہایت سنجیدگی سے کھڑے تھے۔

"میں دیکھ بھی رہا ہوں اور سن بھی چکا ہوں۔ احساس بھی ہو گیا کہ اس مہنگائی کے دور میں لڑکے کا باپ ہو کر مجھے مشکلوں سے خرچے پورے کرنے پڑے ہیں تو یہ تو لڑکی کے باپ ہیں ان کے خرچے ہمارے خرچوں سے بھی زیادہ ہیں اگر انہوں نے ایسا کیا ہے تو اپنی مجبوریوں کی وجہ سے اور ہم لڑکے والوں کی وجہ سے جو جہیز اور ایسی بہت سی رسموں کو روکنے کی کوشش نہیں کرتے۔" انکل نے ممنون نظروں سے ابا کو دیکھا۔

ابا نے آگے بڑھ کر نرمی سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "میرا خیال ہے کافی وقت ہو گیا۔ اب نکاح شروع کرتے ہیں۔"

"واہ یار! ماموں تو چھا گئے آج۔" فہد نے مسکراتے ہوئے ابا کو دیکھا۔ عیسیٰ کی مسکراتی نظریں بھی ان ہی پر تھیں۔

نکاح کی سنت ادا ہوتے ہی مبارک سلامت کی آوازیں بلند ہوئیں۔ عیسیٰ بھی اٹھ کر بے اختیار خوشی سے ابا کے گلے لگ گیا۔

"ارے کیا ہو گیا ہے' اب چھوڑ بھی دے۔" ابا نے مسکراتے ہوئے خود سے چمٹے عیسیٰ سے کہا۔

"تھینک یو ابا! آپ نے سب سنبھال لیا۔"

"اچھا بس کر' میری بوڑھی ہڈیاں اتنا زور نہیں سہہ سکتیں۔" ابا کے کہنے پر عیسیٰ ان سے الگ ہوا۔

"آخر تیری خوشی تھی بھلا ہم اپنی بہو کے بغیر جا سکتے تھے۔" عیسیٰ ان کی بات پر جھینپ گیا۔

"اور پھر تیرے ولیمہ پر بھی یہی ٹینٹ سروس والے ہیں۔ تب ہی تو میں ان سے چھپتا پھر رہا تھا۔" مزے سے لب دانتوں میں دباتے وہ آگے بڑھ گئے تھے اور ان کی بات سمجھتا عیسیٰ بے اختیار ہنس پڑا۔

بھلا یہ ہو سکتا تھا کہ ایسی کوئی اسکیم ابا کی نظروں سے چھپی رہ جاتی۔ ایک بات کا احساس اسے شدت سے ہو رہا تھا کہ اس مہنگائی کے دور میں ہمیں واقعی اپنے شادی کے سسٹم کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ جس طرح ابا اور انکل نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ اسی طرح بہت سے لوگ اپنے بچوں کی شادیوں کے خرچے پورے کرنے کے لیے غلط راستہ اپنا سکتے ہیں۔ اپنی بارات کے فنکشن میں کھڑے کھڑے اس نے ایک فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر اللہ نے اس موقع دیا تو وہ اپنے بیٹے کی شادی میں ضرور ان باتوں کا خیال رکھے گا اور لڑکی والوں کو بھی اس مشکل سے بچائے گا۔

"فہد بھی تو ہے بھائیوں جیسا دوست۔" فہد کا خیال آتے ہی وہ خوش ہوا۔ بس تو پھر فہد کی شادی پر ہی اس نیک کام کا آغاز ہونا چاہیے۔ بیٹا نہ سہی بھائی ہی سہی۔ آخر اسے بھی تو سسٹم بدلنے کے لیے اپنا حصہ ڈالنا چاہیے۔

الوینہ سے یہ سب شیئر کرنے کا سوچ کر وہ خوش ہوا۔ آخر وہ اس کی شریک سفر جو بن گئی تھی۔ اسے اپنا ہم خیال بنا کر ہی وہ ایک نئی سوچ کو پروان چڑھا سکتا تھا کیونکہ ایک عورت کی سوچ نسلوں کی سوچ کو بدل سکتی ہے۔ اسٹیج پر بیٹھ کر یہ سب سوچتا وہ پہلا دولہا تھا۔

پھر سامنے سے آتی الوینہ کا حسین روپ اور شہزادیوں کی سی شان دیکھ کر عیسیٰ کے لبوں پر بھرپور مسکراہٹ پھیل گئی۔





میں اور صائمہ ایک ہی بینک میں جاب کرتے تھے۔ میں صائمہ سے سینئر تھا اور بحیثیت پی آر او اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ صائمہ بطور ٹیلی فون آپریٹر بینک میں ملازم ہوئی تھی۔ میں نے سینئر ہونے کی وجہ سے صائمہ کا بڑا خیال رکھا اور اسے بینک کے متعلق تمام امور سمجھا دیے۔ اسی بنا پر صائمہ میرا بڑا احترام کرتی تھی۔ اتفاق سے میں اور صائمہ یکساں مزاج کے حامل تھے۔ یوں میری اور صائمہ کی خوب دوستی ہوگئی۔ ہم دونوں ایک ساتھ لنچ کرتے اور شام کو ایک

سحر محمد علی



ساتھ بینک سے نکلتے تھے۔ میں صائمہ کو اسٹاپ پر چھوڑ کر پھر گھر جاتا تھا۔ میں آہستہ آہستہ صائمہ کو پسند کرنے لگا تھا۔ شاید صائمہ بھی میری محبت میں گرفتار ہو چکی تھی۔ وہ بھی مجھ سے بڑی اپنائیت سے پیش آتی تھی۔ میں صبح بینک ذرا دیر سے پہنچتا تھا۔ صائمہ مجھ سے پہلے آ جاتی تھی۔ ادھر میری امی نے مجھ پر شادی کے لیے دباؤ ڈال رکھا تھا۔ وہ اپنی بھانجی کو میرے لیے پسند کر چکی تھیں۔ میں ان کو مسلسل ٹال رہا تھا۔ مگر

اب صائمہ سے ملنے کے بعد میں بھی شادی کے لیے تیار تھا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ ابھی صائمہ شادی کے لیے قطعی تیار نہ تھی۔ وہ میرے شادی کے سوال پر ہمیشہ یہی جواب دیتی۔

"دیکھو آصف! میں ابھی شادی نہیں کر سکتی، میرے والدین بوڑھے ہیں، میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔ مجھے گھر چلانے کے لیے ابھی صرف نوکری کرنی ہے۔ شادی کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی۔"

جب میں اسے فی الحال منگنی کرنے کا بولتا تو وہ جواب دیتی۔

"رہنے دو۔ مجھے پتا ہے کہ جیسے ہی منگنی ہوگی تمہاری والدہ شادی کے لیے شور مچانا شروع کردیں گی' انہیں ویسے بھی تمہاری شادی کی بہت جلدی ہے۔"

یوں میں اب تک امی کو صائمہ کے متعلق کچھ نہ بتا سکا تھا۔ ہر رات کھانے پر امی میری شادی اور اپنی بھانجی کا ذکر لے کر بیٹھ جاتیں۔ مگر اب میں نے صائمہ سے حتمی بات کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔



اس دن جمعرات تھی جب میں صبح بینک پہنچا تو خلاف معمول صائمہ نہیں آئی تھی۔ میں کام میں مصروف ہوگیا۔ چند منٹ بعد صائمہ بھی آگئی' مگر مجھے نظرانداز کرکے اپنی سیٹ پر جا بیٹھی۔ میں اٹھ کر اس کے پاس گیا اور بولا۔

"کیا بات ہے صائمہ! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے اور آج تم مجھے شام تک ہاں یا ناں میں جواب دے دو۔"

صائمہ نے بڑی رکھائی سے کہا۔ "میں ٹھیک ہوں اور کیا جواب چاہیے آپ کو؟"

میں بولا۔ "اب انجان مت بنو۔ امی نے میری جان عذاب میں ڈالی ہوئی ہے۔ مجھے ان کو آج جواب دینا ہے۔ تم شادی کے لیے تیار ہو یا نہیں۔" یہ سن کر وہ جیسے حیران رہ گئی پھر اس نے بڑے ترش لہجے میں کہا۔

"مجھے کام کرنے دیں' پریشان مت کریں۔ اور جہاں دل چاہے شادی کرلیں۔ میرا پیچھا چھوڑ دیں۔" یہ کہہ کر وہ فون پر مصروف ہوگئی۔ میں اس کے بدلے ہوئے رویے کو دیکھ کر بہت حیران بلکہ پریشان تھا۔ دوپہر میں لنچ بھی اس نے اکیلے کیا۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا' مگر وہ اجنبی سی بن گئی تھی۔ شام کو وہ اکیلی ہی اسٹاپ پر چلی گئی۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ گھر آکر میں نے اسے فون کیا' مگر اس کا موبائل بند تھا۔ پھر میں نے کچھ سوچ کر امی سے ان کی بھانجی کے لیے ہاں کردی۔

امی خوشی سے نہال ہوگئیں۔ انہوں نے اسی وقت خالا کو فون کرکے خوش خبری سنائی اور اتوار کا دن میرے اور ارم کے نکاح کے لیے مخصوص کردیا۔

میری آنکھوں کے سامنے بار بار صائمہ کا چہرہ آجاتا تھا۔ میں اسے مسلسل فون کررہا تھا مگر اس کا موبائل فون بند تھا۔ دوسرے دن جمعہ تھا' میں نے صائمہ سے بات کرنے کی ہر ممکن کوشش کی' مگر اس نے مجھ سے بات کرنے سے انکار کردیا۔

آج بینک میں ہاف ڈے تھا۔ گھر آنے کے بعد بھی میں صائمہ کے رویے کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ آخر اسے کیا ہوگیا تھا۔ پھر میں نے اپنے دل پر پتھر رکھ ہی لیا' اتوار کی شام میرا اور ارم کا نکاح ہوگیا۔ پیر کی صبح میں سارے بینک اسٹاف کے لیے نکاح کے چھوارے اور مٹھائی لے کر گیا۔ جب میں نے صائمہ کو نکاح کا بتایا تو اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ لگتا تھا بس وہ ابھی رو پڑے گی۔ میں اس کے رویے پر پھر حیران تھا۔ دوپہر کو لنچ پر میں نے اپنے نکاح کی ساری کہانی سنائی اور اس کے رویے کی بھی شکایت کی' جس پر وہ بڑی افسردگی سے بولی۔

"آصف! غلطی میری ہے۔ جمعرات اور جمعے کو میں تو بینک آئی ہی نہیں تھی۔ ٹھہرو' میں تمہیں پوری بات بتاتی ہوں۔ اصل میں جمعے والے دن حیدر آباد میں میری سہیلی کی شادی تھی' وہ لوگ ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی حیدر آباد شفٹ ہوئے ہیں۔ میں نے حیدر آباد جانے کے لیے جب باس سے چھٹی کا کہا تو انہوں نے سختی سے منع کردیا' لیکن مجھے لازمی حیدر آباد جانا تھا۔ لہٰذا میں نے ایک ترکیب سوچی اور اپنی جڑواں بہن رائمہ کو جو بالکل میرے جیسی ہے' بینک میں اپنی جگہ بھیج دیا مگر نہ تم کو کچھ بتایا اور نہ ہی اپنی بہن رائمہ کو اور رہا موبائل تو وہ حیدر آباد پہنچتے ہی چوری ہوگیا تھا۔ لہٰذا تمہارا رابطہ مجھ سے نہیں ہوسکا۔ یہ سب میرا قصور ہے' میری اپنی غلطی ہے۔" یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔





## آؤ

آؤ تھوڑی سی دُور ساتھ چلیں
اس وقت کے آنے سے پہلے
جب خونِ جگر جم جائے گا
اور نغمۂ جاں تھم جائے گا
جب سورج کی روپہلی کرنیں
دُور کہیں کھو جائیں گی
اور بہاریں خزاں کی گود میں جا کر
چپکے سے سو جائیں گی
جب بادل امید کی دھرتی پر بن برسے
ہی اُڑ جائیں گے
اور یادوں کی وادی کے سارے رستے ہی
مُڑ جائیں گے
وہ وقت کہ جب سب خواب جلیں
اس وقت کے آنے سے پہلے
آؤ تھوڑی سی دُور ساتھ چلیں

تسنیم شریف

خیالِ یار سے اک رابطہ بھی رکھتے ہیں
شکستہ پا ہیں مگر حوصلہ بھی رکھتے ہیں

تجھے خبر ہی نہیں عرصۂ حیات میں ہم
تری جُدائی کا اک واقعہ بھی رکھتے ہیں

زمانہ اس لیے حیرت سے دیکھتا ہے کہ ہم
وجودِ سنگ میں اک آئینہ بھی رکھتے ہیں

ہے دھڑکنوں کی زباں پر بھی دسترس ان کی
فقیر لوگ دِلوں کا پتا بھی رکھتے ہیں

ہم اپنے نام کی منزل تلاش کر لیں گے
قدم بھی ساتھ ہیں اور راستہ بھی رکھتے ہیں

نثار ترابی

شگفتہ جاہ

# رنگا رنگ پھول

## رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جب تم اپنے گھر میں داخل ہو تو گھر والوں کو سلام کرو اور جب تم گھر سے باہر جاؤ تو گھر والوں کو سلام کر کے رخصت حاصل کرو۔"
(بیہقی، مشکوٰۃ)

## قاضی ایاس کی وفات،

قاضی ایاس کی وفات کا واقعہ بہت عجیب ہے ان کی عمر جب چھہتر برس کے قریب ہوئی تو انہوں نے ایک رات خواب میں اپنے والد مرحوم اور خود کو دیکھا کہ دونوں اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہیں اور ایک ساتھ چل رہے ہیں۔ دونوں میں کوئی بھی آگے پیچھے نہیں ہوتا۔ دونوں گھوڑے بالکل ساتھ ساتھ ہیں۔ دیکھ کر آنکھ کھل گئی۔

اس خواب کے چند روز بعد ایک رات وہ۔۔۔ حسب معمول بستر پر لیٹے اور گھر والوں سے کہا۔
"جانتے ہو کہ یہ کون سی رات ہے؟"
گھر والوں نے لاعلمی کا اظہار کیا اور کہا۔
"ہمیں نہیں معلوم۔"
فرمایا۔ "اس تاریخ اور اس رات کو میرے والد مرحوم کی عمر چھہتر سال پوری ہوئی تھی اور وہ اس صبح وفات پا گئے تھے۔"
یہ کہہ کر وہ سو گئے۔
جب صبح ہوئی تو گھر والے یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ وہ اپنے بستر پر مردہ پڑے ہوئے ہیں۔
(اکیس جلیل القدر تابعین۔ ص 254)

## تاریخ ساز،

یہ 1942ء کا ذکر ہے۔
ہال ہجوم اور جذبات سے بھرا ہوا تھا۔ جلسے کی رات مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے پروفیسر وائس چانسلر جناب اے، بی، اے حلیم کر رہے تھے۔ ان دنوں حلیم صاحب شعبۂ تاریخ کے صدر بھی تھے۔ وہ استقبالیہ پیش کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو وہ لوگ جو انہیں سالہا سال سے بردباری سے سنتے چلے آئے تھے، ایک درست مگر طویل اور سپاٹ تقریر سننے کے لیے تیار ہو گئے۔
حلیم صاحب نے مہمان خصوصی کو مخاطب کیا اور کہا۔
"قائد اعظم! مجھے آپ سے ایک نسبت ہے۔ میں آج کل تاریخ پڑھا رہا ہوں اور آپ آج کل تاریخ بنا رہے ہیں۔ میں تاریخ کا طالب علم ہوں اور آپ سیاست کے استاد۔"
حلیم صاحب معلم اور مقرر کی حیثیت سے خواہ کیسے بھی رہے ہوں مگر اس روز ان کی زبان سے یہ برجستہ اور برمحل جملہ نکلا اور تاریخی ہو گیا۔
(آوازِ دوست۔ مختار مسعود)

## حکمت،

ایک شخص نے کسی دانا سے کہا کہ آج فلاں شخص تیری بہت تعریف کر رہا تھا۔ دانا نے یہ سنتے ہی سر نیچے کر لیا اور اندیشے میں پڑ گیا۔ تب اس شخص نے کہا۔
"اے حکیم! تجھے کیا اندیشہ پڑا! اس نے تو کوئی بری بات نہیں کہی۔"
جواب دیا۔ "تیری بات کی مجھے کچھ فکر نہیں لیکن

میں سوچتا ہوں کہ مجھ سے کیا بے وقوفی ہوئی جو اس جاہل کو پسند آئی کیونکہ جب تک نادانی نہ ہو نادان پسند نہیں کرتا۔"

ثمرہ، اقرا۔ کراچی

## بڑے لوگ، بڑی باتیں

☆ بادشاہ وہ ہے جو اپنے دل کو اختیار میں رکھے۔
(دیوجانس کلبی)

☆ دوستوں کی نسبت دشمن کو معاف کرنا زیادہ آسان ہے۔ (ڈسوزی)

☆ اپنے آپ پر اعتماد رکھنے والے ہی فتح حاصل کرتے ہیں۔ (مل کاکس)

☆ جو شخص اپنے خلوص کی قسمیں کھائے، اس پر کبھی بھی اعتبار نہ کرو۔ (کولٹ)

☆ جو شخص زیادہ سوچنے والا ہوتا ہے وہ سب سے زیادہ صحیح کام کرسکتا ہے۔
(روز ویلٹ)

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

## وکیل

مشہور اداکار باب ہوپ کو ایک بار ایک ڈاکے کے مقدمے میں گواہ کے طور پر عدالت میں پیش ہونا پڑا۔ ڈاکو کے وکیل نے باب ہوپ کو اپنے سوالات سے ہراساں اور پریشان کرنے کی کوشش کی۔

"مسٹر ہوپ! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ڈاکا کس وقت ڈالا گیا؟"

"میرا۔ میرا خیال ہے۔" باب ہوپ نے کہنا شروع کیا۔

"عدالت کو آپ کے خیال سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میرے سوال کا جواب دیں۔ ڈاکا کس وقت ڈالا گیا تھا؟"

"مجھے ڈائریکٹ جواب کی ضرورت ہے۔" وکیل گرجا۔

باب ہوپ نے معصومیت سے اس کی طرف دیکھا۔ "آپ یہ جاننا نہیں چاہتے کہ میں کیا سمجھتا ہوں۔"

"ہرگز نہیں۔"

"پھر تو میں گواہی نہیں دے سکتا۔" باب ہوپ نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے مایوسی کے انداز میں کہا۔ "کیونکہ مجھے افسوس ہے کہ میں سوچے سمجھے بغیر نہیں بول سکتا۔"

## غلطی

ایک خوب صورت لڑکی کو دوست نے بولنے والا طوطا گفٹ کیا۔ لڑکی کو تحفے میں ملا طوطا بہت ہی پسند آیا۔ وہ بہت خوش ہوئی مگر طوطا بہت گالیاں دیتا تھا۔ لڑکی نے بہت کوشش کی کہ طوطا گالی نہ دے۔ وہ طوطے سے بہت لاڈ پیار کرتی تھی۔

ایک دن طوطا بہت ہی بدتمیزی سے گالی بکتا جا رہا تھا تو لڑکی کو غصہ آ گیا۔ اور اس نے طوطے کو فریزر میں بند کردیا۔ مگر دس سیکنڈ بعد ہی نکال لیا کہ ٹھنڈ سے مر نہ جائے۔ جیسے ہی طوطے کو باہر نکالا، طوطا لڑکی کا نام لے کر گالی دینے لگا۔

لڑکی نے غصے سے اسے پھر فریزر میں ڈال دیا۔ اب ایک منٹ بعد نکالا تو طوطا بہت سہما ہوا تھا۔ گڑگڑا کر معافی مانگ رہا تھا اور توبہ کر رہا تھا کہ آئندہ کبھی گالی نہ دے گا۔ لڑکی نے پیار سے طوطے کو سہلایا۔ طوطا بہت ڈرا سہما ہوا تھا۔

طوطا لڑکی سے بولا۔ "مجھے بتا دو، فریزر میں جو مرغی فریز پڑی ہے، اس نے کیا غلطی کی تھی؟"

## تین جھوٹ

دنیا میں تین جھوٹ ایسے ہیں جو سب سے زیادہ بولے جاتے ہیں۔

1۔ میری بیوی مجھے آج تک نہیں سمجھی۔

2۔ ہم نے رقم کا چیک ڈاک کے ذریعے روانہ کر دیا ہے۔

3۔ حکومت چاہتی ہے کہ لوگوں کے مسائل حل کرے۔

سحرش مصطفیٰ۔ میانوالی

## وصیت،

ایک جرمن ادیب نے اپنی تمام جائیداد کی وصیت اپنی بیوی کے نام لکھتے ہوئے یہ شرط لگادی کہ وہ دوسری شادی ضرور کرے گی تاکہ دنیا میں ایک آدمی تو ایسا ہو جو میرے انتقال پر خود کو انتہائی بدنصیب اور غمگین سمجھے۔

نادیہ یاسر۔ کراچی

## جواہر پارے،

- وقت کے ساتھ شکل بدل سکتی ہے مگر فطرت کبھی نہیں بدلتی۔
- جس نے زندگی میں کبھی ناکامی نہیں دیکھی، وہ کامیاب نہیں کہلاتا۔
- درود شریف پڑھنا شروع کردو، ڈپریشن ختم ہو جائے گا۔
- کلام کے پیچھے متکلم کی شخصیت ہوتی ہے۔
- ہمارا سہارا ہمارے اعمال نہیں، اس کی رحمت ہے۔

(واصف علی واصف)

نوال افضل گھمن۔ کراچی

## ہائی بلڈ پریشر،

ڈاکٹروں کے مطابق دنیا بھر میں ہر تین میں سے ایک انسان ہائی بلڈ پریشر کا شکار ہے۔ اس کے نتیجے میں کسی بھی لمحے فالج، دل کے دورے یا دماغی امراض کا حملہ ہو سکتا ہے۔

ایک تحقیق کے مطابق سات امور ایسے ہیں جن سے بلڈ پریشر کو بڑھنے سے روکا جا سکتا ہے۔ یہ سات امور درج ذیل ہیں۔

1۔ کھانے میں نمک کا اضافہ نہ کریں۔ طبی سائنس دان اس امر کی کڑی نگرانی کی ہدایت کرتے ہیں۔

2۔ ڈاکٹروں کی جانب سے ہدایت کی جاتی ہے کہ تیار کھانوں کے اجزا کو بغور دیکھنا چاہیے تاکہ اس میں نمک کا تناسب معلوم ہو سکے۔ اور گھر سے باہر کھانے پینے کی اشیاء میں اضافی نمک سے بچا جا سکے۔

3۔ ڈاکٹروں کی جانب سے یہ بھی ہدایت کی جاتی ہے کہ بلند فشارِ خون کے مریضوں کو فشارِ خون کی سطح پر مسلسل نظر رکھنی چاہیے۔ اس طرح انسان اس کی سطح میں یک دم کمی یا اضافے سے آگاہ رہتا ہے۔

4۔ خوراک میں تازہ سبزیاں اور پھلوں کے کثرت سے استعمال کے نتیجے میں فشارِ خون منظم رہتا ہے اور انسان اس کی سطح میں یک دم اضافے یا کمی سے بھی محفوظ رہتا ہے۔

5۔ ہر انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے وزن کا خیال رکھے۔ یہ بات سامنے آچکی ہے کہ زائد وزن کا بلند فشارِ خون سے بہت قریبی تعلق ہے۔

6۔ الکحل اور دیگر نشہ آور اشیا سے پرہیز کیا جائے۔

7۔ ورزش کو روزانہ کی زندگی کا معمول بنانا چاہیے۔ ورزش اور کھیلوں کی سرگرمیوں کے ذریعے فشارِ خون اور دل کو اچھی حالت میں برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

## خیال،

"میں نے سنا ہے کہ تم نے مسٹر پال سے شادی کا ارادہ ترک کر دیا ہے؟ آخر کیوں؟"

"پاپا کا خیال ہے کہ پال کو زیادہ تنخواہ نہیں ملتی اور ممی کہتی ہیں کہ ان کی عمر زیادہ ہے۔ آنٹی سوچتی ہیں کہ وہ میرے شوہر کی حیثیت سے موزوں نہیں ہے۔ انکل نے ان کے بارے میں کئی افواہیں سنی ہیں اور میری کزن قسم کھا کر کہتی ہیں کہ وہ لڑکیوں کو فریب دینے کا عادی ہے اور بس۔۔"

"ہاں ہاں، خاموش کیوں ہو گئیں؟ کیا خیال ہے تمہارا؟"

"میں سوچتی ہوں کہ اگر وہ باقاعدہ شادی کا پیغام بھیج دے تو سارے لوگوں کی زبانیں بند ہو جائیں۔"

نادیہ یاسر۔ گوجرہ



خالدہ جیلانی



مسرت الطاف احمد ـــــــ کراچی

اے جانِ داستاں تجھے آیا کبھی خیال
وہ لوگ کیا ہوئے، جو تری داستاں کے تھے
ہم تیرے آستاں پہ یہ کہنے کو آئے ہیں
وہ خاک ہو گئے جو تیرے آستاں کے تھے

نادیہ اشرف ـــــــ ملائے وٹنڈ

اک بار اُلجھنا ہے تم سے
بہت کچھ سُلجھانے کے لیے

فوزیہ ثمر بٹ ـــــــ گجرات

ہم دوستی میں درختوں کی طرح ہیں محسن
جہاں کھڑے ہوں مدتوں قائم رہتے ہیں

مہوش ڈوگر، نارا ڈوگر ـــــــ گوجرانوالہ

چھپتی نہیں ہے یہ نگہ شوق ہم نشیں
پھر اور کس طرح انہیں دیکھا کرے کوئی

تبسم شام ـــــــ آفیسرز کالونی

جو جھیل گئے ہنس کے کڑی دھوپ کے تیور
تاروں کی چھاؤں میں وہ لوگ جلے ہیں

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر ـــــــ گجرات

ایک پل ہے جو میرا عمر بھر کا حاصل ہے
کسی پل ٹھہری تھیں مجھ پہ وہ خواب خواب آنکھیں

مسز نگہت غفار ـــــــ کراچی

کبھی چاند راہوں میں بھٹک گیا کہیں چاندنی بھٹک گئی
میں چراغ وہ بھی بجھا ہوا میری رات کیسے چمک گئی
میری داستاں کا عروج تھا تیری نرم پلکوں کی چھاؤں میں
میرے ساتھ تھا تجھے جاگنا، تیری آنکھ کیسے جھپک گئی

اقصیٰ افضل للیانی ـــــــ سرگودھا

خطا وار سمجھے گی دُنیا تجھے
اب اتنی زیادہ صفائی نہ دے

ثمرہ، اقرا ـــــــ کراچی

نہیں، ہم کو شکایت اب کسی سے
بس اپنے آپ سے روٹھے ہوئے ہیں
بظاہر خوش ہیں لیکن سچ بتائیں
ہم اندر سے بہت ٹوٹے ہوئے ہیں

ثریا شاہ ـــــــ کہروڑ پکا

نہ میرے قلم سے لکھی گئی، نہ میری زباں سے ادا ہوئی
جو نظر سے کہنے کی بات ہے کسی حروف میں نہ سمائے گی
کوئی پھول چنتا ہے کس طرح، کوئی دھول ہوتا ہے کس طرح
یہ وقت وقت کی بات ہے، تجھے زندگی بتلائے گی

فریحہ شبیر ـــــــ شاہ نکڈر

یہ پہلے سوچ لو پھر اور تنہا نہ ہو جانا
اسے چھونے کی خواہش میں اسے پانے کی کوشش میں
بہت سے زخم ہیں دل میں مگر اک زخم ایسا ہے
جو جل اٹھتا ہے راتوں میں جو لو دیتا ہے بارش میں

سیدہ ثوبیا سجاد ـــــــ کہروڑ پکا

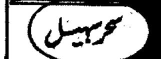
امید بن کے لوگ زندگی میں آتے ہیں
خواب بن کے آنکھوں میں سما جاتے ہیں
پہلے یقین دلاتے ہیں کہ وہ ہمارے ہیں
پھر نجانے کیوں تنہا چھوڑ جاتے ہیں

عظمیٰ شاہ ـــــــ گوجرانوالہ

ہر طرف آپ کی یاد پر لگا کے پہرہ
جی کڑا کر کے بیٹھا تھا کہ مت یاد آئیے
ناگہاں دل کسی بات پر ایسا دکھا
میں بہت رویا مجھے آپ بہت یاد آئے

# خواتین کی ڈائری

امت الصبور




کی ڈائری سے

پاکستان قدرت کا ایک معجزہ۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت۔ اس کا انعام۔ امجد اسلام امجد نے اس دن کی یاد دلائی ہے۔ جب ہمیں ایک نام، ایک پہچان ملی اور پاکستان وجود میں آیا۔

**وہ دن!**

چھیاسٹھ سال پہلے ایک دن ایسا بھی آیا تھا
جب اک سورج نکلنے پر
چمکتی دھوپ پھیلی تھی تو منظر جگمگایا تھا
اگرچہ میں نے وہ منظر بچشم خود نہیں دیکھا
مگر جب یاد کرتا ہوں تو سانسیں گنگناتی ہیں
کئی صدیوں سے صحرا میں بکھرتی ریت کی صورت
کروڑوں لوگ تھے جن کا
نہ کوئی نام لیتا تھا نہ کچھ پہچان تھی باقی
ہر اک رستے میں وحشت تھی
سبھی آنکھوں میں حسرت تھی
نہ آبادی ہنرمندی نہ اگلی شان تھی باقی
کھلا سر پر جو اس اعلان کا خوشبو بھرا سایہ
ہلالی سبز پرچم کا وہ ٹھنڈا دلربا سایہ
تو اُن کی جاں میں جان آئی
لہو میں روشنی جاگی
دہن میں پھر زباں آئی
چھیاسٹھ سال پہلے کا وہ اک احسان مت بھولو
خدا کی خاص رحمت ہے یہ پاکستان، مت بھولو




کی ڈائری سے

جلنے اور جلے جانے کی خواہش ازل سے ہی انسان کی سرشت میں رکھی گئی۔ ان ہی جذبوں کا اظہار کرتی سیف الدین سیف کی یہ غزل قارئین کی نذر۔

میری داستانِ حسرت وہ سنا سنا کے روئے
مجھے آزمانے والے مجھے آزما کے روئے

کوئی ایسا اہلِ دل ہو کہ فسانۂ محبت
میں اسے سنا کے روؤں وہ مجھے سنا کے روئے

مری آرزو کی دنیا، دلِ ناتواں کی حسرت
جسے کھو کے شادماں تھے، اسے آج پا کے روئے

تری بے وفائیوں پر، تری کج ادائیوں پر
کبھی سر جھکا کے روئے، کبھی منہ چھپا کے روئے

جو سنائی انجمن میں شبِ غم کی آپ بیتی
کئی رو کے مسکرائے، کئی مسکرا کے روئے




کی ڈائری سے

محبت، خواب، خواہش، رنگ، خوشبو اور زندگی وقت کی آندھی سب کچھ اڑا کر لے جاتی ہے۔ پھر کس کس چیز پہ افسوس کیا جائے۔ ادریس بابر کی اس غزل میں اسی حقیقت کا اظہار ہے۔

دل کا بس نام تھا، کیسا افسوس
خاک ہو جاتے ہیں دریا، افسوس

جانے کل گھر کی جگہ کیا بن جائے
صرف ویرانی پہ اتنا افسوس

پھول کچھ روز میں لوٹ آئیں گے
دل دوبارہ نہیں کھلتا افسوس

دل بھی ہے ڈوبنے والوں میں سے ایک
پھر بھی سورج کا زیادہ افسوس

## فوزیہ ثمریٹ کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر شکیب جلالی کی یہ غزل آپ سب کی نذر۔

دورِ سحر و شام سے گھبرائے ہوئے ہیں
ہم گردشِ ایام سے گھبرائے ہوئے ہیں

پابستۂ زنجیر تو رُک رُک کے چلیں گے
دشواریٔ ہر گام سے گھبرائے ہوئے ہیں

امیدِ چراغاں ہے نہ امیدِ سحر ہے
زندانی سرِ شام سے گھبرائے ہوئے ہیں

ناکردہ خطاؤں کا بھی اقرار نہ کرلیں
بے باکیٔ الزام سے گھبرائے ہوئے ہیں

ساقی کوئی ہنگامۂ زنجیر بپا کر
ہم شغلِ مے و جام سے گھبرائے ہوئے ہیں

کانٹوں کا بیاں اور ہے، کلیوں کی صدا اور
اُلجھے ہوئے پیغام سے گھبرائے ہوئے ہیں

کچھ لوگ ہیں مرعوب شکیب آپ کے فن سے
کچھ لوگ فقط نام سے گھبرائے ہوئے ہیں

## حمدہ واجد کی ڈائری سے

عہدِ حاضر کی تلخ سچائیاں جن کا تعلق براہِ راست ہماری زندگی سے ہوتا ہے۔ سامنے آتی ہیں تو جمالیاتی آہنگ سے مل کر غزل کا ایک دلکش روپ سامنے آتا ہے۔ افتخار عارف کی اس غزل میں ان ہی کیفیات کا اظہار ہے۔

سمجھ رہے ہیں اور بولنے کا یارا نہیں
جو ہم سے مل کر بچھڑ جائے وہ ہمارا نہیں

سمندروں کو بھی حیرت ہوئی کہ ڈوبتے وقت
کسی کو ہم نے مدد کے لیے پکارا نہیں

جو ہم نہیں تھے تو کون تھا سرِ بازار
جو کہہ رہا تھا کہ بکنا ہمیں گوارا نہیں

ابھی سے برف اُلجھنے لگی ہے بالوں سے
ابھی تو قرضِ مہ و سال بھی اُتارا نہیں

ہم اہلِ دل ہیں محبت کی بستیوں کے مکین
ہمارے پاس زمینوں کا گوشوارہ نہیں

## صائمہ عبدالمجید کی ڈائری سے

احساس و جذبات سے بھرے دل پل میں ٹوٹتے ہیں پل میں بکھر جاتے ہیں۔ ایسے ہی ٹوٹتے، بنتے بکھرتے جذبوں کی ترجمانی کرتی یہ نظم آپ سب بہنوں کے لیے۔

ہم تو بس حباب ہیں کچھ پل میں بکھرنے والے
پھر کسی آنکھ، کسی نیند میں آئیں گے نہیں
پھر کسی راہ، کسی موڑ پہ ہم ہوں گے نہیں
ہم تو بس گرد ہیں کچھ دیر میں چھٹ جائیں گے
ہم تو خوشبو ہیں، ہمیں رنگ نہ دینا کوئی
صرف احساس کو چھو کر گزر جانا ہے ہمیں
ہم تو آنسو ہیں بہیں گے تو نہ لوٹیں گے کبھی
ہم تو بس زخم ہیں سینے کا ہمیں بھر نا ہے
ہم وہ احساس کی بیلیں ہیں جو چھاؤں چاہیں
ہم تو بس خواب ہیں کچھ پل میں بکھرنے والے



ڈراما نگار، ڈائریکٹر

# نوید جعفری سے ملاقات

شاہین رشید

نوید جعفری کافی عرصے سے اس فیلڈ میں ہیں اور بہت کچھ ڈائریکٹ کر چکے ہیں اور لکھ بھی چکے ہیں۔ عموماً" ہمارے یہاں ڈائریکٹرز اور رائٹرز کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی۔ بس ڈراما دیکھ لیا' اچھا تھا برا تھا کے ریمارکس دیے اور بس۔ ان ڈراموں کے پیچھے جن لوگوں کی کاوشیں ہوتی ہیں انہیں بھی ضرور منظر عام پہ آنا چاہیے۔ نوید جعفری صاحب کی ڈائریکشن میں آج کل "اے پلس" سے غریب زادی آن ایئر ہے جو ناظرین میں کافی مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ ان کی تحریر اور ڈائریکشن میں "تنویر فاطمہ بی اے" لوگ آج تک نہیں بھولے۔

"جی نوید جعفری صاحب کیسے ہیں آپ؟"

"الحمد للہ۔"

"کب سے ہیں اس فیلڈ میں.... شوقیہ آئے یا حادثاتی طور پر آئے؟"

"بچپن میں تو کمرشل پائلٹ بننے کا خیال تھا۔ کیونکہ میرے ماموں پائلٹ تھے تو ان کو ہواؤں میں اڑتا دیکھ کر اور ان کا ڈریس دیکھ کر میرا بھی دل چاہتا تھا کہ میں پائلٹ بنوں پھر کرکٹ کا جنون سر پر سوار ہوا اور دل چاہا کہ کرکٹر بنوں.... پھر جب "ففٹی ففٹی" پروگرام شروع ہوا تو مجھے بھی شوق ہوا کہ اداکاری کی جائے۔ نقلیں میں بھی بڑی اچھی بنا لیتا تھا۔

تو جب اداکاری کا جنون سر پر سوار ہوا تو میں نے ٹی وی اسٹیشن آنا جانا شروع کیا.... اور یوں میرا پہلا سیریل تھا "روبوٹ" اس میں مجھے تو اداکاری کا موقع نہیں ملا۔ البتہ چھوٹے بھائی کو موقع مل گیا' کیونکہ وہ خاصا خوب صورت بچہ تھا اور ہم "ٹین ایج" میں آتے تھے۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ رائٹر اور ڈائریکٹر کی

بڑی عزت ہے اس فیلڈ میں' سب سے زیادہ رائٹر کی عزت ہے۔ چنانچہ میں نے بھی کہانیاں لکھنا شروع کردیں اور پڑھائی کے ساتھ جاب اور لکھنا بھی جاری رہا پھر میں نے اپنا بزنس بھی شروع کر دیا۔ مگر جب کراچی کے حالات برے ہوئے تو بزنس بھی ڈوب گیا .... لیکن اللہ تعالیٰ نے میرے لیے کسی اور ہی فیلڈ کا انتخاب کیا ہوا تھا۔۔۔ چنانچہ اللہ نے جو لکھنے کی صلاحیت دی ہوئی تھی' وہ کام آئی اور میں نے (ایپری کوٹ) پروڈکشن کے لیے لکھنا شروع کیا .... اور ساتھ ہی ساتھ ڈائریکشن کا کام بھی شروع کر دیا۔ اللہ برکت ڈالتا گیا اور میں کام کرتا چلا گیا۔"

"مثلاً"؟"

"اس وقت صرف پی ٹی وی ہوا کرتا تھا جب میں نے شروعات کیں خیر جب اس فیلڈ میں آیا تو متعدد ڈرامے لکھے بھی اور ڈائریکٹ بھی کیے۔ جن میں "میرے اپنے' میرے سپنے" "سپنے سہانے" "جہاں آرا بیگم" "سلسلہ چاہتوں کا" جیمز بانڈ 007" "دلوں کے رشتے" اور لاتعداد ٹیلی فلمز کیں پھر اے آر وائی سے میں نے کافی ڈرامے کیے اس میں "یاقوت" "شہزادی" کیا۔ پھر 2008ء میں' میں نے اے آر وائی چھوڑ دیا....

اس کے بعد "تنویر فاطمہ بی اے" "شدن" "تیرے پیار کے بھروسے" "جہاں آرا بیگم" جو کہ ہم ستارے چینل سے آن ایر ہوا ' "آدھے ادھورے" "نقارہ خدا" اور "وفا نا آشنا" جیسے مقبول ڈرامے کیے اور اب بہ حیثیت ڈائریکٹر کے "غریب زادی" اے پلس سے آن ایر ہے اور جو سیریل ابھی انڈر پروڈکشن ہے وہ "اے دل ناداں" ہے۔"

"اس فیلڈ میں قدرت آپ کو لے کر آئی ... کوئی ڈگری لی یا کوئی ٹریننگ لی آپ نے؟"

"اس حوالے سے کچھ نہیں پڑھا میں نے .... میں یہ ضرور کہوں گا کہ کچھ صلاحیتیں خداداد ہوتی ہیں اور ان میں ڈائریکشن اور لکھنے کی صلاحیت رب تعالیٰ نے مجھے دی اور یہی پھر میری روزی کا ذریعہ بھی بنا اور جب میں نے اس فیلڈ میں قدم رکھا تو شروع کے جو دو چار ڈرامے کیے' وہ بہ حیثیت اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے کیے تھے۔۔۔ اور کام کے دوران ہی "مرزا محمود" نے مجھے کہا کہ آپ فریمز بڑے اچھے دیکھتے بھی ہیں اور بناتے بھی ہیں۔ یعنی آپ کا ویژن بہت اچھا ہے ... اور میں جن کا کام کر رہا ہوتا تھا تو وہ مجھے کہتے تھے کہ فلاں سین آپ کرالیں تو پھر میں وہ سین مرزا صاحب کے ساتھ کرتا تھا ... تو مرزا صاحب اکثر کہتے تھے کہ آپ کا ویژن اچھا ہے آپ اس طرف توجہ دیں۔ آپ دیکھیے گا کہ ایک دن آپ بہت اچھے ڈائریکٹر ثابت ہوں گے۔ اور بہت کامیاب ہوں گے۔

تو بس اپنی خداداد صلاحیت کی بدولت میں ڈائریکشن کی فیلڈ میں آ گیا ... اور میں آپ کو بتاؤں کہ "ویژن" کا اچھا ہونا تو ضروری ہے ہی آپ کا مشاہدہ بھی وسیع ہونا چاہیے اور اچھے اچھے رائٹرز کو پڑھنا بھی بہت ضروری ہے۔ جیسے غلام عباس صاحب' سعادت حسن منٹو' واجدہ تبسم صاحبہ' راجندر سنگھ بیدی صاحب اور ان جیسے دوسرے اچھے رائٹرز کو پڑھنا بہت ضروری ہے۔ مطالعہ اور مشاہدہ وسیع ہونا بہت ضروری ہے۔



انگریزی ادیبوں کو پڑھنا بھی بہت ضروری ہے۔ شیکسپیئر، چارلس نکسن، اردو ادب میں آغا حشر کاشمیری مرزا ادیب..... یعنی ڈھیروں نام ہیں جن کو پڑھنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ بغیر مطالعہ کے مہارت نہیں آ سکتی۔"

"آج کل کے رائٹر، ڈائریکٹرز کے بارے میں کیا کہیں گے؟"

"نئے آنے والوں سے تو کچھ اچھی توقعات نہیں ہیں، کیونکہ وہ نہ پرانے لوگوں کو جانتے ہیں نہ انہوں نے ان کو پڑھا ہے اور نہ ہی نئے لوگوں کو..... ان کی اردو بھی پنجابی نما ہوتی ہے اس کو کوئی ٹھیک کرنے والا نہیں ہوتا..... تو مشاہدہ اور مطالعہ بہت ضروری ہے۔"

"شہرت کس ڈرامے نے دی اور راستے کس نے ہموار کیے؟"

"ڈرامے تو بہت کیے مگر "یاقوت" جو کہ "جن" پہ لکھی گئی کہانی تھی بہت مقبول ہوا اسے ہاشم ندیم صاحب نے لکھا تھا۔ اس کے علاوہ "تنویر فاطمہ بی اے" نے بہت زیادہ شہرت دی اور راستے بھی ہموار ہوئے، پھر "شدن" "تیرے پیار کے بھروسے" نے بھی شہرت دی۔ "تنویر فاطمہ بی اے" میں نے لکھا بھی اور ڈائریکٹ بھی کیا۔"

"رائٹرز آپ کو جو لکھ کر دیتے ہیں کیا وہ آپ من و عن ڈائریکٹ کرتے ہیں یا اس کی نوک پلک آپ خود سنوارتے ہیں؟"

"ایک ڈرامہ تھا جو ایک مشہور رائٹر کا لکھا ہوا تھا مگر اس پورے اسکرپٹ کو مجھے ادھیڑنا پڑا، بہت ساری چیزیں مجھے ٹھیک کرنا پڑیں۔ اس طرح "جہاں آراء بیگم" جو کہ ہم ستارے سے ہوا تھا اسے "سعدیہ اختر" نے لکھا تھا اور اس میں دو واقعات ایسے آ گئے تھے کہ مجھے سچویشن تبدیل کرنی پڑی۔

ایک واقعہ تو یہ ہوا کہ "ثنا شاعلی" ڈرامہ چھوڑ کر چلی گئیں اور دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ آرٹسٹ بابر خان کی مسز ثناء خان کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے وہ اپ سیٹ ہو گیا اور میں نے پھر مناسب نہیں سمجھا کہ اسے ڈرامہ مکمل کرنے کے لیے کہوں ..... وہ ڈرامہ اس وقت آن ایئر ہو چکا تھا۔ تو مجھے عبداللہ کادوانی نے فری ہینڈ دیا کہ آپ جیسے چاہیں اسے تبدیل کریں اور میں نے اسے اس انداز میں تبدیل کیا کہ کسی کو پتا بھی نہیں چلا اور یقین مانیے کہ وہ سیریل بہت ہٹ ہوا۔"

"فری لانس کام کرتے ہیں یا کسی چینل سے وابستہ ہیں؟"

"میں فری لانس کام کر رہا ہوں اور کسی بھی پروڈکشن ہاؤس کو میری خدمات کی ضرورت ہو گی تو میں حاضر ہوں۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ "غریب زادی" اے پلس سے آن ایئر ہے اور ایکسپریس انٹرٹینمنٹ کے لیے "دل نادان" کے نام سے سیریل کر رہا ہوں..... مجھے تو کام کرنا ہے۔ اچھا اور معیاری..... جو کوئی مجھے بلائے گا اور میرے پاس ڈیٹس ہوں گی تو میں ضرور کروں گا۔"

"سب چینلز بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ مگر "جیو" "ہم" اور "اے آر وائی" کے ڈرامے زیادہ پسند کیے جاتے ہیں۔ آپ نے ان کے لیے کام کیا؟"

"جیو کے لیے "تنویر فاطمہ بی اے" بہ حیثیت رائٹر اور ڈائریکٹر کے کام کیا "ہم" کے لیے "شدن" کیا جو کہ ہم ستارے سے چلا۔ اس کا رائٹر اور ڈائریکٹر میں ہی تھا۔ پی ٹی وی سے بھی میں نے کافی کام کیا..... میرے کئی ڈرامے کافی بار ریپیٹ Repeat بھی ہوئے۔ جن میں "آس" "دلوں کے رشتے" اور "ماسٹر جی" شامل ہیں۔ اسی طرح کافی ڈرامے "این ٹی ایم" سے ٹیلی کاسٹ ہوئے اور اے آر وائی میں تو باقاعدہ جاب کی 2005ء سے 2008ء تک۔ اور اس جاب میں ٹیلی فلمز ڈائریکٹ بھی کیں اور پروڈیوس بھی کیں۔ تو ماشاءاللہ میرے کریڈٹ میں کافی کام ہے۔ جو کہ بہت مقبول ہوا۔

اور آپ کو بتاؤں کہ "غریب زادی" کو "ابن آس"

لکھ رہے تھے مگر انہوں نے اپنی مصروفیات کی بنا پر معذرت کرلی ہے تو اب "51ویں" قسط سے اسے لکھوں گا بھی میں ہی اور ڈائریکٹ تو کر ہی رہا ہوں اور ہاں۔۔۔ "پری زاد" ہاشم ندیم صاحب کا ناول ہے۔ جس پہ کام ہو رہا ہے اور یہ جیو سے آن ایئر ہو گا اور اس کی کاسٹ بھی کافی بڑی ہوگی۔"

"عموماً" لوگ اس فیلڈ کو برا بھی کہتے ہیں کہ جی ماحول اچھا نہیں ہے۔ آپ بتائیں کہ کیا ایسا ہے؟"

"ایسا نہیں ہے۔ اور فیلڈ بری نہیں، وتی، اسے اچھا یا برا ہم خود بناتے ہیں اب آپ کرکٹ کو ہی لیں۔ یہ ایک گیم ہے تو کتنے کرکٹرز پہ پابندیاں بھی لگیں اور بدنامی بھی حصے میں آئی۔۔۔ تو اس میں قصور کسی کا نہیں انسان کا اپنا ہی ہوتا ہے۔ چاہے وہ کوئی بھی شعبہ ہو۔ نیت صاف ہو۔ کام کی لگن ہو ایمان داری ہو تو ہر فیلڈ اچھی ہے۔"

"نئے آنے والوں کے لیے کیا کہیں گے؟"

"نئے آنے والے امپریشن ایسا دیتے ہیں جیسے انہیں سب کچھ آتا ہے اور جب ہم ان کو موقع دیتے ہیں اور وہ کیمرے کے سامنے آتے ہیں تو ان کے پاؤں لرزنے لگتے ہیں۔ تو ایسے لوگوں کے لیے "ناپا" ہے وہاں جائیں اور سیکھیں، کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن میں واقعی خداداد صلاحیت ہوتی ہے اور وہ جلدی پک کرلیتے ہیں۔ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا لوگ سمجھتے ہیں۔ یہ مشکل کام ہے، کیونکہ ہمیں ویور کو اسکرین کے آگے بٹھانا ہوتا ہے۔ کہانی کا تاثر دینا ہوتا ہے، پیغام دینا ہوتا ہے۔ ہر چیز کو حقیقت کا رنگ دینا پڑتا ہے تب کہیں جا کر ڈرامہ بنتا ہے۔۔۔ اور تب ہی اچھا تاثر بیٹھتا ہے اور لوگ شوق سے دیکھتے ہیں، معیار ایسے ہی نہیں بن جاتے۔ بہت محنت کرنا پڑتی ہے اور الحمدللہ ہمارے ڈراموں کا معیار بہت اچھا ہے۔"

"یہ کیا چینلز کی ڈیمانڈ ہوتی ہے کہ عورت کو مظلوم دکھایا جائے؟"

"جی، اکثر و بیشتر چینلز کی ڈیمانڈ ہوتی ہے کہ عورت



کو مظلوم اور روتا دھوتا دکھائیں اور مرد کو حاوی دکھائیں اور ظلم کرتا ہوا دکھائیں۔۔۔ تو اس معاشرے میں نہ ہر عورت مظلوم ہے اور نہ ہر مرد ظالم ہے۔۔۔ مجھے خود بھی اچھا نہیں لگتا کہ میں ایسے ڈرامے بناؤں۔۔۔ کیونکہ ہمارے معاشرے کی عورت بہت بہادر ہے اور مردوں کے شانہ بشانہ کام کر رہی ہے۔"

"ڈرامے تو بہت بنا لیے۔۔۔ فلم کی طرف بھی رجحان ہے آپ کا؟"

"جی بالکل ہے اور دو کانسیپٹ بہت اچھے ہیں میرے پاس اور ان شاء اللہ بہت اچھی اور معیاری فلم بناؤں گا۔ اس کے لیے ابھی تھوڑا سا ٹائم لگے گا۔"

"آپ اپنے طور پر کچھ کہنا چاہیں گے، کیونکہ آپ کو اب ماشاء اللہ کافی ٹائم ہو گیا ہے اس فیلڈ میں؟"

"جی بالکل کہنا چاہوں گا۔ ہمارے یہاں "لابی سسٹم" بہت زیادہ ہے اور اسے ختم ہونا چاہیے۔ پروڈکشن ہاؤسز چند مخصوص چہروں کو ہی لیتے ہیں اور چند مخصوص لوگوں کے ساتھ ہی کام کرتے ہیں جبکہ کچھ لوگوں کے ساتھ بہت اچھی دوستی تھی اور ہے۔

مگر میں نے آج تک "ان کے لیے" کا کام نہیں کیا کیونکہ انہوں نے مجھے کام کا موقع ہی نہیں دیا۔

اسی طرح ایک اداکار جو میرے چھوٹے بھائیوں کی طرح تھا اور ہے پروڈکشن ہاؤس بنایا مجھے نہیں بلایا اور اس کی وجہ بھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ حالانکہ میری اس سے میٹنگ بھی ہوئی اور اس نے کہا کہ ہم مل کر کام کریں گے۔ مگر کام کے لیے کوئی کال نہیں آئی۔

تو بس یہاں "لابی سسٹم" بہت زیادہ ہے اور شاید اسی لیے ہمارے ڈراموں کا معیار نہیں رہا پہلے جیسا، یہاں اس انڈسٹری میں کچھ ایسے بھی لوگ آ گئے ہیں۔ جنہیں نہیں پتا کہ کہانی کیا ہوتی ہے' کانسپٹ کیا ہوتا ہے... ڈرامہ کیا ہوتا ہے۔"

"جو لوگ ڈگری لے کر آتے ہیں اس فیلڈ میں' ان کے لیے آپ کیا کہیں گے؟"

"دیکھیں جی! تھیوری اور پریکٹیکل میں بہت فرق ہوتا ہے... اس کی مثال یہ دی جا سکتی ہے کہ ایک پڑھا لکھا انجینئر گاڑی کو اپنے انداز میں ٹھیک کرے گا اور ایک استاد اور چھوٹا کہلانے والا بندہ جس نے اپنا گیراج کھولا ہوا ہے وہ آپ کی گاڑی کی ٹیوننگ کر کے آپ کی گاڑی کو پرفیکٹ کر دے گا۔ جبکہ وہ ان پڑھ ہوتا ہے مگر اس کے پاس کام کا تجربہ ہوتا ہے کہ اس نے پریکٹیکلی بہت کام کیا ہوا ہوتا ہے... تو جو پڑھ لکھ کر اور ڈگری لے کر آتے ہیں وہ اس طرح سے کامیاب نہیں ہوتے جو ایک مسلسل کام کرنے والا ڈائریکٹر ہوتا ہے۔ تو پھر وہ اپنی ایک طرح ویلیوز' امپورٹینس اور لابی بنا لیتے ہیں۔

تو تجربہ ہمیشہ کام کرنے سے آتا ہے۔ تھیوری پڑھ لینے سے نہیں آتا... اگر کوئی کہے کہ میں نے ڈگری لے لی ہے بس میں نے سب کچھ پا لیا تو ایسا نہیں ہے... یہ بڑا حساس قسم کا کام ہے اندر سے محسوس کر کے کرنے والا کام ہے... اپنے آپ کو کام میں گم کر کے ہی کچھ اچھی چیز منظر عام پر آتی ہے۔"

"عموماً" گھر کی مرغی دال برابر ہوتی ہے؟"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ... گھر والے اس کام کو نہیں سمجھ رہے ہوتے' ان کے فون آ رہے ہوتے ہیں کہ آپ کب گھر آئیں گے۔ کھانے پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے... عزیز رشتے بھی اسے ایزی لے رہے ہوتے ہیں... "ہاں بھئی کون سا ڈرامہ بن رہا ہے۔" کتنے مل جاتے ہیں ایک ڈرامے سے... تو اس قسم کی باتیں بھی بہت ہرٹ کرتی ہیں... حالانکہ دیکھا جائے تو اب "ڈرامہ" انڈسٹری بن گئی ہے۔ بہت کام ہو رہا ہے لوگ اچھا کما رہے ہیں۔ اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔ برانڈڈ چیزیں پہنتے ہیں... اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہمارا پڑوسی ملک سے مقابلہ ہے۔ ہمیں اچھی سے اچھی چیز پیش کر کے آگے بڑھنا ہے... اور یہ کام بہت سنجیدہ ہے۔"

"کامیاب انسان بننے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟"

"اقربا پروری سے دور رہیں۔ نیک نیتی سے کام کریں اور اچھا کام کرنے والوں کو کام کرنے کے مواقع دیں... یہ ٹھیک ہے کہ پیسوں کے معاملے میں ذرا لمبا انتظار کرنا پڑتا ہے... مگر کچھ لوگ اس معاملے میں بہت اچھے ہوتے ہیں... تو مزدور کو پسینہ خشک ہونے سے پہلے پے منٹ ہو جائے تو کیا ہی بات ہے... تو اس سلسلے میں رائٹر گلڈ بنی ہے جو اپنے اصول و قوانین واضح کریں گے۔

اسی طرح ایکٹر ایسوسی ایشن بھی اس سلسلے میں کچھ کام کر رہے ہیں... کیونکہ کئی لوگوں کی روٹی اس سے وابستہ ہے جیسے "اسپاٹ بوائے سے لے کر ہر چھوٹا بڑا آرٹسٹ اور ایک بات خاص طور پر کہنا چاہوں گا کہ آج جو آرٹسٹ "نامور" بن گئے ہیں انہیں غرور و تکبر نہیں کرنا چاہیے... کل یعنی گزرے کل میں وہ بھی کام کے لیے ترستے تھے' لہٰذا اپنے سے کم عہدے پہ کام کرنے والوں کی بھی عزت کریں' وقت کی پابندی کا بھی خیال رکھیں اور انسان کو انسان سمجھیں۔ قرآن پاک میں بھی انسانیت پہ بہت زور دیا گیا ہے۔"

باتیں بہت تھیں مگر جگہ کی کمی آڑے آئی... ہم نے نوید جعفری صاحب سے اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔

# خبریں و بریں

واصفہ سہیل



گزشتہ دنوں پروجیکٹ غازی کا پریمیئر شو دیکھنے کے بعد ہمایوں سعید بہت ناراض اور غصے میں تھے۔ انہوں نے باہر نکلتے ہی آئی ایس پی آر والوں کو جنہوں نے اس فلم کی تیاری میں ان کی معاونت کی ہے' بتایا کہ فلم فی الحال ریلیز نہیں ہو سکتی کیوں کہ اس میں رفوگری کا بہت کام ہے (تو پہلے سے نہیں پتا تھا کیا جو ...؟) ہمایوں سعید کا کہنا ہے کہ فلم کی پروڈکشن ٹیم پر جلد از جلد فلم ریلیز کرنے کا پریشر تھا۔ (کس کا...؟) اس لیے یہ سب کام عجلت میں ہوئے۔ (جلدی کا کام شیطان کا) پھر پروڈیوسر علی رضا کی ناتجربہ کاری بھی معاملات کو ٹھیک کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنی (علی رضا! یہ ہم نہیں کہہ رہے) ہمایوں سعید نے مزید کہا کہ پریمیر کی رات جب میں نے یہ فلم دیکھی تو فیصلہ کیا کہ اسے ابھی ریلیز نہیں کرنا چاہیے (یعنی آپ نے فلم دیکھنے کی زحمت پریمیر کے موقع پر کی۔ واہ) اس میں ایڈیٹنگ کے اتنے مسئلے ہیں اور پھر آڈیو کے مسائل کی



## سفارش

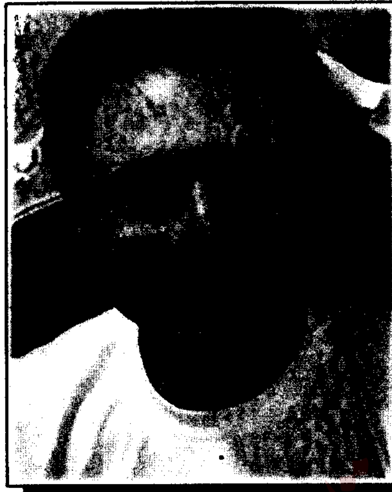
علی ظفر کے بھائی دانیال ظفر اپنے کیریر کا آغاز کوک اسٹوڈیو سے کر رہے ہیں۔ کسی بھی نئے فنکار کو لانچنگ کے لیے کوک اسٹوڈیو کا پلیٹ فارم میسر نہیں آسکتا (وہاں تو وڈے وڈوں کو موقع نہیں ملتا بس.... تعلقات ہونے چاہیں۔ بھئی کرتا دھرتاؤں سے اور کس سے؟) مومنہ مستحسن کے ساتھ ان کا دوگانا منظر عام پر آئے گا۔ دانیال اس بارے میں کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے آپ کو کوک اسٹوڈیو کے ذریعے اس لیے متعارف کروایا کیونکہ یہ ایک بڑا پلیٹ فارم ہے (جی جی۔ آپ کی سفارش بھی بہت بڑی ہے۔ آخر آپ....؟) اور یہاں سے آپ اپنی آواز کو کروڑوں شائقین تک آسانی کے ساتھ پہنچا سکتے ہیں۔ (جی اور آسانی سے بھلا بھی دیتے ہیں۔ بھئی اگر اچھی نہ ہو تو.... آواز....)

## دیر کر دیتا ہوں

وجہ سے فلم میری سمجھ میں نہیں آرہی تو عام فلم بین اسے دیکھنے سینما میں کیوں آئیں گے۔ (کاش پہلے اس پر توجہ دے لیتے تو.....؟)

## سحر

سائرہ شہروز ٹی وی اسکرین سے فلم کی اسکرین تک پہنچ گئی ہیں اور آج کل فلم کے پردے پر جگمگا رہی ہیں۔ سائرہ اس بارے میں کہتی ہیں کہ جس قسم کی فلمیں بن رہی تھیں (کس قسم کی؟) ان کو دیکھتے ہوئے فلم سائن کرنا آسان نہیں تھا۔ (تو کس نے کہا تھا کہ ضرور کرو.....؟) مگر پھر میں نے سوچا کہ (ابھی کام مل رہا ہے تو لے لو ورنہ کس نے پوچھنا ہے۔ ہے نا؟) ہماری فلم انڈسٹری ابھی ترقی کی راہوں پہ چل رہی ہے (ہیں ..... کیا چل رہی ہے؟ بھائی کوشش کر رہی ہے ابھی تو کھڑے ہونے کی.....؟) ہم سارا الزام فلم سازوں کو نہیں دے سکتے (جی جی! اداکاروں کا بھی بہت ہاتھ ہوتا ہے) اب فلم بینوں کو بھی سوچنا ہوگا (فلم بین سوچتے بھی ہیں.....؟) اور فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ ہولی وڈ اور بولی وڈ کی فلموں کے چربے ہی دیکھنا چاہتے ہیں (اف ہالی وڈ ..... اور بالی وڈ..... چربے..... کیا بات کر رہی ہیں سائرہ!) یا



انہیں نیا کام بھی دیکھنا ہے (نیا..... کام..... آہم ہم.....؟) اگر فلم بین ساتھ رہیں تب ہی ہم بولی وڈ کی فلموں کے سحر سے نکلنے کا رسک لے سکیں گے۔ (پہلے ہمارے اداکار تو اس سحر سے باہر آجائیں جو بولی وڈ میں کام کرنے کو تڑپتے ہیں اور نہیں ملتا تو بھاشن دیتے ہیں پھر فلم بین بھی آجائیں گے۔ بھئی باہر اور کہاں۔)

## کام

نعیم طاہر کے بیٹے علی طاہر کا ڈرامے کے زوال کے بارے میں کہنا ہے کہ "لکھنا تنزل کا شکار ہو رہا ہے۔ ڈرامے یکسانیت کا شکار ہیں۔ میں نے جب بھی کوئی نیا آئیڈیا دیا 'ری جیکٹ ہوگیا۔ (سمجھ میں نہیں آیا ہوگا) تجربات نہیں کریں گے تو آگے کیسے بڑھیں گے۔ (آگے تو ہم بہت بڑھ گئے ہیں علی! لیکن۔ تنزلی میں۔ ڈرامے نے ترقی تو کی ہے مگر.....؟) اچھے رائٹر آج بھی ہیں مگر ان سے صحیح کام نہیں لیا جا رہا۔

## سکون

عالمی شہرت یافتہ موسیقار اے آر رحمٰن کو موسیقی سے وابستہ ہوئے پچیس سال گزر چکے ہیں۔ اس عرصے میں انہوں نے خوب نام کمایا اور بہت ساری



کامیابیاں حاصل کیں۔ اے آر رحمن اپنی زندگی کے بارے میں کہتے ہیں کہ "ان کے مذہبی عقائد نے جینے کی راہ متعین کی۔ جس کی بدولت وہ آج اس مقام تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ اے آر رحمن صوفی ازم پر یقین رکھتے ہیں اور سادگی کو ترجیح دینے کے قائل ہیں۔

## خوش فہمی

گزشتہ دنوں فہد مصطفیٰ نے متنازع بیان دیا کہ "میں واحد پاکستانی اداکار ہوں جو کہ خود کو بھارت میں نہ منوانے کے باوجود بے انتہا مقبول ہوں۔" (ہائیں فہد! کیا ہوا؟ زیادہ تھک گئے غالباً"۔ لگتا ہے کچھ دن آرام کرنا ہے) اداکار شان نے بڑا اداکار ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے کہا کہ "فہد! آپ اچھا کام کر رہے ہیں ۔اپنا سر جھکا کر رکھیں۔ (بالکل...!) اور اپنے کام پر توجہ دیں (جی) اور لوگوں کو بات کرنے دیں۔ (خود نہ بڑھکیں ماریں) جیسا کہ آپ نے کہا ہے کہ اچیومنٹس بہت جلدی پرانی ہو جاتی ہیں۔ سخت محنت کریں۔ کیوں کہ ابھی آپ نے صرف دو فلموں میں کام کیا ہے۔ (آگے کا کچھ نہیں پتا) اپنی قربانیوں کو سراہنے سے پہلے دوسروں کی قربانیوں کی بھی قدر کریں۔ بہت سے بہترین اداکار کبھی بھارت نہیں گئے۔ یہ قوم آپ کے جوش اور کام سے پیار کرتی ہے۔ آپ کے الفاظ سے نہیں۔ (اور اتنے بڑے الفاظ...؟) ہاں آپ اکیلے ایسے اداکار ہیں جو کہ ایک ٹی وی گیم شو اور فلمیں ساتھ کر رہے ہیں۔ (فیصل قریشی بھی مارننگ شو اور ڈرامے ساتھ کر رہے ہیں اور شاید فلم بھی) سخت محنت جاری رکھیں۔ فلموں کا کوئی ریٹنگ میٹر نہیں ہوتا۔ ہر جمعہ ایک ٹیسٹ ہوتا ہے۔" (گڈ شان! آپ نے ایک سنجیدہ سینئر اور سمجھدار اداکار ہونے کا ثبوت دیا ہے۔)

## ادھر ادھر سے

☆ جب سویلین حکومتوں کو چلتا کیا جاتا ہے تو عظیم واقعات پیش آتے ہیں۔ 1950ء کی دہائی کا سویلین سرکس ختم ہوتے ہی ملک عظمت کی راہ پر گامزن ہو گیا۔ بھٹو کو پھانسی کے تختے پر لٹکانے سے پاک سرزمین رشک خورشید بن گئی نواز شریف اور بے نظیر کو ملک سے نکالا گیا تو کامیابی اس سرزمین کا مقدر بن گئی۔ جب نواز شریف رخصت ہوں گے تو تاریخ خود کو دہرائے گی اور یہ دھرتی گلابوں کی خوشبو سے مہک اٹھے گی۔

(سید طلعت حسین)

☆ جو کوئی اپنی آزادی کی حفاظت نہ کر سکتا ہو یا ذہنی غلامی میں پختہ ہو جائے چاہے وہ کوئی پرندہ ہو یا کوئی قوم اس کے مقدروں میں غلامی یا ذبح ہونا لکھ دیا جاتا ہے۔

(عطاالحق قاسمی۔ روزن دیوار سے)

☆ عبدالقادر بیدل نے کہا تھا۔ اے بیدل! اگر تو عزت چاہتا ہے تو طمع ترک کردے۔ یہ دونوں صورتیں ایک آئینے میں اکٹھی نہیں ہوتیں لیکن ہم ہیں کہ ایک ہی آئینے میں لالچ، ظلم، بے دینی اور عزت کی تصاویر ساتھ دیکھنا چاہتے ہیں۔ بے سوال، بے حساب اور بے عذاب اور ایسا نہ ہو سکے تو رب سے گلہ کرتے ہیں کہ ہم وفادار نہیں تو بھی دلدار نہیں۔

(وقائع نگار خصوصی۔ امت)

☆ معروف دانش ور سونل ڈیسائی کہتی ہیں کہ بیشتر انڈین والدین اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بیٹوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہیں گے۔ بیٹے کے لیے بیوی کے انتخاب کا معاملہ ماں باپ اس لیے اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں کہ انہیں اندازہ ہے کہ انہیں بیٹے کے ساتھ ساتھ بہو کے ساتھ بھی زندگی بسر کرنی ہے۔ اگر لڑکی ان کی پسند کی ہوگی تو زیادہ آسانی رہے گی 'وہ خیال بھی رکھے گی اور اچھا کھلائے گی بھی۔

(مہرجان انڈیا۔ اکانومسٹ)



# آپ کا باورچی خانہ

شاہدہ ظفر

کھانا تو سب ہی خواتین بناتی ہیں لیکن امور خانہ داری میں سب ہی طاق نہیں ہوتیں۔ گھر والوں کا دل جیتنے کے لیے جہاں دوسری خوبیوں کا ہونا ضروری ہے۔ وہیں کھانا پکانے میں مہارت رکھنا سونے پہ سہاگہ کا کام کرتا ہے کیونکہ اپنی اب تک گزاری ازدواجی زندگی میں اتنا اندازہ ہو گیا کہ جس دن عام روٹین سے ہٹ کر کھانے پر خصوصی ڈشز کا اہتمام کروں۔ میاں صاحب کے موڈ پر خاطر خواہ اثر ہوتا ہے۔ بس جناب ہم بھی متفق ہیں اس بات پر کہ دل کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے۔

س : کھانا پکاتے ہوئے غذائیت کا کتنا خیال رکھتی ہیں؟

ج : کھانا بناتے ہوئے یہی کوشش ہوتی ہے کہ غذائیت کے ساتھ ساتھ ذائقہ بھی ہو۔ لہٰذا ثابت مسالے سل بٹے پر پیس کر استعمال کرتی ہوں کیونکہ پسی اشیاء ملاوٹ سے پاک ہوں ممکن نہیں۔

س : کھانے کا وقت ہے اچانک مہمان آگئے ہیں۔ کوئی ڈش جو فوری تیار ہو سکے؟

ج : موبائل سسٹم نے بہت آسانیاں پیدا کر دیں لہٰذا مہمان بغیر اطلاع کے نہیں آتے۔ اگر آ بھی جائیں تو ہم میٹھے میں سویوں کا زردہ اور ساتھ میں پالک چکن کا قورمہ تیار کرتے ہیں جو کہ جلد بن جاتا ہے۔

## پالک چکن کا قورمہ

ضروری اشیاء :

| | |
|---|---|
| چکن | 1 کلو |
| پالک | آدھا کلو |
| دہی | ایک پیالی |
| لہسن ادرک | ایک کھانے کا چمچہ (پسا ہوا) |
| نمک مرچ | حسب ذائقہ |
| جائفل | ایک عدد |
| جاوتری | ایک چوتھائی چمچہ |
| گرم مسالا | آدھا چمچہ |
| تیل یا گھی | ایک پیالی |

ترکیب :

سب سے پہلے پالک کے پتے کاٹ کر بوائل کر لیں اور نچوڑ کر سل پر پیس لیں۔ دیگچی میں گھی ڈالیں اور چکن دھو کر گھی میں ہلکا براؤن تل لیں۔ چکن نکال کر مزید گھی ڈالیں۔ پسے گرم مسالے کے علاوہ تمام مسالا ڈال کر بھونیں۔ جب بھننے لگے تو پسا ہوا پالک اور چکن بھی شامل کر دیں۔

تھوڑا سا مزید پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ جب پانی خشک ہو جائے اور گھی اوپر آ جائے تو پسا ہوا گرم مسالا ڈالیں اور دیگچی چولھے سے اتار لیں۔ گرم گرم چپاتی کے ساتھ نوش فرمائیں۔

س : کچن کی صفائی کے لیے کیا اہتمام کرتی ہیں؟

ج : کچن میں چیزوں اور برتنوں کے پھیلاؤ سے سخت الجھن ہوتی ہے۔ لہٰذا ساتھ ساتھ برتن دھو کر رکھتی ہوں اور مسالا جات کے ڈبے ان کی بنائی جگہ پر۔ کیونکہ ہمارا کچن شیلف اور کیبنٹ سے مبرا مگر صفائی اور سلیقہ مندی سادہ سی چیز کو بھی چار چاند لگا دیتی ہے۔

س : ناشتے میں کیا بناتی ہیں۔ کوئی ایسی چیز جو آپ بہت اچھی بناتی ہیں؟

ج : ناشتے میں کچے کیک، بسکٹ جیم سلائس وغیرہ کھاتے ہیں۔ بڑے سالن کے ساتھ پراٹھا یا انڈہ وغیرہ استعمال کرتے ہیں لیکن اتوار کو دیر سے اور بھرپور ناشتہ کرتے ہیں۔ جس میں حلوہ پوری، مولی اور آلو کے

پراٹھے کے علاوہ دہی کچوری اور بتھوے کے پراٹھے شوق سے کھاتے ہیں۔

## بتھوے کے پراٹھے

ضروری اجزا :

| | |
|---|---|
| بتھوا | ایک کلو |
| بیسن | ایک پاؤ |
| ثابت دھنیا | ایک چمچہ |
| ٹماٹر | ایک عدد |
| لہسن | پانچ جوئے |
| آٹا | تین پاؤ |
| نمک مرچ | حسب ذائقہ |

ترکیب :

سب سے پہلے بتھوے کے پتے توڑلیں اور بوائل کر کے سل پر پیس لیں۔ ٹماٹر لہسن اور دھنیا مرچ اور نمک چٹنی کی طرح پیس لیں اور آٹے میں بیسن اور تمام مسالے یکجان کر کے گوندھ لیں اور روٹی کی طرح بیل کر توے پر پراٹھے کی طرح تل لیں۔ دہی یا املی کی چٹنی کے ساتھ کھائیں۔ ذائقے سے لطف اٹھائیں اور سردی سے بچیں کیونکہ بتھوا خاصا گرم ہے۔

## دہی کچوری

ضروری اجزا :

| | |
|---|---|
| دہی | ایک پاؤ |
| میدہ | ڈیڑھ پاؤ |
| میٹھا سوڈا | ایک چٹکی |
| چینی | ایک پاؤ |
| گھی | ایک پاؤ |

ترکیب :

دہی میں چینی ملا کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ چینی یکجان ہو جائے۔ اب اس میں میدہ شامل کریں اگر آمیزہ پتلا ہو تو مزید میدہ ڈالیں۔ اب چھوٹے چھوٹے پیڑے بنائیں اور بیل کر پوری کی طرح تل لیں۔

مزیدار کھٹی میٹھی کچوریاں تیار ہیں۔

س : مہینے میں کتنی بار باہر کھانا کھاتی ہیں؟

ج : گھر سے باہر کھانا کھانے کا رواج بالکل نہیں۔ جو کچھ کھانا ہو فرمائش کرنے پر میاں صاحب گھر ہی لے آتے ہیں۔

س : ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کا خیال رکھتی ہیں؟

ج : موسم کی مناسبت سے کھانا موسم کا لطف دوبالا کر دیتا ہے۔ گرمیوں میں کئی قسم کی چٹنیوں کے علاوہ کیری اور کچے ٹماٹر کا اچار۔ آلو، چٹھے اور کدو کا رائتہ اکثر ہی دسترخوان کی زینت ہوتا ہے اور سردیوں میں بیسن کا حلوہ، باجرے کی میٹھی کھچڑی اور گوشت والی باجرے کی ٹکیاں شوق سے کھاتے ہیں۔

س : کھانا پکانے میں محنت کی کتنی قائل ہیں؟

ج : محنت اور لگن سے پکائی ہر چیز ذائقے دار ہوتی ہے۔

س : کچن کی کوئی ٹپ؟

ج : گرمیوں میں دودھ جلد خراب ہو جاتا ہے اگر بوائل کرتے ہوئے ایک چٹکی میٹھا سوڈا ڈال لیا جائے تو نہ ذائقہ تبدیل ہو گا اور نہ ہی دودھ جلد کھٹا ہو گا۔



# موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

## جھٹ پٹ چائنیز بیف

ضروری اشیاء :

| | |
|---|---|
| گائے کا گوشت (چھوٹی بوٹی) | آدھا کلو |
| (ابال کر اسٹرپس کاٹ لیں) | |
| سویا ساس | ایک کھانے کا چمچہ |
| اویسٹر سوس | دو کھانے کے چمچے |
| لہسن' ادرک پیسٹ | ایک چائے کا چمچہ |
| نمک | حسب ذائقہ |
| سیاہ مرچیں (کٹی ہوئی) | آدھا چائے کا چمچہ |
| مشروم | 1 کپ |
| ہری پیاز | 2 عدد (باریک کاٹ لیں) |
| براؤن شوگر | ایک چائے کا چمچہ |
| سرکہ | ایک کھانے کا چمچہ |
| تیل | تین کھانے کے چمچے |
| پانی | ایک کپ |
| کارن فلور | ایک کھانے کا چمچہ |

ترکیب :

ایک برتن میں تیل گرم کرکے گوشت اور مشروم ڈال کر فرائی کریں پسا ہوا لہسن' ادرک ڈال کر بھونیں۔ پیالے میں سویا ساس' اویسٹر ساس' نمک سیاہ مرچیں' براؤن شوگر' سرکہ اور ہری پیاز مکس کر کے گوشت میں ڈال دیں۔

کارن فلور پانی میں گھول کر شامل کرلیں۔ درمیانی آنچ پر پکائیں اور چمچہ مسلسل چلاتی رہیں۔ گریوی گاڑھی ہوجائے تو چولہے سے اتارلیں۔ ڈش میں نکال کر گرم گرم پیش کریں۔

## اسپائسی میکرونی چاٹ

ضروری اشیاء :

| | |
|---|---|
| میکرونی | ڈیڑھ کپ |
| آلو | دو عدد |
| ٹماٹر | دو عدد |
| پیاز | ایک عدد |
| نمک | حسب ذائقہ |
| چلی ساس | چار چائے کے چمچے |
| چاٹ مسالا | 1 چائے کا چمچہ |
| ہرا دھنیا | تھوڑا سا |

ترکیب :

میکرونی کو اچھی طرح ابال کر چھان لیں۔ آلو ابال کر چوکور کاٹ لیں۔ پیاز اور ٹماٹر چوپ کرلیں۔ ایک پیالے میں میکرونی' پیاز' آلو' ٹماٹر اور نمک ڈال کر ملا لیں۔ چلی ساس اور چاٹ مسالا ڈال کر اچھی طرح مکس کردیں۔ ہرا دھنیا باریک کاٹ کر ڈال کر پیش کریں۔

## پراٹھا بوٹی رول

ضروری اشیاء :

| | |
|---|---|
| گوشت (بغیر ہڈی) | آدھا کلو |
| کچا پپیتا | ایک چائے کا چمچہ |
| سرخ مرچ پاؤڈر | ایک چائے کا چمچہ |
| دہی | ایک چوتھائی کپ |
| پسی ہری مرچیں | ایک چائے کا چمچہ |
| گرم مسالا پاؤڈر | آدھا چائے کا چمچہ |
| چاٹ مسالا پاؤڈر | آدھا چائے کا چمچہ |
| املی کی چٹنی | ایک چوتھائی کپ |
| پیاز (باریک کاٹ لیں) | سجاوٹ کے لیے |
| ٹماٹر | سجاوٹ کے لیے |
| سلاد کے پتے | سجاوٹ کے لیے |
| نمک | حسب ذائقہ |
| تیل | حسب ضرورت |

پراٹھے کے لیے :

| | |
|---|---|
| میدہ | آدھا کلو |
| انڈا (پھینٹ لیں) | ایک عدد |
| بیکنگ سوڈا | ایک چوتھائی چائے کا چمچہ |
| نیم گرم پانی | حسب ضرورت |
| نمک | حسب ذائقہ |
| تیل | حسب ضرورت |
| گھی | تین کھانے کے چمچے |

### ترکیب :

پیالے میں گوشت، کچا پپیتا پسا ہوا، سرخ مرچ پسی ہوئی، پسی ہری مرچیں کا، گرم مسالا پسا ہوا، دہی، چاٹ مسالا پاؤڈر اور نمک ڈال کر 1-2 گھنٹے میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔

برتن میں تیل گرم کر کے گوشت ڈال کر درمیانی آنچ پر ڈھک کر گلنے تک پکائیں۔ پانی خشک ہو جائے تو چولہے سے اتار لیں۔ ایک برتن میں میدہ، انڈا، بیکنگ سوڈا، گھی اور نمک ڈال کر نیم گرم پانی سے سخت گوندھ کر آدھے گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ تھوڑا سا گھی ہاتھوں پر لگا کر میدے کے پیڑے بنائیں۔ 10-15 منٹ کے لیے رکھ دیں۔ پیڑے کا پراٹھا بنالیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کر کے پراٹھا سنہرا فرائی کر کے پلیٹ میں نکال لیں۔

پراٹھے میں بوٹیوں کا آمیزہ، پیاز کے لچھے، ٹماٹر، سلاد کے پتے اور املی کی چٹنی ڈال کر رول بنالیں۔

## مینگو ڈیلائیٹ

ضروری اشیاء :

| | |
|---|---|
| دودھ | ایک کلو |
| کلر سویاں (ابال لیں) | دو کھانے کے چمچے |
| چینی | 4 کھانے کے چمچے |
| کنڈینس ملک | 6 کھانے کے چمچے |
| آم | 2 عدد |
| بادام | حسب پسند |

### ترکیب :

آم کو چھیل کر اس کے چوکور ٹکڑے کاٹ لیں۔ ٹکڑوں کی آدھی مقدار کو پیس لیں۔

دودھ گرم کریں۔ اس میں چینی، کنڈینس ملک، پسے ہوئے آم اور ابلی ہوئی سویاں ڈال کر آمیزے کے گاڑھا ہونے تک پکائیں۔

سرونگ ڈش میں نکال کر، بادام اور آم کے ہوئے ٹکڑوں سے سجاوٹ کر کے مزیدار مینگو ڈیلائیٹ پیش کریں۔

## لاہوری چنے کا سالن

ضروری اشیاء :

| | |
|---|---|
| چنے | آدھا پاؤ |
| پیاز | ایک عدد |
| پسا لہسن ادرک | آدھا چائے کا چمچہ |
| ٹماٹر | ایک عدد |
| نمک | حسب ذائقہ |
| پسی لال مرچ | آدھا چائے کا چمچہ |
| پسی ہلدی | ایک چوتھائی چائے کا چمچہ |
| پسا دھنیا | ایک چوتھائی چائے کا چمچہ |
| زیرہ | آدھا چائے کا چمچہ |
| گرم مسالا | ایک چوتھائی چائے کا چمچہ |
| تیل | حسب ضرورت |
| پانی | حسب ضرورت |

### ترکیب :

چنے بھگو کر ابال لیں۔ دیگچی میں تیل گرم کر کے پیاز کو سنہری کریں۔ لہسن ادرک، ٹماٹر، نمک، لال مرچ، ہلدی، دھنیا اور زیرہ ڈال کر پانی کا چھینٹا دیں اور بھون لیں اس کے بعد چنے شامل کر کے حسب پسند شوربہ بنالیں اور گرم گرم پوریوں یا پراٹھوں کے ساتھ پیش کریں۔



## عدنان

# نفسیاتی و ازدواجی الجھنیں

**نسرین ــــ لیہ**

میں نے جب سے آنکھ کھولی ہے' مصائب اور مشکلات کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ ہوش سنبھالا تو بیمار ماں کو دیکھا' چھوٹے بھائی کی پیدائش پر کچھ خرابی ہوئی پھر وہ بستر سے نہ اٹھ سکیں۔ چھ' سات سال کی عمر میں چھوٹے بھائی کو سنبھالنے کی ذمہ داری مجھ پر آپڑی۔ ماں جیسے بتاتیں میں اسے سنبھالتی۔ اسکول جاتی تھی' لیکن پڑھائی کے لیے وقت نہیں ملتا تھا۔ ساتویں کلاس میں تھی کہ ماں دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ اس وقت میری عمر تیرہ سال تھی۔ ابا تو جیسے انتظار میں بیٹھے تھے۔ فوراً" دوسری شادی کرلائے۔ نئی ماں نے آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ مجھے پڑھائی چھوڑنے کا کہا۔ میں پڑھائی چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ ایک دو سال اسی کھینچا تانی میں گزرے۔ پندرہ سال کی عمر میں ماں نے دوسرے شہر میں میرا رشتہ کردیا۔ میں نویں کلاس میں تھی' بہت چاہا کہ میٹرک کرلوں' لیکن اس عورت نے ایک نہ سنی۔ وہ ہر صورت مجھ سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ ابا تو اس کے ہاتھوں کٹھ پتلی تھے۔ بھائی چھوٹا تھا پھر کون تھا جو اسے روکتا۔ شادی ہوگئی تھی۔ میں اپنا شہر چھوڑ کر سسرال آگئی۔ یہ نواحی علاقہ تھا۔ روزگار کے مواقع بھی کم تھے۔ شوہر سیالکوٹ شہر میں ملازمت کرتے تھے۔ جیٹھ' جٹھانی اور دو دیور بھی تھے۔ جیٹھ کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ گھر میرے شوہر کی تنخواہ سے چلتا تھا۔ میری ساس کم عمر بہو اسی لیے لائی تھیں کہ دب کر رہے گی۔ مجھے تو میکے کا بھی کوئی آسرا نہیں تھا۔ اللہ نے شکل و صورت اچھی دی تھی' شوہر گرویدہ ہوگئے۔ یہ صورت حال میری ساس کو کسی قیمت پر گوارا نہیں تھی۔ انہوں نے مجھ پر سختی شروع کردی۔ وہ مہینے میں ایک دو دن کے لیے آتے تھے۔ اس دوران میری ساس کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ مجھے شوہر کے پاس جانے کا موقع نہ ملے۔ ہفتہ بھر کے کام جمع کرکے رکھتیں۔ جٹھانی ان کا پورا پورا ساتھ دیتی۔ میری خامیاں بیان کی جاتیں۔ جٹھانی میری بدسلیقگی کو بیان کرتی' میرے پکائے ہوئے کھانوں میں نقص نکالا جاتا' میں کھانا بناتی تو اس میں نمک ڈال دیتی۔ نظر بچا کر چولہا تیز کردیتی' سالن جل جاتا تو میری لاپروائی کے قصے سناتیں' میں زیادہ سمجھ دار نہیں تھی' بوکھلا جاتی۔ اپنی صفائی میں ایک لفظ نہ بول پاتی' ہکلا کر رہ جاتی۔ رات ہوتی تو ساس کبھی طبیعت کی خرابی' کبھی گرمی کا بہانہ کرکے میرے کمرے میں آجاتیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شوہر کا مزاج بگڑا بگڑا رہنے لگا۔ ان کے آنے میں وقفہ آگیا۔ تین تین ماہ گزر جاتے۔ وہ شکل نہ دکھاتے۔ ساس پہلے تو بہت خوش ہوئیں۔ جٹھانی بھی مطمئن تھی' لیکن جب انہوں نے خرچا بھیجنا بند کردیا تو ان کو فکر ہوئی۔ پتا کروایا۔ دیور کو بھیجا پتا چلا کہ وہ اپنے آفس کولیگ کی بیوہ بہن سے شادی کرچکے ہیں۔ ساس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ انہوں نے سارا غصہ مجھ پر نکالا۔ مجھے مورد الزام ٹھہرایا کہ میں شوہر کو قابو میں نہ رکھ سکی۔ اب میری ساس مجھے گھر میں رکھنے کے لیے تیار نہ تھیں۔ انہوں نے شوہر کو بلا کر کہا کہ اپنی ذمہ داری خود اٹھاؤ' میں تمہاری بیوی کو نہیں رکھ سکتی۔ شوہر کے دل میں میرے لیے کون سی جگہ تھی۔ انہوں نے تین لفظ طلاق کے بولے اور اپنے کندھوں سے بوجھ اتار دیا۔ اولاد بھی نہ تھی جو ان کے پیروں کی زنجیر بن جاتی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں' میں طلاق کا ٹھپہ لگوا کر واپس آگئی۔

ابا تو پہلے ہی کمزور تھے۔ مجھے اس حال میں دیکھ کر ان کو ایسا صدمہ لگا کہ تین ماہ بیمار رہ کر دنیا ہی چھوڑ گئے۔ بھائی کو سوتیلی ماں نے مدرسے میں داخل کرادیا تھا۔ وہ وہیں رہتا تھا۔ ابا کی وفات کے تیسرے دن ماں نے مجھے گھر چھوڑنے کا الٹی میٹم دے دیا۔ میں نے اس سے لاکھ کہا کہ مجھے اس گھر میں رہنے دے' میں محنت مزدوری کرکے اپنا گزارہ کرلوں گی' لیکن وہ کسی قیمت پر اس کے لیے تیار نہ تھی۔ دو مرلہ کا گھر تھا۔ وہ اسے بیچ کر میکے جانا چاہتی تھی۔ گھر بک گیا۔ اس نے حصے کے نام پر میرے ہاتھ پر بیس ہزار رکھے اور خود اپنے میکے چلی گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہاں جاؤں۔ گھر کے سامنے ایک بیوہ خاتون

رہتی تھیں۔ انہوں نے کہا، جب تک کوئی دوسرا انتظام نہ ہو میں ان کے گھر میں رہ سکتی ہوں۔ فوری طور پر میں [illegible]
پناہ لی لیکن ظاہر ہے، یہ سلسلہ زیادہ دیر جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ خاتون نے کہا ان کے دور پار کے کوئی رشتہ دار ہیں۔ ان کی
بیوی دائمی مریضہ ہیں، وہ دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ دو بچے ہیں۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں ان سے شادی کر لوں تو
مجھے ایک ٹھکانا مل جائے گا۔ صاحب کی عمر زیادہ تھی، لیکن میرے لیے سب سے بڑا مسئلہ ایک چھت کا تھا، میں نے اس کو
غنیمت جانا۔ چند افراد کی موجودگی میں سادگی سے نکاح ہوا اور میں رخصت ہو کر ان کے ساتھ گھر آ گئی۔
ان کے گھر میں میرا نہایت سرد مہری سے استقبال ہوا، ان کی بیوی ان کی سگی چچا زاد تھی۔ بظاہر بالکل صحت مند اور ہاق

چوبند تھی، پتا چلا کوئی نسوانی بیماری ہے، رشتہ داری کی بنا پر پورا خاندان اس کے ساتھ تھا۔ مجھے ایک کمرہ دے کر کہا گیا، یہاں سے باہر نہ نکلنا، میں تو اپنے حالات کے ہاتھوں مجبور تھی۔ کیا کہتی۔ اب صورت حال یہ ہے کہ شوہر خرچ کے نام پر دس روپے بھی نہیں دیتے۔ سال ہونے کو آیا ہے۔ اب تک صرف دو جوڑے کپڑے دیے ہیں۔ کچن میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ صبح ایک کپ چائے اور دو توس اور دوپہر اور شام کو دو روٹیاں کبھی دال کبھی سبزی کے ساتھ ایک ٹرے میں رکھ کر بھجوا دی جاتی ہیں۔ شوہر سے کچھ کہنے کی کوشش کرتی ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ بہرے ہیں۔ رات گئے کمرے میں آتے ہیں اور صبح ہونے سے پہلے نکل جاتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے جیسے میں کسی جیل میں ہوں۔ آپ بتائیں۔ کیا کروں، کہاں جاؤں؟

ج :۔ اچھی بہن! آپ کے حالات واقعی بہت المناک ہیں۔ ہمارے معاشرے میں ابھی تک عورت کو اس کا جائز مقام نہیں مل سکا ہے۔ بیشتر گھرانوں میں یہی صورت حال ہے۔ آپ سے صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ ہمت نہ ہاریں۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ آپ کو اولاد کی نعمت سے نوازے تو آپ کے لیے کچھ آسانی ہو جائے۔ آپ کوشش کریں کہ کسی صورت آپ کو تعلیم حاصل کرنے یا کوئی ہنر سیکھنے کی اجازت مل جائے۔ جو حالات آپ نے لکھے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ آپ کو زیادہ دیر برداشت نہیں کریں گے، ایسی صورت میں آپ کے ہاتھ میں بھی کچھ ہونا چاہیے۔ کوئی تعلیم، کوئی ہنر.... ویسے یہ سب کچھ یقینی بھی نہیں ہے۔ ممکن ہے قدرت نے آپ کے لیے آگے کوئی اچھا وقت لکھا ہو۔ آپ اچھی امید رکھیں۔

**سنجیدہ.... لاہور**

اچھی بہن! آپ دنیا میں تنہا ہیں اور نکاح ثانی کرنا چاہتی ہیں۔ نکاح ثانی کی خواہش کرنا بری بات نہیں۔ شریعت نے آپ کو اجازت دی ہے بلکہ بیوہ کے نکاح میں زیادہ جلدی کرنے کی تاکید کی ہے، لیکن آپ کے ساتھ بڑا مسئلہ آپ کی بارہ سالہ بچی ہے۔ آپ کو بہت سوچ سمجھ کر انتخاب کرنا ہوگا۔ وہ صاحب کس طبیعت اور مزاج کے مالک ہیں۔ آیا وہ آپ کی بیٹی کو برداشت کر سکیں گے، ان کے گھر میں رہ کر اپنی بیٹی کو ہر اونچ نیچ اور سرد و گرم سے محفوظ رکھنا بھی ایک بڑا مسئلہ ہو گا۔ آپ ان باتوں پر اچھی طرح غور کریں۔ ویسے آپ کی عمر اٹھائیس سال ہے اگر آپ چار پانچ سال انتظار کریں تو بیٹی کا رشتہ کہیں طے کر کے بھی شادی کر سکتی ہیں۔ یہ آپ کے اور آپ کی بیٹی کے حق میں زیادہ بہتر ہو گا۔

**ربیعہ.... کراچی**

جو شخص گناہ سے توبہ کرے اور اللہ سے استغفار کرے، اللہ تعالیٰ اس کو معاف کر دیتا ہے۔ آپ اپنی غلطیوں پر نادم اور پشیمان ہیں۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔ آپ نے جس جس کے ساتھ زیادتی کی، وہ اگر زندہ ہیں تو کوشش کریں کہ ان کے ساتھ کچھ اچھا کر دیں تاکہ آپ کی غلطیوں کی تلافی ہو سکے۔ اگر وہ زندہ نہیں ہیں تو اللہ تعالیٰ سے ان کی مغفرت کی دعا کریں۔



## بیوٹی بکس

امت الصبور

### سلمیٰ وقار... سیالکوٹ

س : میری شادی ہونے والی ہے' ہمارے ہاں بیوٹی پارلر میں تیار ہونے کا رواج نہیں۔ میں میک اپ کے بارے میں چند باتیں پوچھنا چاہتی ہوں۔

1۔ بلشر کس طرح استعمال کیا جاتا ہے؟

2۔ آئی لائنر کیسے لگایا جائے؟

3۔ فاؤنڈیشن کا انتخاب کرتے ہوئے کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے؟

ج : 1۔ بلشر لگانے سے پہلے آپ مسکرائیں' تاکہ آپ کے رخسار ابھر آئیں۔ رخساروں کے ان ابھار پر بلشر لگائیں۔ اس طرح آپ صحت مند دکھائی دیں گی۔ اسے اچھی طرح بلینڈ کرلیں تاکہ بلشر قدرتی دکھائی دے۔ کبھی بھی بلشر کو رخساروں سے نیچے نہ لگائیں۔ بہت زیادہ نیچے لگایا گیا بلشر کا رنگ یہ ظاہر کرے گا جیسے آپ بے حد تھکی ماندی ہیں' نہ ہی بلشر کو ناک سے زیادہ قریب لگائیں۔ ورنہ سب کی توجہ آپ کی ناک کی جانب مبذول ہوگی۔

کبھی بھی بلشر کو اپنی آنکھوں سے زیادہ قریب نہ لگائیں۔ اس طرح آپ دوسروں کی توجہ اپنی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں' سوجن اور جھریوں پر مبذول کرا دیں گی۔

2۔ آج کل آئی لائنر کا رواج دوبارہ آگیا ہے۔ اپنی اوپری پلک کے اندرونی کنارے سے بیرونی کنارے تک ایک پتلی لائن لگائیں۔ نچلی پلک پر ہرگز نہیں۔ جب یہ سوکھ جائے تو اسی رنگ کی نرم نوک والی پنسل کو اپنی بنائی ہوئی لائن کے اوپر پھیردیں۔ پھر کاٹن سے ہموار کرلیں۔

کالا آئی لائنر کبھی استعمال نہ کریں۔ ڈارک گرے یا چاکلیٹ کلر کا استعمال کریں۔

3۔ فاؤنڈیشن کا انتخاب کرتے ہوئے آپ درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں' اس کے لیے ایسے شیڈ کا انتخاب کریں جو آپ کی اسکن ٹون سے مشابہ ہو' ہلکا یا گہرا ہرگز نہیں۔ شیڈ چیک کرنے کے لیے ہاتھ کی الٹی سطح پر شیڈ لگانا صحیح طریقہ نہیں ہے۔ شیڈ اپنے چہرے پر لگا کر ہی چیک کرنا چاہیے۔

چہرے پر فاؤنڈیشن نقطوں کی شکل میں لگائیں۔ پھر نم اسفنج کی مدد سے اچھی طرح بلینڈ کرلیں۔ چہرے کے علاوہ اپنی گردن پر بھی لگائیں۔

### ثمروٹ..... چیچہ وطنی

س : موسم سرما میں میرے بال اڑے اڑے سے نظر آتے ہیں۔ بالوں کے دو منہ بن گئے ہیں۔ بال بدرنگ اور کھردرے بھی ہیں۔ اس لیے گھنے اور لمبے ہونے کے باوجود خوب صورت نظر نہیں آتے۔ پہلے میرے بال گھنگھریالے تھے۔ میں نے انہیں سیدھا کرایا اور اسٹریٹننگ بھی کرائی۔ اس کے بعد بالوں کا یہ حشر ہوگیا ہے۔ کیا کوئی ایسی صورت ہے کہ بال چمک دار اور دلکش نظر آئیں؟

ج : کنڈیشننگ بالوں کو غذائیت فراہم کرنے کا ایک انتہائی مفید طریقہ ہے۔ یہ بالوں کو ہموار کرتا ہے اور اس سے بالوں میں چمک بھی پیدا ہوتی ہے۔ آپ کنڈیشنر کے بجائے اگر یہ گھریلو اشیا استعمال کریں تو زیادہ مفید ثابت ہوں گی۔

1 استعمال شدہ چائے کی پتی پانی میں دوبارہ ابال کر چھان لیں۔ ٹھنڈا ہونے پر شیمپو کرنے کے بعد اس پانی سے سر دھوئیں۔

2 ایک مگ پانی میں ایک لیموں کا رس ملائیں اور سر دھونے کے بعد آخر میں اسے بالوں پر ڈالیں۔